خواجہ احمد عباس
انقلاب
ایک ناول
Mir Zaheer Abass Rustmani
03072128068

خواجہ احمد عباس

اِنقلاب

ایک ناول

نیا سنسار
۳۵ ب۔ نارتھ بمبئی کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی جوہو بمبئی ۵۴

طابع و ناشر	خواجہ احمد عباس نے یونیورسل فائن آرٹ لیتھو پریس بمبئی ۲ سے چھپوا کر نیا سنسار (پبلشرز) بمبئی ۵۴ سے شائع کیا۔
مطبوعہ	یونیورسل فائن آرٹ لیتھو پریس۔ ۲۳ نوروزجی اسٹریٹ۔ ٹھاکردوار۔ بمبئی ۲
گرد پوش مطبوعہ	بھارتی پرنٹرس۔ ساکی ناکہ۔ بمبئی ۷۲
بارِ اوّل	نومبر ۱۹۷۵ء
تعدادِ اشاعت	ایک ہزار
خوشنویس	محمد عبدالرحمٰن
قیمت	تیس ۳۰ روپیے

ملنے کا پتہ

نیا سنسار۔ بی ۳۴۔ نارتھ بمبئی ہاؤسنگ سوسائٹی۔ جوہو۔ بمبئی ۵۴

اپنی بیوی، دوست اور ساتھی

مجتبائی خاتون مرحومہ

کے نام...

"وہ جو کہ پاس ہو کر دُور ہو گئی......

وہ جو کہ دُور ہو کر پاس آ گئی"

انقلاب کی کہانی

میرا عقیدہ یہ ہے کہ اصل ادیب اور شاعر صرف ہندوستان میں پائے جاتے ہیں۔
امریکہ میں جہاں کتابوں کا ایڈیشن لاکھوں کا ہوتا ہے کامیاب کتابوں پر ادیبوں کو لاکھوں ڈالر رائلٹی ملتی ہے۔ شاعروں کو فی سطر ایک ڈالر سے پانچ ڈالر ملتے ہیں۔ سوویت یونین اشتراکی ملک ہے۔ لیکن وہاں اتنی کتابیں بکتی اور پڑھی جاتی ہیں کہ ادیبوں اور شاعروں کو لاکھوں روبل رائلٹی میں ملتے ہیں۔ ہم نے روس کے ایک مشہور ناول نگار سے پوچھا کہ اتنی رائلٹی کا آپ کیا کرتے ہیں۔ کہنے لگے کہ شروع شروع جوانی میں سُوٹ خریدنے کا شوق ہوتا ہے۔ پھر وہ سوٹ پہننے کا موقع نہیں ملتا کیونکہ ہمارے مُلک میں سادہ لباس ہی مقبول ہے۔ دوستوں کی دعوتیں کرتے ہیں۔ شراب لُنڈھاتے ہیں۔ پھر خوبصورت چیزیں خریدتے ہیں۔ اُن سے جب گھر بھر جاتا ہے تو مضافات میں ایک "ڈاچا" خرید لیتے ہیں۔ جس کی اجازت ہے۔ اس کی سجاوٹ اور آرائش پر پیسہ بے تحاشا خرچ کرتے ہیں۔ پھر بھی رائلٹی ختم ہونے میں نہیں آتی۔ آخر میں تنگ آ کر گورنمنٹ سے درخواست کرنی پڑتی ہے کہ وہ رائلٹی "بحق سرکار ضبط" کرلے۔

ہندوستان میں بدشوقی، غربت اور پندرہ سولہ زبانیں ہونے کی وجہ سے کتابوں کی اشاعت (سوائے ملیالم اور بنگالی کے) ہزار دو ہزار کے ایڈیشن میں ہوتی ہے۔ ہندی کی پاکٹ بکس البتہ بیس پچیس ہزار بک جاتی ہیں مگر اُن کے لئے خاص طور سے سوسوا سو صفحے کے ناول لکھنا پڑتے ہیں۔ وہ بھی کچھ جاسوسی، کچھ رومانی اور "مار دھاڑ سے لبریز" فلمی ٹائپ کے۔ سنجیدہ کتابوں اور ٹھوس نفسیاتی ناولوں کے لئے تو یہی بہت ہے کہ چھپ جاتے ہیں۔

تب ہی تو ہندوستان میں افسانہ کے فن نے زیادہ ترقی کی ہے۔ کیونکہ افسانہ ایک اتوار کو یا "ویک اینڈ" میں لکھا جاسکتا ہے۔ ہمارے ہاں سوموار سے لے کر سنیچر وار تک ادیب کو کچھ اور کرنا پڑتا ہے۔ ہسپتال میں ڈاکٹری، ڈاک خانے یا ریلوے میں ملازمت۔ ریڈیو میں کام، وکالت، پروفیسری یا پھر فلم میں ڈائلاگ لکھنے پڑتے ہیں۔ اتوار کو ادبی کام کرنے کی چھٹی ملتی ہے۔ پھر بھی ہر سال اتنے (اور اتنے اچھے) افسانے لکھے جاتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ یہ تقریباً سب "فن برائے فن" کے لئے لکھے جاتے ہیں۔ جب ہی تو میں کہتا ہوں کہ اصل ادیب اور مصنف صرف ہندوستان میں ملتے ہیں۔

ٹیگور اور ٹالسٹائے کیسے باوجود اپنے ملک کے افلاس اور بدشوقی کے معرکۃ الآرا ناول لکھ پائے؟ بات یہ ہے کہ اُس زمانے میں گیہوں روپے کا بیس سیر بکتا تھا۔ کاغذ روپے کا ایک رِیم ملتا تھا۔ اور یہ دونوں عالمگیر شہرت کے مالک کسی قسم کی اقتصادی مشکلوں میں نہیں پڑے تھے۔ گھر کی جائداد کافی تھی۔ زمینداری سسٹم کی فارغ البالی تھی جس نے اِن دو ترقی پسندوں کو اطمینان اور شانتی

سے اپنی کتابیں لکھنے کا موقع دیا، جن کو پڑھ کر سینکڑوں بلکہ ہزاروں نوجوانوں کو انقلاب کی تحریک ہوئی۔ ورنہ پریم چند جو اپنے زمانے کے بہترین افسانہ نگار اور ناولسٹ تھے آخیر وقت تک بہت تنگی سے بسر کرتے رہے۔

"انقلاب" جیسا ناول لکھنے کے لئے (جس کا پس منظر ملک کی سیاست بلکہ انقلاب ہو) فرصت چاہیے جو مجھے نہیں تھی۔ فارغ البالی چاہیے جو مجھے حاصل نہیں تھی۔ ایک اچھا خاصا اسٹاف چاہیے ریسرچ کرنے کے لئے۔ جو میرے پاس نہیں تھا۔ پبلشر سے بہت معقول ایڈوانس چاہیے۔ جو مجھے ہندوستان میں نہیں مل سکتا تھا۔ پھر بھی میں نے اگست ۴۲ء کو یہ ناول لکھنا شروع کر دیا۔ ہڑتالوں اور سٹرائکوں کے دنوں میں میں نے اپنے ہیرو کے بچپن کے باب لکھے۔ جب چھٹی ملی (اتوار کی یا کوئی اور) تب ناول کو آگے بڑھایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۴۹ء تک یعنی سات برس میں صرف تیرہ باب لکھ پایا۔ وہ بھی انگریزی میں۔۔۔ پھر ایک مہینے کی چھٹی لے کر میں اپنی (مرحومہ) بیوی سمیت راس کماری گیا۔ پورا صندوق بھر کر کتابوں اخباروں اور تراشوں کا ساتھ لے گیا اور وہاں ایک کمرے میں جس کی کھڑکیوں میں سے تینوں طرف سمندر نظر آتا تھا رات دن ایک کر کے یہ ناول مکمل کیا۔

اس کے بعد اس کی اشاعت کی اصل جدّوجہد شروع ہوئی۔ چھ سو صفحے کا ناول کوئی چھاپنے کو تیار نہ تھا۔ سب کا اصرار تھا کہ اس کو ڈیڑھ سو دو سو صفحے کا کر دو تو پاکٹ بک میں چھاپ دیں گے۔ چار برس اسی طرح گزر گئے۔ پھر مغربی جرمنی کے ایک ایجنٹ کا خط آیا۔ اس کو ناول کا مسوّدہ بھیجا۔ اس نے پبلشر سے بات کی۔ انہوں نے ناول کا جرمن ترجمہ چھاپنا منظور کر لیا۔ ۵۴ء کے آخیر میں جب میں پہلی بار روس گیا تو مسودے کی ایک نقل ساتھ لیتا گیا۔ وہاں جا کر یونین آف رائٹرز کو ناول دیا۔ انہوں نے پبلشر کو دکھایا۔ انہوں نے پڑھا، پڑھوایا، پسند کیا اور کنٹراکٹ کر لیا۔ شرط مگر یہ لگائی کہ ہم "انقلاب" نام نہ رکھیں گے کیونکہ اس نام کی کم سے کم سینکڑوں کتابیں اُن کے ہاں ہیں۔ انہوں نے نام رکھا "سین اندی" یعنی "ہندوستان کا بیٹا" اور یہی نام باقی سب سوویت زبانوں میں رکھا گیا۔ اگلے سال یعنی ۱۹۵۵ء میں جرمن اور روسی ترجمہ شائع ہوا۔ (روسی زبان میں نوّے ہزار کا ایڈیشن شائع ہوا) تب جا کر بمبئی کے ایک پبلشر نے کہا کہ سو صفحے کم کر دو تو ہم بڑی پاکٹ بک میں چھاپ دیتے ہیں۔ بادلِ ناخواستہ پچاس ساٹھ صفحے کم کئے۔ تب جا کر سنہ ۱۹۵۶ء میں یہ ناول انگریزی میں ہندوستان میں شائع ہوا۔ پہلا ایڈیشن پانچ ہزار جلدوں کا تھا جو چند ماہ میں بک گیا۔ اس پر رائلٹی ملی ساڑھے سات سو روپے جس سے ناول کو ٹائپ کرانے کا خرچہ تو نکل آیا۔ بعد کے سالوں میں اس کے پانچ پانچ ہزار کے دو ایڈیشن اور شائع ہوئے۔ (کل ملا کر دو ہزار دو سو پچاس روپے ملے) مگر کم سے کم پندرہ ہزار نوجوانوں نے اسے پڑھا۔ (ممکن ہے ایک کاپی ایک سے زیادہ لوگوں نے پڑھی ہو) اور اُن کے خطوں سے معلوم ہوا کہ اُن میں سے اکثر نے اوّلین قومی تحریک کے بارے میں (اور اس کا اثر نوجوانوں کے کردار پر) صرف اس

ناول کے ذریعے جانا۔ یہ ایک کتاب کے لئے ___ اور اس کے لکھنے والے کے لئے ___ بہت بڑا انعام ہے۔

سنہ ۱۹۵۸ء میں یہ ناول سوویت یونین کی یوکرینین زبان میں شائع۔ پہلا ایڈیشن پندرہ ہزار کا چھپا۔ دوسرا ایڈیشن جو پچھلے سال چھپا ہے پچاس ہزار کا ہے۔

سنہ ۱۹۵۸ء ہی میں یہ ناول سوویت یونین ہی کی آذربائی جانین زبان میں شائع ہوا جو مختصر سے علاقے کی زبان ہے۔ (تعداد اشاعت پندرہ ہزار)

سنہ ۱۹۵۹ء میں چیکوسلوواکیہ کی سلوواکین زبان میں شائع ہوا۔ (تعداد اشاعت تین ہزار)

سنہ ۶۰ء میں سوویت قذاقستان کے ایک ادیب ساتھی ہندوستان تشریف لائے اور ایک کاپی قذاق ترجمے کی ساتھ لیتے آئے جو سنہ ۵۹ء میں وہاں شائع ہوا تھا۔ قذاق ایک نئی زبان ہے جو بہت کم لوگ بولتے ہیں۔ (تعداد اشاعت چھ ہزار)

سنہ ۶۱ء میں ہندی زبان میں میرے دوست اور بہنوئی منیش نرائن سکسینہ نے جو ہندی کے مستند ادیب اور مترجم ہیں، اس کا ترجمہ کیا اور راجپال اینڈ سنز نے شائع کیا۔ (تعداد اشاعت دو ہزار)

جب سے کوشش کر رہا کہ اردو کا کوئی پبلشر اس ناول کو چھاپنے کو راضی ہو جائے لیکن لوگ اس کی ضخامت دیکھتے ہی "نہیں" کہہ دیتے تھے۔ پڑھنے کی تکلیف کسی نے نہ کی۔ جب کوئی تیار نہ ہوا تو اپنے اکتیسویں سال میں میں نے اس کی خود کتابت کرائی، خود چھپوایا، اپنے خرچ سے خود شائع کیا۔ (تعداد اشاعت: ایک ہزار!!!) دیکھیں کتنے برس میں یہ بکے گا۔

اپنے سکریٹری عبدالرحمن اور اسسٹنٹ وحید انور صاحب کا میں ممنون ہوں جنہوں نے مہینوں اس کا مسودہ تیار کرنے اور صاف کرنے میں میری مدد کی اور خوشنویس محمد عبدالرحمن صاحب کا جنہوں نے بہت کم وقت میں اس کی کتابت کر دی اور دھاریہ اینڈ کمپنی کا جنہوں نے کاغذ ادھار دے دیا۔ اور اپنے دوست سردار جعفری صاحب کا شکریہ جن کی مہربانی اور مدد سے یونیورسل لیتھو پریس بمبئی میں چھپ کر یہ ناول آخر کار میری اپنی زبان میں سب سے اخیر میں شائع ہو رہا ہے ...

خواجہ احمد عباس

کتاب پہلی

بادل گھر گھر آتے ہیں

۱۔ چڑیاں اور کبوتر

۲۔ سڑکِ اعظم

۳۔ موت سے ملاقات

۴۔ ساری دنیا سے اُوپر!

۵۔ "دیا جلے ساری رات"

کتاب دوسری

طوفان کی آمد آمد

۶۔ سسرال

۷۔ سمندر میں ایک قطرہ

۸۔ "کاہے کو بیاہی بدیس؟"

۹۔ اور خدا سوتا رہا ....

۱۰۔ تمہیدِ غم

کتاب تیسری

بادل کی گرج، بجلی کی کڑک

۱۱۔ ہلال اور تاج

۱۲۔ دردِ بے دوا
۱۳۔ سُنہری ناگن
۱۴۔ پیار کا پھندا
۱۵۔ انقلاب زندہ باد

کتاب چوتھی

طوفان اور طوفان کے بعد

۱۶۔ کھُلی سازش
۱۷۔ انوکھا سفر
۱۸۔ جب شیر بھوکا ہوتا ہے
۱۹۔ دُنیا کا خاتمہ ؟
۲۰۔ کہاں ہے منزل تیری ؟

کتاب پہلی

بادل گھر کر آتے ہیں

۱

حُوریں اور کبوتر

(۱)

مولوی صاحب کی رُعب دار داڑھی پر جب بھی انور کی نظر پڑتی وہ حیرت سے اُسے دیکھتا رہ جاتا۔ اُس سفید اور لمبی داڑھی پر جب جمنا کے کنارے کی صبح کی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے لگتے تو وہ عجیب عجیب شکلیں اختیار کر لیتی۔ کبھی ابابیل کی دُم کی طرح نکیلی ہو جاتی اور کبھی اُڑتے ہوئے کبوتر کے پروں کی طرح پھیل جاتی۔ کبھی تو اتنی خاموش رہتی جیسے کوئی بلّی سو رہی ہو اور کبھی سڑک کے اُس آوارہ کُتّے کی طرح بپھر جاتی جس سے پاس پڑوس کے سارے بچّے ڈرتے تھے۔ جب ہوا کے تیز جھونکے سے اُن کی داڑھی پنکھے کی طرح پھیل جاتی، اُس وقت اسے سنبھالنے میں بُوڑھے مولوی صاحب کی جو حالت ہوتی اُسے دیکھ کر بہت مزا آتا کیونکہ اُس وقت وہ بچّوں کو قرآن ٹھیک سے یاد نہ کرنے کے لیے ڈانٹنا بھول جاتے تھے۔

انور جھوم جھوم کر قرآن کی آیتیں پڑھتا رہتا تھا اور بار بار اُنہیں دُہراتا رہتا تھا۔ کیونکہ قرآن رٹ لینا بہت ثواب کا کام تھا چاہے عربی کا ایک لفظ بھی سمجھ میں نہ آئے۔ اُسے طوطے کی طرح ہی کیوں نہ رٹ لیا جائے۔ مولوی صاحب بچوں کو یہ بتانا کبھی نہیں بھولتے تھے کہ یہ جنت میں پہنچنے کا سب سے سچا راستہ ہے اور جو بچے شریر ہوتے تھے اور دھیان دیکر قرآن نہیں پڑھتے تھے یا مولوی صاحب کا ادب نہیں کرتے تھے اُن کو صاف بتا دیا جاتا تھا کہ وہ جہنم میں جائیں گے جہاں بے حد گرمی پڑتی ہے دلی کی مئی جون کی گرمی سے بھی زیادہ۔ انور کو گرمی سے سخت نفرت تھی کیونکہ اس موسم میں ہر وقت پسینہ ٹپکتا رہتا تھا اور دوپہر میں باہر نکلنے سے لُو لگ کر مر جانے کا ڈر رہتا تھا۔ پر اس گرمی کی کچھ اچھائیاں بھی تھیں گرمی میں ٹھنڈا شربت پینے کو ملتا تھا۔ برف میں لگی ٹھنڈی میٹھی ملائی کی قلفیاں کھانے کو ملتی تھیں لیکن جب بھی انور برف کی قلفی کھاتا تھا اُس کا گلا دُکھنے لگتا تھا اور اسے کھانسی زکام ہو جاتا تھا۔ اسی لیے اس کے باپ نے اُسے نہ صرف قلفی کھانے سے بلکہ برف کا ٹھنڈا پانی تک پینے سے منع کر رکھا تھا اور ان چیزوں کا شوق چوری چھپے نہیں پورا کیا جا سکتا تھا کیونکہ اس کے بعد کھانسی کا ہونا لازمی تھا اور اس سے سارا بھانڈا پھوٹ جاتا تھا۔ انور اپنے من میں سوچتا کہ کُل ملا کر دیکھا جائے تو جنت میں جانا ہی اچھا ہے کیونکہ وہاں ہر وقت موسم ٹھنڈا رہتا ہے، دودھ اور شہد کی ندیاں بہتی ہیں، حُوریں اٹکھیلیاں کرتی ہیں اور پیڑوں پر چڑیاں گاتی رہتی ہیں۔

آخر یہ حُوریں کون ہوتی ہیں؟ انور کے من میں یہ سوال کئی بار اُٹھتا تھا پر آٹھ برس کے اُس بچے کا دماغ اس سوال کا کوئی جواب نہ ڈھونڈ سکا تھا۔ اس میں تو کوئی شک نہیں تھا کہ وہ کسی طرح کی عورتیں ہوتی ہیں؟ کیا وہ پھوپی اماں کی طرح ہوتی ہیں؟ انور کی

پھوپی بیوہ تھیں اور اُن کے کوئی بچہ نہیں تھا اور بچپن میں ہی جب انور کی ماں مرگئی تھیں تو پھوپی اماں نے ہی انور کو پالا پوسا تھا۔ اُن کے سفید بال بہت خوبصورت تھے۔ وہ ہر وقت سفید کپڑے پہنتی تھیں اور بہت کم بولتی تھیں' یا یہ عورتیں گلابو کی طرح ہوتی ہیں' اُس موٹی کالی نوکرانی کی طرح جس کی زبان قینچی کی طرح چلتی تھی لیکن جو کھانا اتنا اچھا پکاتی تھی کہ اس کا نام یاد آتے ہی انور کے منہ میں پانی بھر آتا تھا؟ انور نے اپنی زندگی میں اِن ہی دو عورتوں کو اچھی طرح جانا تھا اور وہ ان میں سے کسی کو بھی اٹھکھیلیاں کرنے والی حوریں نہیں سمجھ سکتا تھا۔ یا وہ اُن دوسری عورتوں' جیسی ہوتی ہیں جن کی انور نے بس ایک جھلک ہی دیکھی تھی۔

انور گا گا کر قرآن پڑھتا رہا اور جھومتا رہا لیکن اُن 'دوسری عورتوں' کی بات سوچتے ہی اس کے چہرے پر لالی دوڑ گئی۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ ایک دن وہ لال کنوئیں کی کسی دکان سے اپنے ابا کے ساتھ دریا گنج میں اپنے گھر جا رہا تھا۔ اُس کے باپ کا قد بہت لمبا تھا اور اسی حساب سے اُن کی ٹانگیں بھی لمبی تھیں۔ انور کو اُن کے ساتھ چلنے کے لیے بیچ بیچ میں بھاگنا پڑتا تھا۔ لال کنوئیں سے وہ حوض قاضی پہنچے اور وہاں سے بائیں ہاتھ چاوڑی بازار میں مڑ گئے۔ کافی رات ہو چکی تھی۔ لوگ دکانیں بند کر کے گھر جا چکے تھے لیکن بازار میں کافی چہل پہل تھی۔ جگہ جگہ پھول ہار والے "لے لو پھول چنبیلی کے" کی آوازیں لگا کر چنبیلی کے گجرے بیچ رہے تھے۔ انور اور اُس کے ابا کو چھوڑ کر بازار میں کسی کو بھی کوئی جلدی نہیں تھی۔ سب لوگ نہایت اطمینان سے چہل قدمی کر رہے تھے' ہنس رہے تھے اور اُوپر کوٹھوں کی طرف دیکھ کر ایک دوسرے کو کہنی مار کر کچھ اشارے کر رہے تھے۔ دکانوں کے اُوپر والے چھجوں پر کوئی ایسی چیز تھی جس میں سب کو دلچسپی معلوم ہوتی تھی۔

انور کی آنکھیں بھی اپنے آپ اُوپر اُٹھ گئیں اور وہاں اس نے ہر چھجّے پر ایک عورت کھڑی دیکھی۔ یہ عورتیں نہ تو پھوپی اماں جیسی تھیں نہ گلابو جیسی۔ وہ رنگ برنگے کپڑے پہنے تھیں۔ لال، ہرے اور نیلے جنہیں دیکھ کر انور کا جی بہت خوش ہوا۔ اُن کے گال گلابی تھے، ہونٹوں پر بھرپور لالی تھی اور کالے بال تیل سے چکنے اور بہت سلیقے سے بنے ہوئے تھے۔ ہر عورت کے پاس لٹکی ہوئی لالٹین اُس کے رُوپ کو چار چاند لگا رہی تھی۔ اُن کی ایک جھلک دیکھ کر ہی انور کو ایسا لگا کہ وہ جتنے لوگوں کو جانتا ہے اُن سب سے یہ الگ قسم کی ہیں اور اُنہیں زندگی کا کوئی راز، کوئی ایسا انوکھا بھید معلوم ہے جس کے بارے میں وہ کچھ بھی نہیں جانتا۔ پر اُسے ایسا لگا کہ بازار میں رنگیلوں اور بے فکروں کی اس بھیڑ کا ہر آدمی اس بھید کو جانتا ہے۔ وہ اپنے ابا سے ان عورتوں کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا پر اس کی ہمت نہیں پڑی کیونکہ اس کے ابا یوں تو اُس کے ساتھ بڑی نرمی سے پیش آتے تھے اور اس کی کسی بھی بات پر جھنجھلاتے نہیں تھے پر انہوں نے اپنے بیٹے کو اوپر کی طرف نظریں ڈالتے دیکھ کر بڑی رکھائی کے ساتھ اُس سے کہا تھا کہ بازار میں چلتے وقت کوٹھوں کی طرف دیکھنا شریفوں کا کام نہیں ہے۔ اس کے بعد باقی راستہ دونوں نے چپ چاپ طے کیا اور انور کی پھر اوپر نظر اُٹھانے کی ہمّت نہیں ہوئی۔ انور کے ابّا نے اُس دن کے بعد سے یہ طریقہ بنا لیا تھا کہ جب بھی اُن کا بیٹا ساتھ ہوتا تو وہ بلّی ماراں اور چاندنی چوک کا چکّر لگاتے ہوئے زیادہ لمبے راستے سے گھر لوٹتے تھے۔

(۲)

کوو۔ وووو! کوو۔ وووو! ہا آ! ہا آ!

کبوتر بازوں کی اس جانی پہچانی آواز میں انور اور اس کی بہن انجم کی ایک بندھی ہوئی دُھن سے قرآن رٹنے کی آواز ڈوب کر رہ گئی۔ انجم انور سے دو برس بڑی تھی اور اُس کے

پاس ہی بیٹھی قرآن پڑھ رہی تھی۔ کبوتر بازوں کی آواز سُن کر انور کا دھیان ٹوٹ گیا۔ وہ کبوتروں کے اُڑتے ہوئے جھنڈ کو دیکھ کر کتنا خوش ہوتا تھا کہ اُس کے دل میں اُن دوسری عورتوں کے بارے میں جو تھوڑی بہت دلچسپی تھی اسے بھی بھول جاتا تھا۔ انور کے ابا کو کبوتر بازی سے بھی سخت نفرت تھی۔ اُن کی رائے میں یہ دلّی کے اُن رئیس زادوں کا شوق تھا جن کے دن اب پورے ہو چکے تھے اور اُن کی رئیسی ختم ہو چکی تھی۔ انہوں نے اپنے بیٹے اور بیٹی کو کتنی ہی بار بتایا تھا کہ اس طرح کی چیزوں کی وجہ سے مغلوں کی سلطنت مٹ گئی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کا بیٹا پتنگ بازی یا کبوتر بازی جیسے فضول شوقوں میں وقت خراب کرنے کی بجائے کُشتی اور کبڈّی میں اور ڈنڈ بیٹھک کی قسم کی کسرت میں دلچسپی لے جو مردوں کے کھیل ہیں اور جن سے تندرستی بنتی ہے۔ انور کو اپنے ابا کی بات پر پورا یقین تھا پر اس کی تندرستی کبھی بھی اتنی اچھی نہیں رہی کہ وہ ان کھیلوں میں حصّہ لے سکے جو اس کے ابّا بتاتے تھے کیونکہ اُن سب میں بہت دَم دار آدمی کی ضرورت ہوتی تھی اور پھوپی اماں اس بات سے لئے کبھی بھی تیار نہ ہوتی تھیں کہ اُن کا لاڈلا بھتیجا اکھاڑے میں جمع ہونے والے اُس پاس کے مُسٹنڈوں سے اپنی ہڈیاں تڑوائے۔ جہاں تک کبوتر بازی اور پتنگ بازی کا سوال تھا انور کو یہ دونوں ہی چیزیں بہت پسند تھیں لیکن وہ اس بات کو اپنے ابّا سے چھپاتا تھا کیونکہ وہ بہت ہی سخت آدمی تھے اور ان سب بُری لتوں سے اپنے بیٹے کو کوسوں دُور رکھنا چاہتے تھے۔ رنگ برنگی پتنگیں کتنی بھلی لگتی تھیں اور آسمان پر پہنچ کر وہ کس ادا سے کبھی اونچی چڑھ جاتی تھیں اور کبھی نیچے آ جاتی تھیں لیکن کبوتروں سے تو انور کو اور بھی زیادہ لگاؤ تھا۔ پتنگ تو صرف اتنی ہی اونچی جا سکتی تھی جتنی لمبی ڈور ہو اور انگلی کے ایک اشارے سے اُس کا رخ موڑا جا سکتا تھا یا اونچا نیچا کیا جا سکتا تھا اور جب بھی پتنگ باز کا دل چاہے اُسے

نیچے اُتار سکتا تھا لیکن کبوتر اپنی مرضی سے جہاں چاہے جا سکتے تھے۔ وہ اپنے اڈّے پر سے ایک بادل کی طرح اُڑتے تھے اور ان کا سایہ ایک چھت سے دوسری چھت پر ہوتا ہوا آگے بڑھتا رہتا تھا اور پھر وہ آسمان پر بہت اونچے اُڑ جاتے تھے جہاں تک کہ دُور اُفق پر صرف ایک دھبّہ جیسا دکھائی پڑتا تھا۔ وہ کہاں جاتے تھے؟ وہ بہت دُور جن انجانے ملکوں میں جاتے تھے وہاں وہ کیا دیکھتے تھے؟ وہ کیا تجربے اور یادیں لیکر واپس لوٹتے تھے؟ انور جب کبھی کبوتروں کو اُڑتا ہوا دیکھتا وہ دل ہی دل میں ان سوالوں پر غور کرتا رہتا۔ گُلابو سوتے وقت اُسے وہ کہانیاں سُناتی تھی۔ اُن میں کی اگر کوئی پری اس سے کبھی یہ پوچھتی کہ وہ کیا بننا چاہتا ہے تو انور یہی کہتا "کبوتر"۔

لیکن فوراً ہی کبوتر بازوں کی "کو۔ ووو۔ ہا آ۔ کو۔ ووو۔ ہا آ" کے پیچھے سے ایک نئی آواز سنائی دی ــــ شہد کی مکھیوں کی گُنگُن جیسی ایک ہلکی سی مِنمِناہٹ ــــ بہت دُور پورب کی طرف جمنا کے اُس پار ایک اکیلا کبوتر آسمان پر اُڑ رہا تھا شاید اپنے جھُنڈ سے بچھڑ کر پیچھے رہ گیا تھا لیکن جیسے جیسے وہ اُڑ کر پاس آتا گیا اس کی آواز تیز ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ وہ شہد کی مکھی کی تیز سے تیز آواز سے بھی زیادہ تیز ہو گئی۔ یہ کبوتر دوسرے کبوتروں سے بالکل الگ تھا کیونکہ وہ اپنے پَر نہیں پھڑپھڑاتا تھا۔ وہ سیدھا اُڑتا چلا آرہا تھا اور دیکھتے دیکھتے وہ بڑے سے بڑے کبوتر سے بھی بڑا ہو گیا۔ وہ تو باز سے بھی بڑا ہو گیا اور جب وہ انور کے سر پر سے ہو کر گذرا تو اسے ایسا لگا کہ وہ تو الف لیلا کی سند باد جہازی والی کہانی کے اُس عقاب سے بھی بڑا تھا جس کے بارے میں گُلابو نے اسے بتایا تھا۔

اس انوکھے کبوتر کو دیکھ کر انور اور انجم کو اتنی دلچسپی ہوئی کہ وہ قرآن کی رٹائی چھوڑ

پھاڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور خوشی اور تعجب سے تالیاں بجانے لگے۔ مولوی صاحب جو بچوں کی قرآن پڑھنے کی سیدھی ہوئی دُھن کی لوریاں سنتے سنتے اونگھ گئے تھے یکایک چونک کر جاگ گئے۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" انھوں نے بناوٹی غصّے کے ساتھ ڈانٹتے ہوئے کہا کیونکہ اتنے موٹے اور نرم دل کے بوڑھے آدمی کے لئے غصے میں اپنی طاقت خرچ کرنا بہت ہی مشکل کام تھا۔ "میری آنکھ ذرا سی جھپکی نہیں کہ تم دونوں کا دھیان اپنے سبق کی طرف سے ہٹ جاتا ہے۔"

وہ بڑا سا کبوتر اڑتا ہوا قطب مینار کی طرف چلا گیا تھا اور اب وہ دُور آسمان پر ایک دھبّے جیسا دکھائی دے رہا تھا حالانکہ انور جو کچھ پڑھتا تھا اس کا مطلب وہ بالکل ہی نہیں سمجھتا تھا اور اسے یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ وہ دنیا کی ایک بہت پُرانی اور خوبصورت زبان کی اعلیٰ درجے کی شاعری پڑھ رہا ہے۔ پھر بھی انور کو ان لفظوں کا تلفّظ بہت اچھا لگتا تھا کیونکہ جب ان لفظوں کا تلفّظ مولوی صاحب کے بتائے ہوئے طریقے سے کیا جاتا تھا تو ایسا لگتا تھا کہ زبان سے الفاظ نہیں بلکہ گاڑھا شہد ٹپک رہا ہے۔ قرآن کی ان آیتوں کو صحیح ڈھنگ سے پڑھ سکنا سچ مچ ایک بہت بڑا کمال تھا اور جب کبھی انور ان کا تلفّظ صحیح صحیح کر لیتا تھا تو اسے بے حد خوشی ہوتی تھی اور اسے ایسا لگتا تھا کہ اس نے کوئی طاقت حاصل کر لی ہے۔ لفظوں پر انسان کی زبان کی انوکھی اور رُعب دار طاقت۔

(۴)

جس وقت انور کمرے میں آیا وہاں بہت سے لوگ بیٹھے ہوئے تھے اور کئی آدمی ایک ساتھ بول رہے تھے۔ انور اپنے ابّا سے بڑے سے کبوتر کے بارے میں پوچھنے آیا تھا۔

جو اس نے آسمان پر اُڑتا ہوا دیکھا تھا۔ وہ چپ چاپ ایک کونے میں بیٹھ گیا اور گھبرا کر سوچنے لگا کہ کسی نے اسے دیکھا نہ ہو۔ جب بھی وہ اپنے ابا کے اتنے بہت سے دوستوں کو ایک ساتھ دیکھا تھا تو نہ جانے کیوں گھبرا سا جاتا تھا۔ وہ اُن سب کو جانتا تھا اور الگ الگ وہ سب اسے بہت اچھے لگتے تھے پر جب وہ ایک ساتھ ہوتے تھے تو اُسے اُن سے ڈر لگنے لگتا تھا۔ اسے ہمیشہ ایسا لگتا تھا کہ وہ سب مل کر ایک ایسی بھیانک طاقت بن گئے ہیں جو ایک شرمیلے اور دبو لڑکے کی سنجیدگی اور شرماہٹ کی دیواروں کو ڈھا دینے پر تُلی ہوئی ہو۔

باہر برآمدے میں بانس کی گہرے ہرے رنگ کی چلمنیں پڑی تھیں تاکہ سورج کی تیز روشنی اندر نہ آسکے۔ گرمیوں میں بھی دوپہر کے وقت کمرہ اندر سے بہت ٹھنڈا اندھیرا اور آرام دہ رہتا تھا۔ چونکہ انور سیدھا چھت پر سے آیا تھا جہاں بیٹھ کر مولوی صاحب ہمیشہ قرآن پڑھاتے تھے، اس لئے کمرے میں گھستے ہی پہلے تو اسے کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔ دھیرے دھیرے اسے اندھیرے میں کچھ شکلیں دکھائی دینے لگیں — فرش پر بچھی ہوئی سفید چاندنی، دیوار کے سہارے لگے ہوئے سفید گاؤ تکیے ایسے لگ رہے تھے جیسے پنا سر اور پتلا ٹانگوں کے موٹے موٹے بچھڑے دیوار سے لگے بیٹھے ہوں اور ان کا سہارا لئے ہوئے اسے اپنے ابا اور ان کے دوستوں کے سفید پوش جسم دکھائی دیئے۔

انور اپنے ابا کو بے حد پیار کرتا تھا بلکہ من ہی من میں اُن کی پرستش کرتا تھا۔ انور کے ابا اکبر علی کا قد لمبا تھا اور وہ اس طرح تن کر کھڑے ہوتے تھے کہ کوئی کہہ نہیں سکتا تھا کہ وہ پچاس برس کے ہیں۔ اُن کا رنگ گورا اور چہرے پر کچھ گلابی پن تھا۔ چھوٹی سی کالی داڑھی سے اُن کے چہرے کا رعب دُگنا ہو جاتا تھا۔ وہ ہمیشہ سفید براق کپڑے پہنتے تھے اور صفائی کا بڑا

خیال رکھتے تھے ۔۔۔ نہ صرف جسمانی صفائی بلکہ ذہنی بھی۔ اُن کے دوست اور کاروبار میں اُن کے ساتھی اُن سے محبّت کرتے تھے اور ان پر پورا اعتبار رکھتے تھے۔ ان کے بیٹے نے دیکھا تھا کہ ایک بار ایک بیوپاری اُن کے پاس بیس ہزار روپے امانت رکھ گیا تھا اور لاکھ کہنے پر بھی اس نے رسید نہیں لی۔ "کمال کرتے ہو اکبر علی، رسید کیا تمہاری زبان سے بڑھ کر ہے۔" اُس بیوپاری نے کہا تھا اور یہ دیکھ کر بیٹا، جس کے سامنے یہ سودا ہوا تھا، فخر سے پھولا نہیں سمایا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں دُعا مانگی تھی۔ "یا خدا، مجھے بھی میرے ابّا جیسا بنانا۔"

اکبر علی کے پاس ہی لالہ رامیشور دیال بیٹھے تھے جو بیوپار میں اُن کے ساجھے دار تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ بیوپار میں ساجھے دار ہونے سے بھی بڑھ کر بہت کچھ تھے۔ وہ اکبر علی کے سب سے پُرانے دوست تھے۔ دونوں سکول میں ساتھ پڑھے تھے اور انور نے اکثر دیکھا تھا کہ وہ دونوں اُس زمانے کی شرارتیں یاد کر کرکے کتنا خوش ہو کر ہنستے تھے۔ رامیشور دیال کا قد چھوٹا اور اُن کے چہرے کا رنگ پیلا تھا۔ بہت ہی نیک طبیعت کے آدمی تھے۔ اور خاص طور پر انور پر تو بہت مہربان تھے۔ ان کی عادت تھی کہ باتیں کرتے کرتے اپنی آستینیں چڑھا لیتے تھے اور فرش پر پالتی مار کر بیٹھے بیٹھے اپنے بائیں تلوے کو تھپکتے رہتے تھے۔ اُن کے کُرتے کے سونے کے بٹن اُس اندھیرے کمرے میں چمک رہے تھے۔ سونے کے اُن بٹنوں کو دیکھ کر انور کا جی بہت للچاتا تھا اور ایک بار رامیشور دیال نے جنہیں انور کاکا کہتا تھا، کہا تھا کہ وہ اسے سونے کے بٹن بنوا دیں گے لیکن اکبر علی نے بڑی سختی کے ساتھ یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ سونے کے بٹن بیکار کی چیز ہیں اور ابھی سے انور کو اگر ان کا شوق پیدا ہو گیا تو وہ بگڑ جائے گا۔ "میں چاہتا ہوں کہ میرا بیٹا اپنے پیروں پر کھڑا ہو۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ سونے کے بٹنوں کا شوق رکھنے والا نکمّا رئیس بنے۔"

کمرے میں دو آدمی اور تھے۔ ایک تھے حکیم عبدالرشید جن کا پیشہ تو حکیمی کرنا تھا پر طبیعت میں شاعری بسی ہوئی تھی اور وہ 'بیدل' تخلص سے غزلیں کہتے تھے۔ وہ بہت ہی نازک طبیعت کے آدمی تھے۔ ہر وقت کپڑوں سے عطر کی خوشبو آتی رہتی تھی۔ لگاتار پان چباتے رہتے تھے اور بات بات میں غالب، میر اور ذوق کے شعر دُہراتے رہتے تھے۔ دوسرے تھے چودھری محمد عمر جن کی طبیعت حکیم بیدل سے بالکل اُلٹی تھی۔ وہ بہت لمبے چوڑے ڈیل ڈول کے آدمی تھے۔ مزاج میں شاعری چھو بھی نہیں گئی تھی لیکن کاروبار کے معاملے میں بہت تیز تھے۔ کئی برس پہلے پنجاب سے آئے تھے اور بہت چھوٹے پیمانے پر کاروبار شروع کر کے انہوں نے چینی اور ایلومونیم کے برتنوں کا بہت بڑا کاروبار کھڑا کر لیا تھا۔ وہ بہت پڑھے لکھے نہیں تھے اور اکثر حکیم بیدل کی باتوں کی باریکی اور ان کے شعر چودھری صاحب کی سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ لیکن اکبر علی ان کی بڑی عزت کرتے تھے اور وہ اکثر انور سے کہتے تھے کہ زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کو محمد عمر کی طرح تجارت کا راستہ اپنانا چاہیے کیونکہ تجارت کے ذریعے ہی آدمی اور قومیں دنیا میں ترقی کر سکتی ہیں۔ وہ کہا کرتے "انگریزوں کو دیکھو صرف تجارت کے بل پر وہ دنیا کے مالک بن بیٹھے ہیں۔"

(۴)

انور کونے میں بیٹھا ان بڑے لوگوں کی باتوں کا مطلب سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ آج کی بات چیت میں ہمیشہ سے زیادہ گرمی تھی۔ کچھ دیر تک تو وہ سمجھ ہی نہیں پایا کہ کس چیز کے بارے میں باتیں ہو رہی ہیں۔ اس کے کان میں بار بار کچھ ایسے لفظ پڑ رہے تھے جن سے وہ بالکل ناواقف تھا۔ جیسے "رولٹ بل" "مارشل لا" "ہڑتال" "کانگریس" "مسلم لیگ" وغیرہ۔ ایک نام جو بار بار لیا جا رہا تھا وہ گاندھی جی کا نام تھا اور ہر شخص

"ستیاگرہ" نام کی کسی چیز سے بارے میں بہت جوش دکھا رہا تھا۔ دھیرے دھیرے جب اس کی آنکھیں کمرے کے اندھیرے کی عادی ہو گئیں تو اس نے وہاں پر جمع ہوئے لوگوں کو پہچاننا شروع کیا۔ اس کے کان بھی بات چیت کے رُخ کا ساتھ دینے لگے اور اس کا دماغ بحث کی کچھ بنیادی باتوں کو سمجھنے لگا۔ جیسے جیسے اس بات چیت میں اس کی دلچسپی بڑھتی گئی، انور اس عجیب چڑیا کو بالکل بھول گیا جس کے بارے میں وہ اپنے باپ سے پوچھنے آیا تھا۔ اب اس کے دماغ پر اس سے بھی عجیب عجیب اور اہم باتیں چھائی ہوئی تھیں۔

انور کو ایسا لگا کہ انگریز سرکار کا رویّہ بہت خراب تھا۔ یوروپ میں "چار سال کی بڑی لڑائی" ہوئی تھی اور ہندوستانیوں نے اس لڑائی کو جیتنے میں انگریزوں کی مدد کی تھی۔ اور ان سے وعدہ کیا گیا تھا کہ اس کے بدلے میں انہیں حکومت کے کام میں زیادہ حصّہ دیا جائے گا۔ لیکن اب لڑائی ختم ہو جانے کے بعد انگریز ان وعدوں کو بھول گئے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ لوگوں میں اس بات پر غصّہ تھا اور کچھ لوگ اس کے بارے میں شور مچانا چاہتے تھے اور کچھ لوگ انگریزوں کو گولی سے اڑا دینا چاہتے تھے جیسا کہ ۱۸۵۷ء میں کیا گیا تھا۔ اُدھر انگریزوں نے ایک نیا قانون بنایا تھا جس کا نام "رولٹ بل" تھا اور اس قانون میں سرکار کے خلاف کوئی بات کہنے یا کوئی کام کرنے کے لئے بہت سخت سزا رکھی گئی تھی۔ گاندھی نام کا کوئی آدمی جو ابھی تک بہت دُور جنوبی افریقہ میں بیرسٹری کرتا تھا لوٹ کر ہندوستان آیا تھا۔ اپنے ملک کے باشندوں کو "ستیہ گرہ" کے ہتھیار کے بارے میں بتا رہا تھا کہ یہی ایک ایسا ہتھیار ہے جس کی مدد سے سرکار کے خلاف کامیابی کے ساتھ لڑا جا سکتا ہے۔ اکبر علی اور اُن کے دوستوں کو بھی "ستیہ گرہ" کے بارے میں زیادہ کچھ نہیں معلوم تھا لیکن ایسا لگتا تھا کہ رامیشور دیال نے گاندھی کا لکھا ہوا کوئی مضمون پڑھا

تھا اور انہیں تھوڑا بہت معلوم تھا کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ شاید یہ مضمون لکھنے والے کا مطلب یہ تھا کہ اگر سب لوگ بے انصافی کے قانونوں کو ماننے سے انکار کر دیں تو سرکار اُن قانونوں کو واپس لینے پر مجبور ہو جائے گی اور پھر انگریزوں کو گولی سے اُڑانے کی کوئی ضرورت ہی نہیں رہ جائے گی۔ دراصل ایسا لگتا تھا کہ یہ آدمی گاندھی کسی کو جان سے مارنے کے بالکل خلاف تھا۔ یہاں تک کہ بے انصاف اور ظالم انگریز افسروں کو بھی نہیں۔ انور اِن باتوں کا پورا مطلب تو نہیں سمجھ پایا۔ پر دو باتیں خود بخود اسے بہت اچھی لگیں ایک تو سرکار کے ناانصافی کے قانونوں کو نہ ماننا اور دوسرے کسی کو بھی جان سے نہ مارنا۔ انور کے ابّا نے اسے سکھایا تھا کہ سچے مسلمان کے لئے بے انصافی کے سامنے سر جھکانا گُناہ ہے۔ اپنے خاندان میں ہی اس کے دادا کی مثال تھی جو دِلّی کے آخری بادشاہ کے دربار میں شاعر تھے۔ لیکن ایک بار اپنی کسی نظم میں انہوں نے بادشاہ اور ان کے درباریوں کی عیّاشی کی زندگی کو بُرا بھلا کہنے کی گستاخی کی تھی اور اس کے لئے معافی مانگنے سے انکار کیا تھا جس کی سزا میں انہیں دربار سے الگ کر دیا تھا۔ اکبر علی اپنے باپ کے اس قصّے کو بڑے فخر سے بیان کرتے کبھی نہ تھکتے تھے اور انور کے دل میں بھی اپنے دادا مرحوم کے لئے بہت عزّت ہو گئی تھی۔ کسی بھی جاندار چیز کو مارنے کے خیال سے ہی اُسے گھن آتی تھی۔ ایک بار اس نے کلّو کو باورچی خانے میں چُوہا مارتے دیکھ لیا تھا تو اُس سے دو دن تک کھانا نہیں کھایا گیا تھا۔ کسی آدمی کو مارنا تو اس سے بھی خوفناک بات تھی۔ انور نے فیصلہ کیا کہ وہ معلوم کرے گا کہ آخر یہ آدمی گاندھی کون ہے۔؟

بحث ابھی چل ہی رہی تھی اور انور ابھی تک یہ پتہ لگا نہیں پایا تھا کہ اُس کے ابّا گاندھی کے ان نئے خیالات سے متفق ہیں کہ نہیں کہ اتنے میں گھر کا پُرانا نوکر فقیرا کمرے

میں آیا اور اس نے اکبر علی کے ہاتھ میں ایک تار دیا۔ اپنے ابا کو تار کی رسید پر دستخط کرتے اور خاکی لفافہ پھاڑتے دیکھ کر انور کا دل زوروں سے دھڑکنے لگا۔ تار آنے پر اس کے دل میں ہمیشہ کھلبلی مچ جاتی تھی۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ اسے اس بات پر بڑی حیرت ہوتی تھی کہ خط اتنی جلدی کیسے آجاتا ہے ـــــ کلکتے تک سے وہ چند گھنٹوں میں دِلّی پہنچ جاتا تھا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ یہ کیسے ہوتا ہے ـــــ کیا یہ خط کبوتر لاتے ہیں۔ جس طرح گلابو کی پرانے بادشاہ والی کہانیوں میں لاتے تھے یا ان خطوں کو بڑا سا کبوتر لاتا تھا جیسے اس نے صبح آسمان پر اُڑتے دیکھا تھا۔؟

تار آنے کا مطلب ہمیشہ یہ ہوتا تھا کہ کوئی بہت بڑی بات ہو گئی ہے۔ ایک بار تار سے دس ہزار کمبلوں کا آرڈر آیا تھا۔ ایک بار اور تار سے اونی کپڑے کی ایک فیکٹری میں، جہاں سے اکبر علی اور رامیشور دیال کا مال آتا تھا، آگ لگنے کی خبر آئی تھی۔ اکثر تار کا مطلب ہوتا تھا کوئی لمبا سفر ـــ کانپور یا امرتسر یا کلکتے تک کا سفر۔ انور کا دل کتنا چاہتا تھا کہ وہ کبھی اپنے ابا کے ساتھ ان جگہوں کے سفر پر جاسکے۔ وہ تمام انوکھی جگہوں کے سپنے دیکھا کرتا تھا جہاں اس کے ابا جایا کرتے تھے۔ پر یہ جگہیں بہت دور تھیں اور کسی لمبے سفر پر جانے کی اس کی خواہش ابھی پوری نہیں ہوئی تھی۔

اکبر علی نے تار اپنے ساجھے دار کے ہاتھ میں دے دیا۔ رامیشور دیال نے اپنی عادت کے مطابق اسے بڑے دھیان سے دھیرے دھیرے پڑھا۔

"اِس کا مطلب ہے کہ آپ کو امرتسر جانا پڑے گا۔" رامیشور دیال نے تار اکبر علی کو واپس کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں، لگتا تو ایسا ہی ہے۔" اکبر علی نے تار کو موڑ کر لفافے میں رکھتے ہوئے کہا۔

تو یہ بات تھی، ابّا امرتسر جا رہے ہیں۔ انور کے دل کو بڑی تسلّی ہوئی اور اس کے دل میں جو ایک عجیب سی تشویش تھی وہ دُور ہو گئی۔ لیکن جیسا کہ ایسے موقعوں پر ہمیشہ ہوتا تھا انور نے آنکھیں بند کر کے دل ہی دل میں اللہ میاں سے دُعا مانگی ــ "یا اللہ میاں، کچھ ایسا کیجئے کہ ابّا مجھے بھی اپنے ساتھ لے جائیں۔ اللہ میاں بس میری یہ مُراد پوری کر دیجئے تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں کبھی کوئی شرارت نہیں کروں گا۔ میں ابّا کا اور پھوپی اماں کا اور مولوی صاحب کا کہنا ہمیشہ مانوں گا۔"

"لیکن اکبر علی یہ وقت تمہارے لئے اس سفر پر جانے کے لئے بالکل مناسب نہیں ہے۔" انور نے چودھری محمد عمر کو کہتے سُنا اور اس نے آنکھیں کھول کر اللہ میاں کی طرف سے دھیان ہٹا کر وہاں پر جمع ہوئے لوگوں کی طرف دھیان دیا۔ "پنجاب میں مارشل لا لگا ہوا ہے اور وہاں ہر آدمی کے لئے جان کا خطرہ ہے۔"

"جی ہاں۔" حکیم بیدل نے ہمیشہ کی طرح بہت دھیرے سے اپنی آواز کھینچ کر کہا۔ "آسمان پر نحوست کے بادل گھر رہے ہیں اور زمانہ بہت خراب ہے جیسا کہ غالب نے کہا ہے ــــ"

"جانے بھی دیجئے کہ غالب نے کیا کہا ہے۔" اکبر علی نے اُن کی بات بیچ میں ہی کاٹتے ہوئے کہا۔ "میں گھر پر عورتوں کی طرح چوڑیاں پہن کر نہیں بیٹھ سکتا۔ اور بہر حال میں تو اپنے کاروبار کے سلسلے میں جا رہا ہوں۔ میں وہاں کوئی سیاسی تحریک چلانے تو جا نہیں رہا ہوں، پھر مجھے کچھ کیوں ہونے لگا؟"

"پھر بھی بھائی صاحب۔" رامیشور دیال نے ہمّت کر کے کہا ــــ رامیشور دیال یوں تو عمر میں اکبر علی کے برابر ہی تھے، پر وہ ہمیشہ انہیں اپنا بڑا بھائی مان کر بھائی صاحب کہتے

تھے ـــ اگر ذرا بھی خطرہ ہے تو میں تو یہی کہوں گا کہ آپ وہاں نہ جائیں۔"

"رامیشور، نادانی کی باتیں نہ کرو۔ جب تک میں امرتسر جا کر ملوں کے ساتھ مال کا بندوبست نہیں کروں گا تب تک ہم اپنا یہ ٹھیکہ پورا نہیں کر سکتے۔ میں کل صبح ہی چلا جاؤں گا۔"

انور کو ابّا کا اس طرح دو ٹوک اپنا پکّا ارادہ ظاہر کر دینا بہت پسند تھا۔ وہ کسی بات سے گھبرانے یا ڈرنے والے نہیں تھے۔ اگر کوئی کام کرنا ہوتا تھا تو وہ اسے پورا کر کے ہی چھوڑتے تھے، چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ انور کا دل ایک بار فخر سے بھر اٹھا اور پھر اس کا فخر سے بھرا ہوا دل زور سے دھڑکا۔ اُس کے کانوں میں گھنٹیاں سی بجنے لگیں اور خوشی کے مارے اس کے سارے بدن میں ہلکی سی کپکپی دوڑ گئی۔

"انور"۔ اس کے ابّا نے اس کی طرف دیکھ کر پکار کر کہا۔

"جی ابّا"۔

"میرے ساتھ امرتسر چلو گے؟"۔ اور یہ کہہ کر وہ مسکرا دیئے۔

یہ سوال اس طرح اچانک اُس پر ٹوٹ پڑا کہ انور ہکّا بکّا رہ گیا۔ اس سے کوئی جواب دیتے نہ بن پڑا۔ وہ یہ سننے کے لئے بھی وہاں نہ رُکا کہ اکبر علی اپنے دوستوں کو یہ سمجھا رہے تھے کہ وہ اپنے آٹھ برس کے بیٹے کو اپنے ساتھ اس لئے لے جا رہے تھے کہ وہ چاہتے تھے کہ اسے دنیا کی تجربہ ہو، سفر کرنے سے اس کا نظریہ وسیع ہو اور وہ سورما اور نڈر بنے۔ انور بھاگ کر زنان خانے میں پہنچ چکا تھا اور اپنی بہن کے گلے سے لپٹ کر بے حد خوش ہو کر کہہ رہا تھا۔ "باجی انجم۔ میں امرتسر جا رہا ہوں۔"

(۵)

گرمی کے دن تھے۔ رات کے وقت آسمان بالکل صاف تھا اور اُس پر لاکھوں ستارے اس طرح جگمگا رہے تھے جس طرح باجی انجم کا وہ گہرا نیلا کامدانی کا ڈوپٹہ جس پر سینکڑوں ستارے لگے ہوئے تھے اور جو انہوں نے عید کے دن پہنا تھا۔ انور گھر کے اندر والے آنگن میں پھوپی اماں، انجم اور گلابو کے پاس سوتا تھا۔ وہ بستر پر آنکھیں کھولے لیٹا تھا۔ اس کی بوڑھی پھوپی اماں دن بھر گھر کا کام کاج کرنے کے بعد تھک کر سو گئی تھیں۔ انجم بھی گہری نیند سو رہی تھی۔ گلابو ہمیشہ کی طرح رات کو گھنٹے دو گھنٹے کے لئے پڑوس میں گپّیں لڑانے کے لئے گئی ہوئی تھی۔ صرف انور ستاروں کا ساتھ دے رہا تھا۔ آنے والے سفر کے خیال سے اس کے دل میں اتنی کھلبلی مچی ہوئی تھی کہ اسے نیند بھی نہیں آ رہی تھی۔

رات کے سنّاٹے میں پُرانے بھاری پھاٹک کے قبضوں کے چوں چوں کی آواز سنائی دی اور انور نے گلابو کو اندر آتے دیکھا۔ گلابو نے یہ کوشش کرتے ہوئے کہ کم سے کم آواز ہو دروازہ بند کیا اور کنڈی چڑھا دی۔ پھر وہ دبے پاؤں آکر اپنی چارپائی کی طرف بڑھی۔

"بُوا گلابو۔" حالانکہ وہ نوکرانی تھی لیکن انور کو سکھایا گیا تھا کہ وہ اسے ہمیشہ عزّت کے ساتھ "بُوا" کہا کرے۔

"ہاں بیٹا، کیا بات ہے؟"

"مجھے نیند نہیں آ رہی ہے۔"

"تو تمہارا مطلب ہے کہ میں تمہیں کوئی کہانی سُناؤں؟"

"ہاں بُوا، میری اچھی بُوا۔"

ایسا لگتا تھا کہ سارے ستاروں کی چمک اور بھی بڑھ گئی ہے جیسے وہ گلابو کی کہانی

سننے کے لئے اور پاس آ گئے ہوں۔ انور کو پکا یقین تھا کہ گلابو جیسی مزیدار کہانیاں سُناتی تھی ویسی ستاروں نے کبھی نہ سُنی ہوں گی۔

جیسے ہی گلابو اپنے بھاری ڈیل ڈول کے ساتھ انور کی چارپائی پر بیٹھی چارپائی چرمُرا اٹھی۔ شاید اسے گلابو کا وہاں بیٹھنا اچھا نہ لگا۔ گلابو نے منہ کا پان تھوک دیا اور کہانی کہنا شروع کیا۔ گلابو کی ہر کہانی ایک ہی طرح سے شروع ہوتی تھی اور انور کہانی کے شروع کے اِن الفاظ سے اچھی طرح واقف ہو چکا تھا۔

"سوئے سنسار جاگے پاک پروردگار، ہمارا تمہارا خدا بادشاہ، خدا کا بنایا نبی بادشاہ ــــ ایک تھا بادشاہ ۔ ۔ ۔"

گلابو اسے جو بھی کہانی سناتی تھی وہ اسی طرح شروع ہوتی تھی۔ اس میں ہمیشہ ایک بادشاہ ہوتا تھا فرق صرف اتنا ہوتا تھا کہ اس کی اولادیں کتنی ہیں۔ کبھی اس کے سات بیٹیاں ہوتی تھیں۔ کبھی اس کے سات بیٹے ہوتے تھے۔ ایک کہانی میں اس کے تین بیٹیاں تھیں۔ اس کہانی میں اس کے صرف ایک بیٹا تھا۔

"بادشاہ اپنے بیٹے سے بہت پیار کرتا تھا۔" گلابو اپنی نرم اور میٹھی آواز میں کہانی کہتی رہی۔ گلابو کا جسم جتنا بھاری بھرکم اور بدصورت تھا، اتنی ہی اس کی آواز میٹھی اور خوبصورت تھی۔ "تو جب شاہزادہ اٹھارہ برس کا ہوا تو ایک دن بادشاہ نے اسے بُلا کر ایک گھوڑا اور ایک تلوار دی اور سمت معلوم کرنے کے لئے قطب نما دی۔"

"بیٹا جاؤ، جا کر دنیا کی سیر کرو۔" بادشاہ نے اس سے کہا۔ "اور خود دنیا کو دیکھو۔" اُس نے شہزادے کو ایک بات کے لئے منع بھی کیا۔ "بیٹا مشرق جانا، شمال جانا، جنوب جانا مگر دیکھو مغرب کبھی نہ جانا کیونکہ اُدھر بہت بُرائی اور بہت خطرہ ہے۔" خداحافظ

کہہ کر بادشاہ نے اپنے بیٹے کو رخصت کیا۔

"سو شہزادہ گھوڑے پر سوار ہو کر سفر پر نکل پڑا۔ پہلے وہ شمال کی طرف گیا ۔ وہ گڈریوں اور سیدھے سادے پہاڑی لوگوں کے ساتھ رہا اور اس نے دیکھا کہ انہیں اپنا پیٹ پالنے کے لیے کتنی محنت کرنی پڑتی ہے اور وہ آندھی طوفان اور برف کا کتنی بہادری کے ساتھ مقابلہ کرتے ہیں۔ پھر وہ جنوب کی طرف چلا۔

"شمال کے برفیلے علاقوں کے بعد جنوب کا علاقہ اسے بہت ہرا بھرا دکھائی دیا اور وہاں کا موسم بھی اچھا تھا۔ خوبصورت گھاٹیوں میں ہو کر ندیاں بہہ رہی تھیں۔ کھیتوں میں چاول اور گیہوں کی فصل لہرا رہی تھی۔ پیڑ پھلوں سے لدے تھے اور زمین پر سے ناریل، آم اور امرود اٹھا کر ہی آدمی اپنا پیٹ بھر سکتا تھا۔ وہاں جن لوگوں سے وہ ملا وہ بات بڑی نرمی سے کرتے اور گھر آئے مہمان کی بڑی آؤ بھگت کرتے تھے لیکن ساتھ ہی وہ بہت کاہل اور سست بھی تھے۔ وہ اپنا کافی وقت ناچنے گانے میں اور اپنے جسموں کو قوس قزح کے ساتوں رنگوں میں رنگنے میں صرف کرتے تھے۔

"اس کے بعد شہزادہ مشرق کی طرف مڑا اور بہت بڑے بڑے شہروں میں جا پہنچا۔ وہاں کے بازار طرح طرح کی انوکھی چیزوں سے بھرے پڑے تھے۔ وہاں کے مندروں پر سونے کے کلس تھے اور وہاں کے رئیس چاندی کی پالکیوں میں چڑھ کر جاتے تھے۔ یہاں کے لوگ بڑے تہذیب والے تھے اور جن لوگوں سے وہ ملا اُن میں بڑے بڑے ودھوان اور ہزاروں برس پرانا علم جاننے والے لوگ تھے۔"

"مشرق کا سفر پورا کر کے شہزادہ ایک جگہ ٹھہر گیا۔ اب صرف مغرب کی طرف جانا رہ گیا تھا۔ بادشاہ نے اسے اُدھر جانے سے بالکل منع کر رکھا تھا لیکن اتنا گھومنے پھرنے کے بعد وہ

مغرب کی طرف جانے کو اتنا بے چین ہو گیا تھا کہ اس نے اپنے باپ کی نصیحت نہ مان کر مغرب کا راز بھی معلوم کرنے کا فیصلہ کیا۔

" اور سو شہزادے نے اپنا تھکا ماندہ گھوڑا مغرب کی طرف موڑا۔ نہ جانے کتنی پہاڑیوں اور دور تک پھیلے تپتے ہوئے ریگستانوں کے پار اُسے سفر کرنا پڑا۔ آخر میں شہزادہ آندھی اور طوفان کا مقابلہ کرتا ہوا ایک خوفناک شہر میں پہنچا۔ یہاں اس کی آنکھوں نے جو کچھ دیکھا وہ سچ مچ بہت ہی بھیانک تھا۔ ہزاروں مرد عورتیں اور بچے زنجیروں سے ایک بہت بڑی چکّی سے بندھے ہوئے تھے جیسے وہ گھما رہے تھے۔ ان کے بیچ میں ایک بہت لمبا چوڑا دیو کھڑا ہوا تھا جس کا سر بادلوں کو چھو رہا تھا اور جس کے پاؤں زمین میں بہت دھنسے ہوئے تھے۔ اس کے ہاتھ میں ایک کوڑا تھا اور جو کوئی بھی کام میں ڈھیل کرتا تھا اس کی پیٹھ پر وہ بڑی بے رحمی سے کوڑا مار دیتا تھا۔ اس چکّی کے پاٹوں سے جو پہاڑ جتنے بڑے تھے بہت بھیانک آواز نکل رہی تھی۔ شہزادے نے جب پاس جا کر چکّی کے پاٹوں کو دھیان سے دیکھا تو اس کے ہوش اُڑ گئے، کیونکہ اس چکّی میں انسان پیسے جا رہے تھے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ دیو کچھ لوگوں کو اُٹھا کر اس چکّی میں جھونک رہا تھا اور اس چکّی کو چلانے والے غلام سر جھکائے کولھو کے بیل کی طرح چکّر لگاتے جا رہے تھے۔ ان کی بیڑیوں کی جھنکار چاروں طرف گونج رہی تھی، وہ خود اپنی تباہی کی چکّی کو روک نہیں سکتے تھے۔

" ان بے چارے بدنصیب لوگوں کو دیکھ کر شہزادے کا دل دہل گیا اور اس نے ترس کھا کر ایک آدمی کی زنجیریں کھولنے کی کوشش کی۔ لیکن اُس آدمی نے اسے روکتے ہوئے کہا۔ بھائی، تم بیکار پریشان نہ ہو۔ ہم لوگ اس چکّی سے اُس وقت تک بندھے رہیں گے، جب تک آسمان پر ایک خاص لال ستارہ نہیں دکھائی دے گا۔ اُس ستارے کے دکھائی

دینے کے بعد ہی ہم آزاد ہوں گے۔ تم جاؤ اور جاکر ہری آنکھ والے اژدھے کا پتہ لگاؤ اور اسے مار ڈالو کیونکہ وہ ہمارے بہت سے بھائیوں کو کھا گیا ہے۔

" اور سو شہزادہ ہری آنکھ والے اژدھے کی تلاش میں نکل پڑا۔ راستے میں پریوں کا دل کو لبھانے والا باغ پڑا۔ ہوا میں سنگیت تھا۔ شراب کی ندیاں بہہ رہی تھیں۔ پیڑوں میں ڈالیاں سُنہرے پھلوں کے بوجھ سے جُھکی جا رہی تھیں اور چاروں طرف سے خوبصورت پریاں پُکار پُکار کر اُس سے کہہ رہی تھیں۔ 'پردیسی تھوڑی دیر کے لئے ہمارے پاس اِس خوبصورت جگہ پر ٹھہر جاؤ۔ ایسی جلدی کیا ہے'۔ لیکن شہزادہ جانتا تھا کہ یہ سب لالچ اُسے اِس لئے دیئے جا رہے ہیں کہ وہ جس کام کو پُورا کرنے نکلا ہے اسے پُورا نہ کر سکے۔ اس چکی" سے بندھے ہوئے غلاموں کی خوفناک تصویر اس کی آنکھوں کے سامنے ناچ رہی تھی۔ اس لئے اس نے پریوں کو ایک طرف دھکیل دیا اور تیزی سے گھوڑا دوڑاتا ہوا پریوں کے باغ کو پار کر گیا۔

" لیکن اس کے بعد اُس کا راستہ خوف کی وادی سے ہو کر گذرتا تھا۔ جس پر جہالت کی کالی چھاؤں پڑ رہی تھی۔ جب وہ وہاں سے گذرا تو بھوتوں نے اس کا گلا گھونٹنے کی کوشش کی اور چٹانوں سے بھیانک آوازیں نکل کر اس کے کانوں میں گونجنے لگیں۔ اِن آوازوں نے چلّا کر کہا، 'واپس لوٹ جاؤ۔ تم ہمارے جنگل سے بچ کر آگے نہیں جا سکتے۔ ہم تمہیں مار ڈالیں گے۔ ڈراؤنے راکشسوں نے آگ کے بھالوں سے اس پر حملہ کر دیا اور زور زور سے چلّا کر اس سے کہنے لگے، واپس لوٹ جاؤ، آج تک کوئی بھی اِس خوف کی وادی کو زندہ پار نہیں کر سکا، ہم تمہیں مار ڈالیں گے۔ لیکن شہزادے کو اُس کے باپ نے سکھایا تھا کہ خدا کے علاوہ کسی اور سے نہ ڈرنا اور اس لئے شہزادے کو اُن

سے ڈر نہیں لگا۔ اس نے تلوار کھینچ لی اور کلمہ پڑھ کر اُن سے چلّا کر کہا۔ ہٹ جاؤ میرے راستے سے۔ میں انسان ہوں۔ انسان کی اولاد ہوں۔ میں ساری دنیا کا مالک ہوں۔ اور اس کا اتنا کہنا تھا کہ بھوت غائب ہو گئے اور ڈرانے والی خوفناک آوازیں سُنائی دینا بند ہو گئیں۔

"چلتے چلتے شہزادے کو ہری آنکھ والا اژدھا ملا۔ اس کے پکھراج کی ہری ہری چمکدار آنکھیں اور سونے کی دُم تھی اور اس کا منہ بہت بڑا تھا۔ ہر بار جب وہ مُنہ کھول کر سانس لیتا تھا تو نہ جانے کتنے مرد، عورتیں اور بچے کھنچ کر اس کے منہ میں چلے جاتے تھے اور انہیں وہ زندہ نگل لیتا تھا۔ شہزادے نے تلوار کھینچی اور اژدھے پر حملہ کرنے کے لئے آگے بڑھا لیکن اس پر تلوار کا وار کرنے سے پہلے وہ کچھ سوچ کر رُک گیا۔ اژدھا اپنے شکار کے پیچھے ایک گول دائرے میں گھوم رہا تھا کہ اچانک اس نے اپنی ہی سنہری دُم پکڑلی اور خود اپنے آپ کو نگلنے لگا۔

"شہزادے نے اُوپر نظر اُٹھا کر دیکھا تو آسمان پر ایک نیا ستارہ چمک رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں اسے بجلی کڑکنے کی آواز اور طوفان کا شور سُنائی دیا لیکن بعد میں اسے پتہ چلا کہ یہ چکّی سے بندھے ہوئے اُن غلاموں کا ہی شور و غُل تھا جو اب آزاد ہو کر خوشی کے مارے چلا رہے تھے......"

لیکن انور تو کب کا سو چکا تھا۔ اُس نے کہانی آخر تک سُنی ہی نہیں!

(٦)

اُس رات انور نے ایک عجیب خواب دیکھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ سپنا دیکھ رہا ہے پھر بھی اس کے من میں ایک گہرا احساس یہ تھا کہ یہ خواب نہیں بلکہ یہ سچائی ہے۔

پہلے تو اس نے آسمان پر ایک بہت بڑا کبوتر اڑتے دیکھا جو ایک چمکدار لال ستارے کی طرف چلا جا رہا تھا۔ پھر اس نے دیکھا کہ کبوتر نہیں ہے بلکہ وہ خود اس بہت بڑے کبوتر کی پیٹھ پر بیٹھا ہوا ہے جسے اس نے اس دن صبح آسمان پر اڑتے دیکھا تھا۔ اس کے دونوں طرف آنکھوں کی طرف مولوی صاحب کی سفید داڑھی لگی ہوئی تھی جو ہوا میں عجیب طرح سے پھڑ پھڑا رہی تھی۔ اس کے ابّا کہیں سے اسے آواز دے رہے تھے، پر جب اس نے مڑ کر دیکھا تو وہ اس کے ابّا نہیں بلکہ کاکا رامیشور دیال تھے۔ وہ آسمان کی طرف اڑتا چلا جا رہا تھا جس کا رنگ نیلا تھا اور جس پر ستارے ٹنکے ہوئے تھے، پر جب اس نے اسے پکڑ کر نیچے کھینچنے کی کوشش کی تو وہ باجی انجم کا دھانی دار ڈوپٹہ نکلا۔ ایک چڑیا اڑتی ہوئی اس کی طرف آ رہی تھی ــــ لیکن نہیں، وہ چڑیا نہیں تھی بلکہ امرتسر سے آیا ہوا تار تھا جو ہوا میں پھڑ پھڑا رہا تھا اور راستے میں وہ بڑا کبوتر ایک سفید گھوڑا بن گیا تھا اور چڑیا کی طرح اڑا چلا جا رہا تھا لیکن تھوڑی ہی دیر میں وہ زمین پر اتر آیا اور ایک گھاٹی میں سے ہو کر دلکی چال سے چلنے لگا۔ ایک حور یا پری ہوا میں اڑتی ہوئی آئی اور بولی "پردیسی، تھوڑی دیر کو رک جاؤ نا۔" لیکن وہ حور نہیں تھی بلکہ چاوڑی بازار کی ان "دوسری عورتوں" میں سے ایک تھی اور اس لئے انور نے جواب دیا۔ "میں انسان ہوں، انسان کی اولاد ہوں میں ساری دنیا کا مالک ہوں۔" اور اس نے جواب دیا۔ "میں عورت ہوں، عورت کی بیٹی ہوں اور تم مجھ سے بچ کر نہیں جا سکتے۔" اور اتنا کہہ کر وہ اپنی باہیں پھیلا کر انور سے لپٹ گئی لیکن وہ وہاں نہیں تھا ــــ اور نہ ہی وہ تھی۔ اب وہ خوف کی وادی میں پہنچ گیا تھا اور ہری آنکھوں والا اژدھا اس کی طرف آ رہا تھا۔ وہ وہیں سہم کر کھڑا ہو گیا اور اسے یقین ہو گیا کہ وہ اژدھا اسے مار ڈالے گا۔ اتنے میں ایک اجنبی ایک دبلا پتلا

چھوٹا سا آدمی آکر اس کے اور اژدھے کے بیچ میں کھڑا ہو گیا اور بولا ”میں گاندھی ہوں
اور میں افریقہ سے آیا ہوں۔ اے اژدھے اِس معصوم بچے کو نہ مارنا۔ نہیں تو میں تمہارے
بے انصافی کے قانونوں کو نہیں مانوں گا۔ مارنا تو تمہیں کسی کو بھی نہیں چاہئے چُوہے
تک کو نہیں۔“ اژدھے نے اپنے نتھنے پھنکار کر زور سے سانس لی اور وہ اجنبی اور انور
دونوں اس اژدھے کے پیٹ میں پہنچ گئے۔“ ...... لیکن اصل میں وہ اژدھے کا پیٹ
نہیں بلکہ اس کے ابّا کی اندھیری بیٹھک تھی اور وہاں حکیم بیدل بیٹھے غالب کے شعر سُنا
رہے تھے۔ ”آسمان پر منحوس گھٹائیں گھِر رہی ہیں“۔ حکیم بیدل نے کہا اور سچ مچ آسمان پر
گہرے کالے کالے بادل گھِر آئے تھے اور تھوڑی ہی دیر میں پانی برسنے لگا ...... کمرے
کے اندر بھی برسنے لگا .....

لیکن پانی کا چھینٹا تو انجم نے ہمیشہ کی طرح انور کو جگانے کے لئے اس کے مُنہ پر مارا
تھا۔ انور نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ اُس کی بہن شرارت بھرے انداز سے مُسکرا
رہی تھی۔ ”اُٹھو، کاہل کہیں کا۔ اگر امرتسر جانا ہے تو فوراً اُٹھ جا نہیں تو ابّا تجھے چھوڑ
کر چلے جائیں گے۔“

۲

سڑک اعظم

(۱)

ریلوے اسٹیشن انور کے لئے ایک نئی ہی دنیا تھی۔ کبھی سپنے میں بھی اُس نے ایسی جگہ نہیں دیکھی تھی۔ بھیانک کالے دیو جیسے بڑے بڑے انجن دھواں اُڑاتے ہوئے ریل کی چمکتی ہوئی پٹریوں پر اِدھر سے اُدھر آجا رہے تھے۔ گاڑیاں آتی تھیں اور بہت دُور بمبئی، کلکتہ اور پشاور تک چلی جاتی تھیں۔ سٹیشن میں آتے ہوئے اور سٹیشن سے باہر نکلتے ہوئے مسافروں کی بھیڑ ایک عجیب بے میل کھچڑی تھی — ہر رنگ کی پگڑیاں، ہر شکل کی ٹوپیاں، شلواریں پہنے ہوئے پٹھان اور دھوتیاں باندھے ہوئے بنگالی، ڈھیلے ڈھالے بُرقعوں میں ملبوس مسلمان عورتیں اور منہ پر چھوٹا سا گھونگھٹ کاڑھے ہوئے کھاتے پیتے گھرانوں کی ہندو عورتیں اور اُن کے ساتھ ہی کچھ گوری چمڑی والی عورتیں ایسی بھی تھیں جو بہت ہی باریک کپڑے پہنے تھیں جن میں سے اُن کا سارا جسم دکھائی دیتا تھا۔ شاید یہی چاوڑی بازار والی وہ 'دوسری عورتیں' تھیں لیکن ایسا نہیں تھا۔ انور کے ابّا نے اُسے بتایا کہ یہ اُن صاحب لوگوں کی، انگریز افسروں کی بیبیاں ہیں یا

بیٹیاں تھیں جو پلیٹ فارم پر ریل کے انجن کی طرح سگریٹ کا دھواں اُڑاتے ہوئے چہل قدمی کر رہے تھے۔

بعد میں اُس کے ابّا نے اُسے بتایا کہ وہ سیدھے امرتسر نہ جا کر ایک دن کے لئے پانی پت میں رُکیں گے جو وہاں سے صرف پچاس میل دُور تھا۔

"ابّا، ہم لوگ رات تک وہاں پہنچ جائیں گے؟" اُس نے پوچھا۔

"رات تک؟ ارے ابھی تین گھنٹے میں پہنچ جاتے ہیں۔"

اتنے میں وہ اس پلیٹ فارم پر پہنچ گئے جہاں اُن کی گاڑی کھڑی تھی۔ چاروں طرف ایک عجیب چہل پہل تھی اور عجیب شور و غُل ہو رہا تھا۔ مسافر اور اُنہیں چھوڑنے کے لئے آئے ہوئے اُن کے دوست، قلی، پھل اور شربت بیچنے والے، کتابیں اور اخبار بیچنے والے سب ایک ساتھ بول رہے تھے اور چلّا چلّا کر اپنا مال بیچنے کی کوشش کر رہے تھے اور اِن تمام آوازوں کے شور و غُل میں اُسے دو آوازیں بالکل صاف سنائی دے رہی تھیں۔ "ہندو پانی" — "مُسلم پانی"۔

مسلم پانی والے کے داڑھی تھی اور وہ اپنے کندھے پر مشک لٹکائے ہوئے تھا۔ اُس کا جوڑی دار ہندو پانی والا دونوں ہاتھوں میں ایک ایک بالٹی لئے ہوئے تھا۔ انور سوچنے لگا کیا اِن دونوں کے پانی میں سچ مچ کوئی فرق ہے۔ لیکن اتنے میں وہ دیکھتا کیا ہے کہ دونوں پانی والوں نے پلیٹ فارم کے بیچ میں جا کر ایک ہی نل سے پانی بھرا۔

انور نے دیکھا کہ گاڑی میں بھی کئی طرح کے ڈبّے ہیں۔ فرسٹ اور سیکنڈ کلاس کے ڈبّوں کے باہر سونے کی طرح چمکتے ہوئے پیتل کے ڈنڈے لگے ہوئے تھے۔ اُن میں چمڑے کی گدّیاں بنی ہوئی تھیں، شیشے لگے تھے اور بجلی کے پنکھے چل رہے تھے۔ زیادہ تر ڈبّوں میں انگریز مرد اور عورتیں بیٹھی تھیں۔ کچھ امیر ہندوستانی بھی اِن ڈبّوں میں سفر کر رہے تھے۔ لیکن ظاہر ہے اُنہیں گوروں کے ساتھ نہیں بیٹھنے دیا جاتا تھا۔

انور نے دیکھا کہ ایک باعزت ہندوستانی صاحب ایک ایسے ہی ڈبے میں گھسنے کی کوشش کر رہے تھے اور اس میں بیٹھے ہوئے دو انگریز انہیں ڈانٹ رہے تھے۔ "گیٹ آوٹ تم کالا آدمی کو ہم اِدھر نہیں بیٹھنے مانگتا" ہندوستانی صاحب نے اپنا ٹکٹ نکال کر انہیں دکھایا کہ انہیں سیکنڈ کلاس کے ڈبے میں بیٹھنے کا حق ہے اور اس سلسلے میں انہوں نے ایک ہندوستانی ٹکٹ بابو سے بھی فریاد کی لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ انہیں مجبور ہو کر سیکنڈ کلاس کے ایک دوسرے ڈبے میں بیٹھنا پڑا۔ جو صرف ہندوستانی لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ انور کو یہ دیکھ کر بہت تعجب ہوا کیونکہ اس نے سن رکھا تھا کہ انگریزوں کے راج میں سب برابر ہیں۔ وہ سوچنے لگا کہ اگر ایسا ہے تو پھر وہ ہندوستانی صاحب انگریزوں کے ساتھ بیٹھ کر ایک ہی ڈبے میں سفر کیوں نہیں کر سکتے؟ اس کے لئے یہ ایک اور پہیلی تھی — بالکل اس پہیلی جیسی کہ ایک ہی نل کے پانی کے دو مذہب کیسے ہو جاتے ہیں اور وہ 'ہندو پانی'، 'مسلم پانی' کہہ کر کیوں بیچا جاتا ہے؟

وہ انٹر کلاس کے ایک ڈبے میں گھسے ہی تھے کہ انجن نے زور سے سیٹی دی اور گاڑی اتنے زور کے جھٹکے کے ساتھ چلی کہ انور اپنے ابا کی گود میں جا گرا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ پلیٹ فارم اور اس پر کھڑے ہوئے سب لوگ دور بھاگے جا رہے ہیں۔ انور کے لئے تو یہ بہت ہی تعجب کی بات تھی۔

"ابا، ابا، سٹیشن بھاگا جا رہا ہے۔" انور نے گھبرا کر چلاتے ہوئے کہا اور ڈبے میں بیٹھے ہوئے سارے مسافر ہنس پڑے۔

اکبر علی نے مسکرا کر دھیرے سے اپنے بیٹے کی باہ کو تھپک دیا اور بولے "بیٹا سٹیشن نہیں ہماری گاڑی بھاگی جا رہی ہے۔ وہ دیکھو سبزی منڈی کے باغ ہیں کیونکہ ہم اُن سے دور ہٹتے جا رہے ہیں اس لئے تمہیں ایسا لگتا ہے کہ وہ دوسری طرف ہم سے دور بھاگتے جا رہے ہیں۔"

انور اپنی اس بے وقوفی کی بات پر بہت شرمندہ ہو رہا تھا لیکن اُس نے یہ سوچ کر اپنے آپ کو تسلّی دی کہ یہ میرا پہلا ہی ریل کا سفر ہے اور یہ سوچ کر اُسے بڑی خوشی ہوئی۔ جوتے اُتار کر وہ آرام سے سیٹ پر بیٹھ گیا اور کھڑکی کے باہر پیچھے کی طرف بھاگتے ہوئے تار کے کھمبوں کو دیکھنے لگا۔۔۔ لیکن اب اُس کی سمجھ میں آگیا تھا کہ وہ بھاگ کر کہیں غائب نہیں ہو جاتے بلکہ صرف ایسا لگتا ہے کہ وہ غائب ہو جاتے ہیں۔

(۲)

گاڑی تیزی سے پانی پت کی طرف بھاگی چلی جا رہی تھی۔ انور کھڑکی کے پاس سے تیزی سے گذرتے ہوئے نظّاروں کو دیکھنے میں محو تھا۔۔۔ کھیت، اور پھلوں کے باغ، ریل کی لیول کراسنگ پر چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں، کہیں دُور کسی مقبرے کا سفید گنبد، گاؤں کے پاس سے دھڑدھڑاتی ہوئی گاڑی کو گذرتے دیکھ کر ہاتھ ہلاتے اور شور مچاتے ہوئے بچّے۔ انور جانتا تھا کہ اُس کے دل میں جو کھلبلی مچی ہوئی تھی اُس کی وجہ صرف یہ نہیں تھی کہ وہ کسی خاص جگہ، پانی پت یا امرتسر جا رہا تھا بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ریل سے جا رہا تھا۔ یہ سوچ کر ہی اس کے خون میں سنسنی سی دوڑ جاتی تھی کہ وہ بہت تیز چلنے والی ریل گاڑی پر سفر کر رہا تھا۔ اُس کا جی چاہتا تھا کہ خوشی کے مارے تالیاں بجانے لگے۔ وہ چاہتا تھا کہ خوب زور زور سے چلّائے، اُچھلے کودے اور جی بھر کر ناچے۔ لیکن اُس کی پرورش اور تربیت اچھے ڈھنگ سے ہوئی تھی اور وہ اس بات کو جانتا تھا کہ اس طرح کی حرکتیں سب کے سامنے نہیں کی جانی چاہئیں۔ اس کے ابّا اس چیز کو سخت ناپسند کرتے تھے کہ کوئی

اپنی خوشی یا غم کا ڈھنڈورا پیٹے۔ انور کو سکھایا گیا تھا کہ اگر کہیں گرنے سے بہت سخت چوٹ بھی لگ جائے تو بھی زور سے نہ روئے۔ حکیم بیدل کے اچھّے سے اچھّے مذاق پر بھی کبھی زور زور سے نہ ہنسے اور جب درزی اس کے لئے عید کی کمخواب کی شیروانی سی کر لائے تب بھی وہ خوشی سے ناچنے نہ لگے۔ اور اس لئے وہ کھڑکی کے پاس چُپ چاپ بیٹھا رہا تھا لیکن اندر ہی اندر وہ خوشی کے مارے پھُولا نہیں سما رہا تھا۔ اُسے ایسا لگ رہا تھا کہ اُس میں پہلے سے زیادہ جان آ گئی ہے جیسے وہ پہلے سے زیادہ طاقتور اور تندرست ہو گیا ہے اور گلّا بُو کی کہانیوں والے شہزادے کی طرح کوئی بھی کام کر سکتا ہے کہیں بھی جا سکتا ہے۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ اس طرح کے راکشش، پریاں، دیو، بھوت اور پریت دراصل کہیں ہوتے نہیں ہیں۔ اُس کے ابّا نے اُسے یہ بات خاص طور پر بتائی تھی اور اس سے کہہ دیا تھا کہ وہ گلّا بُو کی کہانیوں کی ہر بات کو سچ نہ مان لیا کرے۔ نہیں تو وہ بھی بڑا ہو کر پھوپی اماں کی طرح ہو جائے گا جو ان سب چیزوں پر یقین کرتی تھیں۔ لیکن کبھی کبھی انور کا جی چاہتا تھا کہ کاش سچ مچ ایسے راکشش ہوتے۔ اسے اِس کی کوئی فکر نہیں تھی کہ اُس کی آنکھیں کیسی ہوں، پر اس طرح کا ایک آدھ راکشش ہو ضرور، جس سے جا کر اُس کے جیسا بہادر لڑکا لڑ سکے اور اسے مار سکے اور پھر شہزادی سے بیاہ کر سکے جیسا کہ گلّا بُو کی کہانیوں میں ہوتا تھا۔

ریل گاڑی بہت لمبے چوڑے سپاٹ میدان کو پار کرتی ہوئی بھاگی چلی جا رہی تھی۔ ریل کی پٹڑی کے کنارے کنارے انور کو سانپ کی طرح لہراتی اور بل کھاتی ہوئی سفید سڑک دکھائی دے رہی تھی۔ جو کبھی پیڑوں کے پیچھے چھُپ جاتی تھی اور کبھی

پھر اچانک باہر نکل آتی تھی۔ وہ کبھی ریل کی پٹڑی کے اتنے پاس آجاتی تھی کہ انور اس پر جاتی ہوئی اُونٹ گاڑیوں کو صاف دیکھ سکتا تھا اور دوسرے ہی لمحے اتنی دُور ہو جاتی تھی کہ اُفق کے کنارے پر صرف ایک لکیر جیسی دکھائی دیتی تھی۔ مسافروں کی بات چیت کچھ ٹھنڈی پڑ گئی تھی اور اس لئے اکبر علی کو اپنے بیٹے کو کچھ باتیں سمجھانے کا موقع ملا۔ انور کو اپنے ابّا کی باتیں سُننا بہت اچھا لگتا تھا۔ اُنہیں ہر بات معلوم تھی اور وہ کبھی اس کے سوالوں کا جواب دینے سے اکتاتے نہیں تھے۔ انہوں نے انور کو بتایا کہ اس سڑک کا نام گرینڈ ٹرنک روڈ یا سڑک اعظم ہے جو کلکتہ سے دلّی ہوتی ہوئی پشاور تک چلی گئی ہے اور ہندوستان کی مشرقی سمت سے شمال جنوب تک ایک ہزار پانچ سو میل لمبی ہے۔ "یہ سڑک انگریزوں نے بنائی ہے؟" انور نے پوچھا۔ "نہیں۔" اس کے ابّا نے جواب دیا۔ "یہ سڑک ایک ہندوستانی بادشاہ نے بنوائی تھی اس کا نام شیر شاہ سوری تھا۔ اُس نے یہ سڑک اس لئے بنوائی تھی کہ اِس لمبے چوڑے مُلک میں لوگوں کے لئے ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کرنا آسان ہو جائے۔"

"میرے ابّا بھی کتنے عقلمند ہیں!" انور نے سوچا۔

گاڑی کی رفتار دھیمی پڑنے لگی۔ کھڑکی سے باہر اُس نے نظر دوڑا کر دیکھا تو اُسے اُس سپاٹ میدان کے سلسلے کو توڑتا ہوا، جس کا وہ اب تک عادی ہو چکا تھا، ٹیلے پر بسا ہوا ایک چھوٹا سا شہر دکھائی دیا۔ پکی اینٹ کے مکانوں کی قطاریں ایک دوسرے کے اُوپر دُور تک چلی گئی تھیں اور اُن سب کے اُوپر مسجدوں کے مینار اور گنبد سورج کی تیز روشنی میں چمک رہے تھے۔

"تیار ہو جاؤ۔" اُس کے ابّا نے کہا۔ "پانی پت آگیا۔"

پانی پت بہت ہی اُونگھتا ہوا سا شہر نکلا۔ انور دِلّی کی چہل پہل کا عادی تھا۔ اُسے یہاں کی ہر چیز اتنی سُست، اتنی بے رنگ اور اتنی بے جان معلوم ہوئی کہ وہ بیان بھی نہیں کر سکتا تھا۔ بازاروں میں لوگ نہایت اطمینان سے آجا رہے تھے۔ ہر دُکان پر رُک کر تھوڑی دیر گپ لڑاتے یا تھوڑی دیر حُقّہ کا کش کھینچتے۔ کچرے سے لدے ہوئے گدھے ٹیڑھی میڑھی اور اوبڑ کھابڑ سڑکوں کے بیچوں بیچ کھڑے اُونگھ رہے تھے جن کی وجہ سے اُن کے پھٹیچر تانگے کا آگے بڑھنا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ اس شہر کی ایک اور خاص چیز یہاں کی مکھیاں تھیں ــــ لاکھوں کروڑوں مکھیاں ــــ اور انور جسے آبنوس کی لکڑی پر بہت خوبصورت نقّاشی کا کام سمجھ رہا تھا وہ پاس سے دیکھنے پر ایک حلوائی کی دُکان کے دروازے پر چپکی ہوئی مکھیاں نکلیں۔ ایسا لگتا تھا کہ وہاں بہت سے لوگ اُس کے ابّا کو جانتے تھے اور اکبر علی نے اپنے بیٹے کو سمجھا دیا تھا کہ جب بھی کوئی السلام علیکم کہے تو وہ ادب سے سلام کا جواب دے۔ "وعلیکم السلام"۔

بازار سے گذر کر وہ میر فیاّض علی کے گھر پہنچے جو اکبر علی کے بہت پُرانے دوست تھے اور لڑائی کے دنوں میں چار برس تک کمبلوں کے بیوپار میں اُن کے ساتھ کام کر چکے تھے۔ اکبر علی اور ایشور دیال نے فوج کو ہزاروں کمبل سپلائی کئے تھے اور یہ کمبل زیادہ تر پانی پت سے بن کر آتے تھے۔ فیاّض علی کا کہنا تھا کہ وہاں کے کمبل والے لڑائی کے ٹھیکوں کی بدولت بے حد پیسے والے ہو گئے تھے اور وہ اپنی نئی کمائی ہوئی دولت شادی بیاہوں پر، نئے گھر بنوانے پر اور اپنی عورتوں کے لئے گہنے بنوانے پر تباہ کر رہے

تھے۔ ہم شریف لوگوں کے لئے نیچ جات کے اِن حرامیوں کو قابو میں رکھنا مشکل ہو گیا ہے۔" میر فیاض علی کی عادت تھی کہ وہ اپنی باتوں کے بیچ بیچ میں چھنٹی ہوئی گالیوں کا چٹخارہ دیتے رہتے تھے اور ہر بار جب وہ اکبر علی کے کم عمر ناسمجھ بیٹے کے سامنے 'حرامی' کے قسم کا کوئی لفظ کہتے تھے تو اُن کے جیسے شائستہ آدمی کے دل پر گہری چوٹ لگتی تھی۔ جب بات بات میں گالی بکنے والے شہر کے خاندانی رئیس میر فیاض علی اُٹھ کر زنان خانے میں گئے تو انور نے اپنے ابّا سے پوچھا۔ "ابّا، میر صاحب کمبل بنانے والوں کو حرامی کہہ رہے تھے، یہ حرامی کون ہوتا ہے۔"

اکبر علی اپنے بیٹے کے کوئی سوال پوچھنے پر بہت خوش ہوتے تھے اور ہمیشہ بڑے صبر کے ساتھ خوشی خوشی اُس کے سوالوں کا جواب دیتے تھے۔ لیکن کچھ سوال ایسے بھی ہوتے تھے جن کا اُن سے کوئی جواب دیتے نہ بن پڑتا تھا اور اس لفظ 'حرامی' کا مطلب بھی ایسے ہی سوالوں میں آتا تھا۔ پھر بھی انہوں نے اپنی طرف سے اُسے اس کا مطلب سمجھانے کی پوری کوشش کی۔

"یوں سمجھو بیٹا... اس کا مطلب ہوتا ہے... بُرا آدمی۔"

"تو اِس کا یہ مطلب ہے کہ اگر میں کوئی بُری بات کروں۔ جیسے اگر میں آپ کا کہنا نہ مانوں یا اپنا سبق ٹھیک سے یاد نہ کروں تو مجھے بھی حرامی کہا جائے گا؟"

اکبر علی پر اس بات کا یکایک اتنا گہرا اثر پڑا، اُن کا چہرہ اتنا سُرخ ہو گیا اور وہ لاچاری میں اتنی بُری طرح ہکلانے لگے کہ انور سمجھ گیا کہ اس نے یہ سوال پوچھ کر کوئی بہت بڑی غلطی کی تھی۔

"نہیں نہیں.... ایسی بات نہیں ہے۔ ہر بُرے آدمی کو 'حرامی' نہیں کہتے۔

وہ تو بُرے آدمی سے بھی بدتر ہوتا ہے۔"

ظاہر تھا کہ اس لفظ 'حرامی' میں کوئی ایسا بھید تھا جو انور کے ابّا اپنے بیٹے کو نہیں بتانا چاہتے تھے۔ اتنے میں میر فیاّض علی پانوں کی طشتری ہاتھ میں لئے ہوئے زنان خانے میں سے نکل آئے اور باپ بیٹے دونوں کو بات چیت کا رُخ بدل جانے پر بہت خوشی ہوئی۔

"اچھا میر صاحب یہ تو بتایئے"۔ اکبر علی نے کہنا شروع کیا۔ "ملک میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کے بارے میں پانی پت کے لوگوں کا کیا خیال ہے؟"۔

"ملک میں جو کچھ ہو رہا ہے! کیا ہو رہا ہے؟"۔ پرانے خاندانی رئیس میر فیاّض علی نے جن کی رئیسی اب نام ہی کو رہ گئی تھی، ایک پرانی آرام کرسی پر لیٹ کر اطمینان سے حُقّے کا کش کھینچتے ہوئے چونک کر کہا۔ پھر کچھ رُک کر وہ پان کی پیک تھوکتے ہوئے بولے "آپ کا مطلب اِس ستیہ گرہ سے ہے؟ کم سے کم پانی پت کے ہم شریف لوگ تو آٹا دال بیچنے والے اس ٹٹ پونجیے بنیئے سے کوسوں دُور رہیں گے۔"

(۴)

شام کو میر فیاّض علی اپنے مہمانوں کو بو علی شاہ قلندر کا مقبرہ دکھانے لے گئے۔ بو علی شاہ سینکڑوں برس پہلے کوئی فقیر گزرے تھے اور اُن کا نام قلندر اِس لئے پڑ گیا تھا کہ وہ چیتھڑے پہن کر پاگلوں کی طرح رہتے تھے اور دنیا کی ہر بات کو بُھلا کر خدا کے دھیان میں مگن رہتے تھے۔

یہ خوبصورت سفید مقبرہ پتھر کے فرش والے ایک چبوترے آنگن کے ایک کونے میں بنا ہوا تھا۔ اپنے جُوتوں سے کھٹ کھٹ کی آواز کرتے ہوئے وہ اندر پہنچے۔ اندر کے آنگن میں کافی بھیڑ جمع تھی اور اچانک انہیں گانے کی آواز سُنائی دی۔ جوتے اُتار کر

وہ سنگِ مرمر کے چبوترے پر چڑھ گئے۔ وہاں انور نے ایک انوکھا نظارہ دیکھا۔

پتلے سے دروازے میں سے کوٹھڑی کے اندر پھولوں سے ڈھکی ہوئی قلندر صاحب کی قبر دھندلی دھندلی دکھائی پڑ رہی تھی۔ اس کے سامنے ایک چوڑا سا برآمدہ تھا جس میں بیس پچیس آدمی گھیرا باندھ کر بیٹھے ہوئے تھے۔ اُن میں سے ایک آدمی پوری آواز کے ساتھ فارسی کے شعر گا رہا تھا اور باقی لوگ تالیاں بجا بجا کر تال دے رہے تھے۔ شعر کے آخری ٹکڑے پر پہنچ کر سب لوگ ساتھ مل کر گاتے تھے۔ سمندر کی چڑھتی ہوئی لہر کی طرح گانے کی لہر بھی لگاتار اونچی چڑھتی گئی، تالیاں اور زور سے بجنے لگیں اور طوفان کی طرح چڑھتی ہوئی دُھن۔ لوگ سر ہلا ہلا کر جھومنے لگے۔ لوگوں نے آنکھیں بند کر لیں اور ہر ایک رومی کی صوفیانہ شاعری کے جذبات کی اُمنڈتی ہوئی لہروں میں کھو گیا۔ پھر انور یہ دیکھ کر حیرت میں رہ گیا کہ بھیڑ کے بیچ میں کھڑے ہوئے ایک آدمی نے اپنی آنکھیں کھول لیں اور پاگلوں کی طرح کھوئی کھوئی نظروں سے سامنے گھورنے لگا۔ ایک لمحے تک یہ آدمی بالکل خاموش رہا۔ طوفان سے پہلے کی خاموشی کی طرح۔ چاروں طرف جذبات کا جو طوفان اُمنڈ رہا تھا اُس کے بیچ وہی ایک ایسا تھا جو بالکل چُپ چاپ کھڑا تھا۔ پھر یکایک اس پر جنون سوار ہوا۔ اُس کا سارا بدن کانپنے اور ہلنے جلنے لگا۔ گانا اب تک خوفناک حد تک تیز ہو چکا تھا اور لگاتار اُس کی دُھن تیز ہوتی جا رہی تھی اور گانے والوں کی آوازیں اونچی ہوتی جا رہی تھیں۔ اُس آدمی نے اپنے ہاتھ ہوا میں اوپر اٹھا رکھے تھے جیسے وہ کسی نظر نہ آنے والی رسّی کو پکڑا ہوا ہو۔ اچانک وہ اوپر کی طرف اُچھلا اور پاگلوں کی طرح بالکل دیوانہ ہو کر ناچنے لگا۔ ناچتے ناچتے وہ اپنے کپڑے پھاڑتا جا رہا تھا۔ اپنے بال نوچ رہا تھا۔ اُسے اپنے تن بدن کا ہوش

نہ تھا۔ وہ اپنے قابو سے بالکل باہر ہو چکا تھا۔ اُسے کسی بھی چیز کا ہوش نہ تھا۔ اُس کے اندر کوئی ایسی پُر اسرار لہر اُٹھ رہی تھی جو اُس کے دیوانہ وار جذبات کا اظہار کر رہی تھی اور اتنے میں یکایک گانے والوں کے ہونٹوں پر گیت نے دم توڑ دیا۔ جذبات کی لہریں دب گئیں اور مجمع پر مرگھٹ جیسی خاموشی چھا گئی۔ اِس خاموشی میں بھیڑ کے بیچ میں کھڑے ہوئے اُس آدمی کی صورت مضحکہ خیز اور ڈراؤنی لگ رہی تھی؛ وہی صورت جو کچھ لمحے پہلے رُوحانی اور مقدس نظر آتی تھی۔ کچھ لمحوں کے لئے تو وہ اس طرح کھڑا رہا جیسے اسے پھر حال آنے والا ہو لیکن جذبات سے گیت کا سہارا چھن جانے کی وجہ سے اس کے گھٹنے جواب دے گئے اور وہ وہیں زمین پر ڈھیر ہو گیا۔

اس نظارے کا انور کے دل پر اتنا گہرا اثر پڑا کہ کئی منٹ تک وہ بول ہی نہ سکا۔ اس کا سانس تیز چلنے لگا۔ اس کا دماغ چکرانے لگا اور جب گانا یکایک رُک گیا تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کے اندر سے کوئی چیز نکل گئی ہے اور یہ خالی پن اندر ہی اندر اسے کُرید نے لگا۔

تو یہ تھی قوّالی، ایرانی صوفیوں کی وجد آور رسم، اور میر فیّاض علی کو اس پر بہت ناز تھا۔ اُنہوں نے کہا" پانی پت جیسی قوّالی تو کہیں ہوتی ہی نہیں۔" لیکن اکبر علی کچھ جھنجھلائے ہوئے کچھ شرمندہ سا محسوس کر رہے تھے۔ انہیں جذبات کا اس طرح کا اظہار اچھا نہیں لگا تھا اور انہوں نے یہ بات کہہ بھی دی جس پر بوڑھے میر صاحب کے ساتھ اُن کی بحث چھڑ گئی۔ وہ ابھی بحث کر ہی رہے تھے کہ اتنے میں ایک آدمی اٹھا اور مزار کی چوکھٹ پر ماتھا ٹیک کر سجدہ کرنے لگا۔ اکبر علی نے بڑے فاتحانہ انداز سے اُس کی طرف اشارہ کر کے کہا۔" یہ دیکھئے، یہ ہے آپ کا اسلام، ایک قبر پر سجدہ ـــ پھر آپ میں اور بت

پرست کافروں میں فرق ہی کیا رہ گیا۔"

لیکن باہر والے آنگن میں ایک اور چھوٹی سی قبر تھی جس کے سامنے جا کر اکبر علی نے چُپ چاپ اپنی عقیدت کا اظہار کیا اور اپنے بیٹے کو بتایا کہ وہ اُردو کے مشہور شاعر حالی کی قبر تھی جنہوں نے اپنی لافانی مُسدّس میں اسلام کے عروج و زوال کو بیان کیا تھا۔

اکبر علی نے شاعر کی رُوح کے لئے دُعا مانگنے کے بعد ایک بار کنکھیوں سے میر فیاض علی کو دیکھا اور پھر وہاں جمع ہوئے لوگوں کو جو ایک دُوسری قوّالی کی تیاریاں کر رہے تھے اور پھر بولے "انہوں نے ایک پُوری قوم کو جگا دیا لیکن افسوس کہ خود اُن کا شہر ابھی تک غفلت کی نیند سو رہا ہے۔"

(۵)

اب انور اور اُس کے ابّا پانی پت سے ریل گاڑی میں بیٹھ کر امرتسر روانہ ہوئے تو وہ بڑی سڑک اب بھی ریل کی پٹری کے کنارے کنارے چل رہی تھی۔ جب پانی پت کا اونگھتا ہوا شہر پیچھے رہ گیا تو اکبر علی نے ایک لمبے چوڑے میدان کی طرف اشارہ کر کے کہا "یہی وہ میدان ہے جہاں پانی پت کی بڑی بڑی لڑائیاں لڑی گئی تھیں اور اس سے بھی بہت پہلے مہابھارت کی لڑائی کا فیصلہ بھی اسی میدان میں ہوا تھا۔"

تو اِس کا مطلب یہ تھا کہ وہ بڑی تاریخی اہمیّت والی مقدّس سرزمین سے ہو کر گذر رہے تھے۔ انور نے اس لمبے چوڑے میدان کو دیکھا اور فوراً ہی اس کے تصوّر نے وہاں کوروؤں اور پانڈوؤں کی فوجیں لا کر کھڑی کر دیں۔ ہاتھی لاشوں کو اور دم توڑتے ہوئے گھائل سپاہیوں کو روندتے ہوئے آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ رتھوں کی گڑگڑاہٹ سُنائی دے رہی تھی۔ گھوڑے سرپٹ دوڑتے چلے جا رہے تھے اور موت کا سندیسہ

لانے والے کبوتروں کی طرح تیز ہوا میں اُڑ رہے تھے۔ ہندوستان کی تاریخ کے کتنے ہی ورق اسی وسیع میدان میں خون کی لکیروں سے لکھے گئے تھے۔ اس بڑی سڑک پر ہو کر حملہ آوروں، فاتحوں کی فوجیں، دلیش بھگت اور ظالم حکمران اور لیڈرے سب ہی گذرے تھے۔ لیکن وہ دور کیا دکھائی دے رہا تھا؟

سڑک کوئی میل بھر تک بالکل ریل کی پٹری کے ساتھ ساتھ چلی گئی تھی اور اس سڑک پر گھوڑ سوار سپاہیوں کا ایک دستہ چلا جا رہا تھا گھوڑ سوار سپاہی، توپوں کی گاڑیاں جنہیں گھوڑے کھینچ رہے تھے اور کچھ موٹریں۔ انور نے گاڑی میں بیٹھے بیٹھے، پگڑیاں باندھے ہندوستانی سپاہیوں، خاکی ٹوپ لگائے ہوئے انگریز افسروں اور ٹٹوؤں پر بیٹھے ہوئے سائیسوں اور کوچوانوں کو پہچانا۔ اس نے آگے بڑھتے ہوئے اس گھوڑ سوار دستے کو بڑے غور سے دیکھا۔ گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ اور وہ سفید دھول کے بادل اُڑاتے ہوئے آگے بڑھتے جا رہے تھے — ہندوستان میں انگریزوں کی بہت بڑی فوج کا ایک چھوٹا سا دستہ امرتسر کی طرف جا رہا تھا۔

۳

موت سے مُلاقات

(۱)

امرتسر!

گاڑی سٹیشن پر پہنچی اور سینکڑوں مسافروں کو پلیٹ فارم پر اُتار دیا گیا جن میں انور اور اس کے ابّا بھی شامل تھے۔ لیکن وہاں پر ایک بھی قُلی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کچھ مسافر جو خود اپنا سامان لے جانا پسند نہیں کرتے تھے "قُلی! قُلی!" چِلّا رہے تھے پر قُلی کوئی ہوتا تو آتا۔

جب وہ سٹیشن سے باہر نکلے تو دور دور تک کوئی تانگہ دکھائی نہ دیا۔ کوئی مزدور بھی ایسا نہیں تھا جو اُن کا سامان اُس ہوٹل تک پہنچا دیتا جہاں اکبر علی امرتسر میں ہمیشہ ٹھہرتے تھے۔ بڑی عجیب بات تھی۔

"ہوٹل بہت دور نہیں ہے۔ انور کیا تم بستر اٹھا کر ہوٹل تک لے چل سکو گے؟"

اکبر علی نے اپنے بیٹے سے پوچھا۔ بیٹا بھی اپنے ابّا کو مایوس کرنا نہیں چاہتا تھا اس لئے بڑے فخر سے بولا۔ "جی ہاں ابّا۔"

اور سو اپنا سامان سر پہ لاد کر باپ بیٹے دونوں بہت سے دوسرے مسافروں کی طرح ہی دھول سے اٹی سڑک پر چل پڑے۔ سورج آسمان پہ بہت اونچا چڑھ چکا تھا لیکن شہر میں ایک بھی دکان ابھی تک نہیں کھلی تھی۔ کپڑے کی دکانیں، مٹھائی کی دکانیں، دودھ کی دکانیں، کھلونے بیچنے کی دکانیں، شربت کی دکانیں ــــ سب بند تھیں۔ پھر بھی بازاروں میں سناٹا نہیں تھا۔ لوگ چھوٹے چھوٹے گروہوں میں دکانوں کے پٹڑوں پہ بیٹھے بہت جوش کے ساتھ باتیں کر رہے تھے۔ سڑکوں کے نکّڑوں پر اس سے بھی بڑی بڑی بھیڑیں جمع تھیں اور بہت سے لوگوں کی بھرّائی ہوئی آوازیں ہوا میں گونج رہی تھیں۔ پولس والے لاٹھیاں لئے ہوئے بڑے رعب کے ساتھ چپ چاپ گشت لگا رہے تھے۔

"ایسا لگتا ہے کہ آج شہر میں پوری ہڑتال ہے۔" اکبر علی نے دکانوں کی کئی قطاروں کے سامنے سے گذرنے کے بعد کہا اور تھوڑی ہی دیر میں وہیں کے ایک آدمی نے، جو اُن کے ساتھ چل رہا تھا، اُن کے اس خیال کی تائید کی۔ اُس نے بتایا کہ سرکار کو یہ بتانے کے لئے کہ رولٹ بل کے خلاف لوگوں میں کتنا غصّہ ہے، چھ اپریل کو سارے ملک میں پوری ہڑتال کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔"

انور کے لئے یہ خیال بڑا ہیجان انگیز تھا ــــ دلّی، امرتسر، بمبئی اور کلکتے میں، پشاور اور مدراس میں ہزاروں دکانیں ایک ساتھ بند ہو جائیں گی جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انگریز افسر سگریٹیں، گوشت، سبزی اور دودھ کچھ بھی نہیں خرید سکیں گے۔ اتنے زبردست

مظاہرے کا اثر نہ پڑے یہ ناممکن ہے اور اپنی دکانیں بند کر دینے کا سیدھا سادہ طریقہ اپنا کر وہ سرکار کو اپنے بُرے قانونوں کو رد کر دینے پر مجبور کرنے میں کامیاب ہو جائینگے۔

"ابّا، کیا دِلّی میں ہماری دکان بھی بند رہے گی؟" انور نے بھاری بستر کے بوجھ کی وجہ سے ہانپتے ہوئے کہا۔ ہڑتال کے خیال سے اس کے دل میں ولولے کی ایک عجیب سی لہر دوڑ گئی تھی۔

"کیوں نہیں بیٹا۔ رامیشور نے ہماری دکان بھی ضرور بند کر دی ہوگی۔ جب سب لوگ ہڑتال کرنے کا فیصلہ کریں تو ہم سب کو اُس میں شامل ہونا ہی چاہیے۔ لیکن ـــــ"

اور یہ کہتے کہتے اکبر علی اُداس ہو گئے ـــــ "مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ ہڑتال پر ہی یہ قصہ ختم نہیں ہوگا۔ اس سے بھی زیادہ گڑبڑ ہونا لازمی ہے۔"

جس وقت وہ ہوٹل میں گھس رہے تھے، انور نے سڑک پر پولیس والوں کا ایک دستہ قدم ملا کر جاتے ہوئے دیکھا۔ اُن کے آگے آگے ایک انگریز افسر جا رہا تھا جس کی پیٹی سے ایک ریوالور لٹک رہا تھا۔

یکایک انور کے دماغ میں گھوڑسواروں کے اُس دستے کی تصویر گھوم گئی جسے اُس نے گرینڈ ٹرنک روڈ پر قطار باندھے جاتے ہوئے دیکھا تھا ـــــ اسی سڑک پر جسے پہلے بھی کئی فاتحوں نے اپنی فوجیں ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کے لیے استعمال کیا تھا۔

(۴)

رتن سے دوستی ہو جانے کی انور کو بہت خوشی تھی۔ رتن کا باپ، جمعدار اجیت سنگھ پنشن یافتہ فوجی تھا جو رام پال اینڈ سنز کی اُون کی دکان میں

دربان کا کام کرتا تھا۔ اکبر علی کو حساب کتاب کے معاملے میں روز اس دکان میں آنا پڑتا تھا اور انہوں نے خود ہی انور سے کہا تھا کہ وہ کچھ دیر جمعدار اجیت سنگھ کے بیٹے کے ساتھ کھیل لیا کرے۔ رتن تھا تو انور کی ہی عمر کا، پر اُس سے زیادہ تگڑا اور لمبا تھا، اور اس میں انور جیسا شرمیلاپن اور خود آگاہی نہیں تھی۔ وہ بہت ہی ہنس مکھ اور چنچل لڑکا تھا اور جب وہ مسکراتا تھا تو اس کے موتی جیسے دانت چمک اٹھتے تھے۔ اس نے انور کو بتایا کہ وہ تیرنا جانتا ہے، پیڑ پر چڑھ لیتا ہے اور اپنی عمر کے کسی بھی لڑکے کے ساتھ کشتی لڑ سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ دِلّی کے ایک نازک لڑکے کے لیے یہ ساری باتیں بے حد بہادری کا ثبوت تھیں۔ سب ہی سکھوں کی طرح رتن بھی داہنی کلائی پر لوہے کا ایک کڑا پہنے تھا اور اس کے لمبے ریشمی بالوں پر ایک بسنتی رنگ کی پگڑی بندھی تھی، پر اس کے بالوں کی کچھ لٹیں پگڑی کے باہر نکل آئی تھیں جس کی وجہ سے اُس کے کانسے کی مورتی جیسے ٹھوس چہرے پر ایک خاص کشش پیدا ہو گئی تھی۔

انور کا بچپن بہت اکیلے پن میں بیتا تھا۔ جب وہ دُودھ پیتا بچہ تھا تب ہی اس کی ماں کا انتقال ہو گیا تھا اور اُس کی بیوہ پھوپی امّاں نے ہی اُسے پالا تھا۔ اُس کی پھوپی اُس کے بہت لاڈ کرتی تھیں۔ اُس کی بڑی بہن انجم بھی اُس سے بے حد پیار کرتی تھی، پر اُسے اپنی گُڑیوں سے کھیلنا پسند تھا جب کہ انور بھاگ دوڑ کے کھیل کھیلنے کے لیے بیقرار رہتا تھا۔ اُسے باہر جا کر پاس پڑوس کے لڑکوں کے ساتھ کھیلنے کی اجازت نہیں تھی کیونکہ اُس کے ابّا کو ڈر رہتا تھا کہ کہیں وہ بھی اُن بچوں کی طرح گالی بکنا نہ سیکھ لے اور اُس کی پھوپی امّاں تو یہاں تک ڈرتی تھیں کہ وہ کسی دن کہیں اپنی ہڈّی پسلی نہ تڑوا آئے۔ اس لیے انور کچھوے کی طرح اپنے خول میں سکڑتا گیا اور اُس

نے تصور کے کھیل کھیلنا سیکھ لیا۔ زندگی میں رتن اُس کا پہلا دوست تھا اور جب دونوں ساتھ کھیلتے اور باتیں کرتے اور ہنستے تھے تو انور کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ رتن کے بارے میں اُس کے وہی جذبات نہیں ہیں جو اپنے ابّا یا اپنی پھوپی یا اپنی بہن انجم کے بارے میں ہیں۔ رتن کے ساتھ اُس کے تعلّقات میں ایک عجیب راز تھا ایک انوکھا پن تھا جو دوسرے لوگوں کے ساتھ اُس کے تعلّقات میں نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کسی بات کا اُس کے ابّا یا پھوپی پر کیا اثر ہوگا، پر وہ یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ اُس کی کسی بات یا کسی حرکت کا رتن پر کیا اثر ہوگا ___ اور اِس وجہ سے اُن کے آپسی تعلّقات کے بارے میں انور کے لئے ایک انوکھی دلکشی پیدا ہوگئی تھی۔ مثال کے لئے جب اُس نے شرماتے ہوئے اپنا بڑا سا پھولدار رُومال نکال کر رتن کو دیا تھا اُس وقت اُسے یہ پتہ نہیں تھا کہ اُس کا یہ نیا دوست فوراً اُسے اپنی پگڑی پر باندھ لے گا اور بھاگا بھاگا اپنے باپ کو دکھانے جائے گا اور واپس آکر انور کو ایک چھوٹی سی کالی کھلونے کی پستول دے گا۔

"بابا میرے لئے ولایت سے لائے تھے"۔ رتن نے جلدی سے کہا تاکہ انور کو یہ تحفہ لینے سے انکار کرنے کا موقع ہی نہ ملے۔

"تمہارے بابا ولایت ہو آئے ہیں؟"۔ انور نے پوچھا۔ اُسے اِس بات پر تعجب ہوا کہ وہ اِس خوبصورت تحفے کے لئے اپنے دوست کا شکریہ ادا کرنا بھی بھول گیا۔

"ہاں"۔ رتن نے جواب دیا۔ اپنے بابا کے بارے میں باتیں کرتے ہوئے وہ خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا۔ "میرے بابا لڑائی میں ولایتی فوج کے ساتھ لڑے تھے۔ پہلے وہ فرانس میں تھے پھر وہاں سے لندن گئے تھے۔ وہاں بادشاہ جارج پنجم نے

اُن کی بہادری کی تعریف کی تھی" بابا بہت بہادر ہیں۔ سرکار نے اُنہیں بہت سے تمغے دیئے ہیں"۔
انور نے جمعدار اجیت سنگھ کی خاکی وردی پر اُوپر والی جیب کے پاس چھوٹے چھوٹے رنگین فیتوں سے لٹکتے ہوئے یہ سونے اور چاندی کے تمغے دیکھے تھے۔ انہیں دیکھ کر اُس کے دل میں بہت دلچسپی پیدا ہوئی تھی اور اُن کے پیچھے بہادری کی بہت جوش دلانے والی کوئی کہانی چھپی ہوئی ہے۔ پر وہ اتنا شرمیلا تھا کہ اُس وقت ڈراؤنی کالی داڑھی والے اُس بوڑھے سپاہی سے اپنے لڑائی کے کارنامے سُنانے کو نہیں کہہ سکتا تھا لیکن اب اُس نے محسوس کیا کہ رتن کے ساتھ اُس کی دوستی کی وجہ سے اب اُسے یہ فرمائش کرنے کا حق پیدا ہو گیا ہے۔
"کیا تمہارے بابا" اُس نے جھجکتے ہوئے پوچھا "مجھے بتائیں گے کہ انہوں نے ولایت میں کیا کیا دیکھا؟ آج تک میں نے کسی ایسے آدمی سے بات نہیں کی ہے جو ولایت ہو آیا ہو اور لڑائی میں لڑ چکا ہو۔"
"کیوں نہیں، ضرور بتائیں گے۔ بابا میرے میرے کسی بھی دوست کے لئے کچھ بھی بڑی خوشی سے کریں گے"۔
"میرا دوست"۔ رتن نے اُسے یہی تو کہا تھا۔ میرا دوست۔ دو سیدھے سادے لفظ لیکن انور کے کانوں کو وہ کتنے میٹھے لگے۔ اس کا جی چاہا کہ اُس کے دل میں رتن کے لئے نرمی اور پیار کا جو جذبہ اُمڈ رہا تھا اُسے وہ کسی طرح ظاہر کر دے ــــ اب اُس کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ اسی جذبے کو تو دوستی کہتے ہیں۔ اُس کا جی چاہا کہ وہ اپنے دوست کو گلے لگا لے جیسے عید کے دن لوگ گلے ملتے ہیں، اُسے پیار کر لے جیسے پھوپی اماں اُسے پیار کرتی تھیں، کم سے کم اُسی تپاک سے اُس سے ہاتھ تو ملا ہی لے جس تپاک سے اُس

کے اباّ کا کا رامیشور دیال سے ہاتھ ملاتے تھے۔ پر اُسے تو اپنے جذبات کا اظہار کرنے کی بجائے چھُپانا سکھایا گیا تھا اور اس لئے وہ بہت اُداس ہو گیا۔ اُسے ایسا لگا جیسے کسی نے اُس سے اُس کا سُکھ چھین لیا ہو اور اُس کی آنکھیں ڈُبڈبا آئیں لیکن اپنے آنسوؤں کو پی کر اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ اور رتن زندگی بھر ویسے ہی گہرے دوست رہیں گے جیسے کہ اُس کے اباّ اور کا کا رامیشور دیال ہیں۔ اور نہ جانے کیوں یہ فیصلہ کرتے ہی اُس کی اُداسی دُور ہو گئی اور اُسے ایسا لگا کہ اُس میں نئی طاقت آگئی ہے ___ اُسے ایسا لگا کہ اب وہ اکیلا نہیں رہ گیا ہے ــ

(۳)

وہاں پر ایک نہیں بلکہ دو سُنہری مندر تھے۔ ایک تو چٹان کی طرح اٹل تھا پر دوسرا ادا لرزرہا تھا۔ پہلے والے کے اوپر سے جب سفید روئی جیسے بادل گذرتے تھے تو ایسا لگتا تھا کہ وہ آسمان پر تیر رہا ہے اور دوسرا مقدّس تالاب کے گہرے نیلے پانی کے اندر تیر رہا تھا۔ انور ٹکٹکی باندھے سُنہری مندر کا عکس دیکھ رہا تھا اور اسلئے جمعدار اجیت سنگھ اُسے اُس کی تاریخ اور مذہبی اہمیت کے بارے میں جو کچھ بتا رہے تھے اُس کی طرف سے بھی اس کا خیال ایک لمحہ کے لئے ہٹ گیا لیکن اتنا اُس نے ضرور سُنا کہ مندر کے کلس پر سونے کا ورق چڑھا ہوا ہے جس کے لئے لاکھوں روپے خرچ کئے گئے ہیں۔ جمعدار اجیت سنگھ نے اُسے یہ بھی بتایا کہ یہ سکھّوں کا سب سے مقدّس مندر ہے اور ملک کے کونے کونے سے غریب اور امیر یاتری یہاں ماتھا ٹیکنے آتے ہیں اور اس سُنہرے کلس کی دیکھ بھال کے لئے پیسہ دے جاتے ہیں ___

انور کو سُنہری مندر میں اتنی دلچسپی نہیں تھی جتنی کہ جمعدار کی وردی میں لگے تمغوں

ہیں۔ غور سے دیکھنے پر انور کو پتہ لگا کہ اُن میں سے کچھ پر بادشاہ کی ویسی ہی تصویر بنی ہوئی ہے جیسی کہ روپے پر یا اِکنّی دونّی پر بنی ہوتی ہے۔ کچھ پر ایک عورت کی شکل بنی ہوئی تھی جس کے ایک ہاتھ میں بھالا تھا اور دوسرے میں ایک گولہ۔ ہر تمغے پر انگریزی میں کچھ لکھا تھا۔ جو انور پڑھ نہیں سکتا تھا۔ انور کی دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی مگر اپنے شرمیلے پن کی وجہ سے وہ کچھ کہہ نہ سکتا تھا۔ اِس لئے اُس نے عاجزانہ نظر سے رتن کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہا ہو "وہ میں نے جس بات کے لئے کہا تھا اُس کا کیا ہوا؟"۔ رتن سمجھ گیا۔

اُس نے سیدھے سیدھے کہا۔ "بابا، انور آپ سے لڑائی کے بارے میں کچھ جاننا چاہتا ہے۔"

"لڑائی!"۔ بوڑھے سپاہی نے کہا اور کچھ اِس طرح کھسیانا ہو کر کھانسا جیسے اُسے لڑائی میں اپنے کارنامے بیان کرتے ہوئے شرم آ رہی ہو۔ "لڑائی کے بارے میں کوئی سپاہی تمہیں اس کے علاوہ کیا بتا سکتا ہے کہ جس طرح اُس سے لڑنے کو کہا گیا وہ لڑا اور واہگورو کی مہربانی سے دشمن کی گولیوں کا نشانہ بننے سے بچ گیا۔"

لیکن رتن اپنے دوست کو اس طرح مایوس کرنے کو تیار نہیں تھا۔ اُس نے خوشامد کرتے ہوئے کہا۔ "بابا انور کو فرانس کے بارے میں اور مورچے پر کی اُن خندقوں کے بارے میں اور جرمن کی اُن بڑی بڑی توپوں کے بارے میں کچھ بتائیے جو سو میل تک گولے پھینکتی ہیں۔"

انور کی آنکھیں تعجب سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ "جمعدار صاحب، کیا سچ مچ ایسی توپیں ہوتی ہیں۔؟"

"ہاں بیٹا ہوتی ہیں، بلکہ اس سے بھی زیادہ خوفناک چیزیں ہوتی ہیں"۔ اب وہ اپنے لڑائی کے تذکرے سنانے کو تیار ہو گیا تھا۔ "لیکن اگر میں تمہیں بتاؤں گا تو شروع سے بتاؤں گا۔"

تینوں اُس مقدس تالاب کے کنارے آرام سے بیٹھ گئے۔ رتن تو ایک پل کے لئے بھی خاموش نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ اُس نے ایک چھوٹی سی کنکری پانی میں پھینکی اور دو سُنہری مندر آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔

انور اب جس لڑائی کا ذکر سن رہا تھا وہ ایک نئی قسم کی لڑائی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ اب نوجوان شہزادہ سفید گھوڑے پر بیٹھ کر لڑنے نہیں جاتا تھا" اب تیر انداز تیر کمان کے کمال نہیں دکھلاتے تھے، اب دشمن پر دھاوا بولنے کے لئے ہاتھی اور رتھ استعمال نہیں کئے جاتے تھے۔

رتن اپنے بابا کے ان بہادری کے کارناموں کی کہانی پہلے بھی کئی بار سن چکا تھا اس لئے وہ بیچ میں بول اُٹھا" لیکن بابا بڑی بڑی توپوں اور ہوائی جہازوں کو تو آپ چھوڑ ہی گئے۔ اُن کے بارے میں بھی تو انور کو بتایئے۔"

"ہاں تو دشمن کے پاس بہت سی بڑی بڑی توپیں تھیں جو اُس نے کہیں مورچے کے پیچھے لگا رکھی تھیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد کوئی گولا ہمارے سر کے اوپر سے سنسناتا ہوا گذرتا تھا اور زبردست دھماکے کے ساتھ ہماری خندقوں کے پاس آکر پھٹ جاتا تھا۔ جس وقت جرمن پیرس سے ستر میل دُور تھے اُس وقت انہوں نے ایک ایسی توپ لگادی جو سب توپوں کی 'نانی' تھی۔ یہ توپ ستر میل دُور پیرس کے سب سے اُونچے گرجا گھر کی چوٹی پر گولہ پھینک سکتی تھی اور یہ ہوائی جہاز تو ایک بہت بڑی منحوس چڑیا ہوتی ہے۔ سر کے اُوپر سے اُڑتے وقت ایک انڈا چھوڑتی ہے اور یہ انڈا پھٹ کر ہزاروں کی جان لے لیتا ہے۔ ایسی چیزوں کے خلاف بہادر سے بہادر آدمی بھی کیسے لڑ سکتا ہے؟ یہ سب کچھ سائنس کا کرشمہ ہے اور سائنس جرمنوں کے گھر کی

لونڈی ہے۔"

انور کے دماغ میں اُس بڑے سے کبوتر کی تصویر گھوم گئی جو اس نے اڑتا ہوا دیکھا تھا اور اُسے یاد آیا کہ اُس کے ابّا نے بھی اسے بتایا تھا کہ وہ موت اور تباہی پھیلاتا ہے۔

"پھر جمعدار صاحب، آپ نے جرمن کو ہرایا کیسے؟"۔ اُس نے ہمّت کر کے پوچھا۔

وہ بوڑھا سپاہی جواب دینے سے پہلے کچھ دیر رُکا۔ "بیٹا ایسا نہیں تھا کہ ہمارے پاس کوئی ساز سامان تھا ہی نہیں۔ یہ ضرور ہے کہ ہمارے پاس دشمن کے مقابلے میں کم ہتھیار تھے لیکن جس وجہ سے جرمن کی ہار ہوئی وہ بالکل ہی دوسری چیز تھی۔"

"وہ کیا چیز تھی؟ کیا چیز تھی وہ؟"۔ انور نے بے چین ہو کر پوچھا۔

جمعدار اجیت سنگھ کو اس سوال کا جواب دینے میں کچھ جھجک ہو رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ اپنے آپ کو ایسے سوال کے بارے میں رائے دینے کے لائق نہیں سمجھتے تھے۔ "میں تو ایک ان پڑھ سپاہی ہوں، میں سیاست ویاست کیا جانوں؟ لیکن صلح ہونے سے کچھ دن پہلے میں نے خندق میں ایک گورے سے یہ بات سُنی تھی۔ یہ گورا ٹامی فوج میں بھرتی ہونے سے پہلے کسی کالج میں پڑھاتا تھا۔ اس لیے وہ ٹھیک ہی کہتا ہوگا۔ ہاں، تو وہ کہتا تھا کہ جرمن لوگوں نے خاص طور پر کارخانوں کے مزدوروں نے اپنے بادشاہ کے خلاف بغاوت کر دی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ وہ لڑائی اور زیادہ نہیں چلانا چاہتے تھے کیونکہ یہ لڑائی قیصر اور اُس کے وزیروں نے اپنی سلطنت پھیلانے کے لئے چلائی تھی۔ انہوں نے قیصر کو گرفتار کر لیا اور خود اپنی سرکار بنالی۔ ہزاروں جرمن سپاہیوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ "ہمیں قیصر نے بے وقوف بنا کر انگریزوں اور فرانس والوں سے لڑوا دیا۔ ہمارا اُن سے کیا جھگڑا ہے۔ اب قیصر نہیں رہا تو لڑائی بھی نہیں رہے گی۔ تو بیٹا

لڑائی تو جرمن لوگوں نے نہیں جیتوائی ہے۔"

لیکن پورے بیان میں جمعدار اجیت سنگھ نے لڑائی میں اپنے کسی کارنامے کا ذکر نہیں کیا تھا۔ اُس نے یہ بھی نہیں بتایا تھا کہ اُسے وہ سارے تمغے کیسے ملے تھے؟ لیکن اب انور کے دل میں اُس کی بڑی سی کالی داڑھی کا ڈر نہیں رہ گیا تھا۔ اِس لئے اُسے سیدھے سیدھے یہ سوال پوچھ لینے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہوئی۔

"ارے یہ میڈل ؟" جمعدار اجیت سنگھ نے کہا۔ "یہ تو ایسے ہی ہیں۔ مجھے اِس لئے انعام میں دیئے گئے تھے کہ میں سرکار کا وفادار تھا اور جو کچھ مجھے حکم دیا گیا اُسے میں نے پورا کیا۔"

"اور" رتن نے بات جوڑتے ہوئے کہا۔ "اِس لئے بھی کہ آپ نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر ایک انگریز افسر کی جان بچائی تھی۔"

"ہاں"۔ جمعدار اجیت سنگھ نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "ایک بار رات کو ہم نے حملہ کیا جس میں کرنل اسمتھ صاحب زخمی ہو گئے اور جب ہم لوگ پیچھے ہٹ رہے تھے تو وہ ہمارے اور دشمن کے مورچے کے بیچ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ وہ ہمارے افسر تھے اور ہمارے ساتھ اُن کا سلوک بہت اچھا رہا تھا۔ اُن کی جان بچانے کی کوشش کرنا ہمارا فرض تھا اس لئے میں رات کے اندھیرے میں اپنی خندق کے باہر رینگ کر گیا اور اُن کو اپنے ساتھ لے آیا۔"

"لیکن کیا جرمن والوں نے آپ پر گولی نہیں چلائی ؟"

ہاں ہاں چلائی کیوں نہیں۔ کسی جرمن نشانہ باز کی گولی آ کر میری ٹانگ میں لگی۔" اور یہ کہہ کر جمعدار اجیت سنگھ نے بایاں پائنچہ اُٹھا کر اپنی پنڈلی پر دو پلے کے

برابر گھاؤ کا نشان دکھایا۔ زخم بہت دن ہوئے بھر چکا تھا لیکن اس کے خیال سے ہی انور کو متلی سی ہونے لگی۔

(۴)

دن بہت ڈھل چکا تھا۔ مندر کے وسیع آنگن میں مندر کا سایہ لمبا ہوتا جا رہا تھا۔ اجیت سنگھ نے سوچا کہ اکبر علی اپنے بیٹے کا انتظار کر رہے ہوں گے، اس لئے تینوں ہوٹل کی طرف لوٹ چلے۔ انور نے تو آج چھٹی کا پورا مزہ لوٹا تھا۔ لوٹتے وقت اس بات کی طرف انور کا دھیان ہی نہیں گیا کہ لوگ جلدی جلدی اپنے گھروں کو جا رہے ہیں، اس کے چاروں طرف لوگ دبی زبان میں کھسر پھسر کر رہے ہیں اور ہر نکڑ پر پولیس والے تعینات ہیں۔

اکبر علی بہت فکرمند ہو کر اُن کا انتظار کر رہے تھے۔ یہ اُن کے لئے ایک غیر معمولی بات تھی کیونکہ وہ کبھی بلا وجہ فکرمند یا پریشان نہیں ہوتے تھے لیکن شہر میں بڑی گڑبڑ ہو گئی تھی۔ چار دن پہلے جو ہڑتال ہوئی تھی اُس کے سلسلے میں جنتا کے دو لیڈر سیف الدین کچلو اور ستیہ پال گرفتار کر لئے گئے تھے۔ یہ خبر پا کر احتجاجاً لوگوں کے ایک مجمع نے ڈپٹی کمشنر کی کوٹھی پر جلوس لے جانے کی کوشش کی تھی مگر اُن لوگوں کو ہال گیٹ پُل کے پاس ہی روک دیا گیا تھا اور پولیس نے اُن پر گولی چلائی تھی۔ بہت سے لوگ زخمی ہوئے تھے اور کچھ لوگ مارے بھی گئے تھے۔

اجیت سنگھ اور رتن جلدی جلدی اپنے گھر کی طرف چل دیئے اور انور کچھ بوکھلایا ہوا سا چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اکبر علی اُس اندھیرے کمرے میں ٹہل رہے تھے۔ دُور سے لوگوں کے چلّانے کی دھیمی آواز سُنائی دے رہی تھی، اُس کے بعد بھاگتے ہوئے لوگوں

کے قدموں کی آواز سُنائی دی اور پھر اُن کے پیچھے بھاگتے ہوئے پولیس والوں کے بھاری جُوتوں کی آواز۔ لوگوں کا شور بڑھتا جارہا تھا کہ اتنے میں گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سُنائی دی۔ پھر یکایک سنّاٹا چھا گیا۔ پر یہ خاموشی انور کو اور بھی بھیانک لگ رہی تھی اور اُس کے لئے ناقابل برداشت ہوگئی تھی۔ جب اُس کے ابّا نے میز پر رکھا ہوا لیمپ جلاتے کے لئے ماچس جلائی تو انور چونک کر چارپائی پر سے گرتے گرتے بچا۔

اتنے میں ہوٹل کا ایک نوکر ہانپتا ہوا اور گھبرایا ہوا کمرے میں آیا۔ اُس نے بتایا کہ شہر میں گڑبڑ پھیلتی جارہا تھا۔ ہال گیٹ پُل پر پولیس نے جو گولی چلائی تھی اُس پر خفا ہوکر لوگوں نے کئی عمارتوں میں آگ لگادی اور بہت سے انگریزوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔

جب نوکر وہاں سے چلا گیا تو اکبر علی نے پھر کمرے میں ٹہلنا شروع کردیا۔ حالات نے جو شدّت اختیار کرلی تھی۔ اُس کا انور کے دل پر اتنا گہرا اثر پڑا تھا کہ وہ بالکل چپ بیٹھا رہا۔ سنہری مندر کے جس خوبصورت ماحول میں اس نے سارا دن بتایا تھا ــــــ تالاب کا وہ ٹھہرا ہوا پانی، رحمدل اجیت سنگھ کا پیار بھرا برتاؤ اور رتن کی دوستی ــــــ وہ دنیا دفعتاً چکنا چور ہوگئی تھی۔ کھڑکی میں سے ہوا کا ایک جھونکا اندر آیا اور اس کے ساتھ ہی کئی بندوقیں ایک ساتھ چلنے کی آواز اور پھر ٹرک کر مشین گن چلنے کی تڑتڑاہٹ۔

(۵)

۱۳ر اپریل ۱۹۱۹ء۔ انور اِس تاریخ کو کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔

اُس دن آسمان اور دنوں سے زیادہ صاف اور سُورج کی روشنی اور دنوں سے زیادہ تیز تھی۔ انور کو جو دو دن ہوٹل میں بند رہ کر بتانے پڑے تھے، وہ ماضی کا ایک

بھولا بسرا واقعہ معلوم ہو رہا تھا۔ کھڑکی کی چوکھٹ پر چڑیاں خوشی سے چہک رہی تھیں۔ اور ہاتھ منہ دھوتے وقت یا کپڑے بدلتے وقت انور برابر یہی امید کر رہا تھا کہ آج رتن سے اُس کی ملاقات ضرور ہوگی۔ وہ اپنے دوست سے کئی دن سے نہیں ملا تھا اور اُسے ایسا لگ رہا تھا کہ اُس سے بچھڑے ہوئے نہ جانے کتنا عرصہ بیت گیا ہے۔

اکبر علی نے اخبار الگ رکھتے ہوئے بتایا کہ شہر کی حالت بہت سُدھر گئی تھی اور کوئی دنگا فساد نہیں ہوا تھا۔ انہوں نے اُٹھ کر اپنی شیروانی پہنی اور اون کے بیوپاریوں سے حساب کتاب کرنے کے لئے بازار جانے کی تیاری کرنے لگے کیونکہ یہ کام دو دن سے ٹل رہا تھا۔ چلنے سے پہلے انہوں نے اپنے بیٹے سے کہا: "اگر کوئی گڑبڑ نہ ہوئی تو ہم لوگ کل واپس لوٹ سکتے ہیں۔"

انور اکیلا رہ گیا تھا۔ اُس کا ساتھ دینے کو وہاں صرف اُس کے خیال تھے۔ اُس نے سڑک کے پتھروں پر یکایک بھاری جوتوں کی آواز سنی اور بھاگ کر "چھجے" پر دیکھنے پہنچ گیا۔ ایک فوجی دستہ شہر کی گشت پر جا رہا تھا۔ آگے آگے سکھ گھوڑسوار تھے۔ اُنکے پیچھے ایک موٹر میں کچھ لال مُنہ والے انگریز افسر تھے۔ ان انگریز افسروں کے پاس پستول تھے اور ایسا لگتا تھا کہ وہ کسی بھی وقت چلا دیں گے۔ سب سے پیچھے گورکھوں کا ایک دستہ تھا جن کے سروں پر ایک طرف کو بے حد جُھکے ہوئے ٹوپ لگے ہوئے تھے اور پیٹیوں سے کُھکھریاں بندھی ہوئی تھیں۔ ہوٹل کا نوکر بغل والے کمرے میں جھاڑو لگا رہا تھا۔ اُس نے اچانک اِس فوجی دستے کو دیکھ کر، جو اب دوسری سڑک پر مڑ رہا تھا، بڑی نفرت کے ساتھ زمین پر تھُوکا اور بولا "سُوّر کے بچّے ہمیں ڈرانا چاہتے ہیں ––"

انور اپنے کمرے میں جا کر آرام کرسی پر لیٹ گیا اور چڑیوں کی حرکتیں دیکھنے لگا۔

ماں اپنے بچوں کو دانہ کھلا رہی تھی اور انہیں اڑنا سکھا رہی تھی۔

کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا اور رتن اندر داخل ہوا۔ "رتن! میرے یار"۔۔۔۔ انور مارے خوشی کے پھولا نہیں سما رہا تھا ۔۔۔۔ شروع شروع میں تو دونوں کچھ ہچکچاہٹ میں پڑے رہے لیکن جلد ہی دونوں جی کھول کر باتیں کرنے لگے اور ہنسنے لگے اور دن بھر کے پروگرام بناتے لگے۔ رتن نے انور کو بتایا کہ آج بیساکھی کا تہوار ہے اور شہر میں بہت بڑا میلہ لگے گا۔ نئے سال کا تہوار بیساکھی بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔ آس پاس سے آئے ہوئے کسانوں کی بھیڑ سڑکوں پر گھوم رہی تھی۔ انور نے سوچا اِس بھیڑ کے ساتھ گھومنے پھرنے میں بڑا مزہ رہے گا۔ انور نے اپنے ابّا سے شہر جانے کی اجازت نہیں لی تھی لیکن اُس کے ابا نے اُسے ہوٹل سے باہر نکلنے کے لیے منع بھی تو نہیں کیا تھا۔ اور پھر وہ لوگ تو ابّا کے واپس لوٹنے سے بہت پہلے ہی گھنٹے دو گھنٹے میں بازار گھوم کر لوٹ آئیں گے۔ فضا میں ایک عجیب جوش تھا۔ اُس کے دل میں ایک انجانا تجربہ کرنے کا دھندلا سا جذبہ تھا اور اُسے سب سے بڑا سہارا یہ تھا کہ رتن اسکے ساتھ تھا۔ انور اپنے دوست کے ساتھ نکل پڑا۔ اُس کا دل ہمیشہ سے زیادہ تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

سڑکوں پر لمبے چوڑے ڈیل ڈول والے کالے رنگ کے کسانوں کی بھیڑ تھی۔ اُن کے سر پر بڑی بڑی پگڑیاں، بدن پر کھدّر کے کپڑے اور پیروں میں نوکدار جوتے تھے جن پر گرد کی ایک تہہ جمی ہوئی تھی۔ انور نے سوچا یہ اسی لمبی سڑک کی گرد ہوگی۔ دونوں لڑکے بازاروں میں بے مقصد گھومتے رہے۔ کبھی کسی دکان کے آگے رک کر اُس میں سجی ہوئی چیزیں دیکھنے لگتے اور پھر بھیڑ کے ساتھ آگے بڑھ جاتے۔ نہ تو اُن کو سمت کا

خیال تھا اور نہ وقت کا احساس۔

ایک سڑک کے نکّڑ پر انور کی ہی عمر کے ایک لڑکے کے چاروں طرف ایک بھیڑ جمع ہو گئی تھی۔ وہ لڑکا پھٹے پُرانے کپڑے پہنے تھا اور ایک دکان کے تختے پر کھڑا ہو کر ٹین کا پیپا بجا کر ڈُگّی پیٹ رہا تھا۔ انور نے سوچا یہ تو سچ مچ کوئی مزیدار بات ہوگی۔

ڈُگّی پیٹنے والے لڑکے نے کافی بڑی بھیڑ جمع کرنے کے بعد اُونچی آواز میں کہنا شروع کیا۔ "بھائیو۔ آج شام کو چار بجے جلیانوالہ باغ میں لالہ ہردیال کی صدارت میں ایک عام جلسہ ہوگا۔ آپ سب لوگ ہزاروں کی تعداد میں شریک ہو کر جلسے کو کامیاب بنائیے۔" پھر اُس نے ٹین کو کئی بار لکڑی سے پیٹا اور دُکان کے پٹڑے پر سے نیچے کُود کر دُوسری جگہ ڈُگّی پیٹنے چلا گیا۔

انور کبھی کسی 'عام جلسے' میں نہیں گیا تھا اور اُسے یہ جاننے کی خواہش تھی کہ آخر یہ عام جلسہ کیسا ہوتا ہے۔ رتن کو زیادہ آزادی ملی ہوئی تھی اس لئے وہ اس طرح کی کئی میٹنگیں دیکھ چکا تھا۔ اُس نے انور کو بتایا کہ ان میٹنگوں میں بہت مزہ آتا ہے اور کسی بھی حالت میں اِن میں جانے سے نہیں چُوکنا چاہیئے۔

"تو پھر چلو اس میں چلیں گے۔" انور نے بڑے جوش سے کہا۔ "اُس لڑکے نے کیا بتایا تھا کہ میٹنگ کہاں ہوگی؟ کس باغ میں؟"

"جلیانوالہ باغ میں۔" امرتسر کے باشندے رتن نے جواب دیا۔

(۶)

جب وہ باغ میں گھُسے تو انور کو کچھ نااُمیدی ہوئی۔ اس نے سوچا تھا کہ یہ باغ بھی دلّی کے باغوں اور پارکوں کی طرح ہوگا ——— ہری ہری مخملی گھاس، سایہ دار درخت،

پھولوں کی کیاریاں اور فوارے۔ لیکن یہ باغ تو دُور تک پھیلا ہوا ایک بنجر علاقہ تھا جس کے بیچ میں ایک سفید مقبرے کے کھنڈر تھے۔ ایک کونے میں تین چار پیڑ تھے اور اُن کے پاس ہی ایک بالکل اکیلا تاڑ کا پیڑ کھڑا تھا جس کی کمر بڑھاپے کی وجہ سے جھک گئی تھی۔ سارا علاقہ چاروں طرف کے مکانوں سے بالکل گھرا ہوا تھا۔ بس اس میں گھسنے کے لئے ایک ہی پھاٹک تھا۔ لیکن عمارتوں کے بیچ میں جہاں کہیں جگہ چھوٹی ہوئی تھی، اُس میں سے ہوکر اِکّا دُکّا لوگ میدان میں آکر جمع ہونے لگے تھے۔

دونوں لڑکے اپریل کی تیز دھوپ سے بچاؤ کی کوئی جگہ ڈھونڈ رہے تھے، پر کوئی جگہ دکھائی ہی نہیں دے رہی تھی۔ دیکھتے دیکھتے میدان بھرنے لگا۔ پھاٹک کے پاس لکڑی کا ایک پلیٹ فارم بنایا گیا تھا جس پر کھڑے ہو کر لوگ تقریر کرنے والے تھے۔ رتن بھیڑ کے بیچ سے راستہ بناتا ہوا پلیٹ فارم کے جتنا پاس ہو سکتا تھا پہنچ گیا۔ اُس نے کہا: "اگر ہم پلیٹ فارم کے پاس نہیں بیٹھیں گے تو ہمیں کچھ بھی نہیں سُنائی دے گا۔" سب کی طرح وہ بھی زمین پر بیٹھ گئے اور ایک دوسرے کی قربت کا مزہ لینے لگے۔ جلد ہی چاروں طرف لوگوں کی بھیڑ جمع ہو گئی اور اُن کی تعداد لگاتار بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

انور کے ابّا نے اُسے ایک گھڑی دی تھی۔ اُس نے گھڑی دیکھی کہ ابھی اسے کتنی دیر اور انتظار کرنا پڑے گا۔ گھڑی میں ساڑھے چار بجے تھے۔ رتن نے انور کو کہنی سے ٹھیلتے ہوئے کہا: "دیکھو، دیکھو میٹنگ شروع ہو رہی ہے۔"

پلیٹ فارم پر ایک مقرّر کے آتے ہی بھیڑ میں خاموشی چھا گئی۔ لوگوں نے باتیں کرنا بند کر دیا۔ مقرّر نے کہا کہ "عوام کے مقبول لیڈر ڈاکٹر کچلو صدارت کریں گے۔" اُس نے کہا: "ہاں، میں جانتا ہوں کہ سرکار نے اُن کو نظر بند کر رکھا ہے لیکن وہ ابھی تک

ہمارے دلوں میں موجود ہیں!" یہ کہہ کر اس نے کرسی پر ڈاکٹر کچلو کی ایک تصویر رکھ دی۔
ڈاکٹر کچلو بہت خوبصورت آدمی تھے اور ان کے ایک چھوٹی سی کالی داڑھی تھی
چاروں طرف سے کانوں کو بہرا کر دینے والی تالیوں کی زوردار آوازوں کو چیرتا ہوا ایک
زوردار نعرہ اس طرح گونج اٹھا جیسے سمندر میں جوار کی بڑی لہر ان گنت چھوٹی چھوٹی
لہروں کو روندکر آگے بڑھ جاتی ہے "انقلاب زندہ باد!"۔ انور "انقلاب" کے لفظ
کا پورا مطلب بھی نہیں سمجھتا تھا۔ وہ بس موٹے موٹے طور پر یہ جانتا تھا کہ جب کوئی
بنیادی اُتھل پتھل ہوتی ہے تو اسے انقلاب کہتے ہیں۔ پر نہ جانے کیوں اس نعرے
سے اُس کے سارے بدن میں جوش کی چنگاریاں سُلگ اٹھیں۔ اُسے ایسا لگا جیسے کوئی
اس کا ایک ایک رونگٹا نوچے لے رہا ہے۔ اُس کا چہرہ تمتما اٹھا اور اُس کا سر اسی طرح
چکرانے لگا جیسے ایک بار لُو لگ جانے پر ہوا تھا۔ اُس نے رتن کی طرف دیکھا اور اُسے
ایسا لگا کہ اُس کے دوست کے جذبات پر بھی ایسا ہی اثر ہوا تھا۔ اُس کی مٹھیاں بھنچی
ہوئی تھیں۔ وہ دانت بھینچ رہا تھا اور اُس کی پیلی پگڑی میں سے پسینہ بہہ کر باہر آ رہا
تھا حقیقت میں سارے مجمع نے جوشیلی آواز میں اس نعرے کو دُہرایا۔ انقلاب زندہ باد!
انقلاب زندہ باد! انقلاب زندہ باد! بیس ہزار انسانوں کی آوازوں سے فضا گونج
اٹھی اور پھر وہ چاروں طرف کی دیواروں سے ٹکرا کر لوٹ آئی۔ یہ آواز آہستہ آہستہ اونچی
ہوتی گئی اور پھر دفعتاً خاموش ہوگئی کیونکہ لوگ دم لینے کو رُک گئے تھے اور پھر ایک بار
یہی سلسلہ جاری ہوگیا۔ انقلاب زندہ باد! انقلاب زندہ باد! صرف ان دو لفظوں کو
بار بار دُہرانے سے ایک جوش سا پیدا ہو جاتا تھا۔ انور کے لئے یہ بالکل ویسا ہی تجربہ
تھا جیسے باقی پت کی قوالی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ یہ بالکل ہی دوسری قسم کی قوالی تھی اور

اس سے دل میں جذبات کا جو طوفان اُٹھتا تھا اُس میں درگاہ والا رُوحانی نشہ نہیں تھا بلکہ میدانِ جنگ کا جنون تھا جس کا ذکر رتن کے بابا نے کیا تھا۔

آخر میں جب نعرے بازی ختم ہوئی تو تقریروں کا سلسلہ شروع ہوا اور ہر لہجے اِس اُتار نے انور کو بہت ہی مایوس کر دیا۔ ان تقریروں میں ہندو مسلم اتحاد کی اپیل کی گئی۔ دس تاریخ کی فائرنگ میں جو لوگ شہید ہوئے تھے اُن سے ہمدردی کا اظہار کیا گیا اور سرکار سے لیڈروں کو رہا کر دینے اور رَولٹ بِل کو رد کر دینے کی درخواست کی گئی۔ کسی نے بہت ہی ماتمی آواز میں ایک نظم پڑھی جس میں اس بات پر افسوس ظاہر کیا گیا تھا کہ عوام کی فریاد پر غور نہیں کیا جا رہا تھا اور بیچ بیچ میں لوگ "ہندو مسلمان کی جے" کا نعرہ لگا دیتے تھے۔ لیکن اِن سب میں اُس "انقلاب" کے بارے میں ایک بھی لفظ نہیں تھا جس کے بارے میں وہ ابھی کچھ دیر پہلے گلا پھاڑ پھاڑ کر چلّا رہے تھے۔ انور کو یہ ساری باتیں غیر دلچسپ معلوم ہوئیں اور اُسے ایسا لگا کہ یہ لوگ بات کو بہت گھُما پھرا کر کہہ رہے ہیں۔ وہ حالات کی باریکیوں کو پُوری طرح نہیں سمجھتا تھا۔ اُس کی سمجھ میں تو بس اتنا ہی آیا تھا کہ سرکار نے جنتا کے ساتھ بُرا سلوک کیا تھا اور لوگوں میں اس بات پر بڑا غصّہ اور دُکھ تھا۔ "انقلاب زندہ باد" کے نعروں سے جو جوش پیدا ہوا تھا وہ اب ٹھنڈا پڑتا جا رہا تھا اور مجمع پر اس کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ پارک کے ایک سِرے پر کچھ لوگوں نے تاش کھیلنا شروع کر دیا تھا۔ بچّے اِدھر اُدھر بھاگ دوڑ رہے تھے اور بیچ بیچ میں کہیں سے کسی بچّے کے رونے کی آواز بھی آ جاتی تھی۔ انور گھر واپس جانا چاہتا تھا اور اُسے ایک دم جمعدار اجیت سنگھ کو آتا دیکھ کر بہت اُمید بندھ گئی۔ جمعدار صاحب کو رتن کو وہاں دیکھ کر بڑا تعجّب ہوا۔

اربے رتن، یہ تیرا کیا طریقہ ہے؟ تو مجھے بغیر بتائے گھر سے چلا آیا اور اکبر صاحب کے بیٹے کو بھی اپنے ساتھ لیتا آیا۔ اُس کے ابا اس کے لئے بے حد پریشان ہو رہے ہیں، چلو دونوں اب چلو یہاں سے۔"

انور جب جمعدار صاحب کے ساتھ چلنے کے لئے اُٹھا تو وہ یہ سوچ سوچ کر ڈر رہا تھا کہ وہ اپنے ابا کو کیا بتائے گا کہ وہ کہاں چلا گیا تھا لیکن اتنے میں آسمان پر ایک گڑگڑاہٹ سُنائی دی اور سب لوگ سر اوپر اُٹھا کر ہوائی جہاز کو دیکھنے لگے۔ ایک شکاری چڑیا کی طرح ہوائی جہاز اُن کی طرف جھپٹتا چلا آ رہا تھا۔ وہ نیچے آتا چلا جا رہا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ وہ اُن کے بیچ میں ہی گر پڑے گا۔ مرد گھبرا کر اُسے دیکھ رہے تھے؛ عورتیں چلّا رہی تھیں اور بچے ڈر کے مارے چیخ رہے تھے۔ لیکن اچانک ہوائی جہاز پھر اونچا اُٹھنا شروع ہوا اور تھوڑی دیر میں وہ دُور صرف ایک دھبّے کی طرح دکھائی دینے لگا۔ مقرّر نے اپنی تقریر پھر شروع کی۔ جو لوگ گھبراہٹ کے مارے اُٹھ کھڑے ہوئے تھے، وہ پھر بیٹھ گئے اور انور اور رتن جمعدار صاحب کے پیچھے چل دیئے۔ جمعدار اجیت سنگھ اپنی فوجی وردی اور تمغوں کا رُعب ڈالتا ہوا بھیڑ کو چیر کر آگے بڑھتا رہا پر ایک بار پھر انہیں رُک جانا پڑا۔ کسی نے خبردار کر دیا اور فوراً ہی یہ خبر سارے مجمع میں گونجنے لگی۔

"وہ آ گئے۔۔۔ وہ آ گئے۔"

(۷)

انور نے اپنی گھڑی دیکھی۔ ساڑھے پانچ بجے تھے۔ پھر اُس نے پھاٹک کی طرف نظر دوڑائی اور جو کچھ اُس نے دیکھا اُسے دیکھ کر اُس کا خون جم گیا۔

تیس یا چالیس انگریز اور گورکھا سپاہیوں کا ایک دستہ آ کر باغ کے پھاٹک کے

سامنے تعینات ہو گیا تھا۔ اُن سب کے پاس رائفلیں تھیں۔ کچھ گورے افسروں کے پاس ریوالور بھی تھے۔ اُن میں وہ لال مُنہ والا افسر بھی تھا جسے انور نے اکثر موٹر پر فوجی سپاہیوں کے ساتھ گشت لگاتے دیکھا تھا۔

اس کے بعد پلک جھپکتے میں جو واقعات ہوئے وہ انور کی سمجھ سے باہر تھے۔ پر وہ اس کی یادداشت پر سالہا سال تک اپنا بھیانک عکس چھوڑ گئے۔ انور مورتی بنا ایک جگہ پر کھڑا تھا اور سارے واقعات ایک سپنے کی طرح اُس کی آنکھوں کے سامنے سے گذر رہے تھے۔ اسے اتنا گہرا دماغی صدمہ پہنچا تھا کہ اُسے ڈر بھی نہیں لگ رہا تھا۔ وہ یہ سوچ بھی نہیں پا رہا تھا کہ اُس کے چاروں طرف جو حادثے ہو رہے ہیں اُن کی اہمیت کیا ہے؟ لال مُنہ والے افسر نے گورکھوں سے چلا کر کچھ کہا اور انہوں نے اپنی بندوقیں تان لیں اور بھیڑ کی طرف نشانہ لگا کر کھڑے ہو گئے۔ "فائر" حکم ہوا اور گورکھوں نے تعمیل کی لیکن انور نے دیکھا کہ گولی چلانے سے پہلے انہوں نے اپنی بندوقوں کا مُنہ کچھ اوپر اُٹھا لیا تھا۔ یکایک گولیوں کی منحوس بوچھار نے خاموشی کو کانچ کی دیوار کی طرح چکنا چور کر دیا۔ پیڑوں پر سے کبوتروں اور کوّوں کا ایک جھُنڈ شور کرتا ہوا اُڑ گیا۔ چاروں طرف بھاگ دوڑ مچ گئی۔ لوگ اُٹھ اُٹھ کر بھاگنے لگے۔ عورتوں نے اپنے بچّوں کو اس طرح سینے سے لگا لیا۔ جیسے باز کے جھپٹنے پر مُرغی اپنے بچّوں کو پروں کے نیچے چھپا لیتی ہے۔ پر کوئی گولی سے زخمی نہیں ہوا بلکہ بھیڑ میں سے کسی نے چلّا کر کہا بھی "ڈرو نہیں، وہ خالی کارتوس چلا رہے ہیں۔" کچھ لوگ بھاگتے بھاگتے رُک گئے اور کچھ پلٹ کر سپاہیوں کا سامنا کرنے کے لئے کھڑے ہو گئے۔ وہ لال مُنہ والا انگریز غصّے سے پاگل ہو رہا تھا۔ وہ اپنا ریوالور ہلا ہلا کر گورکھوں سے ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی میں کہہ رہا تھا۔ "تُم شالا سُوّر کا بچّہ لوگ، اتنا اونچا میں

گولی کیوں چلاتا ہے۔ ینچا میں گولی چلاؤ نہیں تو ہم تم کو گولی مار دے گا۔" سارے گورے افسروں نے اپنے اپنے ریوالور نکال لئے اور گورکھوں کی طرف نشانہ لگا کر کھڑے ہو گئے۔ لال منہ والے افسر نے حکم دیا "فائر"! ۔ اور گورکھوں نے گولی چلا دی۔ اِس بار اُن کی رائفلوں کی نلیاں سیدھی بھیڑ کی طرف تھیں۔ "لیٹ جاؤ"۔ جمعدار اجیت سنگھ نے بالکل فوجی طریقے سے حکم دیا اور دونوں لڑکے فوراً زمین پر لیٹ گئے۔ ذرا سی بھی دیر ہو جاتی تو وہ بچ نہ سکتے۔ کیونکہ وہ زمین پر لیٹے ہی تھے کہ اُن کے اُوپر سے گولیاں سنسناتی ہوئی گذر گئیں۔

انور زمین پر اوندھا لیٹا لیٹا یہ ناٹک دیکھ رہا تھا۔ اُس کے لئے یہ بیحد بھیانک تجربہ تھا۔ رائفلیں کتّوں کی طرح بھونک رہی تھیں۔ گولیوں کی بوچھار ایک لمحے کے لئے بھی نہیں رُکی تھی۔ مرد، عورتیں اور بچے چاروں طرف گولیوں کا شکار ہو کر گر رہے تھے۔ ہر طرف لوگوں کی چیخ پُکار اور کراہیں سُنائی دے رہی تھیں۔ باغ سے باہر نکلنے کے تنگ راستوں کی طرف بھاگتے ہوئے لوگوں کو اپنے جُوتوں اور پگڑیوں کا بھی ہوش نہیں رہا تھا کچھ لوگوں کی تو دھوتیاں تک پیچھے رہ گئی تھیں۔ جو لوگ زمین پر لیٹے ہوئے تھے انہیں اپنے پیروں تلے روندتے ہوئے بھاگنے والے آگے بڑھے جا رہے تھے۔ ایک بار تو انور کی ٹانگ پر بھی کسی کا بھاری سا بوٹ پڑا اور اس کی ہڈی ٹوٹتے ٹوٹتے بچی۔ جو لوگ باہر نکلنے کے راستوں تک پہنچ بھی گئے۔ اُن کی بھی خیریت نہیں تھی۔ اُس لال منہ والے افسر نے رائفلوں کے مُنہ اُن کی طرف کروا دیئے اور باہر نکلنے سے پہلے ہی انہیں گولیوں سے بھُون دیا گیا۔

اُن کے چاروں طرف مرے ہوئے، دَم توڑتے ہوئے اور زخمی لوگ پڑے تھے اور گولیوں کی تڑتڑاہٹ کے بیچ ان کی خوفناک چیخیں اور "یا اللہ" اور "ہے بھگوان"

اور "ارے میری ماں" کی آوازیں سُنائی دے جاتی تھیں۔ اُن کے پاس ہی کوئی آدمی بہت زور سے کراہ رہا تھا۔ انور نے ذرا سا سر اٹھا کر دیکھا تو وہ ہوٹل کا نوکر نندو نکلا۔ اُسے دیکھنے سے صاف پتہ چلتا تھا کہ گولی اُس کے پیٹ میں لگی ہے کیونکہ جب بھی درد کی لہر اُٹھتی تھی وہ اپنا پیٹ پکڑ لیتا تھا۔ ایک بار اُس نے بڑی کوشش کر کے اپنا سر ذرا سا گھمایا اور دونوں ہاتھ سے پیٹ پکڑ کر زور سے تھوکا — خون!

نندو کے مُنہ سے گاڑھا گاڑھا کتھئی رنگ کا خون نکلتے دیکھ کر انور کو متلی ہونے لگی۔ نندو نڈھال ہو کر پھر پہلے کی طرح لیٹ گیا تھا اور خون کی ایک پتلی سی دھار اُس کے مُنہ کے ایک کونے سے دھیرے دھیرے بہہ رہی تھی۔ یوں تو ہر طرف لاشیں اور زخمی جسم پڑے تھے، لیکن یہ تو ایک ایسا آدمی تھا جسے وہ جانتا تھا، جس کے ساتھ وہ باتیں کر چکا تھا اور ہنس چکا تھا۔ نندو ایک نوجوان آدمی تھا اور ابھی کل ہی تو اُس نے انور کو بتایا تھا کہ حال ہی میں اُس کی شادی ہوئی ہے۔ ایک پل کے لئے سارے مجمع کا درد نندو کی اس تکلیف میں سمٹ آیا۔

انور کے لئے اپنے آپ کو اور زیادہ قابو میں رکھنا ناممکن ہو گیا تھا۔ انجانے ہی وہ کہنی کے بل کچھ اوپر کی طرف اُٹھا اور تھوڑے ہی فاصلے پر تڑپتے ہوئے نندو کی طرف اشارہ کر کے اونچی آواز میں بولا۔ "جمعدار صاحب، جمعدار صاحب، اس کے لئے ہم کچھ نہیں کر سکتے کیا؟"

"سر نیچے کرو۔" جمعدار اجیت سنگھ نے کڑک کر حکم دیا۔ انور نے کھٹ سے اپنا سر نیچے کر لیا۔ وہ بال بال بچ گیا کیونکہ اُسی وقت ایک گولی سنسناتی ہوئی اُس کے پاس سے نکل گئی۔ یہ احساس ہوتے ہی کہ وہ موت کے مُنہ سے کس طرح بال بال بچ گیا

تھا انور کے سارے بدن سے ٹھنڈے پسینے چھوٹنے لگے۔

اجیت سنگھ نندو کو دیکھ رہا تھا۔ "زیادہ کچھ تو ہم کر نہیں سکتے۔ لیکن کم سے کم اُسے پیٹ کے بل اوندھا تو لٹا ہی دینا چاہئے تاکہ خون بہہ جائے اور وہ اطمینان سے مر سکے۔"

یہ کہہ کر وہ دھیرے دھیرے رینگتا ہوا نندو کے پاس پہنچ گیا۔ انور اور رتن دَم سادھے بڑی فکر کے ساتھ اُسے دیکھتے رہے۔ نندو خون کا بہاؤ روکنے کی کوشش میں اپنا پیٹ دونوں ہاتھوں سے دبائے تھا۔ جمعدار اجیت سنگھ نے آہستہ سے اُسے پلٹ دیا اور فوراً ہی اس کی تکلیف کم ہو گئی۔ انور اپنا مُنہ زمین سے لگا کر چُپ چاپ لیٹ گیا۔ لیکن اُن کے اُوپر گولیاں اب بھی اپنا خوفناک موت کا سنگیت سنا رہی تھیں جب اجیت سنگھ پھر رینگ کر اپنی جگہ پر واپس لوٹا تو اس کے چہرے پر غُصّے کا ایک نیا وحشیانہ رنگ اُبھر آیا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا تھا۔

"کیا سرکار پاگل ہو گئی ہے؟ کیا سرکار پاگل ہو گئی ہے؟" اُس نے کئی بار دُہرایا اور پھر اس سے پہلے کہ رتن اور انور اُسے روک سکتے، اجیت سنگھ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور سیدھا اُن سپاہیوں کی طرف بڑھا جن کی بندوقیں موت اُگل رہی تھیں۔

"اوئے جرنیل صاحب۔" اُس نے کسی بھی چیز کی پرواہ نہ کرتے ہوئے زور سے کہا۔ ہر طرف چلتی ہوئی گولیوں کی منحوس سنسناہٹ کو چیرتی ہوئی اُس کی کڑک دار آواز گونج اُٹھی۔

چاروں طرف سنسناتی ہوئی گولیوں کے بیچ اُس نے ایک بار پھر چلّا کر کہا۔ "اوئے جرنیل صاحب۔ میں لڑائی میں آپ کی طرف سے لڑ چکا ہوں۔ میں نے ایک انگریز افسر کی جان بھی بچائی تھی۔ اگر میری بات پر یقین نہیں ہے تو ان تمغوں کو دیکھ لو! لیکن یہ

تو لڑائی نہیں ہے۔۔ آپ نہتّے لوگوں پر گولی نہیں چلا سکتے۔ اگر اسی طرح آپ گولی چلاتے رہے تب تو آپ بیس ہزار لوگوں کو بھُون کر رکھ دیں گے۔ ہم نے تو کبھی نہتّے جرمنوں پر بھی گولی نہیں چلائی۔"

جمعدار اجیت سنگھ کو اس طرح آگے بڑھتا دیکھ کر کچھ ڈر بھی لگتا تھا۔ پر ساتھ ہی ساتھ فخر کا احساس بھی ہوتا تھا۔ انور دنگ ہو کر اُسے دیکھ رہا تھا۔ وہ یہ بھی بھول چکا تھا کہ اُس کی جان خطرے میں ہے۔ سارا مجمع حیرت سے بُت بنا اُسی طرف دیکھ رہا تھا اور ایک لمحے کے لئے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے اُس بوڑھے نے بندوق والے سپاہیوں پر جادو کر دیا ہو' ایک لمحے کے لئے اُن کی اُنگلیاں بندوق کی لبلبیوں پر جمی رہ گئیں۔

جمعدار اجیت سنگھ اُس لال مُنہ والے افسر سے کچھ ہی گز کی دُوری پر رہ گیا تھا۔ وہ لال مُنہ والا افسر چبوترے پر ہاتھ میں ریوالور لئے تشانہ تانے کھڑا تھا۔ "بولو صاحب بولو۔ اپنے سپاہیوں کو گولی چلانا بند کرنے کا حکم دو۔" اجیت سنگھ کی آواز میں اب بھی چیلنج تھا' پر اس کی کڑک دار آواز کچھ لڑکھڑانے لگی تھی۔ "جرنیل صاحب ہم سب لوگ سرکار کے وفادار ہیں' ہم میں سے کوئی بھی باغی یا غدّار نہیں ہے۔ آپ ہم لوگوں پر کیوں اِس طرح گولی چلا رہے ہیں؟ سرکار! ہمارے اُوپر رحم کرو۔ آپ ہمارے مائی باپ ہیں۔۔۔۔" اُس کی آواز میں چیلنج کی جو کڑک تھی وہ غائب ہو کر خوشامد کی لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں بدل گئی۔ یہ کہہ چکنے کے بعد اجیت سنگھ کا تیس برس کی عادت سے سدھا ہوا ہاتھ مشین کی طرح اُوپر اُٹھا اور اُس نے ایڑیاں کھڑکا کر اُس گورے افسر کو فوجی سلام جھاڑا۔

اُسی وقت ایک گولی دغنے کی آواز گونج اٹھی اور جمعدار اجیت سنگھ کا جسم

ایک لمحے کے لئے کھڑا رہ گیا۔ اُس کا ہاتھ ابھی تک ماتھے سے لگا ہوا تھا جیسے کہ وہ یوں ہی دائمی سلام کرتا کھڑا رہے گا۔

وہ اِس طرح کھڑا تھا جیسے اب آگے قدم بڑھانے والا ہو لیکن ایک پل میں وہیں اچانک زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ گولی چلنا بند ہو گئی۔ لال مُنہ والے افسر نے اپنے سپاہیوں کو کچھ حکم دیا اور سارے افسر اور سپاہی قدم ملاتے ہوئے پھاٹک سے باہر چلے گئے۔ جلیانوالہ باغ پر موت کا سا سنّاٹا چھا گیا جو گولیوں کی آواز سے بھی بھیانک تھا۔ انور اور رتن پیٹ کے بل رینگتے ہوئے جمعدار اجیت سنگھ کے پاس پہنچ گئے۔ گولی ایک تمغے کو چیرتی ہوئی پار نکل گئی تھی۔ اجیت سنگھ مر چکا تھا۔

انور سے جمعدار اجیت سنگھ کے چہرے کی طرف دیکھا نہ گیا۔ اُس کے چاروں طرف زمین پر لاشیں اور زخمی جسم پڑے تھے جیسے گیہوں کی فصل کاٹ دی گئی ہو۔ ایک بچّہ اپنی ماں کو جگانے کی کوشش کر رہا تھا مگر ماں ہمیشہ کی نیند سو رہی تھی۔ انور کی ہی عمر کا ایک اور لڑکا بے جان پڑا تھا۔ ہر طرف خون ہی خون دکھائی دیتا تھا۔ انور کا سر چکرانے لگا۔ اسے متلی ہو رہی تھی۔ لاکھ چاہنے پر بھی وہ اُلٹی نہ کر سکا۔ اُس نے اپنا سر زمین پر ٹیکا دیا اور اُسے ایسا لگا کہ آسمان گھوم رہا ہے ستارے ناچ رہے ہیں موت کا ناچ ناچ رہے ہیں اور کھجور کا وہ ٹیڑھا پیڑ بھی تو ناچ رہا تھا۔ لیکن بے ہوش ہونے سے پہلے انور نے رتن کے چہرے کی جھلک دیکھی۔ رتن کے چہرے پر رنج یا دکھ نہیں تھا بلکہ وہ دُور خلاؤں میں تک رہا تھا۔ وہ سسکیوں کو روکنے کے لئے اپنے ہونٹ کاٹ رہا تھا اور اُس کی آنکھوں میں بدلے کی آگ دہک رہی تھی۔

۴

ساری دنیا سے اُوپر

(۱)

وقت ہر زخم کو بھر دیتا ہے اور بچپن میں تو بدن کے ہی نہیں، دل کے گھاؤ بھی بہت جلدی بھر جاتے ہیں۔ لیکن انور کے لئے امرتسر کے اُس دلخراش حادثے کو بھول جانا آسان نہیں تھا۔ اُس پورے قتلِ عام سے بھی بڑھ کر جمعدار اجیت سنگھ اور نندو کی موت سے اُس کے دل پر بہت گہرا زخم لگا تھا۔ اُس حادثے کے آٹھ مہینے بعد بھی اُن دونوں کی صورتیں انور کو سپنے میں دکھائی دیتی تھیں۔ جب بھی وہ اپنے دوست رتن کے بارے میں سوچتا اُسے اُس کی آنکھوں میں وہی انتقام کی آگ دہکتی ہوئی دکھائی دیتی۔ اور وہ اُس دلخراش اور ذلّت آمیز حادثے کو کبھی نہیں بھولا تھا جس کا ذکر اُس نے آج تک کسی سے نہیں کیا تھا۔

امرتسر سے چلنے سے ایک دن پہلے جب کہ اُس کے ابّا بازار گئے ہوئے تھے، انور

چپکے سے ہوٹل سے نکل کر شہر کے اُس علاقے میں گیا تھا جہاں رتن اپنی بیوہ ماں کے ساتھ رہتا تھا۔ اُس تنگ گلی کے نکڑ پر کچھ گورے سپاہی بندوقوں پر سنگینیں لگائے کھڑے تھے۔ ایک بار تو انور کے جی میں آیا کہ وہ اُلٹے پیر واپس آجائے لیکن وہ اُس دن کے قتل عام کے بعد سے اپنے دوست سے ملا نہیں تھا۔ اور دوسرے دن وہ دلّی واپس جارہا تھا۔ کون جانے پھر کب ملنا ہو؟ انور ڈرتا ڈرتا سڑک کے کنارے کنارے سپاہیوں کی طرف بڑھا۔ لیکن اُس نے گلی میں قدم رکھا ہی تھا کہ ایک سپاہی نے اُس کی گردن پکڑ کر نیچے دھکیل دیا اور اسے گلی کی اوبڑکھابڑ اور گندی زمین پر رینگ کر چلنے پر مجبور کیا۔ بالکل چوہے کی طرح رینگ کر۔ بیچ میں وہ ایک بار اپنی دُکھتی ہوئی کمر سیدھی کرنے کے لیے رُک کر ذرا سا اوپر اُٹھا ہی تھا کہ کسی نے بھاری فوجی بوٹ سے اُسے ٹھوکر ماری۔ غصّہ اور لاچاری سے انور کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔ انور کو اپنی زندگی میں اتنی بڑی ذلّت نہیں اُٹھانی پڑی تھی۔ اتنی لاچاری بھی اُس نے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ وہ اتنا بوکھلا گیا کہ اُس نے اپنے ابّا سے بھی اس واقعے کا ذکر نہیں کیا۔

(۲)

وقت ہر گھاؤ کو بھر دیتا ہے اور بچپن میں ان گنت ایسے حادثے ہوتے رہتے ہیں جو ماضی کی دُکھ بھری یادوں کو بھلائے رکھنے میں مدد دیتے ہیں۔ انور کو دن بھر میں فرصت ہی کہاں ملتی تھی۔ صبح اُٹھتے ہی مولوی صاحب سے قرآن پڑھتا تھا اور اُس کے بعد جلدی سے اُلٹا سیدھا کچھ کھا کر سکول بھاگتا تھا۔ گرمیاں بہت دن ہوئے بیت چکی تھیں اور پھر برسات آگئی تھی۔ اور اب تو برسات بھی ختم ہو کر سردیاں شروع ہو چکی تھیں۔ انور کو سردیوں کا موسم سب سے اچھا لگتا تھا۔ یہ لحاف کا موسم ہوتا تھا جو رات

کے وقت اپنی گرم آغوش میں چھپا لیتا تھا۔ یہ گرم گرم کھچڑی کے اوپر جمے ہوئے گھی کا ڈلہ رکھ کر کھانے کا موسم تھا۔ بالکل ایسے لگتا تھا جیسے ہمالہ پہاڑ کے اوپر برفیلی چوٹی ہو۔ جس کی تصویر اُس نے اپنی جغرافیہ کی کتاب میں دیکھی تھی۔ یہ رس دار گنے "چوسنے" کا موسم تھا۔ اور یہی بیر کھانے کا موسم بھی تھا۔ جو کھانے کے کام بھی آتی تھیں اور ان کی گٹھلیاں سکول کی کھانے کی چھٹی کے دوران کھیلنے کے کام بھی آتی تھیں۔

اپنی عمر کے بچوں کے درمیان انور کو سکول کی زندگی میں بہت مزا آتا تھا، حالانکہ شرمیلی فطرت ہونے کی وجہ سے اُس کے دوست بہت نہیں تھے۔ آج کل اُسے اپنے ابا کے کمرے میں بیٹھ کر وہاں کی بات چیت سُننے کا وقت نہیں ملتا تھا۔ اُسے یہ نہیں معلوم تھا کہ سرکار نے اُس لال مُنہ والے افسر کو سزا دینے سے انکار کر دیا تھا اور ملک میں سیاسی ہیجان برپا ہو گیا تھا۔ سکول میں ماسٹر صاحب نے لڑکوں کو یہ بتایا تھا کہ انگریز سرکار بہت انصاف پرست اور فیاض سرکار ہے اور بچوں کو سکول میں "برٹش راج کی دین" کی ایک لمبی فہرست یاد کرائی جاتی تھی ـــــ ریلیں، سڑکیں، سکول، ڈاک تار وغیرہ۔ انور کے دماغ میں جلیانوالہ باغ کا منظر ان ساری چیزوں پر ایک بھیانک سوالیہ نشان کا سایہ ڈالتا رہتا تھا۔ نہ جانے کیوں اُسے ایسا لگتا تھا کہ ماسٹر جی (جو ہر وقت بینت پھٹکارتے رہتے تھے اور اکثر لڑکوں کو سزا دینے کے لئے اُسے استعمال بھی کرتے تھے) وہ نہ اُس کی بات سمجھیں گے نہ اُس کے ساتھ ہمدردی جتائیں گے۔

(۳)

انور کے چاروں طرف کی دنیا میں اور بھی بہت سی تبدیلیاں ہو رہی تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ اُس کے اور اُس کی بہن کے درمیان فاصلہ بڑھتا جا رہا ہے حالانکہ وہ اب

بھی ایک دوسرے سے بے حد پیار کرتے تھے۔ وہ دونوں سکول جانے لگے تھے لیکن اب انجم کو مولوی صاحب سے قرآن پڑھنے کی اجازت نہیں تھی۔ پھوپی اماں نے اُس کی قرآن کی پڑھائی چھڑانے کی وجہ یہ بتائی تھی کہ انجم اب گیارہ برس کی ہونے کو آئی، اب اُسے پردہ کرنا چاہیئے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اب انجم کبھی کبھار کے علاوہ گھر سے باہر نہیں نکل سکتی تھی اور سو بھی پھوپی اماں کی طرح سر سے پیر تک بُرقع اوڑھے بغیر باہر نہیں جا سکتی تھی۔ بُرقع کے خیال سے ہی انور کا دم گھٹنے لگتا تھا اور اُس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ایک پُوری چھولداری اوڑھ کر عورتیں آخر سانس کیسے لے پاتی ہوں گی۔

ایک دن جب گُلابو بیٹھی انجم کا بُرقع سی رہی تھی اور انجم اپنے پہلے بُرقعے کی خوشی میں اِترا رہی تھی، انور نے اپنی پھوپی سے پوچھا۔ "پھوپی اماں! جب عورتیں باہر نکلتی ہیں تو انہیں بُرقع کیوں پہننا پڑتا ہے؟"

پہلے تو پھوپی اماں انور کے اس دوٹوک سوال کو سُن کر بہت چکرائیں، پھر انہوں نے کسی طرح یہ جواب دیا۔ "بیٹا، عورتوں کو پردہ اِس لئے کرنا پڑتا ہے کہ ہمارے مذہب اسلام میں اس کا حکم دیا گیا ہے۔"

انور کو بھلا اس جواب سے کہاں تسلّی ہوتی۔ اُس نے دوسرا سوال کیا۔ "لیکن ہمارے مذہب میں صرف عورتوں کے لئے ہی پردہ کیوں بتایا گیا ہے، مردوں کے لئے کیوں نہیں؟"

"اِس لئے ... اِس لئے کہ ..." پھوپی اماں نے اٹک اٹک کر جواب دیا۔ "سڑک پر چلنے والے لوگ بہت بُرے ہوتے ہیں اور وہ عورتوں کو بُری نیّت سے گھورتے ہیں۔"

"بُری نیّت؟" یہ انور کے لئے ایک نئی پہیلی تھی۔ یہ زندگی کا کوئی ایسا راز تھا جس کے بارے میں وہ کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ اس نے چاوڑی بازار میں مردوں کو

گھورتے دیکھا تھا۔ کیا وہ بُری نیت سے اُنہیں گھورتے ہیں؟ اُن کی بُری نیت کیا ہوتی ہے؟ شاید کسی عورت کے گہنے چھین لینے کو بُری نیت کہتے ہوں۔

اُس نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔ "پھوپی اماں، اگر آپ بغیر برقع اوڑھے باہر نکلیں تو کیا لوگ آپ کو بھی بُری نیت سے دیکھیں گے؟" اور وہ سمجھ نہ سکا کہ اس کا یہ سوال سُنتے ہی پھوپی اماں کے جُھرّی دار چہرے پر لالی کیوں دَوڑ گئی اور ان کی آواز بھرّا کیوں گئی۔

لیکن انجم شاید پردے میں رہنے کے خیال سے خوش تھی۔ اپنے برقعے کو دیکھتے ہی وہ خوش ہو اُٹھتی تھی اور یہ محسوس کرنے لگتی تھی کہ اب وہ بڑی ہو گئی ہے اور اُس کی بھی کچھ اہمیت ہو گئی ہے۔ یہ بات انور کی سمجھ کے باہر تھی اور اُسے ایسا لگتا تھا کہ شاید انجم پھوپی اماں کو دکھانے کے لئے ہی یہ سب کرتی ہے لیکن انجم میں ایک دوسری تبدیلی بھی آ رہی تھی۔

وہ اپنا بہت سارا وقت پھوپی اماں اور رگّا بو سے کھانا پکانا اور سینا پرونا سیکھنے میں صرف کرنے لگی تھی۔ اور انور کے لئے سب سے بڑی پہیلی تو یہ تھی کہ انجم اب پہلے کی طرح اپنے بھائی سے لڑتی نہیں تھی بلکہ بہت خاموش رہتی تھی اور اُس میں ایک خاص بزرگی آ گئی تھی جو اُس کی عمر کی لڑکی کے لئے عجیب بات تھی۔

(۳)

سکول میں انور کا ایک دوست تھا — گوپال۔ گوپال ایک ٹھیکیدار کا بیٹا تھا۔ اُس کے باپ نے لڑائی کے زمانے میں بہت پیسہ بنایا تھا اور اجمیری گیٹ کے باہر بہت سی بنجر زمین خرید لی تھی۔ سُنا جاتا تھا کہ وہاں لاٹ صاحب کے لئے بہت

بڑی بستی بسائی جانے والی تھی۔ انور کو گوپال پر رشک آتا تھا۔ وہ انگریزی ڈھنگ کے کپڑے پہنتا تھا۔ صاحب لوگوں کی طرح بال بڑھاتا تھا۔ اُس کے پاس ایک فاؤنٹن پن اور سُنہری گھڑی بھی تھی۔ لیکن ہر چیز سے بڑھ کر انور کو گوپال کی سائیکل دیکھ کر رشک ہوتا تھا وہ کالی چمکدار سائیکل چاندی کی طرح چمکتا ہوا اُس کا ہینڈل اور مست دُھن میں ٹن ٹن کرتی ہوئی اُس کی گھنٹی۔ گوپال روز اِسی سائیکل پر چڑھ کر سکول جاتا تھا اور شام کو جب سکول کی چھٹی ہوتی تھی تو نہ جانے کتنے لڑکے سائیکل کے کیریر پر بیٹھنے کے لئے گوپال کی خوشامد کرتے تھے۔ انور اپنی طرف سے کبھی بھی کیریر پر بیٹھنے کے لئے گوپال سے نہ کہتا لیکن ایک دن گوپال نے جو پڑھائی میں ہمیشہ پیچھے رہتا تھا گھر پر کرنے کے لئے دیئے گئے کچھ سوال حل کرنے میں انور کی مدد لی اور اس کے بدلے میں اُسے سائیکل پر بیٹھ کر گھر چلنے کی دعوت دی۔

"پہلے کہاں چلیں؟" گوپال نے گھنٹی کی دُھن پر پیڈل مارتے ہوئے پوچھا۔ انور اپنا پُورا زور لگا کر کیریر سے چپکا ہوا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ کسی وقت بھی گر پڑے گا۔ سائیکل کی گھنٹی لگاتار بج رہی تھی۔

"چلو اسٹیشن چلیں"۔ انور نے تجویز پیش کی۔ اُسے یاد تھا کہ امرتسر جاتے ہوئے اُس نے سٹیشن پر کیسی کیسی انوکھی اور شاندار چیزیں دیکھی تھیں۔

سٹیشن کے پھاٹک پر بے حد بھیڑ تھی اس لئے انہیں سائیکل سے اُتر جانا پڑا۔ دونوں سیر سپاٹے کے لئے نکلے تھے اس لئے سائیکل میں تالا لگا کر حفاظت سے رکھ دینے کے بعد گوپال نے دو پلیٹ فارم ٹکٹ خریدے اور بھیڑ کے ریلے کے ساتھ وہ بھی سٹیشن کے اندر پہنچ گئے۔ سب لوگ تلک نام کے کسی شخص کے بارے میں باتیں

کر رہے تھے، جو بمبئی سے امرتسر جاتے ہوئے دلّی سے گذرنے والا تھا۔ گوپال کو شربت والے کی دُکان پر رکھی ہوئی ہری، لال، پیلی بوتلوں میں زیادہ دلچسپی تھی لیکن انور تلک نام کے اُس شخص کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ امرتسر کا نام سُن کر اُس کی دلچسپی اور بڑھ گئی۔ اُس نے ایک بوڑھے شریف آدمی سے جاکر تلک کے بارے میں پوچھا۔ بوڑھے نے اس متجسّس لڑکے کے سوال کا جواب دینے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں دکھائی اُس نے انور کو بتایا کہ تلک ہندوستان کے بہت بڑے قومی لیڈر ہیں اور اپنے ملک کے لوگوں کے حقوق کے لئے لڑنے کی وجہ سے انہوں نے کئی سال جیل میں بتائے تھے۔ وہ ویسے تو مراٹھا تھے پر انہوں نے ملک کی جو خدمت کی تھی اس کی وجہ سے سارے ملک کے لوگوں کے دلوں پر اُن کا سکّہ جم گیا تھا۔ اب وہ کانگریس کے جلسے میں حصّہ لینے امرتسر جا رہے ہیں۔ اور سب لوگ اُن کے لئے اپنی عقیدت پیش کرنے کے لئے وہاں جمع ہوئے ہیں۔ اتنے میں گاڑی آگئی۔ پورے پلیٹ فارم پر اور گاڑی کے چاروں طرف لوگوں کی ایسی بھیڑ تھی کہ کہیں تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ ہر آدمی اس عظیم لیڈر کو دیکھنے کے لئے بے چین تھا۔ ہزاروں آدمی سٹیشن کے باہر والے برآمدے میں جمع تھے۔ ریلوے کے افسران بھیڑ کو باہر ہی رکھنے کی کوشش میں صرف اُن ہی لوگوں کو اندر جانے دیتے تھے جن کے پاس پلیٹ فارم کا ٹکٹ ہوتا تھا۔ لیکن آخر کار لاچار ہو کر اُنھوں نے پھاٹک کھول دیئے اور لوگ اس طرح اندر گھس پڑے جیسے دریا کا باندھ ٹوٹ گیا ہو۔ اس دھینگا مُشتی میں ایک پھل والے کا ٹھیلہ اُلٹ گیا۔ نہ جانے کتنوں کے پیر کچلے گئے۔ انور کی ترکی ٹوپی گُم ہو گئی اور بھیڑ کے دھکّوں سے وہ دونوں ایک دیوار سے جا لگے۔ بھیڑ نعرے لگا رہی تھی "لوکمانیہ تلک کی جے!" "مہاتما گاندھی

کی جے!" "ہندو مسلم بھائی بھائی!"

سٹیشن سے باہر نکلتے ہوئے انور نے کہا "کیسے کمال کی بات ہے کہ اتنے بہت سے لوگ یہاں تلک کا استقبال کرنے کو جمع ہوئے ہیں جو یہاں سے بہت دُور بمبئی کے رہنے والے ہیں۔ سچ مچ کوئی بہت بڑے آدمی ہوں گے۔"

"ہاں یہ بھی کوئی کانگریسی ہیں" گوپال نے کہا۔ انور کی سمجھ میں نہ آیا کہ گوپال نے یہ لفظ اتنی نفرت سے کیوں کہے تھے "میرے پتا جی ان لوگوں کو پسند نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ لوگ سرکار کا تختہ اُلٹنا چاہتے ہیں اور اگر سرکار ہی نہ ہو گی تو پھر میرے پتا جی کو یہ ٹھیکے کون دے گا؟ آؤ چلیں، ہمیں اس طرح کے لوگوں سے کوئی سروکار نہیں رکھنا چاہیئے۔"

لیکن انور یہ محسوس کرتا تھا کہ اُسے اس طرح کے لوگوں سے بہت سروکار رکھنا ہو گا۔ وہ نہ جانے کونسی طاقت تھی جو بیساختہ اُسے ان لوگوں کی طرف کھینچتی تھی۔ لیکن وہ گوپال کے ساتھ بحث کر کے اپنی اِس نئی دوستی کو بگاڑنا نہیں چاہتا تھا۔

(۵)

جب انور گھر پہنچا تو اُسے رتن کا خط ملا۔ اُس نے بڑی بے صبری سے خط کھول کر اُسے کئی بار پڑھا۔ رتن کے سب ہی خطوں کی طرح یہ خط بھی بہت چھوٹا تھا اور اُس کی اسی جانی پہچانی کھُلی کھُلی لکھائی میں لکھا ہوا تھا جس کی وجہ سے صفحہ پر صرف چھ سات لائنوں سے زیادہ نہیں آتی تھیں۔ رتن بھی انور کی طرح ہی سکول جاتا تھا اور اپنا سارا وقت پڑھائی میں لگاتا تھا۔ اُس نے وظیفہ پانے کی ٹھان لی تھی کیونکہ اس کے بنا اس کی ماں اُسے ہائی سکول میں پڑھنے نہیں بھیج سکتی تھی۔ رتن نے لکھا تھا "کئی مہینے تک سکول کے سب لڑکوں کو زبردستی چلا کر چھ میل دُور چھاؤنی لے جایا جاتا تھا اور وہاں ہم سے

انگریزوں کے جھنڈے کو سلامی دلوائی جاتی تھی۔ ہم لوگوں کے ساتھ کچھ گورے ٹامی بھی رہتے تھے۔ اگر کوئی لڑکا ڈھیل ڈھال کرتا تھا تو اُن میں سے کوئی ٹامی اسے ٹھوکر سے مارتا تھا۔ اب یہ سلسلہ بند ہو گیا ہے لیکن یقین جانو میں اسے بھولوں گا نہیں ——— اور نہ ہی میں اپنے بابا کے قتل کو بھولا ہوں۔" خط کے نیچے لکھا تھا۔ "تمہارا دوست رتن۔" اور اُس کے بعد پھر لکھا تھا۔ "کانگریس کا سالانہ جلسہ یہاں ہونے جارہا ہے۔ لوکمانیہ تلک، گاندھی جی، مولانا محمد علی اور شوکت علی سب ہی لوگ آرہے ہیں۔ یہ لیڈر جتنے دن یہاں رہیں گے اِن کی خدمت کرنے کے لئے میں بھی والنٹیروں میں بھرتی ہو گیا ہوں۔ میں بہت خوش ہوں کہ مجھے اُن کو اتنے نزدیک سے دیکھنے کا موقع ملے گا۔ اپنے اگلے خط میں میں تمہیں اُن کے بارے میں اور بھی بہت سی باتیں لکھوں گا۔"

انور سوچ رہا تھا کہ رتن زیادہ سنجیدہ ہو گیا ہے اور بڑے بڑے جلسوں میں حصّہ لے رہا ہے جب کہ میں بچوں کی طرح گوپال کی چمکدار سائیکل دیکھ کر دل ہی دل میں للچایا کرتا ہوں۔ پر وہ زیادہ دیر اپنے ان خیالوں میں ڈوبا نہ رہ سکا۔ اُس کے ابّا نے، جو پھوپی اماں سے باتیں کر رہے تھے، انور کو بلا کر بتایا کہ اُس کے تایا ابّا امجد علی ——— اکبر علی کے بڑے بھائی ——— کچھ دن کے لئے دلّی آرہے ہیں۔ انور کو یہ جان کر خاص طور پر خوشی ہوئی کہ وہ اپنے ساتھ اپنے بیٹے رؤف کو بھی لا رہے ہیں۔ انور جانتا تھا کہ اُس کے تایا ابّا بڑے رعب داب والے آدمی تھے جن سے سب کی روح فنا ہوتی تھی۔ وہ بچوں کو پاس نہیں پھٹکنے دیتے تھے اور نوکروں کو ہر دم ڈانٹتے پھٹکارتے رہتے تھے وہ گڑگاؤں ضلع میں تحصیلدار تھے اور برسوں سے سرکاری نوکری کرتے کرتے اُن میں ایک اکڑ سی آگئی تھی لیکن انور رؤف سے کبھی نہیں ملا تھا۔ رؤف انور سے کچھ ہی سال

بڑا تھا۔" بھائی صاحب رؤف کو دلّی کی سیر کرانے لا رہے ہیں۔" اکبر علی نے کہا۔ لیکن انور کو اصلی خوشی تو اُن کی اس بات سے ہوئی کہ "تم دونوں سب جگہیں ایک ساتھ دیکھ آنا۔ بھائی صاحب اپنی موٹر میں آئیں گے، اس لئے گھومنے پھرنے میں کوئی دقّت نہیں ہوگی۔"

(۶)

اُونچی سی موٹر کھڑ کھڑ کرتی، ہارن بجاتی ہوئی دلّی دروازے سے شہر سے باہر نکلی۔ دونوں لڑکے سامنے والی سیٹ پر ڈرائیور کے پاس بیٹھے تھے۔ امجد علی اور اکبر علی پیچھے بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ بیچ بیچ میں اُن کی بات چیت کا کچھ حصّہ انور کے کانوں میں بھی پڑ جاتا تھا۔ اُس کے تایا ابا کہہ رہے تھے۔" یہ باغی اور انتشار پسند لوگ ــــ امرتسر میں جنرل ڈائر نے ان لوگوں کے ساتھ جو سلوک کیا وہ بالکل ٹھیک تھا۔ یہ لوگ اسی لائق ہیں۔ اگر میری تحصیل میں اس قسم کا کوئی آدمی میرے ہاتھ لگ تو میں اُسے مزا چکھا دوں گا۔" انور کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر "انتشار پسند" کون ہوتے ہیں؟ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا جمعدار اجیت سنگھ اور نندا اور وہ سارے لوگ جو گولی سے مارے گئے تھے انتشار پسند تھے؟ لیکن جلد ہی اُس کا دھیان سڑک کی بائیں طرف پتھروں کی بنی ہوئی ایک عمارت کے شاندار کھنڈروں کی طرف چلا گیا۔ یہ پُرانا قلعہ تھا۔ اُس کے چاروں طرف ایک اُونچی سی دیوار اور کھائی تھی۔

اکبر علی کو دلّی کی تاریخ اور اس کی یادگاروں کے بارے میں بہت معلومات تھیں۔ اور جب بھی اُنھیں موقع ملتا تھا وہ اپنے بیٹے کو ان چیزوں کے بارے میں بتاتے تھے۔ رؤف پہلی بار دلّی آیا تھا اِس لئے اسے اس کی تاریخ کے بارے میں بہت کم معلومات تھیں۔ اپنے بڑے بھائی پر اپنی معلومات کا رعب جھاڑ کر انور بہت خوش ہو رہا تھا۔

اُس نے رؤف کو بتایا کہ دِلّی ہزاروں برسوں سے ہندوستان کی راجدھانی رہی ہے
کتنے ہی شاہی خاندان یہاں حکومت کر چکے ہیں، سینکڑوں بادشاہ یہاں کے تخت
پر بیٹھ چکے ہیں۔ اِس کا نام ہمیشہ سے دلّی نہیں تھا۔ سب سے پہلے اس کا نام تھا
اندر پرستھا۔ یعنی اندر کا شہر۔ جب مغل بادشاہ شاہجہاں، جس نے آگرہ کا
تاج محل بنوایا تھا، اپنی راجدھانی آگرہ سے یہاں لایا تو اُس نے اُس کا نام شاہجہان
آباد رکھ دیا۔ سات بار دلّی اجڑی اور ہر بار پُرانے کھنڈروں سے ایک نیا شہر
بسایا گیا۔ اِسی لئے ہر طرف اِن پُرانی دِلّیوں کے کھنڈر آج بھی دکھائی دیتے ہیں۔۔۔
محل، مقبرے، رصد گاہ اور سرائیں۔ انور نے یہ بھی بتایا کہ داہنی طرف دُور تک جو خالی
جگہ پڑی ہے وہاں کچھ دن میں ایک نئی دلّی بسائی جائے گی آٹھویں دلّی، انگریزوں
کی دلّی۔ انور جانتا تھا کہ اس میں سے کچھ زمین گوپال کے پتا جی کی تھی۔ وہ وہاں اُن انگریز
افسروں کے لئے بنگلے بنوا لیے تھے جو بڑے لاٹ صاحب کا شہر بن جانے کے بعد
وہاں آکر رہنے لگیں گے۔

ہمایوں کے مقبرے، حضرت نظام الدین کی درگاہ اور صوفی شاعر، موسیقار
اور فلسفی امیر خُسرو کے چھوٹے سے مزار سے ہوتے ہوئے وہ مہرولی گاؤں پہنچے۔
اور وہاں پہنچ کر موٹر رُک گئی۔ اور انور نے رؤف کو آسمان کو چھوتی ہوئی شاندار
قطب مینار کی چوٹی دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ انہیں ایسا لگ رہا تھا کہ
قطب مینار اُن کے اُوپر جُھکتی آ رہی ہے۔۔۔ وہ جھکتی چلی آ رہی تھی، یہاں تک کہ
اُنہیں ایسا لگا کہ وہ کسی بھی لمحے اُن کے سر پہ آ گرے گی۔ رؤف ڈر کے مارے سفید
پڑ گیا۔ لیکن انور نے ایک تجربہ کار آدمی کی طرح اُسے سمجھایا کہ وہ حقیقت میں

رگ نہیں رہی ہے بلکہ آسمان پر چلتے ہوئے بادلوں کی وجہ سے ایسا نظر کا دھوکہ ہوتا ہے۔

لڑکے قطب مینار کے اُوپر چڑھنے کی ضد کرنے لگے اور سب لوگوں نے اندھیری بدبودار چکّردار سیڑھیوں پر چڑھنا شروع کیا۔ اُوپر جیسے جیسے مینار کا گھیرا کم ہوتا گیا ویسے ویسے سیڑھیاں بھی چھوٹی ہوتی گئیں۔ اندھیرے میں چمگادڑ اپنے پر پھڑپھڑاتے ہوئے سامنے سے گذر جاتے تھے۔ رؤف کا جوش ٹھنڈا پڑنے لگا تھا اور وہ واپس جانے کی بات کر رہا تھا۔ لیکن انور جانتا تھا کہ اُوپر پہنچ کر کیسا مزا آئے گا۔ اس لئے وہ اپنے بھائی کو سمجھا رہا تھا کہ منزل کے اتنے پاس پہنچ کر اُسے ہمّت نہیں ہارنا چاہیئے۔

ساری دنیا سے اُوپر۔ مینار کی چوٹی پر پہنچ کر چاروں طرف نظر دوڑانے سے انہیں ایسا لگ رہا تھا کہ اُن کی آنکھوں کے آگے ساتوں دلّیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ جس سڑک سے ہو کر وہ آئے تھے وہ ایک پتلی سی پٹّی کی طرح پیڑوں کے بیچ سے چکّر کاٹتی ہوئی دُور تک چلی گئی تھی۔ اور اِن تمام دِلّیوں سے پرے جمنا بہہ رہی تھی جو اب جاڑے میں گھٹ کر ایک پتلی سی دھارا رہ گئی تھی۔ تیسرے پہر کی ہوا میں کچھ خنکی تھی جو بہت اچھی لگتی تھی۔ انور نے اپنی ٹوپی اُتار دی اور ہوا کے سرد جھونکے اس کی منڈی ہوئی چاند کو گُدگُدانے لگے۔ قطب مینار کی چوٹی پر کھڑے ہو کر اُسے بہت خوشی ہو رہی تھی۔ نیچے زمین پر چلتے ہوئے مرد اور عورتیں چیونٹیوں جیسے دکھائی دے رہے تھے۔ موٹر بالکل کھلونے کی موٹر معلوم ہوتی تھی۔ وہ بہت اونچائی پر کھڑے تھے۔ لیکن کچھ چیزیں اُن سے بھی اُونچی تھیں۔ نیچے سے دیکھنے پر جو بادل مینار کی چوٹی کے چاروں طرف گھیرا بنائے ہوئے دکھائی دیتے تھے وہ اب بھی

بہت دُور اور بہت اُونچائی پر تھے۔ مغربی اُفق پر جیسے جیسے سُورج گہرے کے ایک گہرے سمندر میں ڈُوبتا جا رہا تھا ویسے ویسے ہوا اور ٹھنڈی ہوتی جا رہی تھی۔ ٹھنڈک کی ایک لہر سی اُس کی گردن سے ریڑھ کی ہڈّی کے نیچے تک دوڑ گئی۔ انور کو چھینک آ گئی۔

"اب گھر چلیں، بہت دیر ہو گئی ہے۔" اکبر علی نے کہا اور سب لوگ اُن اندھیری سیڑھیوں سے نیچے اُترنے لگے۔ اُوپر کی ٹھنڈی ہوا میں کھڑے رہنے کے بعد سیڑھیوں کی بدبُو اور گھُٹن کچھ زیادہ ہی معلوم ہونے لگی تھی۔

۵
"دِیا جلے ساری رات....."

(۱)

دیکھنے میں بہت ڈراؤنی تھیں وہ مونچھیں ـــــ بے حد گھنی، کچھ بال سفید ہو چلے تھے اور موم لگا کر اُن کے سِرے اینٹھ کر نُکیلے کر دیئے گئے تھے۔ داڑھی بہت صاف بنی ہوئی تھی مگر بھوؤں کے بال اتنے لمبے اور گھنے تھے کہ ایسا لگتا تھا جیسے آنکھوں کے اُوپر ایک چھپّر پڑا ہو۔ ہاتھوں پر، اُنگلیوں پر یہاں تک کہ کانوں پر بھی گھونگریلے بالوں کے گچھّے تھے۔ لیکن بنا فریم والی عینک کے صاف سُتھرے شیشوں کے پیچھے سے جو آنکھیں چمک رہی تھیں اُن میں رحمدلی تھی اور انور کو مُشفقانہ نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

انور ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے دواخانے میں تھا۔ اکبر علی نے اُسے بتایا تھا کہ ڈاکٹر انصاری دِلّی کے سب سے بڑے ڈاکٹر ہیں۔ اُنہوں نے ولایت کی سب سے

بڑی یونیورسٹیوں میں ڈاکٹری پڑھی تھی اور ولایت کے کئی ہسپتالوں میں کام بھی کرچکے تھے۔

پندرہ دن تک انور حکیم بیدل کا یونانی علاج کرچکا تھا لیکن قطب مینار کی چوٹی پر ایک چھینک سے جو زُکام شروع ہوا تھا وہ ابھی تک ٹھیک نہیں ہوا تھا۔ حقیقت میں اُس نے بڑھتے بڑھتے برونکائٹس کی شکل اختیار کرلی تھی جس کی وجہ سے اُسے رات بھر نیند نہیں آتی تھی اور دن بھر وہ نڈھال رہتا تھا۔ اب وہ اپنے تایا ابّا اور اپنے بھائی رؤف کے ساتھ سیر سپاٹے کے لئے بھی نہیں جاسکتا تھا۔ پھوپی امّاں اُس کے کمرے کی ہر کھڑکی اور ہر دروازہ بند رکھتی تھیں اور حکیم بیدل اُسے ڈھیر جوشاندہ اور دوسری دوائیں پلاتے تھے۔ پر ان تمام علاجوں کے باوجود اُسکی حالت بگڑتی گئی۔ آخر کار اکبر علی نے اُسے ڈاکٹر انصاری کو دکھانے کا فیصلہ کیا جو پاس ہی دریا گنج کے سرے پر رہتے تھے۔ اُن کے بنگلے کے ایک طرف پُرانی دلّی کی فصیل تھی اور دوسری طرف دریائے جمنا۔ انور نے جس وقت سے ڈاکٹر صاحب کے کمرے میں قدم رکھا تھا تب ہی سے اُس کا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔ اُس نے سُن رکھا تھا کہ ڈاکٹر لوگ کیسے کیسے خوفناک آپریشن کر ڈالتے ہیں اور پیٹ چیر دینا یا ہاتھ پیر کاٹ کر الگ کر دینا اُن کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہوتا ہے۔ پھوپی اماں نے اُس کے دل میں ڈاکٹروں کا اور بھی ڈر بٹھا دیا تھا اور اس لئے انور نے اپنے دل میں یہ تصویر بنالی تھی کہ جن ڈاکٹر صاحب کے یہاں اُسے لے جایا جا رہا ہے وہ جلّاد یا قصائی قسم کی کوئی چیز ہوں گے اور وہ خوفناک مونچھیں سچ مچ کسی جلّاد کی ہی لگتی تھیں۔ لیکن انور کو اُن خوفناک مونچھوں کا اُن کی مہربان آنکھوں اور نرم میٹھی آواز سے کوئی تعلق

نہیں دکھائی دیتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب ولایتی ڈھنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تھے پر بول خالص ہندوستانی رہے تھے۔

"کیوں بیٹا، کیا حال ہے؟"۔

انہوں نے صرف اتنا ہی کہا لیکن اُن کی اس ایک بات سے انور کا سارا ڈر دُور ہو گیا اور وہ انہیں اپنی سکول کی پڑھائی اور اپنی امرتسر کی سیر کے بارے میں ساری باتیں بتانے لگا۔ اُس نے انہیں جلیانوالہ باغ کے بارے میں بھی بتایا۔ جلیانوالہ باغ کی فائرنگ کی بات سُنتے ہی ڈاکٹر صاحب کے ماتھے پر بل پڑ گئے، اُنکی آنکھیں کچھ دُھندلی پڑ گئیں۔ اُن میں آنسو چھلک آئے اور اُنہوں نے کاغذ کاٹنے کا چاقو گلابی بلاٹنگ پیپر میں گڑا دیا۔ یہ صاف ظاہر تھا کہ وہ اس موضوع پر زیادہ دیر انور کو باتیں نہیں کرنے دینا چاہتے تھے۔ اس لئے انہوں نے بڑی ہوشیاری سے بات چیت کا رُخ بدل دیا۔ اب وہ کبوتروں، پتنگوں اور ہوائی جہازوں کی بات کر رہے تھے اور جب ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ "انور جانتے ہو جب تم بڑے ہو گے اُس وقت ہوائی جہاز اتنے ہی عام ہو چکے ہوں گے جتنی کہ آج کل ریل گاڑیاں"۔ تو انور کی آنکھیں حیرت کے مارے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

(۲)

ڈاکٹر صاحب سے باتیں کرتے ہوئے انور کو نہ جھجک ہو رہی تھی، نہ ڈر ہی لگ رہا تھا۔ اچانک اُسے یہ محسوس کر کے تعجب ہوا کہ اُس کی بیماری بالکل غائب ہو گئی ہے۔ اُس کا گلا اب نہیں دُکھ رہا تھا۔ اُسے بُخار بھی نہیں لگ رہا تھا۔ اور حالانکہ چاروں طرف کی کھڑکیاں کُھلی ہوئی تھیں پھر بھی جب سے وہ کمرے میں آیا تھا اُسے

نہ چھینک آئی تھی نہ کھانسی۔ یہ ڈاکٹر صاحب تو سچ مچ جادوگر تھے۔ وہ انور سے اِس طرح باتیں کر رہے تھے جیسے وہ بیمار ہے ہی نہیں ——— اور حقیقت میں وہ بیمار تھا ہی نہیں۔ ڈاکٹر انصاری انور سے ریل گاڑیوں موٹروں اور دُوسری ایسی چیزوں کے بارے میں باتیں کر رہے تھے جن میں بچّوں کو دلچسپی ہو سکتی ہے۔ اِس بات چیت کے دَوران ہی انہوں نے انور سے ایک کوچ پر لیٹ جانے کو کہا۔ اور ایک تجربہ کار ڈاکٹر کی طرح بڑے غور سے اُس کی جانچ کی ——— اُس کی نبض دیکھی آلہ لگا کر اُس کا سینہ دیکھا اور انگلیوں سے اُس کا پیٹ ٹھونک پیٹ کر دیکھا۔ اُن کی لمبی لمبی پتلی اُنگلیاں اتنی نرم اور نازک تھیں کہ انور کو یقین ہو گیا کہ ان انگلیوں سے کبھی کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ اور وہ اِس بات پر تعجب کرنے لگا کہ ڈاکٹر انصاری وہ خوفناک آپریشن کیسے کرتے ہوں گے جن کے بارے میں اُس نے سُن رکھا تھا۔

ڈاکٹر انصاری نے انور کو اُٹھا کر کھڑا کر دیا اور اُس کا کندھا تھپکتے ہوئے بولے "بیٹا، تمہیں کوئی بیماری نہیں ہے۔ لیکن میں اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ تمہارے جیسے سمجھدار لڑکے سکول میں اپنا وقت خراب کریں۔ تمہاری تو ابھی کھلے میدانوں اور باغوں میں دوڑنے بھاگنے کی عُمر ہے۔ تمہیں تو دیہات کی کُھلی ہوا میں سیر کرنا چاہیئے۔" انور کو اُن کے یہ الفاظ ایسے لگے جیسے کوئی بڑی ممتا سے اپنے ملائم ہاتھوں سے اُسے تھپک رہا ہو۔ پھر ڈاکٹر صاحب انور کے ابا سے مخاطب ہو کر بولے "۔اکبر صاحب کیا آپ اپنے بیٹے کو کچھ دن کے لئے شہر کے شور غل سے دُور کسی گاؤں میں نہیں بھیج سکتے؟"۔ اکبر علی ڈاکٹر انصاری سے اچھی طرح واقف تھے۔ انہوں نے ڈاکٹر صاحب کو

یقین دلایا کہ اس میں کوئی دِقّت نہیں ہوگی۔ انور کچھ دن کے لئے جاکر اپنے تایا ابّا کے ساتھ رہ سکتا ہے جو اُس وقت گڑگاؤں میں تحصیلدار تھے اور اُن کے ساتھ ہی اُن کی تحصیل کے گاؤں کے دَورے پر جا سکتا ہے۔

وہ لوگ اُٹھ کر جانے ہی والے تھے کہ انور نے دو لمبے چوڑے ڈیل ڈول کے داڑھی والے بزرگوں کو اس چھوٹے سے کمرے میں داخل ہوتے دیکھا۔ وہ دونوں عرب لوگوں کی طرح ڈھیلے ڈھالے لبادے پہنے تھے اور ایسا لگتا تھا کہ اُن دونوں سے کمرہ بالکل بھر گیا تھا۔ انور اُن کی عجیب چال ڈھال کو دیکھ کر اور اُن کی گونجتی ہوئی آوازوں کو سُن کر کچھ ڈر سا گیا۔ ڈیل ڈول تو دونوں ہی بزرگوں کا لمبا چوڑا تھا پر اُن میں سے ایک دوسرے کے مقابلے میں زیادہ تگڑے تھے اور جب بولتے تھے تو ایسا لگتا تھا کہ بادل گرج رہے ہیں۔ ایک بولے "انصاری، ابھی تو ہم لوگ باہر جا رہے ہیں۔ تیسرے پہر تم سے ملاقات ہوگی۔" دوسرے بزرگ نے جن کے ہاتھ میں کچھ کاغذ تھے، ایک کاغذ میز پر رکھتے ہوئے کہا "تم اسے ذرا دیکھ لینا اور شام کو اس کے بارے میں اپنی رائے بتانا۔" پھر دونوں اسی طرح اچانک باہر چلے گئے جیسے وہ اندر آئے تھے اور رحق میں سے انور کو صرف دو ڈھیلے ڈھالے کالے لبادے ہوا میں اُڑتے دکھائی دیئے۔

"جانتے ہو کون تھے؟" ڈاکٹر انصاری نے جاتی ہوئی اُن دونوں ہستیوں کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا اور انور کو اُن سے ناواقف دیکھ کر بتایا کہ وہ محمد علی اور شوکت علی تھے۔ انور کو یکایک یاد آیا کہ اپنے ابّا کی بیٹھک میں ایک بار کسی بحث کے دَوران اُس نے اُن کا نام سُنا تھا۔ یہ دونوں بھائی تحریکِ خلافت کے لیڈر تھے اور ابھی حال ہی میں جیل سے چھوٹ کر آئے تھے۔ انور کو یقین تھا کہ ایسے

رُعب دار آدمیوں سے تو سرکار بھی ڈرتی ہوگی۔

"انور پھر آنا لیکن کھانسی یا زکام کی شکایت لے کر نہ آنا۔" ڈاکٹر انصاری نے انور اور اُس کے ابّا کو وداع کرتے ہوئے کہا۔

(۳)

ایسا لگتا تھا کہ ڈاکٹر انصاری کے بنگلے میں عجیب عجیب لوگ رہتے تھے۔ جس وقت انور اپنے ابّا کے ساتھ لان پار کرکے پھاٹک کی طرف جا رہا تھا اُس نے دیکھا کہ کئی لوگ لان پر دھوپ میں بیٹھے ہوئے ایک آدمی کو دیکھ رہے ہیں۔ انور نے یہ بھی دیکھا کہ پتلی پتلی ٹانگوں والا ایک آدمی موٹے کھدّر کی دھوتی اور کرتا پہنے بیٹھا چرخہ کات رہا ہے۔ اُس نے اپنے سر پر ایک سفید انگوچھا بھی ڈال رکھا تھا جس کی وجہ سے انور کو یہ دھوکہ ہوا کہ شاید کوئی عورت ہے۔ جب دونوں اُس آدمی کے پاس سے ہوکر گُذرے تو چرخہ ایک لمحے کے لئے رُک گیا اور انگوچھے میں سے بڑے بڑے گول شیشوں والی عینک پہنے ہوئے ایک چہرہ دکھائی دیا اور انور کو دیکھ کر دو آنکھیں عینک کے پیچھے مشفقانہ انداز میں مُسکرا دیں۔ انور سٹپٹا گیا اور اُس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ وہ اِس استقبال کا جواب کیسے دے۔ اس لئے وہ بھی جواب میں مسکرا دیا۔ وہ چھوٹا سا گنجا سر پھر انگوچھے میں چھُپ گیا اور چرخا پھر اپنی لے کے ساتھ چلنے لگا۔

جب وہ لوگ وہاں سے کافی آگے بڑھ گئے تو اکبر علی نے بتایا۔ "یہ مہاتما گاندھی تھے۔ گاندھی جی، محمد علی، شوکت علی اور ڈاکٹر انصاری سب سوراج کے لئے مل کر کام کر رہے ہیں۔"

"سوراج کیا ہوتا ہے ابّا؟" انور نے پوچھا۔

"سوراج کا مطلب ہوتا ہے اپنی حکومت۔ ہندوستانیوں کی حکومت بیٹا۔"

انور کو کئی مہینے پہلے کی وہ بات یاد آئی جب اُس کے ابّا اور کا کا رامیشور دیال گاندھی کے بارے میں اور انگریزوں کو مارے بنا اُنھیں یہاں سے نکال دینے کی باتیں کر رہے تھے۔ تو یہ تھا وہ بڑا آدمی جو سپنے میں اُسے اژدھے سے بچانے آیا تھا۔ اُس نے سوچا یہ آدمی دیکھنے میں تو اتنا چھوٹا ہے پر اُسے اژدھے سے ڈر نہیں لگتا۔

"ابّا!"

"ہاں، بیٹا!"

"مہاتما گاندھی بوڑھیوں کی طرح، ہماری گلابو بُوا کی طرح، چرخہ کیوں چلا رہے ہیں؟"

یوں تو اکبر علی ہمیشہ ہی انور کو کوئی بات سمجھا کر بہت خوش ہوتے تھے مگر انور کے اِس سوال کا جواب دے کر اُنھیں ہمیشہ سے زیادہ خوشی ہوئی۔ "اُن کا کہنا ہے کہ ہم ولایتی کپڑا خرید کر کروڑوں روپیہ اپنے ملک سے باہر بھیج دیتے ہیں اِس لئے ہم اپنے دیش کا بنا ہوا کھدّر پہنیں تو وہ روپیہ ہندوستان میں ہی رہیگا اِس کے علاوہ ہمارے دیش میں کروڑوں لوگ بے روزگار ہیں اور کروڑوں لوگ ایسے ہیں جو اپنی کمائی سے اپنی ساری ضرورتیں پوری نہیں کر سکتے۔ غریب کسانوں کو دو فصلوں کے بیچ کئی مہینے خالی بیٹھے رہنا پڑتا ہے۔ اگر ہم سب لوگ کھدّر پہننے لگیں تو اُن کو بھی کچھ اور آمدنی ہو سکتی ہے۔ اُن کا یہ بھی کہنا ہے کہ چرخہ کاتنے سے ہمارے اندر سادگی اور ایمانداری پیدا ہوتی ہے۔"

"ابّا۔"

"ہاں بیٹا۔"

"آپ کو مہاتما گاندھی اچھے لگتے ہیں؟"

"ہاں انور، وہ بہت بڑے آدمی ہیں۔ وہ مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔"

"ابّا"

"ہاں بیٹا"

"مجھے بھی مہاتما گاندھی بہت اچھے لگتے ہیں۔"

(۴)

گڑگاؤں کی خشک اور ٹھنڈی آب و ہوا میں رہ کر انور کی کھانسی بالکل جاتی رہی۔ وہاں وہ کھلی ہوا میں تندرست زندگی بتاتا تھا۔ اُس کے تایا ابّا بہت سخت آدمی تھے اور اِس بات پر زور دیتے تھے کہ تینوں بچّے — انور، رؤف اور رؤف کی نو سال کی بہن بلقیس — بہت صبح اُٹھا کریں۔ اتنی صبح گرم گرم بستروں سے نکلنا بہت بُرا لگتا تھا لیکن ایک بار وہ کُھلے میدانوں میں نکل جاتے اور انہیں ٹھنڈی ہوا میں سانس لینے کا موقع ملتا تو انہیں بہت خوشی ہوتی تھی۔ وہ ایک دوسرے کا پیچھا کرتے۔ رؤف سب سے آگے نکل جاتا کیونکہ وہ سب سے بڑا تھا اور سب سے لمبا بھی۔ اور بلقیس سب سے چھوٹی ہونے کی وجہ سے سب سے پیچھے رہ جاتی تھی۔ اور جب انور اُس سے بہت آگے نکل جاتا تو وہ بہت روتی چلاّتی۔ اُسے روتا دیکھ کر انور رُک جاتا اور جب تک وہ اُس کے برابر نہیں پہنچ جاتی تھی تب تک وہ آگے نہیں بڑھتا تھا اور اگر وہ بہت تھکی ہوتی تھی تو دونوں کھیتوں کے بیچ سے ہو کر آہستہ بہتے ہوئے چشمے کے کنارے بیٹھ جاتے تھے۔

بلقیس انور کو بہت اچھی لگتی تھی۔ وہ چھوٹی اور نازک تھی لیکن اُس میں زندگی
بھر پور تھی۔ اُس کے بال گہرے بھورے رنگ کے تھے جنہیں گوندھ کر ایک چھوٹی سی
چوٹی باندھ دی جاتی تھی اور جب وہ دوڑتی تھی تو یہ چوٹی بہت ہی مضحکہ خیز انداز
سے اُوپر نیچے اُچھلتی رہتی تھی۔ انور کو رؤف بھی بہت اچھا لگتا تھا لیکن چونکہ اُس
کی پرورش بالکل ہی دوسرے ماحول میں ہوئی تھی اس لئے رؤف کی کچھ عادتوں پر
انور کو بہت تعجب ہوتا تھا۔ اکبر علی اپنے بیٹے کو کبھی نوکروں سے بدتمیزی سے بات
بھی نہیں کرنے دیتے تھے۔ ایک بار اُس نے جب "لوا گلابو" کی بجائے صرف "گلابو" کہہ
دیا تھا تو اُس کے ابّا نے سزا کے طور پر اُسے دن بھر کھانا نہیں دیا تھا۔ لیکن رؤف نہ
صرف اپنے نوکروں پر چلاتا تھا بلکہ اُنہیں ایسی ایسی گالیاں بھی دیتا تھا کہ انور تو
سُن کر ہی شرم سے پانی پانی ہو جاتا تھا۔

تحصیلدار امجد علی کے گھر میں نوکروں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ اُن کے ذاتی نوکروں
کے علاوہ کوئی آدھے درجن سرکاری چپراسی ہر وقت رؤف کی خوشامد اور چاپلوسی
کرنے کے لئے موجود رہتے تھے اور وہ بھی اُن پر رُعب جھاڑ کر بہت خوش ہوتا تھا۔
جب وہ صبح ٹہل کر لوٹتے تھے تو انہیں بہت بھوک لگی ہوتی۔ رؤف کی ماں،
جنہیں انور "بڑی اماں" کہتا تھا ناشتہ رکھتی تھیں اور تینوں اُٹھ کر ناشتہ کرتے
تھے۔ بڑی اماں انور پر بہت مہربان رہتی تھیں۔ وہ حد درجے کی کاہل تھیں۔ دن
بھر میں کم سے کم سو پان چبا جاتی ہوں گی کیونکہ گھر کا سارا کام نوکر کرتے تھے اس لئے
انور نے اپنی بڑی اماں کو کوئی کام کرتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ چھوٹی اماں کی طرح نہیں تھیں
جو دن بھر برتن مانجھنے، کھانا پکانے، سلائی کرتے وغیرہ میں پھنسی رہتی تھیں اور انجم کو بھی

گھر کا کام کاج کرنے میں گلابو کا ہاتھ بٹانے پر مجبور کرتی تھیں لیکن انور کے تایا ابّا ٹھہرے سرکاری افسر۔ اُن کے گھر میں بچوں کا سارا کام نوکر کرتے تھے اور انور کو یہ بات عجیب عجیب لگتی۔ اس کی سمجھ سے باہر تھا کہ کوئی دوسرا اُس کا بستر لگائے یا اُس کے جُوتوں پر پالش کرے۔

(۵)

ناشتہ کرکے رؤف سکول چلا جاتا، امجد علی کچہری چلے جاتے، بڑی اماں دوپہر کا کھانا کھانے سے پہلے ایک نیند سو لینے کے لئے لیٹ جاتیں اور بلقیس اپنی گڑیاں نکال کر بیٹھ جاتی تھی۔ انور بھی اپنی کوٹھری میں جا کر اپنے صندوق میں سے اپنا خُفیہ خزانہ نکالتا تھا۔ یہ خزانہ وہ کتابیں تھیں جو اُس کے ابّا نے چلتے وقت اُسے دی تھیں اور کہا تھا "اگر تم اِن سب کو پڑھ لوگے تو تمہاری سکول کی پڑھائی کا جو نقصان ہوگا وہ پُورا ہی نہیں ہو جائے گا بلکہ تمہیں اس سے بھی زیادہ فائدہ پہنچے گا۔"

اکبر علی نے سب کتابوں پر ایک جیسی جلد بنوا دی تھی۔ انور کو یہ موٹی پتلی کتابیں بہت اچھی لگتی تھیں ــــ اُسے اُن پر چڑھی ہوئی لال چمڑے کی جلد اور اُن پر سُنہرے حرفوں میں لکھا ہوا کتاب اور مصنف کا نام بہت ہی پسند تھا۔ اُسے اُن کی صاف سُتھری خوشبو بھی بے حد پسند تھی ــــ تازے کاغذ کی خوشبو، چھاپے خانے کی سیاہی، لئی اور چمڑے کی خوشبو اور وہ ایک نامعلوم خوشبو جو سب ہی کتابوں میں سے آتی ہے۔ اُسے اُنہیں پڑھنے میں بھی بہت مزا آتا کیونکہ اُنہیں پڑھ کر اُسے ایسا لگتا جیسے اُس کی آنکھوں کے سامنے انوکھی اور دلچسپ دنیا کے دروازے کھُلتے جارہے ہیں۔ انور جب بھی کوئی کتاب کھولتا تو اُسے ایسا لگتا کہ وہ کتاب نہیں پڑھ رہا

ہے بلکہ وسیع اَن جانے بڑا عظموں کا سفر کر رہا ہے۔

اُس نے اُن میں سے کئی کتابیں پڑھ ڈالی تھیں اور اُن کو پڑھ کر اُس کے تصوّرات میں ہلچل پیدا ہو اُٹھتی تھی۔ جب اُس نے "چار درویش" پڑھی تو اُسے ایسا لگا کہ ایران کے اُن چار درویشوں کے ساتھ وہ بھی اُن عجیب اور انوکھے تجربوں سے گذر رہا ہے۔ سیدھی سادی زبان میں لکھی ہوئی "حکایاتِ لقمان" سے اُس نے وہ بہت سی عملی معلومات حاصل کی تھیں جو لقمان نے انسانوں اور جانوروں کے بارے میں اپنے ان قصّوں میں بھر دی تھیں۔ شررؔ کی "بہشت بریں" پڑھ کر اُسے ایسا لگا تھا کہ وہ پھر اسا سیلوں کے اُس ظالم لیڈر کے زمانے میں پہنچ گیا ہے جس نے بھولے بھالے لوگوں کو بہکا کر اپنا پیرو بنانے کے لئے اُس زمین پر ایک نقلی جنّت بنائی تھی جہاں حوریں بھی تھیں اور دُودھ اور شہد کی ندّیاں بھی تھیں اور چہچہاتی ہوئی چڑیاں بھی لیکن اُس پر سب سے گہرا اثر "مسدس حالی" کا ہوا تھا۔۔۔ جس جوشیلے رزمیہ میں اسلام کے عروج و زوال کا ذکر پانی پت کے اُسی شاعر نے کیا تھا جس کی قبر پیا انور اور اُس کے ابّا نے عقیدت کے پھول چڑھائے تھے۔ نو برس کا انور شاعری کی باریکیوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا، اس میں جن تاریخی واقعات کی طرف اشارہ تھا اُن سے بھی وہ بالکل ناواقف تھا، پر حالیؔ کی اِس لافانی نظم کے الفاظ میں ایسی دُھن اور ایسی روانی تھی کہ اُن کو پڑھ کر اس کے جذبات میں ایک لہر سی پیدا ہو جاتی تھی اِن بندوں کو پڑھ کر اُسے ویسی ہی خوشی ہوتی جیسی قرآن کی آیتوں کو پڑھتے وقت ہوا کرتی تھی۔ اور اِن بندوں میں زور بھی ویسا ہی تھا۔

ہر بار انور جب اُسے پڑھتا تو اُسے ایسا لگتا کہ شاعر کا مقصد بجا یہ تھا کہ

پڑھنے والوں میں کبھی جوش پیدا ہو، کبھی وہ فخر محسوس کریں، کبھی وہ نا اُمید ہوں اور کبھی شرمندہ۔ لیکن اِن سب چیزوں کے ملنے سے دل میں یہ جذبہ ضرور پیدا ہو جاتا تھا کہ کوئی تبدیلی فوراً ہونا چاہیئے۔ اِن بندوں کو پڑھ کر علم کی شمع سے جہالت کے اندھیرے کو دُور کرنے کا ارادہ ہوتا تھا۔ اور بے شک شاعری کا یہی مقصد تھا۔

(۶)

قدرت کے اصولوں کے مطابق موسم بدلتے رہے۔ تحصیلدار صاحب کے بنگلے میں جو ٹھنڈی ہوا چلتی تھی اُس میں اب وہ برفیلی چُبھن نہیں رہ گئی تھی۔ آس پاس کے کھیتوں پر جو کہرے کے بادل چھائے رہتے تھے وہ دھوپ میں غائب ہو گئے۔ کچھ دن بعد مکئی کے کھیت کٹ گئے، اور گیہوں بونے کے لئے کھیت تیار کئے جانے لگے۔ پھر جون میں سُورج تپنے لگا اور پسینہ پھُوٹنے لگا۔ لُو لگ جانے کے ڈر سے بچّوں کو دوپہر سے شام تک گھر سے باہر نکلنے کے لئے بالکل منع کر دیا گیا۔ اِس لُو میں تو خس کے پردے بھی اتنی جلدی سُوکھ جاتے تھے کہ تحصیلدار امجد علی کے تین نوکروں کو لگاتار اُن پر پانی چھڑکتے رہنا پڑا۔

انور سارا وقت اپنے بھائی بہن کے ساتھ کھیلنے، اپنے ابّا کی بھیجی ہوئی کتابیں پڑھنے اور کبھی کبھی رتن کو خط لکھنے میں صَرف کرتا۔ امرتسر سے اُس کا دوست بھی لگ بھگ ہر ہفتے خط لکھتا اور اس کے خط تحصیلدار صاحب کے ٹھنڈے اور محفوظ ماحول میں حقیقت کے تیز جھونکوں کی طرح آتے تھے۔ اُس کے خطوں سے پتہ لگتا تھا کہ امرتسر میں کانگریس کے جلسے کے موقع پر رتن نے لیڈروں کے کیمپ میں والنٹیر کی حیثیت سے کام کیا تھا اور ایک بار تو گاندھی جی کے لئے پانی بھی لے

گیا تھا۔ رتن سنگھ نے بڑی تفصیل کے ساتھ ان جلسوں اور اُن میں شرکت کرنیوالے لیڈروں کے بارے میں لکھا تھا ـــــ تِلک کے بارے میں' علی برادران کے بارے میں' اور انور کے ڈاکٹر انصاری کے بارے میں ـــــ اور ان سب باتوں کو پڑھ کر انور کو رتن کی خوش قسمتی پر رشک آنے لگا۔

مگر رتن کے دن بہت مصیبت میں کٹ رہے تھے جس کی وجہ سے انور کو اپنی عیش و آرام کی زندگی پر شرم آنے لگی۔ جمعدار اجیت سنگھ کے مرتے ہی اُس کی پنشن بھی بند ہو گئی تھی اور رتن کی بیوہ ماں کو اپنے سارے گہنے گروی رکھ دینے پڑے تھے تاکہ اُس کا بیٹا سکول میں اپنی پڑھائی جاری رکھ سکے ـــــ یہ پیسہ بھی خرچ ہو گیا تھا اور اب وہ دن بھر چرخہ چلا کر اور سوت بیچ کر اپنا پیٹ پالتی تھی۔ رتن نے لکھا تھا ' مہاتما جی نے اگر ہمیں یہ چرخہ نہ دیا ہوتا تو ہم بھوکوں مرنے لگتے اور مجھے شاید پڑھائی چھوڑ کر سٹیشن پر بوجھ ڈھونا پڑتا'۔ بڑی مصیبت میں اُن کے دن کٹتے تھے۔ ایک بار مہینے بھر تک رتن کا کوئی خط نہیں آیا۔ بعد میں اُس کے خط سے پتہ چلا کہ اُس کے پاس پوسٹ کارڈ خریدنے کو بھی پیسے نہیں تھے۔ اُس وقت انور کے صندوق میں دس روپے تھے۔ اُس کے ابا ہر مہینے اسے دو روپے بھیجتے تھے اُسی کو بچا بچا کر اُس نے یہ دس روپے جوڑے تھے۔ وہ چپ چاپ ڈاکخانے گیا اور دس روپے کے ٹکٹ خرید کر ایک لفافے میں رتن کو بھیج دیئے۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ جس کے پاس جتنا ہی کم پیسہ ہوتا ہے اُسے اس طرح کے تحفے قبول کرنے میں اتنی ہی زیادہ ہچکچاہٹ ہوتی ہے۔ رتن نے اپنے اگلے خط کے ساتھ سارے ٹکٹ واپس کر دیئے اور اپنے دوست کا خط پڑھ کر انور کی آنکھوں میں آنسو

آ گئے۔ اس نے اپنے خط میں لکھا تھا "اب کبھی مجھے اس طرح کی کوئی چیز نہ بھیجنا۔ میں جانتا ہوں تم نے دوستی کا حق نبھانے کے لیے ہی ایسا کیا ہوگا۔ پھر بھی مجھے اس سے ٹھیس پہنچی۔ ماں کہتی ہیں کہ خیرات لینے سے اچھا ہے کہ آدمی بھوکوں مر جائے۔"

(۷)

آسمان پر کالے بادل چھانے لگے اور پہلا چھینٹا پڑتے ہی زمین سے گیلی مٹّی کی سوندھی سوندھی مہک آنے لگی۔ سوکھی ہوئی مٹّی نے اسپنج کی طرح سارا پانی جذب کر لیا اور جلد ہی ہر طرف نئی زندگی کی کونپلیں پھوٹنے لگیں۔ گرد گاؤں کا چھوٹا سا گندا قصبہ نہا دھو کر نکھر آیا۔ سڑکوں پر گرد اڑنا بند ہو گئی اور تحصیلدار صاحب کے بنگلے میں جہاں بھی خالی جگہ تھی وہاں گھاس اور ہریالی اُگ آئی تھی۔ بڑی اماں نے نیم کے سایہ دار پیڑ کی سب سے اونچی ڈال پر سوت کی رسّی کا جھولا ڈلوا دیا اور تینوں بچّے لمبے لمبے پینگ لیکر اُس پر جھولنے لگے۔

اسی موسم میں جب نہ بہت گرمی پڑتی تھی نہ بہت سردی تحصیلدار صاحب اپنی تحصیل کے دورے پر جاتے تھے۔ دورے پر جانے کی تیاّریاں زوروں پر جاری تھیں اور بچّے گاؤں کی سیر کے خیال سے بہت خوش تھے۔ رؤف پہلے بھی اپنے ابّا کے ساتھ دورے پر جا چکا تھا۔ اُس نے انور اور بلقیس کو بتایا کہ دورے پر کتنا مزا آتا ہے۔ اُس نے انہیں بتایا کہ "گاؤں میں ابّا کی حیثیت بالکل بادشاہ جیسی ہوتی ہے اور میری شہزادہ جیسی۔ سب لوگ جھک جھک کر ہمیں سلام کرتے ہیں۔" انور پر اس بات کا کوئی خاص اثر نہیں پڑا لیکن اُس نے یہ بات رؤف سے کہی نہیں۔ نوکروں سے کس طرح بات کی جانی چاہیئے، اس سوال کو لیکر اُس کا اور رؤف کا

جھگڑا ہو چکا تھا اور انور نہیں چاہتا تھا کہ اپنے تایا کے یہاں اتنے دن ہنسی خوشی گذار دینے کے بعد اب چلتے وقت وہ اور زیادہ کڑواہٹ نہیں پیدا ہونے دینا چاہتا تھا۔

کچھ ہی دنوں بعد اُسے یہ دیکھنے کا موقع ملا کہ رؤف نے جو بات کہی تھی اُس کا کیا مطلب تھا۔ امجد علی تحصیلدار دَورے پر جاتے تھے تو ایک پُورا قافلہ اُن کے ساتھ ہوتا تھا۔ سب سے آگے وہ خود گھوڑے پر چلتے تھے۔ اُن کے پیچھے ایک تانگے میں "بچّے" اور سب سے پیچھے ایک بیل گاڑی پر خیمے، بستر، چارپائیاں، کرُسیاں اور برتن لدے ہوئے۔ اس شاہی ٹھاٹ سے وہ ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں کا دَورہ کرتے تھے۔ اُنہیں دیکھتے ہی گاؤں والے طاقتور سرکار کے اس نمائندے کو عقیدت پیش کرنے کے لئے پکتے تھے۔ وہ ہاتھ جوڑ کر اُن کا استقبال کرتے تھے۔ اور پھر گاؤں میں سب سے اچھّی جگہ پر خیمہ لگانے، خدمت گاری کرنے، لکڑی کاٹنے اور پانی بھرنے میں تحصیلدار صاحب کے عملے کی مدد کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانا چاہتے تھے۔ خیمہ لگتے ہی تحصیلدار صاحب اپنا حُقّہ لیکر ایک آرام کرُسی پر بیٹھ جاتے تھے اور چیتھڑے پہنے ہوئے میلے کچیلے کسانوں کا تانتا لگ جاتا تھا۔ جن میں سے ہر ایک کوئی نہ کوئی فریاد لیکر اُن کی نظرِ کرم کی بھیک مانگتا ہوا آتا تھا "حُضور اِس سال فصل بہت خراب ہوئی"۔ اور "حضور ہمارے پاس لگان دینے کو پیسہ ہے ہی نہیں"۔ اور "حضور مائی باپ ہیں"۔۔۔۔۔ یہی اُن سب کی فریاد ہوتی تھی۔ رؤف کہتا تھا کہ جب کوئی 'مائی باپ' کہتا تھا تو اُسے بہت ہنسی آتی تھی۔ اس سے یہی پتہ چلتا تھا کہ یہ کِسان کتنے بے وقوف ہیں۔

نور پور بہت ہی چھوٹا گاؤں تھا۔ اُس میں ایک کچے راستے کے دونوں طرف لگ بھگ پچاس جھونپڑیاں پڑی تھیں۔ جب پانی بہت برستا تھا تو یہ راستہ بالکل نالہ بن جاتا تھا۔ چاروں طرف گندا پانی کھڑا رہتا تھا جس پر ہری ہری کائی کی ایک موٹی تہہ جمی رہتی تھی جس میں مچھر پلتے تھے۔ امجد علی نے سب بچوں سے کہہ دیا تھا کہ جب تک وہ نور پور میں رہیں تب تک بنا اُبالا ہوا پانی نہ پئیں۔

تحصیلدار صاحب نے گاؤں کے باہر ایک آم کے باغ میں اپنا خیمہ لگایا تھا اور خیمہ لگتے ہی باغ کا مالک ایک ٹوکری میں پکے ہوئے رس دار آم لیکر حاضر ہو گیا تھا۔ باورچی خانے کی چھولداری سے مسالے دار کھانوں کی خوشبو آرہی تھی جو آموں کی تیز میٹھی میٹھی خوشبو سے بھی زیادہ تھی۔ انور نے اپنے آپ اُس باغ میں ایک سایہ دار جگہ ڈھونڈلی اور اپنی کتاب لیکر وہاں جا بیٹھا۔ وہ اُردو میں "رابن سن کروسو" کا قصہ تھا اور کتاب پڑھتے پڑھتے وہ اپنے تصوّر میں ایک ویران ٹاپو پر پہنچ گیا اور وہاں ریت پر آدمی کے پیروں کے نشان دیکھ کر اُس نے "فرائی ڈے" کو کھوج لیا تھا۔ اُسے اس طرح کے قصے بہت پسند تھے۔ اُنھیں پڑھ کر بہت جوش آتا تھا لیکن اس نے مشکل سے کچھ ہی صفحے پڑھے ہوں گے کہ اُسے کچھ شور سُنائی دیا۔ باورچی کسی پر چلّا رہا تھا اور اُسے گالیاں دے رہا تھا اور وہ آدمی بھی اُس سے جھگڑ رہا تھا۔ اب انور بھاگ کر باورچی خانے میں پہنچا تو اُس نے دیکھا کہ اُس کے تایا کا پہلوان جیسا باورچی یعقوب جس کی بہت بھیانک کالی داڑھی تھی، انور کی ہی عمر کے ایک چھوٹے سے پتلی پتلی ٹانگوں والے لڑکے کو

پیٹ رہا ہے۔

"یعقوب، یعقوب، کیا کر رہے ہو؟ خبردار جو اب مارا۔" انور نے چلّا کر کہا۔ باورچی اپنے مالک کے بھتیجے کا حکم تو نہیں ٹال سکتا تھا لیکن اُسے یقین تھا کہ جب وہ ساری بات انور کو بتائے گا تو اس کی سمجھ میں آجائے گا کہ اُس لڑکے کو بلاوجہ سزا نہیں دی جا رہی ہے۔

یعقوب نے سرکاری افسروں کے سبھی نوکروں کی طرح بہت ہی خوشامد بھرے لہجے میں کہنا شروع کیا۔ "انور میاں، آپ اِس بدمعاش کو نہیں جانتے۔ مجھے تحصیلدار صاحب کے لئے آملیٹ بنانا ہے اور سارے گاؤں میں مجھے اسی کے گھر میں انڈے ملتے ہیں۔ لیکن یہ کسی طرح انڈے دیتا ہی نہیں۔ نہ جانے اُنہیں رکھ کر کیا کرے گا، اُنہیں سینک کر کیا بچّے نکالے گا؟"

انور نے اُس بھوکے ننگے لڑکے کو دیکھا اور اُس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اُن انڈوں کو بیچ کر کچھ پیسے کیوں نہیں بنا لیتا جبکہ ظاہر تھا کہ اُسے پیسوں کی سخت ضرورت ہوگی۔ "کیوں جی، تم اپنے انڈے بیچ کیوں نہیں دیتے؟"۔

یعقوب نے کھیسیں نکال دیں لیکن انور کو اُس کا مطلب اُس وقت سمجھ میں آیا جب اُس لڑکے نے جواب دیا۔ "حضور، میں تو بیچنا چاہتا ہوں لیکن یہ ہمیں پیسہ نہیں دیتا۔ یہ رامو کی بگیا سے سبزی اور بنئے کی دُکان سے گھی بھی مفت لایا ہے۔ میرے اور میری ماں کے پاس صرف چھ مُرغیاں ہیں اور ہم اُن کے انڈے بیچ کر اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ حضور آپ ہمیں چھ انڈوں کے تین آنے دلا دیں تو میں چلا جاؤں۔"

اب سارا معاملہ انور کی سمجھ میں آیا۔ یعقوب زور زبردستی سے سارا سامان

مفت لاتا اور اپنے مالک سے پورے پیسے وصول کرتا تھا۔ اُس نے سوچا کہ ایک بار اس کی شکایت جہاں اپنے تایا سے کر دی تو یہ ساری دھاندلی ختم ہو جائے گی۔

وہ لڑکا آنسو پونچھ کر اب اپنی سسکیاں روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ انور نے اُس سے کہا۔ "تم میرے ساتھ آؤ اور تم بھی آؤ یعقوب۔ میں تایا ابا سے تمہاری شکایت کروں گا۔" باورچی نے خانساماں کو آنکھ مار کر کچھ اشارہ کیا اور انور کے ساتھ ہو لیا۔

تحصیلدار امجد علی کے پاس ہی ایک کرسی پر سفید گل موچھوں والا ایک بوڑھا آدمی بیٹھا اُن سے کچھ باتیں کر رہا تھا۔

وہ بوڑھا اُن سے کہہ رہا تھا۔ تحصیلدار صاحب اب میں آپ کو کیا بتاؤں یہ سؤر کے بچے کسان، اِن کے دماغ ساتویں آسمان پر پہنچ گئے ہیں۔ اِن میں سے کچھ تو ایسے ہیں جو نہ ہماری بات سنتے ہیں نہ سرکاری افسروں کی۔ یہ ہر کام کے لئے مزدوری مانگتے ہیں جیسے اِن کے باپ دادا کو زمیندار کا کام کرنے کی مزدوری ہی تو ملتی تھی۔ اور میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ یہ سب اُس بنیئے کی اولاد گاندھی کا کیا دھرا ہے، اُس نے ہی جھوٹے حقوق کی باتیں کر کر کے اِنکے دماغ بگاڑ دیئے ہیں۔"

تحصیلدار صاحب نے حقہ گڑگڑاتے ہوئے جواب دیا۔ "لیکن آپ فکر نہ کریں ٹھاکر صاحب، سرکار ایسے لوگوں سے نبٹنا اچھی طرح جانتی ہے۔ پانی میں رہ کر کوئی مگرمچھ سے بیر نہیں رکھ سکتا۔

"تایا ابا۔" انور نے اُن کی بات چیت کے بیچ میں اونچی آواز میں کہا۔ "یعقوب اس لڑکے کو انڈوں کے پیسے نہیں دیتا اور اوپر سے اُسے گالیاں دے رہا ہے اور

پیٹ رہا ہے۔"

لیکن امجد علی کو اپنے بھتیجے کی شکایت بالکل سمجھ میں نہیں آئی۔ وہ بولے "کیوں یعقوب کیا ہوا؟ جب وہ انڈے دینے کو تیار ہے تو تم اس لڑکے کو پیٹ کیوں رہے ہو؟"

"لیکن سرکار یہ حرامی تو انکار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ پیسے لیے بنا تو وہ لاٹ صاحب کو بھی انڈے نہیں دے گا۔ سرکار اصل میں اس نے آپ کی بڑی توہین کی ہے۔"

یہ سن کر اس گاؤں کے خاندانی زمیندار ٹھاکر چیتن سنگھ نے معاملہ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ یہ تحصیلدار صاحب پر اپنی دھاک جمانے کا اچھا موقع تھا اور بوڑھے زمیندار صاحب یہ موقع ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہتے تھے۔

"کیوں بے لونڈے، کیا نام ہے تیرا؟"

"میرا نام بھولا ہے ٹھاکر صاحب۔"

"تیرے باپ کا کیا نام ہے؟"

"میرا باپ تو مر چکا ہے، ٹھاکر صاحب۔ پچھلے سال جب ہیضے کی بیماری پھیلی تھی اسی میں مر گیا تھا۔ اس کا نام رامو تھا۔"

"تم جانتے ہو یہ کون صاحب ہیں؟" انہوں نے امجد علی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ بھولا چپ رہا۔ صرف اس نے اپنا سر ہلا دیا۔

"تو انہیں جانتا ہے پھر بھی تو ان کے ناشتے کے لیے چند انڈے دینے سے انکار کرتا ہے؟ جانتا ہے یہ تجھے اس پیڑ سے باندھ کر تیری کھال کھنچوا سکتے ہیں؟۔ خیریت جانو کہ تحصیلدار صاحب بہت رحمدل آدمی ہیں، نہیں تو سرکار کا حکم نہ ماننے کے جرم میں تجھے گرفتار کروا کر جیل میں بند کروا دیتے۔ سمجھا؟" بھولا ڈر کے مارے

پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ "اچھّا اس بار تو میں تجھے معاف کرلئے دیتا ہوں۔ سلام کر تحصیلدار صاحب کو اور بھاگ جا یہاں سے۔"

"سلام تحصیلدار صاحب، سلام ٹھاکر صاحب۔" اور بھولا کھال کھنچوانے کے ڈر سے کانپتا ہوا اپنی پھرتیلی ٹانگوں سے وہاں سے جان بچا کر بھاگا۔ بوڑھے ٹھاکر صاحب نے فخر کے ساتھ امجد علی کی طرف دیکھا اور یعقوب بھی وہاں سے چلا گیا۔ چلتے چلتے اُس نے انور کو اس طرح دیکھا جیسے کہہ رہا ہو۔ "میں تو پہلے ہی سے جانتا تھا کہ یہی ہوگا۔" انور بہت ذلّت محسوس کر رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اُس نے بھولا کی طرفداری کر کے بہت بڑی بیوقوفی کی ہے۔ اب ہر آدمی اُس کا مذاق اُڑائے گا۔ رؤف اور بلقیس بھی اُس پر ہنسیں گے۔ لیکن اُس کا دل کہتا تھا کہ اُس نے ٹھیک کیا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے اور اس خیال سے کہ کہیں کوئی اُسے روتا دیکھ نہ لے اور اُسے شرمندہ نہ ہونا پڑے وہ بھاگ کر آموں کے باغ کے ایک کونے میں جا کر بیٹھ گیا۔ دوپہر کے کھانے کے وقت اُسے بالکل بھوک نہیں لگی۔ وہ جانتا تھا کہ اب زندگی میں کبھی بھی وہ آملیٹ شوق سے نہیں کھا پائے گا۔

(۹)

انور گاؤں کی طرف جا رہا تھا۔ راستے میں اُسے دو کسان جولائی کی تپتی ہوئی دھوپ میں کھیت جوتتے ہوئے دکھائی دیئے۔ اُن کی کالی ننگی پیٹھیں دھوپ میں چمک رہی تھیں۔ خیمے میں سب لوگ دوپہر کا کھانا کھا کر سو رہے تھے لیکن انور کی آنکھوں میں نیند نہیں تھی۔ بھولا کا خوفزدہ چہرہ اُس کا پیچھا کر رہا تھا۔ اُس

سے فریاد کر رہا تھا اور اُس پر الزام بھی لگا رہا تھا۔ اب وہ اُسی بھوت کو ٹھنڈا کرنے جا رہا تھا۔ اُس کی جیب میں لگ بھگ دو روپے کی ریزگاری کھنک رہی تھی جو وہ بھولا کو دینے جا رہا تھا۔ اِس طرح وہ اُن تین آنوں کا بدلہ چکا دینا چاہتا تھا جو یعقوب نے اُسے نہیں دیئے تھے۔ لیکن اُس بیچارے جاہل باورچی کا کیا قصور ہے؟۔ انور نے سوچا۔ اس شرمناک حرکت کی اصل ذمہ داری اُس کے تایا ابا امجد علی پر تھی۔ ایک لمحے کے لئے اُس کے دل میں اپنے تایا ابا کے لئے سخت نفرت پیدا ہوئی اور اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ جلدی سے جلدی گھر واپس چلا جائے گا۔

گاؤں میں گھستے ہی انور نے ایک بہت ہی درد بھرا گیت سُنا۔ ایک جھونپڑی میں کچھ لڑکیاں مل کر ڈھولک پر ایک دُھن گا رہی تھیں جس کی وجہ سے اُس دُھن میں اور درد پیدا ہو گیا تھا۔ انور کو دِلّی کے رئیس زادوں کی شائستہ زبان سننے کی عادت رہی تھی اِس لئے وہ پنجابی کے اِس لوک گیت کے بول تو نہیں سمجھ پایا، پر گانے کی ٹیپ کچھ اس طرح کی تھی ــــ "دیوا بلے ساری رات، میریا ظالما، دیوا بلے ساری رات"۔ دیا ساری رات کیوں جلتا ہے؟ عورت کس کا انتظار کر رہی ہے؟ اگر انور پنجاب کے اِس مشہور لوک گیت سے واقف ہوتا تو اُسے یہ بھی معلوم ہوتا کہ عورت صدیوں سے اپنے عاشق کا انتظار کرتی رہی ہے اور وہ ابھی تک نہیں آیا۔

لیکن انور کے دماغ پر تو بھولا کا آنسوؤں سے بھیگا ہوا چہرہ چھایا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر میں اپنے عاشق کا انتظار کرنے والی بیراگن کا درد بھرا گیت دُور سے آتی ہوئی ایک دُھن کی طرح لگا۔ پھر بھی نہ جانے کیوں اِس گیت کی دُھن اور بول دونوں ہی بھولا کی حالت پر پورے اُترتے تھے۔ آخر عاشق کہاں چلا گیا تھا؟ کیا

زمیندار نے بیگار لینے کے لئے اُسے پکڑ لیا تھا؟ یا تحصیلدار صاحب نے اُسے پیڑ سے باندھ دیا تھا اور اُس کی کھال کھنچوا رہے تھے؟

گاؤں کے کچھ بڑے بوڑھوں کو ایک سایہ دار پیڑ کے نیچے بیٹھ کر آرام کرتے دیکھ کر اُس نے اُن سے پوچھا۔ "رامو کے بیٹے بھولا کا گھر کونسا ہے؟" اُن میں سے ایک داڑھی والے بوڑھے نے ایک جھونپڑی کی طرف اشارہ کر دیا۔ وہ جھونپڑی باقی سب جھونپڑیوں سے نیچی اور زیادہ ٹوٹی پھوٹی دکھائی دیتی تھی۔

اپنی منزل پر پہنچ کر انور کو اندر جاتے شرم آ رہی تھی لیکن جس مقصد کو لیکر وہ نکلا تھا جب تک اُسے پورا نہ کر لے تب تک اُس کے دل کو سکون نہیں ملے گا۔

"بھولا! بھولا!" اُس نے زور سے آواز دی۔ سفید بالوں والی ایک دُبلی پتلی عورت نے دروازہ کھولا۔ وہ بھولا کی ماں تھی اور اسے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے ایک لڑکا اُس کے دروازے پر کھڑا ہے لیکن بھولا نے، جو ایک کونے میں بیٹھا رُوکھی روٹی کھا رہا تھا، انور کو پہچان لیا اور اُسے سلام کرنے کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا۔

"ماں"۔ اُس نے کہا۔ "یہ تحصیلدار صاحب کے بھتیجے ہیں۔ اُنہوں نے ....."

لیکن انور نے اسے جملہ پورا نہیں کرنے دیا۔ اس نے جلدی سے اپنی جیب سے پیسوں کی تھیلی نکالی اور اُسے بھولا کی حیران ماں کے ہاتھوں میں رکھ کر بولا۔ "اسے آپ لے لیجیے۔ بھولا کو سکول بھیج دیجئے گا" اور اتنا کہہ کر وہ وہاں سے بھاگ آیا۔

گاؤں کے وہی بوڑھے جنہیں انور نے آتے وقت دیکھا تھا، بیٹھے اس بات پر غور کر رہے تھے کہ تحصیلدار صاحب کے بھتیجے کے گاؤں میں آنے کے

پیچھے کیا راز ہو سکتا ہے۔ کچھ ہی منٹ بعد اُنہیں یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ وہی لڑکا تیزی سے بھاگا چلا جا رہا ہے جیسے کوئی بھوت اُس کا پیچھا کر رہا ہو۔ شہر کے اِن امیروں کے ڈھنگ بھی نرالے ہوتے ہیں۔

انور نے گاؤں کے باہر ہی نکل کر دم لیا۔ اُسے ڈر تھا کہ کہیں بھولا یا اُس کی ماں پیسے واپس کرنے اُس کے پیچھے نہ آ رہے ہوں۔ کھیتوں کے کنارے پہنچ کر وہ دم لینے کے لئے رُکا اور اطمینان کا سانس لیا۔ پیچھے سے ایک دُھن کے ساتھ ڈھولک کی آواز سُنائی دے رہی تھی اور لڑکیاں مل کر ابھی تک وہی گیت گا رہی تھیں ــــ "دلوا بلے ساری رات۔"

اُس کے سامنے جُتے ہوئے کھیت پھیلے تھے۔ کچھ کھیتوں کو کسان ابھی تک جوت رہے تھے۔ بیچ بیچ میں وہ اپنے بیلوں کی رفتار تیز کرنے کے لئے اُن کی پیٹھ پر ایک چابک جڑ دیتے تھے۔ اور کھیتوں کے اُوپر تھوڑی ہی اُونچائی پر کالے کالے بادل تیر رہے تھے ــــ یہ آنے والے طُوفان کی صاف نشانی تھی۔

کتاب دوسری

طوفان کی آمد آمد

٦

سُسرال!

(۱)

جن دنوں انور اپنے تایا ابّا کے ہاں تھا اُنہی دنوں ایک سیاسی طوفان کی گرج سُنائی دے رہی تھی۔ سارے ملک میں نافرمانی کا ایک عجیب سا جذبہ پھیل گیا تھا۔ ہر طرف بغاوت پھیلی ہوئی تھی اور اس بغاوت کا اظہار اُن حلقوں سے ہو رہا تھا جہاں سے اُس کی کوئی اُمید نہیں تھی۔ جن لوگوں کو سیاست میں کوئی دلچسپی نہیں تھی، جو نرم دل اور امن پسند تھے، جو مطلبی اور دبّو تھے، جنہوں نے زندگی بھر سرکاری افسروں کے تلوے چاٹے تھے اور اُن کی خوشامد کی تھی ـــــ یہ سب لوگ بھی سیاسی تحریک میں کھنچ کر آ گئے تھے۔ دلّی لوٹنے کے کچھ دن بعد انور نے ایک دن اپنے ابّا کی بیٹھک میں سُنا کہ سرکار کی نافرمانی کے جُرم میں سارے ملک میں جو پہلے دو آدمی گرفتار کیے گئے تھے وہ پانی پت کے دو مسلمان تھے۔ پانی پت کے اُسی سوئے ہوئے قصبے کے جہاں وہ پچھلے سال گیا تھا ـــ

اکبر علی کو میر صاحب کے یہ الفاظ یاد آ گئے کہ "کم سے کم پانی پت کے ہم شریف لوگ تو آٹا دال بیچنے والے اس ٹٹ پونجیے بنیئے سے کوسوں دُور رہیں گے"۔ اور ان الفاظ کو یاد کر کے وہ مُسکرا دیئے۔ جب پانی پت میں اتنی زبردست لہر آئی تھی تو باقی ملک میں کیا ہوگا؟

اِس طوفان کے پیچھے جس نے سارے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا، تاریخی مذہبی، سیاسی اور معاشی طاقتیں کام کر رہی تھیں۔ انور کی سمجھ میں یہ تو نہیں آیا تھا کہ یہ سارا جھگڑا کن مسائل کو لے کر ہو رہا تھا، پر اُسے اتنا احساس ضرور تھا کہ سرکار ظُلم کر رہی تھی اور لوگ پریشان ہو کر سرکار کے اس ظلم کی مخالفت کر رہے تھے۔ اُس کے دل میں یہ تصویر جلیانوالہ باغ کے حادثے کی شکل میں چھائی ہوئی تھی جس کو اُس نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اُس کے دل سے یہ بھیانک تصویر کبھی نہیں مِٹ سکتی۔ اِس سیاسی تحریک کی جڑ میں گہری معاشی بے چینی بھی چھُپی ہوئی تھی۔ غربت زدہ کسانوں میں اپنے حقوق کیلئے بیداری پیدا ہو رہی تھی۔ وہ اِس بات کو سمجھتے جا رہے تھے کہ وہ زندگی بھر دُوسروں کی غلامی کرنے اور بھوکوں مرنے کے لئے ہی نہیں پیدا ہوئے ہیں۔ اُن کا مستقبل زیادہ روشن ہو سکتا ہے۔ انور نے گڑگاؤں کے آس پاس کے گاؤں میں کسانوں کی حالت دیکھی تھی، اور وہ اُس کسان کے چھوٹے سے لڑکے بھولا کو نہیں بُھلا سکتا تھا جس نے تحصیلدار صاحب کے ظالم باورچی کو تین انڈے دینے سے انکار کر دیا تھا۔ سارے ملک میں نافرمانی کا جو جذبہ پھیلتا جا رہا تھا، بھولا کا انکار اُسی کی ایک علامت تھی۔

(۲)

انور پھر سکول جانے لگا لیکن ایسی ہلچل کے زمانے میں پڑھائی میں دل لگانے کا کوئی سوال ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ ہر طرف جلوسوں، عام جلسوں، حُب الوطنی کے نغموں

اور نعروں کا دَور دَورہ تھا۔ چاروں طرف ایک نیا لفظ سُنائی دیتا تھا "بائیکاٹ"۔ ہر چیز کا بائیکاٹ کیا جارہا تھا۔ سرکاری نوکریوں کا عدالتوں کا سکولوں اور کالجوں کا اور ولائتی کپڑے کا۔ روز سرِ بازار ولایتی ہیٹوں اور سُوٹوں کے ڈھیر جلائے جاتے تھے اور بڑے بڑے فیشن والے لوگ بھی فخر کے ساتھ کھدر کے کپڑے پہننے لگے تھے۔ ایک دن جب انور نے ڈاکٹر انصاری کو دریا گنج میں اپنی موٹر پر جاتے دیکھا تو وہ اُنہیں آسانی سے پہچان بھی نہ سکا۔ اُن کا ٹھاٹ دار ولایتی سُوٹ اب اُن کے جسم پر نہیں تھا۔ اُس کی بجائے وہ کھدّر کا لمبا سا کرتہ اور پاجامہ پہنے ہوئے تھے۔ اُن کی مونچھیں اب بھی ڈراؤنی لگتی تھیں لیکن اُن کی مسکراہٹ میں پہلے کی طرح ہی مٹھاس تھی۔ انور کو اِس بات کی بڑی خوشی ہوئی کہ ڈاکٹر صاحب اُسے بھُولے نہیں تھے۔ اُسے دیکھتے ہی انہوں نے اپنی موٹر روکی اور اُس کی صحت کے بارے میں پوچھنے لگے۔

بہت ہی جوشیلے اور نہ بھُولنے والے دن تھے۔ اِس سے پہلے شاید ہی کبھی ہندوؤں اور مسلمانوں نے اتنے کھُلے طور پر اور اتنے جوش کے ساتھ آپس میں بھائی چارہ دکھایا ہوگا۔ جلوسوں میں ہندو اور مسلمان مل کر "اللہ اکبر" اور "وندے ماترم" کے نعرے لگاتے تھے۔ اپنی دوستی کا ثبوت دینے کے لئے وہ ایک دوسرے کے ہاتھ سے پانی پیتے تھے اور ہندو لیڈروں کو جُمعہ کی نماز کے بعد مسلمانوں کے سامنے تقریر کرنے کے لئے جامع مسجد میں بُلایا جاتا تھا۔

روز سڑکوں پر نئے نئے گیت سُنائی دیتے تھے۔ جوشیلے گیت، جن سے ملک کے نوجوانوں میں سیاسی بیداری جاگ اُٹھی تھی۔ کراچی میں علی برادران گرفتار کر لیے گئے تھے اور اُن کی بوڑھی ماں مہاتما گاندھی کے ساتھ تحریک میں شامل ہوگئی تھیں۔ جیسے

جیسے وقت گذرتا گیا ددجنوں نئے گیت فضا میں گونجتے گئے انور نے بھی بلا کسی مشکل کے اُن میں سے کچھ گیت سیکھ لئے تھے

کہہ رہے ہیں کراچی کے قیدی

ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو

بولی امّاں محمّد علی کی ____

جان بیٹا خلافت پہ دیدو

کچھ گیت ایسے بھی تھے جن میں انگریزوں کا مذاق اُڑایا گیا تھا جیسے ____

بول گئی مائی لارڈ ککڑوکوں

جب کبھی کوئی انگریز اکیلا جاتا ہوا دکھائی دے جاتا تو لڑکے مُرغے کی بولی کی نقل کرتے اور ہوا میں ککڑوکوں کی آواز گونج اٹھتی جس کی وجہ سے اپنی اکڑ میں پھولے ہوئے صاحب بہادر کو بڑی اُلجھن ہوتی تھی۔ انور فطرتاً ڈرپوک تھا اِس لئے وہ کھلے عام اپنی نفرت کا اظہار کرتے میں ہچکچاتا تھا لیکن عدول حُکمی کا جو جذبہ چاروں طرف پھیلا ہوا تھا اُس کا اثر اُس پر بھی ہوا تھا اور ایک دن سکول سے لوٹتے وقت اُسے چاندنی چوک میں ایک انگریز سپاہی اکیلا جاتا ہوا دکھائی دیا۔ اُس سے نہ رہا گیا اور اُس نے چلّا کر کہا "بول گئی مائی لارڈ ککڑوکوں"۔ سپاہی نے مُڑ کر دیکھا کہ اُس کو یہ گالی کس نے دی تھی۔ انور نے جب اُس کا غُصّے سے لال چہرہ دیکھا تو اس سے پہلے کہ انگریز حکمرانوں کا غُصّے میں بپھرا ہوا نمائندہ اُس کا پیچھا کرتا ____ وہ وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا لیکن انور کے دل میں اُس انگریز کا ڈر سما گیا تھا۔ اس لئے وہ پوری تیزی سے بھاگا چلا جارہا تھا۔ اُس کے دماغ میں جلیانوالہ باغ کا وہ خوفناک نظارہ گھوم رہا تھا۔ ___ لال مُنہ

والے سپاہی اُس کی طرف بندوقیں تانے قطار باندھے چلے آرہے تھے اور اس رات کو اُن سپاہیوں نے خواب میں بھی اُس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔

(۳)

انور ایک ایسے دَور سے گذر رہا تھا جب ہر طرف اُتھل پُتھل ہو رہی تھی لیکن ابھی تک یہ اُس کے لئے صرف ایک دلچسپ اور جوشیلا ڈرامہ ہی تھا۔ اُس کی ذاتی زندگی پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑا تھا۔ وہ کنارے پر کھڑا ہوا طوفانی لہروں سے جدّوجہد کرتے والوں کا تماشہ دیکھ رہا تھا۔

امرتسر سے خط آیا تھا۔ رتن کی ماں نے لکھا تھا کہ رتن گرفتار کر لیا گیا ہے اور ایک غیر قانونی جلوس میں شامل ہونے کے جُرم میں اُسے سال بھر کی قید کی سزا دی گئی ہے۔ انور روز سارے ملک میں گرفتاریوں کی خبریں پڑھتا اور سُنتا آیا تھا۔ اُن میں بڑے بڑے لیڈر بھی تھے۔ پر یہ خبر پاکر کہ اُس کا دوست جیل میں ہے، اُسے صدمہ سا پہنچا۔ درمیانہ طبقے کے رواجوں میں جکڑے ہوئے ماحول میں پلنے کی وجہ سے انور جیل خانے کو ایک بُری جگہ سمجھتا تھا جہاں چور ڈاکو اور بدمعاش لوگ رکھّے جاتے تھے لیکن اب حالت بدل گئی تھی اور جیل میں سزا کاٹنا بڑی عزّت کی بات سمجھی جانے لگی تھی۔ دیش بھر میں ہزاروں لوگ جیل جا رہے تھے۔ اخباروں میں اتنی جگہ نہیں تھی کہ اُن سب کا صرف نام بھی چھاپ سکیں۔ کچھ دن بعد اُس کے پاس امرتسر ڈسٹرکٹ جیل سے رتن کا خط آیا۔

"میرے پیارے دوست انور تمہیں یہ جان کر خوشی ہوگی کہ میں یہاں آجکل اپنی سسرال میں ہوں ..."

سسرال! رتن نے جیل کو سسرال کہا تھا اور پھر جیل کی زندگی کا ذکر کیا تھا۔ وہاں وہ بہت خوش معلوم ہوتا تھا۔ اُس کے ساتھ کانگریس اور خلافت کے بہت سے رضاکار وہاں تھے۔ رتن نے بڑے فخر سے لکھا تھا ـــــ "میں یہاں سب سے چھوٹا ہوں اور سب لوگ میرا بے حد خیال رکھتے ہیں۔ میرا سال بھر کی سکول کی پڑھائی کا تو ہرج ہوگا پر یہاں بہت سے عالم لوگ ہیں جو مجھے ہر وقت کچھ نہ کچھ سکھانے کو تیار رہتے ہیں ـــــ مجھے یقین ہے کہ یہاں سکول کے مقابلے میں زیادہ کام کی باتیں سیکھوں گا۔" ظاہر ہے کہ رتن ذہنی طور پر انور سے بہت آگے نکل گیا تھا۔ انور کا دماغ تو ابھی تک بچوں جیسا ہی تھا۔

سسرال! جیل ہندوستان کے لاکھوں لوگوں کے لئے سسرال بن گیا تھا۔ جب بھی کوئی گرفتار کیا جاتا تھا تو اُس کے دوست اور ساتھی اُسے ہار پہناتے تھے، اُس پر پھولوں کی بارش کرتے تھے، اُسے بدھائیاں دیتے تھے، اُس سے دیر تک ہاتھ ملاتے تھے اور گلے مل کر ہنس ہنس کر اُسے اس طرح وداع کرتے تھے جیسے وہ سچ مچ اپنی دُلہن کو لینے جا رہا ہو۔

ایک دن وہ بھی آیا جب اکبر علی نے کاکا رامیشور دیال اور اپنے دوسرے دوستوں کے ساتھ بات چیت کے دوران بالکل ہی اس ڈھنگ سے کہا جیسے وہ بیوپار کے کام سے امرتسر یا کانپور جانے کی بات کہتے تھے۔ "کل میں بھی سسرال جا رہا ہوں۔"

کونے میں بیٹھے ہوئے انور کا دل دھک سے رہ گیا اور اُسے ایسا لگا جیسے کسی نے اُس کے دل میں چھرا اُتار دیا ہو۔ اِس خیال سے کہ اُس کے ابا سال بھر کے لئے یا شاید دو سال کے لئے چلے جائیں گے، انور کو بہت دُکھ ہو رہا تھا لیکن ساتھ ہی یہ اُس کے لئے بڑے فخر کی بھی بات تھی۔ انور جانتا تھا کہ اب وہ اپنا سر اُونچا کر کے چل سکے گا اور اپنے

دوستوں سے کہہ سکے گا "میرے ابا بھی سسرال گئے ہوئے ہیں" اور سب لوگ اُس کی اسی طرح عزت کریں گے جیسے کسی بہادر آدمی کے بیٹے کی عزّت کی جاتی ہے۔

(۴)

دوسرے دن اکبر علی گرفتار کرلئے گئے اور رسمی عدالتی کارروائی کے بعد اُنہیں پندرہ مہینے کی سزا ہوگئی۔

انور کو اس عظیم واقعہ کی ایک ایک بات یاد تھی۔ اُس کے ابّا روز کے مقابلے میں جلدی اُٹھے تھے اور نہا دھو کر انہوں نے دُھلے ہوئے کپڑے پہنے تھے اور پھر اپنی داڑھی پر کنگھا کیا تھا۔ ہر جمعہ کو اُن کا یہی دستور تھا۔ پر آج اُنہوں نے ہر بات کی طرف کچھ زیادہ ہی دھیان دیا تھا۔ انہوں نے نہانے دھونے اور کپڑے بدلنے میں کچھ زیادہ ہی وقت لگایا تھا۔ جب وہ تیار ہوگئے تو اُنہوں نے پھوپی امّاں کو نوٹوں کی ایک گڈّی دے کر کہا "لو یہ رکھو، شاید میں کافی دن تک واپس نہ لوٹ سکوں"۔ پھر اُنہوں نے انجم کو گلے لگا کر اُسے پیار کیا اور انور کی بانہہ پکڑ کر اُسے اپنے ساتھ زنان خانے سے باہر لے گئے۔

دوپہر کے وقت انور اپنے ابّا کے ساتھ جمعہ کی نماز پڑھنے جامع مسجد گیا۔ جامع مسجد کے لال پتھر سورج کی روشنی میں چمک رہے تھے۔ مسجد میں لوگ کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے اور مؤذّن کے اشارے پر ایک کے بعد ایک لوگوں کی نہ جانے کتنی قطاریں کھڑی ہو جاتی تھیں۔ انور اس نظارے سے ہمیشہ بہت لُطف اندوز ہوتا تھا۔ اُسے مذہب کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ نہیں معلوم تھا کہ اُس کے ابّا سچّائی اور نیک اخلاقی پر زور دیتے تھے اور مولوی صاحب جنّت اور جہنّم کی جو باتیں کرتے تھے، اُس سے زیادہ انور کو مذہب کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم تھا۔ ہزاروں لوگوں کو ایک ساتھ

اُٹھتے بیٹھتے اور ایک ساتھ سجدے میں گرتے دیکھ کر دہ دنگ رہ جاتا تھا۔ اُس کے ابّا نے اکثر اُسے بتایا تھا کہ اسلام میں جماعت باندھ کر نماز پڑھنے کا جو طریقہ بتایا گیا ہے اُسکی کی ایک جمہوری بُنیاد ہے۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی جب انور نے چاروں طرف نظر ڈالی تو اُس نے دیکھا کہ سب ہی طبقوں کے لوگ کندھے سے کندھا ملا کر وہاں نماز پڑھ رہے ہیں ___ کلف دار ململ کے کُرتے پہنے ہوئے گورے چِٹّے رئیس، کڑھی ہوئی گول ٹوپیاں پہنے ہوئے چھوٹے موٹے دکاندار، کارخانے والے اور موٹے گاڑھے کے کپڑے پہنے ہوئے کسان یا نوکر۔ سب ہی وہاں موجود تھے۔ جب سارے نمازی ایک ساتھ سجدے میں گرتے تھے اور قرآن کی آیتیں پڑھتے تھے تو انور کے دل میں مذہبی جوش کے مقابلے میں بھائی چارے اور برادری کا ایک عجیب جذبہ پیدا ہوتا تھا۔

(۵)

نماز کے بعد جمع ہوئے لوگوں نے وہاں ایک عام جلسہ کیا اور کئی کھدر پوش ہندو مسجد میں آئے اور انہیں نمازیوں کے مجمع کے سامنے لال پتھّر پر بیٹھنے کی جگہ دی گئی۔ لوگوں نے تقریریں کیں ___ سب سے آخر میں اکبر علی کی تقریر ہوئی اور وہ سب سے اچھّی تقریر تھی۔ انور نے بڑے فخر کے ساتھ اپنے ابّا کو اُٹھ کر منبر پر جاتے دیکھا۔ گھنی کالی داڑھی میں اُن کے چہرے پر ایک عجیب جوش نمایاں تھا۔ اُن کے منبر پر آتے ہی چاروں طرف سے "اللہ اکبر" کے نعرے لگنے لگے۔ اتنے میں ایک کونے سے بھیڑ کو چیرتی ہوئی 'انقلاب زندہ باد' کی آواز سنائی دی اور فوراً بھیڑ نے نعرہ اُٹھا لیا۔ بار بار لوگوں نے ایک آواز سے اِس نعرے کو دُہرایا اور اس گونجتی ہوئی آواز کی لہریں منبر کی طرف بڑھتی رہیں۔ لوگوں کے جوش کے اس اظہار کے بعد اکبر علی نے اپنی تقریر شروع کی۔ انور اُس

آواز سے اچھی طرح واقف تھا۔ اکبر علی کی آواز ضرورت کے مطابق بہت سخت بھی ہو جاتی تھی اور بہت نرم بھی۔ اپنی اس آواز میں بتایا کہ بدیسی حکومت میں کتنے ظلم اور کتنی بے انصافیاں سہنی پڑتی تھیں۔ کس طرح لوگوں کو ذلیل کیا جاتا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ تاریخ میں کتنی ہی بار یورپ کی طاقتوں نے ترکی کے ٹکڑے کر دینے کی کوشش کی تھی۔ اُنہوں نے جلیانوالہ باغ کے قتلِ عام کا ذکر اتنے جوشیلے الفاظ میں کیا کہ کئی سُننے والوں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

اُنہوں نے ہزاروں گرفتاریوں کا ذکر کیا جس میں محمد علی اور شوکت علی بھی شامل تھے اور یہ اعلان کیا کہ اور بھی بہت سے لوگ گرفتار کئے جائیں گے۔ شاید اِس مسجد میں میٹنگ کے بعد کچھ لوگ گرفتار کئے جائیں لیکن ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی کہا کہ لوگ خاموش رہیں اور اپنے آپ کو قابو میں رکھیں۔ انہوں نے کہا "مہاتما گاندھی نے قسم لی ہے کہ ہماری آزادی کی لڑائی عدم تشدّد کی بنیاد پر لڑی جائے گی اور ہم اُنہیں مایوس نہیں کریں گے"۔ جب اُنہوں نے اپنی تقریر ختم کی تو لوگوں نے "نعرہ اللہ اکبر" اور "انقلاب زندہ باد" کے نعرے لگائے۔ اکبر علی کی تقریر کے دَوران انور نے اُن کے ایک ایک لفظ کو بڑے غور سے سُنا بھلے ہی اُس کی سمجھ میں ہر بات نہ آئی ہو۔ وہ خوشی اور فخر کے مارے پھُولا نہیں سما رہا تھا "میرے ابّا سچ مچ کتنے شاندار اور ہوشیار آدمی ہیں"۔

میٹنگ ختم ہوئی اور لوگ مسجد کے تین پھاٹکوں سے باہر نکلنے لگے۔ گھبراہٹ میں انور اپنے ابّا کی اچکن کا دامن پکڑے ہوئے اُن کے ساتھ چپکا رہا۔ اُسے ڈر تھا کہ کہیں وہ اس بھیڑ میں اپنے ابّا سے الگ نہ ہو جائے۔ بھیڑ کے ساتھ وہ بھی مسجد کے مشرقی دروازے سے باہر نکلے۔ اتنے میں پولس کے ایک داروغہ صاحب چھ سات سپاہیوں

کے ساتھ وہاں آ پہنچے اور اکبر علی کے پاس آکر بڑی شرافت سے بولے "اکبر علی صاحب آپ مہربانی کر کے میرے ساتھ کوتوالی چلیے۔"

ہر آدمی جانتا تھا کہ اس کا کیا مطلب ہے۔ انور کو بھی کوتوالی کے اس بلاوے کے بارے میں کسی طرح کا شبہہ نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اُس کے ابّا وہاں گرفتار کر لئے جائینگے نہ جانے کیوں وہ اس بات کے بارے میں نہیں سوچ رہا تھا کہ اس کی اپنی زندگی میں کتنی گڑبڑ پیدا ہوگی بلکہ اُسے اس بات پر تعجب ہو رہا تھا کہ اُس کے ابا کو گرفتار کرنے کے لئے جو پولیس کا افسر آیا تھا وہ بھی ہندوستانی تھا۔ بڑے تعجب کے ساتھ وہ داروغہ صاحب کی خاکی پگڑی کے کلف دار طُرّے کو گھورتا رہا۔ پھر اُس کی نظریں نیچے اُتریں اور اُن کی کالی چمکدار پیٹی اور اتنے ہی چمکدار کالے چمڑے کے کیس میں رکھے ہوئے ریوالور پر جم گئیں۔

"اچھا، تو سسرال سے بُلاوا آ ہی گیا" اکبر علی نے ہنستے ہوئے کہا۔ "چلیے میں تو تیار ہوں۔"

لیکن جو لوگ وہاں جمع تھے اُن کا رویّہ دوسرا ہی تھا۔ انھوں نے چلّا کر کہا "نہیں، یہ نہیں ہوسکتا۔ اِس داروغہ کو شرم نہیں آتی؟ غدّار کہیں کا! اِس طرح کے ہندوستانی تو انگریزوں سے بھی بدتر ہیں۔ اُتار لو اس کی پگڑی۔" انور نے دیکھا کہ داروغہ صاحب کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ اُن کی اینٹھی ہوئی مونچھیں کانپنے لگیں۔ اُن کی رگیں تن گئیں اور اُن کا ہاتھ ریوالور پر پہنچ گیا۔ انور سمجھ گیا کہ کوئی گڑبڑ ہونے والی ہے۔ وہاں ہزاروں کی تعداد میں لوگ جمع تھے اور پولیس والے تھے کل چھ سات۔ اور لوگوں کی آواز میں غصّہ بڑھتا جا رہا تھا۔ "ٹوڈی بچّہ۔ غدّار۔ یہ اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے؟ کہیں کا وائسرائے ہے؟ ——

ہے۔۔ ہے۔۔ ہے۔۔ اور اب۔ واللہ اسے کوئی کون پوچھتا ہے۔" اتنے میں کسی ہمّت والے نے زور کا ایک ہاتھ مارا اور داروغہ صاحب کی پگڑی دھول چاٹنے لگی۔ لوگوں نے بہت غصّے میں آگے بڑھ کر داروغہ صاحب کو گھیر لیا تھا اور وہ بھیڑ میں اِس طرح گھِر گئے تھے کہ اپنا ریوالور بھی نہیں نکال سکتے تھے۔ داروغہ صاحب کی آنکھوں میں خوف تھا۔ انور یہ سوچ کر گھبرا اُٹھا کہ یہ لوگ اُسے مار ڈالیں گے، لیکن اتنی بھیڑ کی غصّے سے بھری ہوئی آوازوں کے اُوپر اکبر علی کی گونجتی ہوئی آواز سُنائی دی "بھائیو، یہ مت بھُولئے کہ ہم نے عدم تشدّد کی قسم کھائی ہے۔" اُنہوں نے یہ الفاظ بہت نرمی سے لیکن بہت ہی قطعیت کے ساتھ کہے تھے اور کسی کو اُن کی بات ٹالنے کی ہمّت نہیں تھی۔ بھیڑ پیچھے ہٹنے لگی۔ جو لوگ داروغہ صاحب کے پاس کھڑے تھے وہ پیچھے ہٹنے لگے اور داروغہ صاحب نے اپنی پگڑی پھر اپنے سر پر رکھ لی۔ اُس کا طرّہ ٹیڑھا ہو گیا تھا اور دھول سے بھر گیا تھا۔

"انور، اب میں جا رہا ہوں۔" اُس کے ابّا نے کہا "میرے پیچھے ٹھیک سے رہنا۔ پھوپی امّاں کا کہنا ماننا اور اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو رامیشور کاکا کے پاس چلے جانا۔ اچھا خدا حافظ۔" بس اتنا کہہ کر وہ داروغہ صاحب کے ساتھ چلے گئے۔ نہ اُنہوں نے پیار کا کوئی لفظ کہا، نہ اپنے بیٹے کو گلے لگایا، نہ چلتے وقت پیار ہی کیا، نہ پیٹھ پر تھپتھپایا۔ انور اپنے ابّا کو اچھی طرح جانتا تھا اِس لئے اُسے اس بات کی اُمید ہی نہیں تھی کہ وہ کھُلے عام اپنے جذبات کا اظہار کریں گے، پھر بھی نہ جانے کیوں اُس کا دل اپنے باپ سے پیار کا کوئی لفظ سُننے کے لئے، اُن کے پیار کا کوئی اظہار دیکھنے کے لئے تڑپ اُٹھا تاکہ وداعی کے اِس لمحے کا درد کچھ کم ہو سکے۔ اکبر علی داروغہ صاحب کے ساتھ چل دیئے اور

بھیڑ بھی اُن کے ساتھ ہولی۔ انور لال پتّھر کی اُن سیڑھیوں کے اُوپر اکیلا کھڑا رہ گیا۔ اُن سیڑھیوں کا ہر زینہ پچھلے زینے سے زیادہ چوڑا تھا اور سب سے نیچے سڑک سے ملا ہوا جو زینہ تھا وہ سب سے چوڑا تھا۔ وہ کچھ دیر آرام کرنے کے لئے وہیں سیڑھی پر بیٹھ گیا، اُسے پتّھر کی گرمی بھی محسوس نہیں ہوئی۔ بڑی دیر تک وہ وہاں دھوپ میں بیٹھا رہا اور یہ سوچتا رہا کہ ابّا کے بنا اُس کی زندگی کیسے گذرے گی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا وہ ابّا کے بنا رہ بھی پائے گا کہ نہیں ـــــ پھر اُس کا دھیان پھوپی امّاں اور انجم کی طرف گیا۔ اور وہ سوچنے لگا ابّا کی گرفتاری کی خبر سُن کر اُن پر کیا اثر ہوگا۔ پھر اُسے اپنے ابّا کی یہ بات یاد آئی کہ "اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو رامیشور کاکا کے پاس چلے جانا۔" ہاں وہ کاکا کے پاس دُکان پر جا کر کاکا سے ملے گا۔ جب وہ چلنے کے لئے اُٹھا تو اُسے سامنے لال قلعہ دکھائی دیا جس کے صدر پھاٹک پر یونین جیک لہرا رہا تھا۔ "یہ جھنڈا یہاں کتنے دن تک ابھی اور لہرائے گا؟" انور سیڑھیاں اُترتے ہوئے سوچ رہا تھا۔

سمندر میں ایک قطرہ

(۱)

لالہ رامیشور دیال اُصول کے بڑے پابند تھے۔ اُن کا جسم بہت دُبلا پتلا تھا اور آئے دن کوئی نہ کوئی بیماری اُنہیں لگی ہی رہتی تھی۔ اِس لئے ڈاکٹروں نے اُنہیں رائے دی تھی کہ اگر وہ زندہ رہنا چاہتے ہیں تو انہیں کھانے پینے کے معاملے میں بہت پرہیز کرنا ہوگا۔ کام کرنے آرام کرنے اور سوتے کا وقت مُقرّر کرنا ہوگا۔ ڈاکٹروں نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ جوش و خروش والی باتوں سے دُور رہیں اور اسی لئے اُن کی بیوی اُنہیں میٹنگوں میں جانے نہیں دیتی تھی۔ لاجونتی کا جسم جتنا بھاری تھا اُتنی ہی بھاری اُن کی آواز بھی تھی۔ اُس نے ساری گرہستی کو اور اپنے شوہر کو بھی جذبات کے بندھن میں مضبوطی سے جکڑ رکھا تھا۔ اُس کے کوئی بچہ نہیں ہوا تھا اور اس لئے وہ اپنی ساری مامتا اپنے بیمار شوہر کی دیکھ بھال کرنے اور اُن کا حد سے زیادہ خیال رکھنے میں دکھاتی تھی۔

لیکن ساتھ ہی یہ بھی چاہتی تھی کہ جو وہ کہے وہی کیا جائے جیسے وہ اُن کی بیوی نہیں بلکہ اُن کی ماں ہو۔ وقت پر وہ لالہ جی کو گولیاں کھلاتی، دوا پلاتی، اُن کے گرتے ہوئے بالوں میں تیل ملتی، انہیں کھانا کھلاتی اور آرام کرنے یا دُکان جانے کی اجازت دیتی۔ اور اگر وہ ٹھیک وقت سے واپس نہ لوٹتے تو اُن کی خیریت نہیں تھی۔ تیسرے پہر تین بجے سے پانچ بجے تک اُن کا آرام کرنے کا وقت تھا۔ اور اگر اِس درمیان دُکان سے کوئی ضروری سے ضروری سندیسہ بھی آتا تو وہ اُن تک نہ پہنچاتی۔ اس وقت میں وہ کسی بھی طرح کی دخل اندازی یا خلل برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

وہ اپنے شوہر کو پلنگ پر لیٹ جانے کا حکم تو دے سکتی تھی لیکن اُن کی آنکھوں میں نیند لے آنا اُن کے بس میں نہیں تھا اور عام طور پر رامیشور دیال یہ دو گھنٹے کا وقت عجیب عجیب باتیں سوچنے میں صرف کرتے تھے جن کے بارے میں وہ اپنی بیوی کو کچھ بھی بتانے کی ہمت نہیں کر سکتے تھے۔ وہ پڑے پڑے اپنے بچپن کے بارے میں، اپنے سکول کے دنوں کے بارے میں اور اپنے دوستوں کے بارے میں سوچتے رہتے تھے۔ وہ سوچتے رہتے تھے کہ جوانی میں اُن کے دل میں کیسی کیسی تمنّائیں تھیں، کہاں کہاں کی سیر کرنے کے منصوبے اُن کے دل میں تھے اور زندگی میں کن رنگینیوں کے پروگرام اُنھوں نے بنائے تھے لیکن جسم کے کمزور ہونے کی وجہ سے اور ارادہ اُس سے بھی کمزور ہونے کی وجہ سے وہ گھر بار سے بندھ کر رہ گئے تھے اور شادی ہو جانے کے بعد تو اُن کے لئے فرار کا آخری راستہ بھی بند ہو گیا تھا۔ اب زندگی کی ساری رنگینیاں اُنکے دماغ ہی میں رہ گئی تھیں اور اپنی بیوی کے نادر شاہی غصّے سے بچنے کا اُن کے پاس صرف یہ راستہ رہ گیا تھا کہ وہ دو گھنٹے کے لئے سونے کا بہانہ کر کے لیٹ جاتے تھے۔

آج وہ خاص طور پر اکبر علی کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ اُن کے دوست اور ساجھے دار کو جیل گئے تین مہینے سے زیادہ ہو چکے تھے جس کی وجہ سے رامیشور دیال پر کام کا بوجھ بڑھ گیا تھا۔ انہیں اس کا کوئی دُکھ نہیں تھا کیونکہ اکبر علی سے اُن کو بہت لگاؤ تھا اور قوم کی خاطر جیل جانے کے لئے اُن کی بڑی عزت کرتے تھے۔ وہ دل ہی دل میں سوچ رہے تھے کہ کاش وہ بھی اکبر علی کے ساتھ جیل میں ہوتے اور اُن کے ساتھ اُن دلچسپ بحثوں میں حصّہ لیتے جن میں اُنہیں بہت مزا آتا تھا اور جو اُن کے دوست کی گرفتاری کے بعد ختم ہو گئی تھیں۔

وہ جیل میں اکبر علی سے جا کر ملنے کی بھی سوچ رہے تھے۔ پر ساتھ ہی اُنہیں اس بات کی بھی فکر تھی کہ اُن کی بیوی کو اس کا پتہ نہ چلنے پائے کیونکہ اُن کی بیوی اکبر علی کو بالکل پسند نہیں کرتی تھیں اور ہمیشہ بڑی نفرت سے اُنہیں "وہ تمہارے مسلمان دوست" کہتی تھیں اور یہ بات اُن کے گلے سے نیچے نہیں اُترتی تھی کہ اُن کے شوہر کی ایک دوسرے مذہب کے آدمی کے ساتھ اتنی گہری دوستی ہو۔ لیکن وہ جانتی تھیں کہ اب اتنی پُرانی دوستی کو توڑنا ناممکن تھا اور اس لئے اُنہوں نے اپنے دل کو سمجھا لیا تھا۔

(۲)

پاس والے کمرے میں کچھ آوازیں سُن کر رامیشور دیال کا دھیان ٹوٹ گیا۔ لاجونتی کسی سے باتیں کر رہی تھی۔ یکایک دُوسری آواز کو پہچان کر اُن کا دل خوشی سے اُچھل پڑا۔

"میں نے تم سے کہہ دیا ہے کہ لالہ جی سو رہے ہیں اور میں اُن کو جگا نہیں سکتی۔" لالہ جی نے اپنی بیوی کو کہتے سُنا "اگر تمہیں ملنا ہی ہے تو کل دُکان پر مل لینا۔"

"لیکن کاکی میں اکبر علی صاحب کا بیٹا انور ہوں۔ میرے ابّا نے کہا تھا کہ اگر کوئی ضرورت پڑے تو کاکا سے مل لینا۔ صبح مجھے سکول جانا ہوتا ہے اس لئے اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو کاکا کے اُٹھنے تک میں یہاں انتظار کر لوں گا۔" انور کی آواز میں بڑی انکساری اور نرمی تھی لیکن للائن پر اُس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔

"نہیں نہیں، تم کسی اور وقت اُن سے مل لینا۔ معلوم نہیں کتنی دیر میں اُٹھیں گے۔"

"اچھی بات ہے کاکی۔ کاکا سے اتنا کہہ دیجئے گا کہ انور آیا تھا۔" انور کی آواز میں بڑی ناامیدی تھی۔ وہ مایوس ہو کر واپس جا رہا تھا۔

"انور، انور! اندر آجاؤ! میں جاگ رہا ہوں۔" اُنہوں نے چلّا کر کہا اور انور بھاگ کر کمرے میں پہنچ گیا۔ اُس کا چہرہ خوشی سے کھِلا ہوا تھا۔ لاجونتی بھی جھنجھلائی ہوئی اُس کے پیچھے پیچھے آئیں اور اُنہوں نے تیسرے پہر کا آرام کرنے کا اصول توڑنے کے لئے اپنے شوہر کو گھور کر دیکھا اور پھر جھلّا کر پیر پٹکتی ہوئی کمرے کے باہر چلی گئیں۔

"کہو بیٹا کیسے ہو؟" رامیشور کاکا نے بڑے پیار سے انور کو گلے لگا کر کہا۔ وہ انور کو ہمیشہ "بیٹا" کہتے تھے اور حالانکہ اس میں کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی کہ باپ کے دوست باپ جیسا ہی سلوک کریں پر انور کو اس سے ہمیشہ اُلجھن ہوتی تھی۔ اُس کے ابّا اپنی محبّت کو اتنا کم ظاہر کرتے تھے کہ اس طرح کے لاڈ پیار سے انور کو کچھ شرم بھی آتی تھی اور وہ کچھ جھنجھلا بھی جاتا تھا۔

"تو بیٹا بتاؤ کس کام سے آنا ہوا؟" انجم اور پھوپی امّاں اور خود انور کی صحت اور اس کی سکول کی پڑھائی میں ساری پوچھ تاچھ کرنے کے بعد اُنہوں نے پوچھا۔

"کاکا، جیل سے خط آیا ہے۔" انور نے بڑے جوش سے کہا۔ "اُنہوں نے لکھا

ہے کہ میں آپ کے ساتھ اُن سے ملنے آسکتا ہوں اور یہ کہ ہم دونوں کو سرکار سے اُن سے ملنے کی اجازت مل سکتی ہے۔ کاکا آپ ڈپٹی کمشنر کو خط لکھ دیجیے اور ہم لوگ جلدی اُن سے ملنے چلیں۔ تین مہینے سے میں نے ابّا کو نہیں دیکھا ہے۔ کیا ہم لوگ کل چل سکتے ہیں؟"

رامیشور دیال لڑکے کی بے صبری پر بڑے پیار سے مسکرا دیئے۔ "ہاں ہاں انور، تمہارے ابّا سے ملنے ضرور چلیں گے لیکن ملاقات کی اجازت لینے میں ایک دن سے زیادہ کا وقت لگ جائے گا لیکن تم فکر نہ کرو جب سب کچھ طے ہو جائے گا تو میں تمہیں خبر کر دوں گا۔"

انور کو یہ جان کر بہت تسلّی ہوئی کہ رامیشور کاکا ابّا سے ملاقات کا انتظام کرنے کی پوری کوشش کریں گے۔ وہ چلنے کے لئے اُٹھا پر اُس کے کاکا نے اُسے روک لیا۔

"ذرا رُکو انور، یہ لو۔" اور اتنا کہہ کر انہوں نے تکیئے کے نیچے سے ایک رُوپیہ نکال کر اُس کی طرف بڑھا دیا۔ انور کے ابّا اُسے خرچ کرنے کے لئے روز صرف ایک آنہ دیتے تھے۔ چاندی کا چمکتا ہوا رُوپیہ دیکھ کر انور بہت خوش ہوا لیکن اُس کی پرورش بہت سختی کے ماحول میں ہوئی تھی اور اُسے اس طرح کے انعام لینے سے منع کیا گیا تھا۔

"ایک روپیہ کاکا!" اُس نے تعجب سے کہا۔ "میں اس کا کیا کروں گا؟"

"لے لو بیٹا۔" اور یہ کہہ کر رامیشور دیال نے رُوپیہ اُس کے ہاتھ میں رکھ کر جلدی سے اُسے کمرے کے باہر کر دیا۔

(۳)

جیل کی اُونچی اُونچی دیواریں کسی قلعے کی دیواریں لگتی تھیں۔ لوہے کے بڑے سے پھاٹک میں موٹی موٹی سلاخیں لگی تھیں لیکن انور اور رامیشور دیال کے اندر

آنے کے لئے پھاٹک کی ایک چھوٹی سی کھڑکی کھول دی گئی۔ ایک سنتری کندھے پر سنگین لگی بندوق رکھے اُس برآمدے کے آگے پہرہ دے رہا تھا جس میں جیل کے دفتر کے دروازے کھلتے تھے جس وقت اُنہیں سپرنٹنڈنٹ کے دفتر میں لے جایا جا رہا تھا۔ اُس وقت انور بہت ڈر رہا تھا۔ کہانیوں میں اُس نے سُنا اور پڑھا تھا کہ لوگوں کو کس طرح تہہ خانوں میں ڈال دیا جاتا ہے اور اُنہیں کیسی کیسی تکلیفیں دی جاتی ہیں۔ اُس وقت اُس کے تصوّر میں وہی تصویریں آ رہی تھیں۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ اس جیل کا سپرنٹنڈنٹ بھی ویسا ہی شیطان ہوگا لیکن وہ تو بہت ہی شریف آدمی نکلا وہ کچھ تھکا ہوا ضرور معلوم پڑتا تھا لیکن اُس نے انور کو دیکھتے ہی مسکرا کر اُسکا استقبال کیا۔ رامیشور کاکا نے اُسے ملاقات کی اجازت دکھائی اور سپرنٹنڈنٹ اُنہیں بغل والے کمرے میں لے گئے۔ جہاں کچھ سیاسی قیدی بیٹھے اپنے رشتے داروں اور دوستوں سے باتیں کر رہے تھے۔ ایک وارڈر کونے میں سٹول پر بیٹھا چُپ چاپ اُنہیں دیکھ رہا تھا۔

"تمہارے ابّا ابھی ایک منٹ میں یہاں آتے ہیں۔" سپرنٹنڈنٹ کے کمرے سے وہ جس دروازے سے نکل کر آئے تھے اُسی کی بغل میں ایک دوسرا دروازہ تھا۔ شاید یہی جیل کے اندر جانے کا دروازہ تھا۔ اُس کمرے میں ایک ہی کھڑکی تھی جس میں سے چاروں طرف سے گھرے ہوئے آنگن میں کچھ قیدی جیل کے موٹے کپڑے پہنے ہوئے کام کرتے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ سروں پر ٹوکریاں رکھے اینٹیں اور گارا اور سیمنٹ ڈھو کر کہیں لے جا رہے تھے۔ شاید جیل کے اندر کوئی عمارت بن رہی تھی۔ انور کو یہ دیکھ کر بڑا ترس آیا کہ اُن میں سے کچھ کے پیروں میں بیڑیاں پڑی

ہوئی ہیں تاکہ وہ بھاگ نہ سکیں۔ رامیشور کا کا نے بتایا کہ یہ بہت خطرناک قیدی ہیں، جنہیں قتل یا ڈاکے کے جرم میں لمبی لمبی سزائیں دی گئی ہیں۔ انور پر پہلا اثر یہ ہوا کہ اُسے اِس بات پر بڑی جھنجھلاہٹ ہوئی کہ اُس کے ابّا کو، جو سب سے زیادہ شریف آدمی تھے، ایسے غنڈوں اور بدمعاشوں کے ساتھ رکھا جائے۔ اُسے یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ آخر لوگ دوسرے لوگوں کو لُوٹتے کیوں ہیں یا اُن کا خُون کیوں کر ڈالتے ہیں۔

وہ اسی مسئلے پر سوچ رہا تھا جس پر بہت پہلے سے اُس سے بڑے بڑے مُفکّر اپنا سر کھپاتے آئے تھے۔ اتنے میں جیل کے اندر جانے والا دروازہ کھلا اور اُس کے ابا کمرے میں داخل ہوئے۔

"ابّا!" انور خوشی کے مارے چلّایا اور اپنے ابّا کے گلے سے لپٹ جانے کے لیے آگے بڑھا۔ اکبر علی نے ہمیشہ کی طرح بڑے خاموش ڈھنگ سے اپنے بیٹے کی پیٹھ تھپتھپائی اور اپنی محبّت کا اِس سے زیادہ کوئی اظہار کئے بنا اُنہوں نے بڑے تپاک سے رامیشور دیال سے ہاتھ ملایا۔ پھر اُنہوں نے دونوں سے اشارے سے کُرسی پر بیٹھ جانے کو کہا اور خود بھی ایک کُرسی لے کر اُن کے پاس بیٹھ گئے۔

دونوں دوست باتیں کر رہے تھے اور انور اپنے ابّا کو دیکھ رہا تھا۔ وہ پہلے سے کچھ دُبلے ہو گئے تھے اور اُن کا چہرہ کچھ پیلا پڑ گیا تھا۔ لیکن وہ ہمیشہ کی طرح ہی ہنس مُکھ تھے اور باری باری سے کبھی وہ اپنے ساجھے دار سے بیوپار کی باتیں کرتے اور کبھی اپنے بیٹے سے گھر کا حال چال پُوچھتے۔ لیکن انور جیل میں ابّا کی زندگی کے بارے میں جاننے کے لئے بے چین تھا۔ اکبر علی اُن لوگوں میں سے نہیں تھے جو اپنی مُصیبتوں کا دُکھڑا روتے اور خاص طور پر اپنے بیٹے کے سامنے۔ اُنہوں نے انور کو بتایا کہ جیل

میں انہیں کسی طرح کی تکلیف نہیں تھی۔ انہوں نے کہا۔ "میں آجکل بہت سی کتابیں پڑھ رہا ہوں جو کاروبار میں پھنسے رہنے کی وجہ سے باہر نہیں پڑھ پا رہا تھا۔ اور میرے ساتھ یہاں بہت اچھے لوگ ہیں۔ اسی جیل میں سیاسی قیدیوں میں وکیل، اور بیرسٹر، بڑے بڑے عالم، پروفیسر، مولوی اور پنڈت تھے اور ان کے بیچ فلسفیانہ، سیاسی، مذہبی اور سماجی مسائل کے بارے میں لمبی چوڑی بحثیں چلتی رہتی تھیں۔ انور کے دل میں اس بات سے بڑی دلچسپی پیدا ہوئی اور اس نے اپنے ابا سے پوچھا، "کیا یہاں لڑکے بھی رہیں ... میرا مطلب ہے میری عمر کے لڑکے؟" اور جب اس کے ابا نے جواب میں "ہاں" کہا تو اس نے اپنے دل میں فوراً فیصلہ کر لیا۔ وہ بھی وہیں آئے گا جہاں اس کے ابا تھے۔

جب ملاقات کا وقت پورا ہو گیا تو سپرنٹنڈنٹ نے ایک بار پھر بڑی نرمی کے ساتھ آکر انہیں اس بات کی اطلاع دی اور انہوں نے ایک دوسرے سے رخصت لی۔ انور نے سپرنٹنڈنٹ صاحب سے ہاتھ ملایا اور رامیشور دیال نے، جو خود نرم دل تھے، سپرنٹنڈنٹ صاحب کا ان کی مہربانی کے لئے تہہ دل سے شکریہ ادا کیا لیکن جب وہ برآمدے سے نکل کر اسی چھوٹی سی کھڑکی کے راستے باہر کی روشنی میں نکلے تو انور کے دل میں یہ یقین پیدا ہو گیا کہ جلد ہی وہ پھر جیل آئے گا لیکن اس بار کسی سے ملنے نہیں بلکہ قیدی بن کر۔

(۴)

وہی ہندوستانی جو ابھی کچھ دن پہلے تک قانون کے پابند اور امن پسند تھے انہیں اچانک نہ جانے کیوں جیل جانے کا شوق پیدا ہو گیا تھا — بیوپاریوں نے

اپنی دُکانیں چھوڑ دیں طالب علموں نے سکولوں اور کالجوں میں اپنی پڑھائی چھوڑ دی، مُلاّؤں اور پروہتوں نے اپنے اپنے مسجد مندر چھوڑ دیئے، عورتیں زنان خانے کی اُونچی اُونچی دیواروں سے باہر نکل آئیں، وکیلوں کو جس قانون کی حفاظت کرنا سکھایا گیا تھا اُسی قانون کو وہ خود توڑنے لگے، بڑے بڑے رائے بہادروں اور خان بہادروں نے اپنے خطاب واپس کر دیئے۔ سرکاری نوکر راج کے دشمنوں سے جا ملے —— اور یہ سب لوگ جا کر جیلوں میں بھر گئے۔ دنیا کی تاریخ میں اِس سے پہلے کبھی اتنے بہت سے لوگ اپنی مرضی سے جیل نہیں گئے تھے۔

جب سے انور جیل میں اپنے ابا سے مل کر آیا تھا اُس وقت سے اُس پر جیل جانے کا بھوت سوار تھا۔ وہ موٹے کھدر کے کپڑے پہننے لگا تھا اور گاندھی ٹوپی لگانے لگا تھا جسے اب بغاوت کی نشانی سمجھا جاتا تھا۔ رات کو جب وہ اپنے کمرے میں اکیلا ہوتا اور گھر کے باقی لوگ سو جاتے تو وہ چپ چاپ اپنا بستر چارپائی پر سے اُتار کر نیچے زمین پر بچھا لیتا تاکہ اُسے فرش پر سونے کی عادت ہو جائے۔ اُس سے کسی نے کہا تھا کہ جیل میں بہت کھردرے کمبل اوڑھنے کے لئے دیئے جاتے ہیں۔ اس لئے وہ بھی ابا کی دُکان سے اپنے لئے ایسا ہی ایک کمبل لے آیا تھا۔ وہ کالا کمبل تھا اور اُس کے رُوئیں بہت سخت تھے اور اُس میں سے ایک عجیب سی بُو آتی تھی۔ لیکن انور نے اُس کی عادت ڈال لینے کی ٹھان لی تھی۔ روز رات کو وہ نرم ریشمی لحاف چھوڑ کر اُسی کمبل کو اوڑھ کر سو جاتا تھا، حالانکہ شروع شروع میں عادت نہ ہونے کی وجہ سے اُسے نیند بالکل نہیں آتی تھی۔ دھیرے دھیرے اُسے اِس کی عادت پڑ گئی اور اپنی اس کامیابی پر وہ دل ہی دل میں بہت خوش بھی ہوا۔ لیکن بہت سویرے ہی اور لوگوں کے جاگنے

سے پہلے وہ اُٹھ جاتا تھا اور بستر پھر چارپائی پر لگا کر کمبل گدّے کے نیچے چھپا دیتا تھا۔ اگر کوئی اُسے یہ تپسّیا کرتے ہوئے دیکھ لیتا تو وہ شرم سے مر جاتا۔

وہ روز سکول جاتا تھا مگر پڑھائی میں اُس کا دل نہیں لگتا تھا۔ اُسے جلوسوں اور گرفتاریوں کی خبروں میں اور کسی نہ کسی لیڈر کی گرفتاری پر آئے دن ہونے والی ہڑتالوں میں زیادہ دلچسپی تھی۔ چوراہوں پر ولایتی کپڑے کی جو ہولی جلائی جاتی تھی وہ اس کے لیے ایک نئی دلچسپی کا سامان تھا۔ سڑک کے بیچوں بیچ ولایتی کپڑوں کی بہت بڑی بڑی ہولیاں جلائی جاتی تھیں اور بے حد قیمتی سوٹ اور شیروانیاں، عورتوں کی جارجٹ کی ساڑیاں اور زری کے بیاہ کے جوڑے آگ کی ان لپٹوں میں جھونک دیئے جاتے تھے۔ لڑکوں کے لیے یہ بھی ایک کھیل تھا اور کچھ لڑکے تو اپنے گھر سے کپڑے چرا کر لے آتے تھے اور اس ہولی میں جلا دیتے تھے۔ اکثر یہ دیکھنے میں آتا تھا کہ کوئی لڑکا آگے آگے کوئی ریشمی کوٹ یا شیروانی لیے بھاگا چلا آرہا ہے اور اُس کے پیچھے پیچھے غصّے میں لال پیلا ہوتا ہوا اُس کا باپ اُسے کوستا اور گالیاں دیتا چلا آرہا ہے اور اِس سے پہلے کہ باپ لڑکے کو روک سکے، وہ کپڑا آگ کی نذر ہو چکتا تھا اور لڑکا بڑی ڈھٹائی سے اپنے باپ کی طرف اس طرح دیکھتا تھا جیسے کہہ رہا ہو کہ اب جو سزا آپ چاہیں دے لیں لیکن قوم پرستی کا جذبہ اتنا زوردار تھا کہ باپ کو سب کے سامنے اپنے بیٹے کو ڈانٹنے کی بھی ہمّت نہیں پڑتی تھی، اُسے ڈر رہتا تھا کہ کہیں لوگ اُسے "غدّار" نہ ٹھہرا دیں۔

انور نے بھی پھوپی امّاں کے ڈر کے مارے کچھ ولایتی کپڑے الگ چھپا کر رکھ چھوڑے تھے اور اُنہیں وہ ایک ایک کر کے لاکر اس آگ میں جھونک دیتا تھا۔

ظاہر ہے کہ پھوپی اماں اس بات کے بالکل خلاف تھیں کہ اچھے اچھے نئے کپڑے اِس طرح جلا دیئے جائیں۔ انور نے ایک چمکدار ریشمی شیروانی، جو پچھلی عید پر اس کے لئے سِلوائی گئی تھی، بچا کر رکھ چھوڑی تھی۔ لیکن جب تحریک نے زور پکڑا اور زیادہ سے زیادہ تعداد میں لیڈر پکڑ کر جیل میں بند کئے جانے لگے اور ڈھیروں ولایتی کپڑا روز جلایا جانے لگا تو انور بھی زیادہ دیر تک اپنے کو قابو میں نہ رکھ سکا۔ وہ جانتا تھا کہ اُس شیروانی کو جلتے دیکھ کر اُسے بڑا دُکھ ہوگا لیکن وطن پرستی کے لئے تو اپنی پیاری سے پیاری چیز کی بھی قربانی دینی پڑتی ہے۔ اگر وہ اپنا جی کڑا کر کے اپنی شیروانی بھی نہیں جلا سکتا تو پھر وہ جیل کیسے جائے گا۔

ایک دن صبح ناشتہ کرنے کے بعد وہ اپنے کمرے میں گیا اور شیروانی نکال کر اُس نے بڑی حسرت بھری نگاہ سے اُسے آخری بار دیکھا اور پھر اُسے ایک کاغذ میں لپیٹ لیا۔

اپنی سکول کی کتابوں کے نیچے ایک بنڈل چھپائے ہوئے وہ چپکے سے گھر سے کھسک رہا تھا کہ اتنے میں اُس نے گلی میں ایک تانگہ آ کر رُکنے کی آواز سُنی اور باہر نکلتے ہی وہ اپنے تایا ابّا امجد علی سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ وہ ابھی ابھی تانگے سے اُترے تھے اور اُن کا چپراسی اُن کا صندوق لئے ہوئے اُن کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔

"سلام تایا ابّا" انور اتنا کہہ کر جلدی سے آگے بڑھا۔

"جیتے رہو بیٹا" تایا ابّا نے اپنی عادت کے مطابق ناک کے سُر میں بڑی بے پروائی اور رُکھائی سے کہا "اتنی جلدی کہاں چل دیئے؟"

"سکول جا رہا ہوں تایا ابّا" انور کسی صورت سے اپنی جان چھُڑا کر وہاں سے

بھاگ نکلنا چاہتا تھا۔

امجد علی کچہری میں برسوں تک مجرموں کو دیکھتے دیکھتے ہر چیز کو شُبہ کی نظر سے دیکھنے کے عادی ہو چکے تھے۔ اُنھوں نے فوراً بھانپ لیا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ انور کسی چیز کو اپنی کتابوں کے نیچے چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"یہ کیا ہے؟" اُنھوں نے پوچھا۔

انور جانتا تھا کہ اُس کے تایا ابّا اُسے کبھی بھی یہ شیروانی ولایتی کپڑوں کو ہولی میں جلانے نہیں دیں گے۔ پھوپی امّاں نے اُسے پہلے ہی بتا رکھا تھا کہ وہ اپنے چھوٹے بھائی سے اس لیے خفا تھے کہ وہ "اُن باغی کانگریسیوں کے ساتھ اپنی اوقات خراب کر رہا ہے اور جیل جا کر اُس نے خاندان کے نام پر دھبّہ لگا دیا ہے"۔ انور جانتا تھا کہ اگر اُنھوں نے دیکھ لیا کہ اِس بنڈل میں کیا ہے تو اُس کا سارا بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔

"کچھ نہیں تایا ابّا، کچھ بھی تو نہیں"۔ اُس نے گھبراہٹ میں اٹک اٹک کر جواب دیا اور وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ اُس کے تایا ابّا چلّا چلّا کر اُسے روک رہے تھے پر اُس نے اس کی طرف کوئی دھیان ہی نہیں دیا۔

(۵)

اُس دن جب انور رات کو گھر لوٹا تو تایا ابّا اُس کا انتظار کر رہے تھے۔ ہر طرف ایک عجیب تناؤ اور خاموشی تھی۔ پھوپی امّاں اور آپا انجم کے چہروں پر اُس نے گہری فکر کے آثار دیکھے۔

"انور"۔ امجد علی کی آواز میں وہ کڑک تھی جس کے آگے پرانے سے پرانے مجرم بھی اُن کی کچہری میں پیش کیے جانے پر تھر تھر کانپنے لگتے تھے۔

"جی تایا ابا" انور نے دبی زبان میں جواب دیا۔

"سارے دن کہاں رہے؟ بولو، بتاؤ" اور جب بے حد غصے میں پوچھے گئے اِس سوال کے جواب میں انور چپ چاپ کھڑا رہا جیسے وہ گونگا ہو گیا ہو تو امجد علی نے خود اپنے سوال کا جواب دیا" اگر تم نے نہ بولنے کی قسم کھا رکھی ہے تو میں بتاتا ہوں کہ تم کہاں تھے؟ تم کانگریس اور خلافت کے اُن بدمعاشوں کے ساتھ دن بھر واہی تباہی گھومتے رہتے ہو غیر قانونی جلوسوں میں حصہ لیتے ہو اور ولایتی کپڑا جلاتے ہو۔ صبح تُم نے مجھ سے کہا تھا کہ تم سکول جا رہے ہو لیکن تم وہاں گئے ہی نہیں۔ میں تمہارے ہیڈ ماسٹر صاحب سے ملا تھا وہ تمہاری حرکتوں سے بہت ناراض ہیں۔"

سارے ملک میں ہر طرف جو شاندار، جوش دلانے والے اور دل میں ایک ولولہ پیدا کر دینے والے حادثے ہو رہے تھے وہ ایک پل میں خاک میں ملا دیئے گئے۔ تحصیلدار صاحب کی سرکاری نظروں میں یہ سارے حادثے اُن غنڈوں اور شہدوں کی شرمناک حرکتیں تھیں جو گولی سے اُڑا دیئے جانے کے لائق تھے۔ انور بوکھلا گیا۔ اُس نے سوچا" شاید تایا ابا ٹھیک ہی کہتے ہوں، لیکن ....."

" لیکن تایا ابا، پھر ابا کیوں اِس چکر میں پڑے؟ اگر جیل جانا اچھا کام نہ ہوتا تو وہ کبھی ایسا نہ کرتے۔"

"یا خدا!" امجد علی کا غصہ یہ سُنتے ہی بھڑک اُٹھا" تُو نے بھی مجھے کیسا بھائی دیا ہے اور کیسا بھتیجا؟ سرکار نے تو ان غیر قانونی حرکتوں کو کچلنے میں میری خدمتوں سے خوش ہو کر مجھے اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر بنا دیا ہے اور ہمارے خاندان والے سرکار کا شکریہ کس طرح ادا کر رہے ہیں؟ اِن سوّر کے بچوں کا ..... گاندھی اور محمد علی اور

شوکت علی کا ـــــ ساتھ دے کر۔"

وہ اسی طرح بھٹکتے رہے اور آخر میں یہ فیصلہ کرتے ہوئے بولے "اُس احمق اکبر نے تو جو کچھ کیا ہے اُسے میں مٹا نہیں سکتا لیکن میں اس بات کو قطعی برداشت نہیں کر سکتا کہ اب اُن کا لڑکا خاندان کو سرکار کی نظروں میں اور گرا دے۔ انور، کل صبح تمہیں میرے ساتھ گڑگاؤں چلنا ہوگا، یہاں تمہاری پھوپی اماں تمہاری دیکھ بھال نہیں کر سکتیں۔ تمہارے ابّا جب تک جیل سے لوٹ کر نہیں آ جاتے تب تک میں تمہیں اپنی نگرانی میں رکھوں گا۔"

اُس رات انور نے نہ کھانا کھایا نہ اُسے نیند آئی۔ اُس کے تایا ابّا نے آج جس طرح اُس سے بات کی تھی ویسے کوئی آج تک اُس سے نہیں بولا تھا اور اُس کے ابّا کے اس طرح بولنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اُن کی یہ بے انصافی اُس کے دل کو کھرچتی رہی۔ اُسے سب سے بُری تو وہ بات لگی تھی جو انہوں نے اُس کے ابّا کے بارے میں کہی تھی حالانکہ جس وقت اُنہوں نے اُس کے ابّا کے بارے میں وہ باتیں کہی تھیں تو غصّے کے مارے اس کی زبان بند رہ گئی تھی لیکن بعد میں اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ جا کر اُن سے کہہ دے کہ وہ تحصیلدار ہوں یا اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر، پر وہ اُس کے ابّا کی جوتیوں کے برابر بھی حیثیت نہیں رکھتے ہیں۔ اُس کا جی چاہتا تھا کہ وہ جا کر اُن سے کہہ دے کہ اُن کے جیسے لوگوں کو عام لوگ غدّار، ٹوڈی اور خوشامدی ٹٹّو سمجھتے ہیں۔ لیکن اُس کے اندر کوئی چیز ایسی تھی جو اُسے ایسا کرنے سے روکتی تھی۔ شاید اُس کی وجہ یہ تھی کہ اُسے بچپن سے بڑوں کی عزّت کرنا سکھایا گیا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اُسے جھگڑے فساد سے فطرتاً نفرت تھی یا شاید اس وجہ سے کہ اس کا جسم بہت

کمزور تھا۔

رات کے سناٹے میں وہ اپنے بستر پر پڑا جاگ رہا تھا۔ اُس کا تکیہ گرم آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ بار بار وہ اپنے دل میں کہہ رہا تھا۔ "مجھے اپنے تایا ابّا سے نفرت ہے۔ مجھے اپنے تایا ابّا سے نفرت ہے۔ میں اُن کے ساتھ ہرگز نہیں جاؤں گا ۔۔۔ میں اُن کے ساتھ ہرگز نہیں جاؤں گا۔"

پڑوس کی مسجد میں مولوی صاحب لوگوں کو صبح کی نماز کے واسطے بُلانے کے لیے اذان دے رہے تھے۔ اسی وقت انور اُٹھا اور اپنی گرم شیروانی پہن کر اُس نے گلے میں ایک مفلر لپیٹ لیا تاکہ اُس کے کانوں میں سردی نہ لگے اور دبے پاؤں کمرے سے باہر نکل گیا۔ باہر آنگن میں ابھی اندھیرا تھا۔ اُس کا پیر سوتی ہوئی بِلّی پر پڑتے پڑتے بچا اور بِلّی میاؤں میاؤں کرتی ہوئی ایک طرف کو بھاگ گئی۔ ایک پل کے لیے وہ خاموش کھڑا رہا کہ شاید کوئی جاگ جائے۔ جلدی جلدی قدم بڑھاتا ہوا وہ پھاٹک پر پہنچا لیکن اُس کی کُنڈی اتنی اُونچی تھی کہ وہاں تک اُس کا ہاتھ نہیں پہنچتا تھا اس لئے وہ ایک سٹول لے آیا اور گھبراہٹ میں کانپتے ہوئے سٹول پر چڑھ گیا۔ کُنڈی تو کھُل گئی پر اُس ڈگمگاتے ہوئے سٹول پر وہ اپنا بیلنس قائم نہ رکھ سکا اور ایک دھماکے کے ساتھ سٹول سمیت زمین پر آگرا اور اُس کا سر پتھّر کی چوکھٹ سے ٹکرا گیا۔ اُس وقت اُسے چوٹ کا ہوش نہیں تھا۔ اُسے تو بس یہ فکر تھی کہ شور سُن کر کہیں سب لوگ جاگ نہ جائیں اور جاگ کر وہاں نہ آ جائیں۔ بنا سوچ بچار کے اُس نے دروازہ کھولا اور باہر نکل کر سر پر پاؤں رکھ کر سُنسان گلی میں بھاگ کھڑا ہوا اور بڑی سڑک پر ہی پہنچ کر دم لیا۔ پَو پھٹ رہی تھی اور دریا کے اُس پار مشرق کی طرف

افق دھیرے دھیرے گلابی اور سنہرا ہوتا جا رہا تھا لیکن اوپر آسمان پر ابھی تک کچھ تارے چمک رہے تھے۔

انور پہلے کبھی اتنے سویرے نہیں اُٹھا تھا اور اب وہ ایک عجیب جوش محسوس کرنے لگا۔ ہوا تیر کی طرح چُبھ رہی تھی اور جب وہ مفلر اپنے مُنہ پر لپیٹنے لگا تو اُسے بائیں آنکھ کے اُوپر ماتھے پر کوئی چیز چپچپی سی لگی۔ خون! یہیں پر اُسے پتھر کی چوکھٹ سے چوٹ لگی تھی۔ اُسے فتح کا ایک عجیب سا احساس ہوا۔ لوگ ہمیشہ اُس کے چھوٹے قد اور دُبلے پتلے جسم کا مذاق اُڑاتے تھے۔ اس کی پھوپی اماں ہمیشہ اس طرح حفاظت سے رکھتی تھیں جیسے وہ کوئی ٹوٹنے والا کھلونا ہو لیکن اُس نے پتھر پر اپنا سر پھوڑ لیا تھا اور سچ مچ اُس کے خون نکل رہا تھا پھر بھی اُس نے کوئی تکلیف محسوس نہیں کی تھی اور جب اُسے چوٹ کا پتہ لگا تب بھی وہ گھبرایا نہیں تھا۔ وہ رویا بھی نہیں تھا۔ اُس نے مردوں کی طرح اس چوٹ کو برداشت کر لیا تھا۔ اُس کے ابا اُس سے اسی بات کی اُمید رکھتے تھے۔

اُس کے ابا! جلد ہی کچھ ہی گھنٹوں میں وہ اُن کے پاس پہنچ جائے گا جیل میں۔ انور نے طے کر لیا تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔

(۶)

انور نے سوچا تھا کہ جیل جانا بہت آسان بات ہے بس ایک پکا ارادہ کرنے کی ضرورت ہے پھر کوئی بھی قانون توڑ دو۔ اور پولیس پکڑ کر کٹہرے دار کالی لاری میں بٹھا کر لے جائے گی۔ انور نے سیاسی قیدیوں کو پہلے بھی ایسی ہی لاریوں میں بیٹھ کر جیل جاتے دیکھا تھا۔

لیکن سرکار دوسرے ڈھنگ سے سوچ رہی تھی۔ اُس نے جیل عام مجرموں کے لئے چور اُچکوں، جیب کتروں اور قاتلوں کے لئے بنوائے تھے۔ لیکن اب اُن کے سامنے ایک عجیب کیفیت آگئی تھی ایسی کیفیت جس کا سامنا دنیا کی کسی بھی سرکار نے اس سے پہلے کبھی اتنے بڑے پیمانے پر نہیں کیا تھا۔ ہزاروں ایسے شریف لوگوں کو جو اب تک قانون کے پابند تھے اور خدا سے بھگوان سے ڈرتے تھے اچانک نہ جانے کیوں جیل جانے کا شوق پیدا ہوگیا تھا۔ دس ہزار، بیس ہزار، تیس ہزار، پھر بھی یہ سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ جیل خانے ٹھسا ٹھس بھر گئے تھے۔ جیل کے افسروں، پولیس والوں اور اہل کاروں پر کام کا بوجھ بہت بڑھ گیا تھا۔ وہ جیل خانے والے تیرتھ یاتریوں کے اس حیرت انگیز جلوس سے تنگ آ گئے تھے۔ سول نافرمانی کے بوجھ کے نیچے سرکار کی پوری مشینری چرمرانے لگی تھی۔

اس لئے ہوا یہ کہ جس وقت انور نے جیل جانے کا فیصلہ کیا اُسی وقت سرکار نے جیلوں میں بہت زیادہ لوگ نہ ٹھونسنے کا فیصلہ کیا۔ کچھ بڑے بڑے باغیوں کے لئے تو کسی طرح جیل میں جگہ نکل بھی سکتی تھی پر چھوٹے موٹے لوگوں سے نپٹنے کے لئے کوئی دوسرا راستہ اپنانا ضروری تھا۔

گھر سے نکلتے وقت انور نے کوئی خاص پروگرام نہیں بنایا تھا۔ اس لئے وہ بنا مقصد اِدھر اُدھر بھٹکتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد اُسے اپنے سکول کے دوستوں کی ایک ٹولی دکھائی دی۔ جو کانگریس کا بڑا سا جھنڈا لئے ہوئے جا رہی تھی۔ یہ لوگ کسی جلوس میں شامل ہونے جا رہے تھے اور اُن میں سے ایک لڑکے نے بڑے رُعب کے ساتھ انور کو بتایا۔ "آج بہت سی گرفتاریاں ہونے والی ہیں۔" "گرفتاریاں؟"

اسی کی تو انور کو تلاش تھی۔

جلوس بہت لمبا تھا، اُس کا ایک سرا فتح پوری مسجد پر تھا اور دوسرا پتھر والے کنوئیں پر۔ انور اور اُس کے سب ہی دوستوں کے دل میں اِس جنگ میں کود پڑنے کی دُھن سمائی ہوئی تھی۔ وہ لوگ اپنی اِسی دُھن میں جلوس کے آگے پہنچ گئے۔ ایک داڑھی والے مولوی صاحب اور گیروے کپڑے پہنے ہوئے ایک سوامی جی جلوس کے آگے آگے چل رہے تھے۔ گیت گائے جا رہے تھے، نعرے لگ رہے تھے۔ وہی نعرے جو اُس نے امرتسر میں سُنے تھے۔ انور نے بھی اپنی پتلی آواز بھیڑ کی گونجتی ہوئی آوازوں میں ملا دی۔ اللہ اکبر! وندے ماترم! اور پہلی بار انور اِن جادو بھرے لفظوں کے جوش سے واقف ہوا ـــ انقلاب زندہ باد ـــ اِن الفاظ کو سن کر مجمع کے دل میں جذبات کی ایک لہر سی دوڑ جاتی تھی۔ بھیڑ میں انور انسانیت کے سمندر میں ایک بوند کی مانند ہو گیا تھا۔ اُس کی شخصیت مجمع میں مل کر ایک ہو گئی تھی۔ مجمع کے جذبات سے متاثر ہو کر انور میں ایک عجیب سی تبدیلی آ گئی۔ اب وہ شرمیلا انور نہیں رہ گیا تھا اب وہ کمزور نہیں تھا۔ اب اُس میں ایک نئی طاقت آ گئی تھی نئی اُمنگ اور نئی ہمت پیدا ہو گئی تھی۔ اُس وقت وہ موت کا بھی سامنا کر سکتا تھا۔

سڑک پر راستہ روک کر کھڑی ہوئی پولیس کی شکل میں موت سے اُس کا واسطہ پڑا۔ وہ اپنے کندھوں پر بندوقیں اُٹھائے کھڑے تھے۔ بندوقوں کا مُنہ سیدھا بھیڑ کی طرف تھا۔ جلوس ٹھہر گیا۔ پولیس کی ناکہ بندی کی خبر دیکھتے دیکھتے جلوس کے پیچھے تک پہنچ گئی اور پورے جلوس میں ایسا گُنجن پیدا ہوا جیسے لاکھوں شہد کی مکھیاں بھنبھنا رہی ہوں۔ ایک لمحہ پہلے جو جوش دکھائی پڑ رہا تھا وہ غائب ہو گیا

فضا میں ایک تناؤ سا پیدا ہو گیا۔ انور کے سکول کا ایک ساتھی کشن، جو اوروں سے چھوٹا تھا، اچانک رونے لگا۔ اس سنجیدہ ماحول میں یہ ایک مضحکہ انگیز واقعہ تھا اور اس سے مجمع کی یکسانیت کا جذبہ ٹوٹ گیا۔ وہ سب الگ الگ لوگ بن گئے جن کی اپنی اپنی چھوٹی چھوٹی کمزوریاں اور فکریں تھیں ___ اُس چھوٹے سے بچّے کی طرح، جو پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔

پولیس کے ایک افسر نے آگے بڑھ کر دونوں لیڈروں کو گرفتاری کا وارنٹ دکھایا اور وہ اس طرح مُسکرا دیئے جیسے وہ اپنی گرفتاری کی راہ ہی دیکھ رہے تھے۔ "تو سُسرال کا بُلاوا آ گیا، چلیے، میں تیّار ہوں۔" داڑھی والے مولوی صاحب نے داروغہ کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ گیروے کپڑوں والے سوامی جی نے مُڑ کر بھیڑ کو مخاطب کر کے تقریر شروع کر دی۔ "بھائیو! ہمیں گرفتار کر لیا گیا ہے اور ہم جا رہے ہیں، آپ لوگ خاموش رہیئے گا اور یاد رکھیئے گا کہ ہم نے اہنسا کی قسم کھائی ہے۔ ہم خود مر جائینگے لیکن دشمن کو نہیں ماریں گے۔ سچّائی ہی ہمارا ہتھیار ہے۔" انور نے پولیس والوں کی رائفلوں کو دیکھا جو بھیانک نظروں سے بھیڑ کو تاک رہی تھیں اور اُس کے دل میں ایک دُھندلا سا شک پیدا ہوا کہ کیا سچّائی سے اِن رائفلوں کو ہرایا جا سکتا ہے۔ امرتسر کی یاد اُس کے دماغ میں بجلی کی طرح کوند گئی۔ وہ دیکھ چکا تھا کہ اِس طرح کی رائفلیں کیا کر سکتی ہیں۔

دونوں لیڈروں کو وہاں پر کھڑی ہوئی پولیس کی بہت سی لاریوں کی طرف ___ لے جایا گیا۔ اور جب وہ اُن ہی میں سے کسی ایک میں غائب ہو گئے تو انور کو یکایک یاد آیا کہ وہ کیا کرنے نکلا تھا۔ اُسے جو کرنا ہے وہ جلدی کرنا چاہیئے نہیں تو موقع ہاتھ

سے نکل جائے گا۔ وہ پولیس کی لاریوں کی طرف بھاگا۔ باقی لڑکے بھی یہ سوچ کر کہ کہیں وہ انور سے پیچھے نہ رہ جائیں، اُس کے ساتھ ہو لیے۔

"کدھر جا رہے ہو؟" ایک پولیس والے نے اُن کا راستہ روک کر پوچھا۔

"مجھے بھی گرفتار کرو"۔ انور نے جواب دیا۔ "میں بھی سرکار کے خلاف ہوں۔"

اُسے یقین تھا کہ اِس دلیل کے آگے پولیس والے لاچار ہو جائیں گے۔

"ہاں ہاں"۔ باقی لڑکوں نے بھی ایک ساتھ چلّا کر کہا۔ "ہم بھی سرکار کے خلاف ہیں، ہم سب کو بھی گرفتار کر کے جیل لے چلو۔"

یہ سُن کر ڈراؤنی صورت والے داروغہ کے چہرے پر ایک مُسکراہٹ دوڑ گئی۔

"اچھا، چلو بیٹا"۔ اُس نے کہا اور اپنے کسی ماتحت کو آنکھ مار کر اشارہ کیا۔ "سب لڑکوں کو گاڑی میں چڑھا دو۔"

سب لڑکے پولیس کی لاری کی طرف اِس طرح بھاگے جیسے کہیں پکنک پر جا رہے ہوں۔ کوئی بیس لڑکے رہے ہوں گے اور سب بے حد جوش میں تھے ــــ بس ایک کشن کو چھوڑ کر جس کے چہرے پر بالکل مُردنی چھائی ہوئی تھی۔ جب لاری چلنے کو ہوئی تو اُس نے انور سے پوچھا۔ "اچھا، ایک بات تو بتاؤ جیل میں ہمیں مار تو نہیں پڑے گی؟"

"نہیں نہیں"۔ انور نے اُسے تسلّی دیتے ہوئے کہا۔ یہ کہتے وقت وہ اپنے آپ کو بہت بڑا سمجھ رہا تھا اور اُس سے اِس طرح بات کر رہا تھا جیسے کوئی باپ اپنے بیٹے سے کرتا ہے۔ "نہیں، جیل میں مار نہیں پڑے گی، بس کوٹھریوں میں بند کر دیا جائے گا۔"

"تمہیں کیسے معلوم؟" ایک دوسرے لڑکے نے پوچھا۔ یہ انور کے لئے کامیابی کا لمحہ تھا۔ اُس نے فوراً جواب دیا۔ "میں اس لئے جانتا ہوں کہ میرے ابّا وہاں رہیں۔"

"لیکن ہم لوگ جا کہاں رہے ہیں؟" جب بس پُرانے قلعے والی سڑک پر بائیں ہاتھ کو مُڑی تو ایک لڑکے نے چلّا کر کہا۔ "یہ تو جیل کا راستہ نہیں ہے۔"

(۷)

رات بہت کافی بیت چکی تھی۔ چاروں طرف سنّاٹا تھا ___ اندھیرا اور سردی۔ سڑک کے دونوں طرف پیڑوں کے نیچے کچھ عجیب عجیب شکلیں چلتی پھرتی دکھائی پڑ رہی تھیں۔ کہیں دُور سے اُلّو کے ہُو ہُو کرنے کی آواز آ رہی تھی اور چمگادڑ اپنے پر پھیلا کر رات کے گہرے اندھیرے میں اُڑ رہے تھے۔

انور کو ڈر لگ رہا تھا۔ لیکن بیچارے کشن کی حالت تو اُس سے بھی بُری تھی۔ وہ تو بالکل نا اُمید ہو کر انور کی بانہہ زور سے پکڑے ہوئے تھا۔ سردی کے مارے اُس کے دانت کٹکٹا رہے تھے اور تھکن کے مارے اُس کے پاؤں نہیں اُٹھ رہے تھے اپنے دوست کو اتنی بُری حالت میں دیکھ کر انور کو اپنے ڈر پر قابو پانے میں کچھ مدد ملی۔ وہ اپنے کو عمر میں بہت بڑا اور طاقتور سمجھنے لگا اور کشن کے لئے اُس کے دل میں ایک پیار اُمنڈنے لگا۔ اُس چھوٹے سے روتے ہوئے بچّے کو دیکھ کر اُس کے دل میں اُس کی حفاظت کرنے کا جذبہ پیدا ہوا اور وہ یہ محسوس کرنے لگا کہ ایسی مصیبت کے وقت میں اپنے ساتھی کی حفاظت کرنا اُس کا فرض ہے۔ وہ کشن کو ڈھارس بندھانے کے لئے اُس سے کہنے لگا کہ اب دِلّی بس تھوڑی ہی دُور ہے۔ حالانکہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اُسے ابھی پورے دس میل چلنا ہے۔ وہ کشن کو یقین دلا رہا تھا کہ دیہات

کے اس حصّے میں کوئی جنگلی جانور نہیں ہے' وہ اپنا دل مضبوط رکھنے کے لیے مذاق کر رہا تھا ہنس رہا تھا اور وطن پرستی کے گیت گا رہا تھا اور اُس کی یہ ترکیب کامیاب بھی ہو رہی تھی صرف اس کے لئے نہیں بلکہ کشن کے لئے بھی۔ اب اُنہیں چلنے میں اتنی تھکن نہیں محسوس ہو رہی تھی اور کچھ دیر بعد جب آسمان پر پتلا سا چاند نکل آیا تب تو اندھیرے کے بھوت بھی بھاگ گئے اور کشن کی بھی اتنی ہمّت بندھ گئی کہ اُس نے انور کی بانہہ ڈھیلی چھوڑ دی۔

پولیس والوں نے سکیم یہ بنائی تھی کہ لاری کو بہت دُور دیہات کی طرف لے جایا جائے اور دو دو تین تین کر کے بچّوں کو تھوڑی دُور پر راستے میں اُتار دیا جائے اور اُنہیں اس سرد اندھیری رات میں پیدل رستے ہوئے گھر جانے کے لئے چھوڑ دیا جائے۔ پولیس والوں کو پُورا یقین تھا کہ بگڑے ہوئے کم عمر لڑکوں کے لئے یہ سزا قید کے مقابلے میں کہیں زیادہ کارگر ثابت ہو گی۔ اس کے علاوہ اس طرح جیل میں بھیڑ بڑھنے کا کوئی خطرہ نہیں رہے گا کیونکہ جیل یوں بھی ٹھُسا ٹھُس بھر چکے تھے۔ دونوں لڑکے رات کے اندھیرے میں لگاتار چلتے چلے جا رہے تھے لیکن کچھ میل چلنے کے بعد کشن اتنا تھک گیا کہ اُسے تھوڑی دیر سُستا لینے کا موقع دینے کے لئے اُنہیں ہر تھوڑی دُور پر رُک جانا پڑتا تھا حالانکہ انور اپنے ننھے ساتھی کے سامنے اس بات کو کبھی تسلیم نہ کرتا لیکن میلوں تک اس طرح چلتے رہنے کے بعد وہ خود بھی تھک گیا تھا۔ صبح کا وہ جوش' وہ جلوس' وہ گیت' وہ نعرے جیل میں اپنے ابّا کے پاس پہنچ جانے کا پکّا ارادہ ـــــ یہ سب چیزیں دُھندلے ماضی کے حادثے معلوم ہونے لگے تھے۔ دن بھر کے جوش و خروش کے بعد اب اُس کا جذبہ ٹھنڈا پڑنے لگا تھا۔ انور کشن کی ہمّت بڑھانے کے لئے جو

گیت گا رہا تھا وہ دھیرے دھیرے بند ہو گئے۔ اب تو بات کرنا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ چُپ چاپ سنجیدہ مُنہ بنائے وہ سڑک پر چلے جا رہے تھے اور اُن کے پیچھے گرد کا ایک ہلکا سا بادل اُڑ رہا تھا۔

یکایک انور کو خیال آیا کہ اُسے بھُوک لگی ہے۔ اُس نے نہ صبح ناشتہ کیا تھا نہ دوپہر کو کھانا کھایا تھا نہ رات کو۔ اُسے یاد آیا کہ وہ تھکا ہوا ہے اور اُسے نیند آ رہی ہے۔ پچھلی رات وہ سویا بھی نہیں تھا۔ اُسے اُس چوٹ کی یاد آئی جو صبح اُس کو لگی تھی اور حالانکہ خون بہنا جلد ہی بند ہو گیا تھا پر اب پھر اُس کے سر میں درد ہو رہا تھا۔ اُسے خیال آیا کہ اسے سردی لگ رہی ہے اور برف جیسی ٹھنڈی ہوا کے تیر اُس کی گرم شیروانی کو چھید کر اُس کے جسم کی ہڈیوں تک چبھ رہے ہیں۔ وہ اپنے گرم اور گُدگُدے بستر کے لئے تڑپ اُٹھا۔ وہ اُس گرم گرم سالن اور تازی چپاتیوں کے لئے بے چین ہو گیا جو بُوا گلابو نے اُس کے لئے بنائی ہوں گی۔

تھوڑی دُور آگے اُنہیں ایک بیل گاڑی کے پہیئے کی چرخ چوں سُنائی دی اور دونوں لڑکوں کو ڈھارس بندھی۔ صرف اس لئے نہیں کہ کچھ دُور کے لئے اُنہیں گاڑی میں بیٹھ کر جانے کا موقع ملے گا بلکہ اس سے بھی بڑھ کر اس لئے کہ کسی آدمی کا ساتھ رہیگا۔ اُنھوں نے جلدی جلدی اپنے قدم بڑھائے اور جلد ہی بند گوبھی گاجر اور مولیوں سے لدی ہوئی بیل گاڑی کے پاس پہنچ گئے۔ گاڑی والے کو یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ دو لڑکے جو اپنے پہناوے سے شہر کے کسی کھاتے پیتے گھرانے کے لڑکے معلوم ہو رہے تھے۔ اتنی رات گئے سڑک پر کہاں چلے جا رہے ہیں۔ لیکن جب انور نے سارا قصہ بتایا تو وہ جھٹ سے بولا۔ "بیٹا آجاؤ، یہاں گاڑی پر میرے پاس آجاؤ۔ بہت تھک گئے ہو گے تم تو۔ واہ

میں چھوٹے چھوٹے بچوں کو بیس بیس میل اکیلے چلانا! ___ یہ پولیس والے بھی بہت حرامی ہوتے ہیں۔" حرامی! پھر وہی گالی کا لفظ۔ لیکن اُس کسان نے اِس کے ساتھ ہی کچھ ایسی چنی چنی گالیاں بھی دیں جو انور نے پہلے کبھی سُنی بھی نہیں تھیں اور جن کا مطلب تو اس کی سمجھ سے بالکل باہر تھا۔

اتنی دُور پیدل چلنے کے بعد وہ بیل گاڑی سب سے آرام دہ سواری معلوم ہو رہی تھی۔ لیکن گاڑی کے جھٹکوں سے اُن کا خالی پیٹ اور بھی خالی معلوم ہونے لگا اور تازی سبزیوں کی خوشبو اُن کی ناک میں گھس رہی تھی۔ انور بھوکا مرد رہا تھا لیکن ایک شریف گھر میں پلا ہونے کی وجہ سے وہ کسی اجنبی سے کھانے کو کیسے مانگ سکتا تھا؟۔

"کیا گاجریں لے جا رہے ہو؟" اُس نے کسان سے پوچھا۔

"ہاں بیٹا، گاجریں ہیں، مولیاں ہیں اور گوبھی کے پھول بھی ہیں۔ میں انہیں سبزی منڈی لے جا رہا ہوں۔"

"مجھے گاجریں بہت اچھی لگتی ہیں۔" کرشن نے بنا پوچھے ہی کہا۔ "کتنی میٹھی ہوتی ہیں۔"

"ہاں! اچھی تو مجھے بھی لگتی ہیں۔" انور نے کہا۔ "جاڑے میں ہم لوگ بہت گاجر کھاتے ہیں اور میری پھوپی اُن کا بہت اچھا حلوہ بناتی ہیں۔ کیا تمہاری گاجریں اچھی اور میٹھی ہیں؟"

"کھا کر دیکھو۔" یہ کہہ کر اُس نے دونوں کو کچھ گاجریں اُٹھا کر دے دیں۔

شکریہ ادا کئے بنا ہی دونوں لڑکے بھوکے بھیڑیوں کی طرح اُن پر ٹوٹ پڑے اور گاجریں چبانے لگے۔ اُنہیں اس طرح گاجریں کھاتا دیکھ کر کسان نے سوچا "میں بھی کتنا بیوقوف ہوں، مجھے پہلے ہی سوچنا چاہیئے تھا کہ وہ بھوکے ہوں گے۔"

پیٹ بھرتے ہی کشن تو انور کے کندھے پر سر رکھ کر فوراً سو گیا۔ پو پھٹ رہی تھی۔ اور سامنے بہت دُور دِلّی سے بھی آگے انور کو آسمان دھیرے دھیرے گلابی ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔ اُن کے چاروں طرف سنّاٹا تھا ہر چیز سو رہی تھی ـــــ کھیت سو رہے تھے اپنی جھونپڑیوں میں کسان سو رہے تھے اور چھپرّوں کے نیچے مویشی سو رہے تھے۔ گاڑی چرّخ چوں کرتی ہوئی اپنی مستانی چال سے چلی جا رہی تھی اور بیلوں کے گلے میں بندھی ہوئی گھنٹیاں سُریلی آواز سے بج رہی تھیں۔ گاڑی والا بھی اُونگھ اُونگھ کر کچھ گنگنا رہا تھا۔

انور کو بھی نیند آ رہی تھی لیکن چاروں طرف کے حیرت انگیز ماحول نے اُس کو چونکا دیا تھا ـــــ صبح کا سُہانا منظر دیہات کا پُرسکون ماحول مٹّی اور پیڑوں کی خوشبو چرچراتی ہوئی گاڑی کا مدھر سنگیت کسان کا گیت اور بیلوں کی گھنٹیاں اُس کے دل میں کشن کے لئے بے پناہ پیار اُمنڈ آیا جو اُس کے کندھے پر سر رکھے سو رہا تھا۔ اُس کا دل کسان کے لیے شکر گذار تھا جس نے اُنہیں گاڑی پر بٹھا لیا تھا اور گاجریں کھانے کو دی تھیں۔ "دنیا کتنی خوبصورت اچھی اور انوکھی ہے"۔ اُس نے سبزیوں کے ڈھیر پر سر ٹکاتے ہوئے سوچا اور دھیرے دھیرے وہ بھی سو گیا۔

(۸)

ڈرتے ڈرتے انور نے گھر میں قدم رکھا۔ انور کا دل بیٹھنے لگا۔ یہ سوچ کر کہ اُسے اپنے تایا ابّا کے سامنے اس بات کا جواب دینا ہوگا کہ وہ لگ بھگ بیس گھنٹے تک کہاں غائب رہا۔ یا شاید تایا امجد علی کو پہلے ہی یہ پتہ چل گیا ہو کہ کل والے جلوس میں اُس نے حصّہ لیا تھا اور بعد میں پولیس نے کیا کیا تھا۔ اگر ایسا ہوا تو شدید ہنگامہ ہو جائیگا۔

لیکن انور کل کے تجربے سے اتنا خوش تھا کہ اُسے اپنے تایا ابّا کی ڈانٹ کی کوئی فکر نہیں تھی۔ وہ صرف یہ سوچ رہا تھا کہ جو کچھ ہونا ہو وہ جلدی ہی ہو جائے۔

گھر میں اُسے جو پہلا آدمی دکھائی دیا وہ ابّا تھے۔ پہلے تو اُس نے سوچا کہ شاید وہ خواب دیکھ رہا ہے لیکن نہیں وہ اکبر علی ہی تھے۔ وہ تکیوں کا سہارا لگائے بیٹھے تھے اور اُن کے پاس حکیم بیدل بیٹھے اُن کی نبض دیکھ رہے تھے۔

یکایک انور کی سمجھ میں آیا کہ اُس کے ابّا بیمار تھے اور اس خیال کے آگے وہ اور سب باتیں بھول گیا۔ وہ بھاگ کر اُن کے پاس گیا اور بولا "ابّا، ابّا آپ واپس آگئے!"

"ہاں انور لیکن تم اب تک کہاں تھے؟ میں نے سنا ہے کہ تم کل صبح سے گھر نہیں آئے۔ اُن کی آواز میں کمزوری تھی یہ اکبر علی کی پرانی کڑک دار آواز نہیں تھی۔

انور نے مختصراً سب کچھ سچ سچ بتا دیا اور یہ دیکھ کر اُسے تسلّی ہوئی کہ اُس کی بات سُن کر اُس کے ابّا بڑے پیار سے مسکرا دیئے۔ اتنے میں امجد علی پیالے میں کھولتی ہوئی کوئی چیز لیکر وہاں آئے لیکن اب انور کو اُن سے کوئی ڈر نہیں تھا۔ جب وہ اپنے ابّا کے پاس ہوتا تھا تو اُسے کسی سے ڈر نہیں لگتا تھا۔

"انور یہ بھی اچھا مذاق رہتا کہ ادھر میں چھوٹ کر آتا اور ادھر تم جیل میں بند کر دیئے گئے ہوتے، رہتا نا؟"

اس پر حکیم بیدل بولے۔ "میں تو کہتا ہوں کہ آپ کو رہا کرنے میں انہوں نے کوئی جلدی نہیں کی ہے اگر آپ کو مہینے بھر بھی جیل میں اور رکھا جاتا تو آپ کی صحت بالکل تباہ ہو جاتی۔ یہ ساری گڑبڑ جیل کے کھانے کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔"

"لیکن مجھے یہ بالکل اچھا نہیں لگا ــــ میں اپنی رہائی سے بالکل خوش نہیں ہوں۔"

اکبر علی بولے "میں یہاں زخمی سپاہی کی طرح پڑا ہوں اور دوسرے لوگ لڑ رہے ہیں، جیسے ہی میری طبیعت کچھ ٹھیک ہوگئی میں افسروں کو اطلاع دے دوں گا کہ وہ مجھے پھر گرفتار کر سکتے ہیں۔"

اتنے میں کاکا رامیشور ہاتھ میں اخبار لئے ہوئے آئے۔ انور کی پیٹھ تھپک کر اور ہمیشہ کی طرح اطمینان سے ایک طرف بیٹھ کر انہوں نے اپنی ران پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا "ارے، اکبر تم فکر کیوں کر رہے ہو؟ کیا تمہیں نہیں معلوم کہ گاندھی جی نے تحریک واپس لے لی ہے۔"

"کیا مطلب تمہارا؟" اکبر علی کی آواز میں پھر وہی پہلے والا جوش پیدا ہو گیا تھا۔

"ہاں ہاں۔ میں ٹھیک ہی کہہ رہا ہوں، یہ دیکھو اخبار میں لکھا ہے۔"

"لیکن کیوں؟ آخر کس وجہ سے؟"

"یوپی کی چوری چورا نام کی کسی جگہ پر کچھ پولیس والے مار ڈالے گئے تھے، اس لئے گاندھی جی کہتے ہیں کہ لوگوں کے دلوں میں ابھی تک ہنسا ہے اور اس لئے سول نافرمانی کی تحریک واپس لی جاتی ہے۔"

یہ صحیح ہے کہ کچھ پولیس والے مار ڈالے گئے لیکن اس سے کیا ہوا؟ ہر آدمی تو مہاتما یا سنت نہیں ہو سکتا۔ کیا ان لوگوں نے ہمارے بہت سے آدمیوں کو نہیں مارا ہے؟" اکبر علی کی آواز میں ایک ایسی کڑواہٹ تھی جو انور نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ کچھ دیر رک کر وہ پھر دھیمی آواز میں جیسے اپنے آپ سے کہنے لگے "یہ کیا کیا؟ آخر یہ کیا کیا؟ جب ہم منزل کے اتنا قریب پہنچ گئے تھے تب ہمیں روک لیا۔"

لیکن انور کو سیاست کی فکر نہیں تھی۔ وہ صرف یہ دعا مانگ رہا تھا "یا خدا کسی طرح میرے ابا کو صحت یاب کر دے۔"

۸

"کاہے کو بیاہی بدیس؟"

(۱)

حکیم عبدالرشید بیدل کے علاج اور پھوپی اماں کی تیمارداری کی بدولت اکبر علی جلد ہی اچھّے ہو گئے۔ پر موت کا سایہ اُن کے سر پر منڈلا رہا تھا اور اُن میں ایک صاف تبدیلی جھلک رہی تھی۔ وہ اپنا کاروبار اب بھی دیکھتے تھے اور بیٹھک میں اب بھی اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرتے تھے۔ وہ اب بھی اخبار پڑھتے تھے اور سیاسی واقعات پر بحث کرتے تھے۔ لیکن اُن میں وہ پہلے والا جوش باقی نہیں رہ گیا تھا۔ اُن کی داڑھی سفید ہونے لگی تھی اور بیماری کی وجہ سے اُن کے چہرے کا رنگ بھی کچھ پھیکا پڑ گیا تھا اور اُن کی آواز میں پھر کبھی وہ پہلے والی گونج پیدا نہ ہو سکی۔ وہ کافی کمزور ہو گئے تھے اور بوڑھے لگنے لگے تھے۔ اکثر وہ بڑی دیر تک بالکل خاموش بیٹھے بہت اُداس ہو کر کچھ سوچتے رہتے تھے اور جب کوئی اُن سے کچھ کہتا تو یکایک چونک پڑتے تھے۔

انور بھی بڑے غور سے اپنے ابّا کو دیکھتا رہا۔ اُس نے دیکھا کہ اب وہ نماز میں زیادہ وقت لگاتے تھے۔ پہلے بھی وہ دن میں پانچ بار پابندی سے نماز پڑھتے تھے لیکن وہ نماز اتنی پھُرتی سے پُوری کر لیتے تھے کہ ایسا لگتا تھا جیسے کوئی سیکھا ہوا سپاہی فوجی قواعد کر رہا ہو۔ لیکن اب وہ گھنٹوں جا نماز پر بیٹھے کچھ سوچتے رہتے تھے یا تسبیح پھیرتے رہتے تھے۔ اکثر نماز پڑھتے وقت اُن کی آنکھوں سے آنسو بہہ کر اُن کی داڑھی میں جذب ہو جاتے تھے۔ اور وہ کانپتی ہوئی آواز میں دُعا مانگتے تھے "اے خدا تُو بڑا رحیم ہے تُو بڑا کریم ہے میرے بچّوں پر رحم کر۔ ہمیں ایمان کے راستے پر لے چل اور بُرائیوں سے بچا۔" اور جب انور یہ سُنتا تو اُس کے دل میں خدا کا خوف پیدا ہوتا جس کے سامنے اُس کے ابّا بھی اتنے لاچار تھے۔

کچھ اور تبدیلیاں بھی ہوئی تھیں۔ اب اکبر علی اپنا زیادہ وقت چودھری محمد عمر کے ساتھ بتاتے تھے اور اکثر صدر بازار میں اُن کی چینی کے برتنوں کی دُکان پر بھی جاتے تھے۔ یہ پنجابی بیوپاری ہمیشہ سے اِس بات کے خلاف تھے کہ اکبر علی سیاست میں اپنا وقت خراب کریں۔ وہ اکثر اُن سے کہتے تھے "اکبر صاحب آپ سیاست کے جھگڑے اُن لیڈروں پر کیوں نہیں چھوڑ دیتے اور اپنے کاروبار کو زیادہ وقت کیوں نہیں دیتے؟" نہ جانے کیوں انور کو چودھری محمد عمر اچھے نہیں لگتے تھے۔ اُسے اُن سے کوئی خاص شکایت نہیں تھی لیکن اُن کا اکھڑ پن اُن کی سخت آواز اور بڑی بے تکلّفی سے اُس کی پیٹھ پر دھپ مارنا انور جیسے شائستہ لڑکے کو بالکل پسند نہیں تھا۔

ایک دن جب انور بیٹھک میں گیا تو اُس نے دیکھا کہ اُس کے ابّا چودھری محمد عمر کے ساتھ بیٹھے ہوئے ہیں اُن کے سامنے کچھ کاغذات رکھے ہوئے تھے اور وہ کچھ راز کی باتیں کر رہے تھے۔ یہ سوچ کر کہ اُن کی باتوں میں خلل نہ پڑے انور پیچھے لوٹا ہی تھا کہ

محمد عمر صاحب نے اُسے پکارا۔ "آؤ انور، تم سے کیا چوری ہے۔" اور جب وہ بیٹھ گیا تو اکبر علی نے کہا۔ "دیکھو انور، میں نے ابھی چودھری صاحب کے ساتھ ساجھے کے ایک دستاویز پر دستخط کئے ہیں۔ میں اب اِن کی چینی کے برتنوں کی دُکان میں ساجھے دار ہو گیا۔" اور پھر اپنی ہمیشہ جیسی مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔ "اب اگر تمہیں کبھی پلیٹوں یا گلاسوں کی ضرورت ہو تو تم ہمیشہ ہماری دُکان سے مُفت لا سکتے ہو۔"

ہماری دُکان! انور کو نہ جانے کیوں یہ بات کچھ اچھّی نہیں لگی۔ "لیکن ابا، آپ کا رامیشور دیال کاکا کے ساتھ بھی تو ساجھا ہے!"

"سو تو ہے انور، لیکن کیا میں دو دُکانوں میں ساجھے دار نہیں ہو سکتا؟ اور پھر تم جانتے ہو کہ جب سے لڑائی ختم ہوئی ہے تب سے کمبلوں کا کاروبار برابر مندا پڑتا جا رہا ہے۔ تمہیں اِن سب باتوں کا پتہ ہونا چاہئے۔ کیونکہ میرے مرنے کے بعد تمہیں ہی سارا کاروبار دیکھنا ہو گا۔"

"ہاں بیٹا" محمد عمر صاحب نے انور کی پیٹھ پر ایک دھپ مارتے ہوئے اپنی گرجدار آواز میں کہا۔ "میں چاہتا ہوں کہ تم اور شفیع بھی آپس میں ویسے ہی پکّے دوست ہوں جیسے ہم اور تمہارے ابا ہیں۔"

انور نے محمد عمر صاحب کے بیٹے کو دیکھا تھا۔ بہت بڑے ڈیل ڈول کا اکھڑ قسم کا لڑکا تھا۔ جب بھی وہ اپنے ابا کے ساتھ صدر بازار والی دُکان پر جاتا تھا تو شفیع ہمیشہ کاروبار کے بارے میں اپنی گہری معلومات کا اُس پر رُعب جھاڑتا تھا۔ اُس نے پرائمری تک اپنی پڑھائی کر کے سکول چھوڑ دیا تھا کیونکہ اُس کے ابا کو کاروبار میں ہاتھ بٹانے کے لئے کسی کی ضرورت تھی۔ شفیع کا دوست اور ساجھے دار بننے کی بات انور کو بالکل پسند

نہیں آئی لیکن اپنے ابّا کا لحاظ کر کے اُس نے کچھ کہا نہیں اور چودھری صاحب کی اِس بے تکلّفی کو چپ چاپ ٹال گیا۔

(۲)

انور نے بیٹھک میں بڑے لوگوں کی باتیں سُن کر بہت کچھ سیکھا تھا۔ سکول سے آکر وہ چپ چاپ بیٹھک میں جا کر ایک کونے میں بیٹھ جاتا اور اپنے ابّا اور اُن کے دوستوں کی باتیں سُنتا رہتا۔

روز کسی نہ کسی نئی بات پر بحث ہوتی تھی اور روز انور کچھ نئے لفظ سیکھتا تھا۔ گاندھی جی نے نافرمانی کی تحریک واپس لے لی تھی۔ پھر بھی سرکار نے اُنہیں پکڑ کر جیل میں بند کر دیا تھا۔ حکیم بیدل اخبار سے اُن کے مقدمے کا حال پڑھ کر سُنا رہے تھے۔ انور نے سُنا کہ جس وقت قیدی کو عدالت میں لایا گیا تو سب لوگ ادب سے اُٹھ کھڑے ہوئے — یہاں تک کہ خود جج صاحب بھی کھڑے ہو گئے تھے۔ انور کو اب سے کئی برس پہلے کا وہ دن یاد آگیا جب اُس نے ڈاکٹر انصاری کے بنگلے کے لان پر پتلی پتلی ٹانگوں والے ایک دُبلے پتلے آدمی کو چرخا چلاتے دیکھا تھا۔ اُسے بڑے بڑے گول شیشوں والی عینک اور اُس بوڑھے کی دوستانہ مسکراہٹ یاد آگئی۔ اور اب اُسی کو جیل میں بند کر دیا گیا تھا۔ کیوں؟ کیونکہ وہ اپنے دُشمنوں کو مارنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ ایک چوہے تک کو مارنا نہیں چاہتا تھا؟ یہ دنیا اب تک انور کے لئے ایک بہت بڑی پہیلی بنی ہوئی تھی

لیکن ایک بات وہ جانتا تھا کہ اُس کے ابّا نے ابھی تک گاندھی جی کو تحریک واپس لینے کے لئے معاف نہیں کیا تھا اور ڈاکٹر اُن کے بارے میں بہت طنز بھری باتیں کیا کرتے تھے اور جب رامیشور دیال وہاں پر موجود نہ ہوتے تھے تو چودھری

محمد عمر صاحب کہا کرتے تھے۔ "بنیا بہرحال بنیا ہوتا ہے آٹا دال بیچنے والا۔"

ایک دن اچانک بغیر کسی اطلاع کے رتن انور کے گھر آیا۔ شروع میں تو اُسے پہچاننا ہی مشکل تھا کیونکہ اُس کی عمر کو دیکھتے ہوئے وہ سِکھ لڑکا کافی لمبا تگڑا ہو گیا تھا۔ وہ سر پر کالی پگڑی باندھنے لگا تھا اور جب انور نے اُس سے پوچھا کہ اُس نے پیلی پگڑی باندھنا کیوں چھوڑ دیا تھا تو رتن نے جواب دیا تھا "تم نہیں جانتے میں اکالی بن گیا ہوں؟"

"اکالی! اکالی کیا ہوتا ہے؟" انور کو اپنے دوست کے سامنے اپنی جہالت کا ثبوت دیتے ہوئے بہت شرم آئی۔

"تم نہیں جانتے؟" نوجوانی کے جوش کے ساتھ اپنے ہاتھ ہلاتے ہوئے رتن نے اُسے سمجھایا کہ اکالی تحریک کس طرح شروع ہوئی تھی، کس طرح یہ تحریک سِکھوں کے گردواروں کو سرکار اور اُس کے گُرگوں کے ہاتھوں سے واپس لے لیگی اور یہ بھی بتایا کہ پولیس نے سِکھوں کو کیسی کیسی تکلیفیں دی تھیں، کس طرح انہیں پیٹا تھا اور کچھ سِکھوں کو تو جان سے بھی مار ڈالا تھا۔ اُس نے بتایا کہ اکالی ایک بڑھتی ہوئی انقلابی طاقت ہے رتن اپنے الفاظ کے بہاؤ میں ایسا کھو گیا تھا کہ اُسے اِس بات کی فکر بھی نہیں تھی کہ اُس نے جو کچھ کہا تھا وہ سب اُس کے دوست کی سمجھ میں آیا بھی تھا کہ نہیں "تم دیکھ لینا ایک دن یہی اکالی ہندوستان کو آزاد کرائیں گے!"

"لیکن رتن، یہ تو بتاؤ دِلّی کیسے آنا ہوا؟"

"تم نہیں جانتے؟" اور اُس کا یہ سوال سُن کر انور کو ایک بار پھر اپنی جہالت کا احساس ہوا۔ رتن نے اُسے بتایا، "یہاں کانگریس کا جلسہ ہونے والا ہے، اس لئے اکالی والنٹیروں کا ایک جتھا لاہور سے یہاں اِس لئے بھیجا گیا ہے کہ اپنی تحریک کے

بارے میں کانگریس والوں کو بتائے۔ یہ تو تم جانتے ہی ہو گے کہ ہم کانگریس کے ساتھ ہیں۔"

"کیا میں بھی کانگریس کے اجلاس میں آسکتا ہوں؟"۔ انور نے پوچھا اور رتن نے اپنے آپ کو اپنے دوست سے بہت بڑا محسوس کرتے ہوئے اُس سے کہا کہ وہ اُس کے لئے بھی ایک ٹکٹ کا انتظام کر رکھے گا۔

"اچھا اب میں چلتا ہوں۔" رتن نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"اس طرح بنا کھائے پیئے کیسے جا سکتے ہو ذرا ٹھہرو! میں جا کر پھوپی اماں سے ہم لوگوں کے لئے کچھ تیار کر دینے کو کہتا ہوں۔ پھر ہم ساتھ کھائیں گے بس ہم دونوں۔"

پھوپی اماں نے انور سے کہا کہ وہ اُس کے دوست کو اندر نہیں آنے دے سکتیں "تمہاری سمجھ میں اتنا بھی نہیں آتا کہ اب تمہاری بہن بڑی ہو گئی ہے اُسے پردہ کرنا چاہیئے تم ایک اجنبی آدمی کو گھر کے اندر نہیں لا سکتے۔" لیکن انہوں نے اُن دونوں کے لئے باہر کھانا بھجوا دیا اور کیونکہ اکبر علی گھر پر نہیں تھے اس لئے دونوں بیٹھک میں فرش پر بیٹھ کر کھانا کھانے لگے۔ فقیرا سالن اور چاول اور ذائقے دار سبزیاں لا کر دیتا جا رہا تھا۔

رتن انور سے اگلے دن کانگریس کے پنڈال پر ملنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ "تم بڑے گیٹ پر آجانا۔ میں وہیں ملوں گا۔"

جب انور اندر گیا تو اُس نے پھوپی اماں کو گلابو سے کہتے سُنا "اس سکھ لڑکے نے جن برتنوں میں کھانا کھایا ہے اُنہیں الگ رکھنا اور راکھ سے مانجھ کر تین بار پاک کر لینا۔"

انور نے محسوس کیا کہ یہ اُس کے دوست کی بے عزتی ہے اور وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اُسے اسی طرح کا ایک واقعہ یاد آیا جب اُس نے کاکا امیشور دیال کے گھر پر کھانا کھایا تھا اور اُن کی بیوی نے بھی وہ تھالی اور پیتل کی کٹوریاں الگ رکھوا دی تھیں جن

میں اُسے کھانا دیا گیا تھا۔ اُس وقت اِس بات کی اہمیت انور کی سمجھ میں نہیں آئی تھی لیکن اب وہ سمجھ گیا تھا۔ جس طرح وہ کاکا کی بیوی کی نظروں میں اَپوِتّر تھا اُسی طرح رتن پھوپی اماں کی نظروں میں ناپاک تھا۔ لیکن کیوں؟ آخر کیوں؟ کس وجہ سے؟

(۳)

ستمبر ۱۹۲۳ء میں دِلّی میں کانگریس کا جو خاص اجلاس ہوا' اُس میں انور جا نہیں سکا اور رتن پنڈال کے بڑے پھاٹک پر بڑی دیر تک کھڑا اُس کی راہ دیکھتا رہا۔
انور نے رتن سے ملنے کا جو وعدہ کیا تھا اُسے بھی پُورا نہیں کر سکا اور اُس اجلاس کے صدر مولانا ابوالکلام آزاد کی تقریر بھی نہیں سُن سکا۔ یہ ایک تاریخی اجلاس تھا' کیونکہ اس میں کانگریس کے لیڈروں نے فیصلہ کیا تھا کہ سرکار کے ساتھ مکمل عدم تعاون کی تحریک کو لیجسلیٹو کونسل میں دستوری مخالفت کی سمت میں موڑ دیا جائے۔
اِس عرصے میں اکبر علی نے اپنی بیٹی انجم کی شادی اپنے بھتیجے رؤف کے ساتھ کر دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ اور ایک تیرہ برس کے لڑکے کے لئے بڑی سے بڑی سیاسی اُتھل پتھل کے مقابلے میں بیاہ کی چہل پہل میں دلچسپی لینا فطری تھا۔ اُس دن صبح جب انور سو کر اُٹھا اور رتن سے ملنے کے لئے کانگریس کے پنڈال جانے کی تیاری کرنے لگا تو اُسے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ بیٹھک میں اُس کے ابّا تایا امجد علی سے کچھ باتیں کر رہے ہیں۔ تایا ابّا رات ہی کو آئے تھے اور دونوں بھائی بہت گھُل مل کر باتیں کر رہے تھے۔ بیٹھک سے گذرتے وقت انور نے تایا امجد علی کو کہتے سُنا "تو اگر یہ طے رہا اگلے چاند کی بارہویں کو مبارک دن ہے' میں نے مولوی صاحب سے پوچھ لیا ہے"۔ اور اِس پر چھوٹے بھائی نے جواب دیا "میں بالکل راضی ہوں بھائی صاحب۔ اِس بیماری نے

مجھے بالکل کمزور کر دیا ہے، کون جانے اللہ نے مجھے کتنی عمر دی ہے؟ آنکھیں بند ہونے سے پہلے چاہتا ہوں کہ میں انجم کا بیاہ کر جاؤں۔" اس پر امجد علی نے جواب دیا۔ "ماشاء اللہ رؤف اب بالغ ہوا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ اس وقت اس کی شادی کر دی جائے، دیر سے شادی کرنے میں جوان لڑکوں میں دنیا بھر کے عیب پیدا ہو جاتے ہیں۔"

تو باجی انجم کا رؤف بھیّا کے ساتھ بیاہ ہونے والا ہے! ایک لمحے کے لئے انور کے دل میں یہ خیال اُٹھا کہ رؤف کی جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو اچھا تھا کیونکہ رؤف اُسے اچھا نہیں لگتا تھا۔ وہ ضرورت سے زیادہ رئیسانہ مزاج کا اور ضدّی تھا۔ لیکن بیاہ کی خبر سُنتے ہی وہ اتنا خوش ہوا اُٹھا تھا کہ اس کے لئے کسی اچھّائی یا بُرائی پر غور کرنے کا کوئی موقع ہی نہیں تھا۔ انور اپنے خاندان میں ہی کئی شادیاں دیکھ چکا تھا اور اُن کی چہل پہل میں اُسے بہت مزا آتا تھا — رنگ برنگے کپڑے، گہنے اور دعوتیں۔ لیکن جب اپنے ہی گھر میں شادی ہو اُس میں تو بے حد مزا آئے گا!

"انور، ذرا اِدھر آنا۔" اُس کے ابّا نے آواز دی اور انور نے جا کر تایا ابّا کو سلام کیا۔ پھر اکبر علی اُس سے بولے۔ "اگلے مہینے تمہاری بہن کی شادی تمہارے رؤف بھیّا سے ہونے والی ہے، دریبہ جا کر ذرا بنارسی لال جوہری کو بُلا لاؤ۔"

اور جب وہ بھاگ کر دریبے کی طرف گیا جہاں جوہریوں اور سُناروں کی دکانیں تھیں، تو وہ رتن اور کانگریس کے بارے میں سب کچھ بھول گیا۔ حالانکہ ابھی کل ہی وہ وہاں جانے کے لئے اتنا بے چین تھا۔

(۴)

"باجی انجم، باجی انجم، اس گھر میں کسی کی شادی ہونے والی ہے، بھلا بتاؤ تو کس کی؟"

"چل یہاں سے شریر کہیں کا، تیری ہی شادی ہونے والی ہوگی کسی کانی چڑیل سے۔"
اپنی بہن کو ایک کونے میں بیٹھ کر ریشمی کرتے پر گوٹا ٹانکتے دیکھ کر انور کو اُسے چھیڑنے کا اچھا موقع مل گیا۔ اُس نے بتایا کہ کون کون سے زیور بنوائے گئے ہیں اور باہر بیٹھک میں ریشم، جامہ وار اور مشروع کے کیسے کیسے تھان رکھے ہوئے ہیں۔ اُس نے باجی انجم سے پوچھا کہ وہ اپنے تایا ابّا امجد علی سے اچانک پردہ کیوں کرنے لگی ہے اور بات چیت کے دوران کوئی نہ کوئی موقع نکال کر وہ رؤف کا بھی ذکر کر دیتا جسے سنتے ہی انجم کے گورے گالوں پر لالی دوڑ جاتی۔ آخر کار پھوپی اماں نے آ کر اُس بیچاری لڑکی کی جان چھڑائی اور انور کو ڈانٹا کہ وہ اپنی بہن کو تنگ کرنے کی بجائے باہر جا کر بیوپاریوں اور پھیری والوں سے نپٹنے میں ابّا کی مدد کیوں نہیں کرتا۔ بیاہ کی بھنک پا کر جوہریوں اور سناروں کے ساتھ بہت سے بیوپاری اور پھیری والے بھی اُس گھر کے چکّر لگانے لگے تھے۔ انور نے باہر دیکھا تو بیٹھک میں ہر رنگ کے کپڑے، چاندی، پیتل اور چینی کے برتنوں، میز کرسیوں، قالینوں، جوتوں اور یہاں تک کہ لحاف گدّوں اور تکیوں کے ڈھیر لگے تھے۔

ساری خریداری کی ذمّہ داری چودھری محمد عمر صاحب پر تھی اور وہ ہر بیوپاری سے بڑے رُعب کے ساتھ بات کرتے تھے، جیسے کوئی بڑا بیوپاری چھوٹے بیوپاری سے کرتا ہے۔ بیچ بیچ میں کسی چیز کو پسند کر کے وہ کہہ دیتے تھے۔ "اچھا اسے بھی رکھ لیں۔" اور اکبر علی کو تسلّی دینے کے لئے جنہیں ان سب چیزوں کے پیسے دینے تھے یہ بھی کہتے جاتے تھے۔ "اکبر علی میں یقین دلاتا ہوں کہ برسوں میں کسی نے اپنی بیٹی کو ایسا جہیز نہیں دیا ہوگا۔"

انور کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ بیاہ کی اِن ساری تیاریوں میں کسی چیز کی کمی ہے لیکن وہ یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ وہ کیا چیز تھی۔ محمد عمر صاحب کی باتیں سُنتے سُنتے ایک دن اچانک اُس کی سمجھ میں آگیا کہ کس چیز کی کمی تھی ــــ کمی تھی کاکا رامیشور دیال کی۔ وہ کئی دن سے بیٹھک میں دکھائی نہیں دیئے تھے۔

"ابّا ابّا"۔ اُس نے ہمّت کر کے پوچھا۔ اتنے دن سے کاکا کیوں نہیں آئے ہمارے یہاں؟"

"اپنی دُکان کے کام میں پھنسے ہوں گے۔" اکبر علی نے چھوٹا سا جواب دیا اور انور کو ایسا لگا کہ کسی وجہ سے اُس کے ابّا اُس کے اِس سوال سے خوش نہیں ہوئے تھے اور "اپنی دکان" سے اُن کا کیا مطلب تھا کیونکہ پہلے تو وہ ہمیشہ "ہماری دُکان" کہتے تھے۔ اِس درمیان کیا ہو گیا تھا۔؟

(۵)

اِس درمیان میں جو کچھ ہوا تھا وہ صرف اتنا ہی نہیں تھا کہ اکبر علی اور رامیشور دیال کی پُرانی ساجھے داری ختم ہو گئی تھی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی ساجھے داری بھی خلافت اور سوراج کی ملی جلی تحریک کے دوران مضبوط ہونے والا اُن کا اتحاد بھی خطرے میں پڑ گیا تھا اتحاد اور دیش بھگتی کی لہر اُترنے لگی تھی۔ سِول نافرمانی کی تحریک کے واپس لے لئے جانے کی وجہ سے ملک کی سیاسی زندگی میں ایک خلا پیدا ہو گیا تھا جسے بھرنے کے لئے دو ایک دوسرے کی مخالف تحریکیں چل پڑی تھیں۔ ایک مذہبی ہندو کانگریسی کو سزا کی میعاد پُوری ہونے سے پہلے ہی رہا کر دیا گیا تھا۔ سُنا جاتا تھا کہ اُنہیں اِس لئے رِہا کر دیا گیا تھا کہ اُنہوں نے یہ ارادہ ظاہر کر دیا تھا کہ وہ سیاسی معاملوں میں حصّہ نہ لے کر مذہبی کاموں میں ہی اپنا سارا وقت لگائیں گے۔ یہاں تک کہا جاتا تھا کہ کچھ بڑے بڑے سرکاری افسروں

نے انہیں یہ قدم اُٹھانے کے لئے اُکسایا تھا۔ کچھ بھی رہا ہو، پر اُنہوں نے جیل سے باہر آکر "شُدھی" کی تحریک شروع کی جس کا مقصد یہ تھا کہ اُن سب لوگوں کو جو ہندو نہیں تھے پھر ہندو بنا لیا جائے۔ اسی کے ساتھ ایک اور تحریک بھی شروع کی گئی جس کا مقصد تھا "سنگھٹن"۔ یعنی ہندو ہونے کی حیثیت سے ہندوؤں کی ایک لڑاکو تنظیم بنائی جائے اور اس کی مخالفت میں فوراً "تبلیغ" یعنی اللہ کا پیغام پھیلانے کی تحریک شروع کی گئی اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے مسلمانوں کی "تنظیم" شروع کی گئی۔ ہندو تحریک کی طرح ہی "تبلیغ" اور "تنظیم" کے جتھوں کی رہنمائی بھی ایک پُرانے کانگریسی رہنما کے ہاتھ میں تھی جو کسی زمانے میں اتحاد کے گُن گاتے تھے۔

اپنے ابا کی بات چیت کے دوران انور "شُدھی" اور "تبلیغ" جیسے لفظ سنتا تھا۔ لیکن وہ اُن کا پورا مطلب نہیں سمجھتا تھا لیکن اُس نے کبھی یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ اِن سب باتوں کا تعلق کاکا رامیشور دیال کے ساتھ اُس کے ابا کے تعلقات سے بھی ہو سکتا ہے کیونکہ انور کو یہی سکھایا گیا تھا کہ وہ اپنے ابا کے پُرانے ساجھے دار کو "کاکا" کہا کرے اور چاچا کی طرح اُن کی عزّت کیا کرے۔ انور نے ہمیشہ سے اُنہیں اپنے ہی گھر کا ایک آدمی سمجھا تھا اور ہمیشہ سمجھتا رہے گا۔ وہ اپنے سگے تایا امجد علی سے بھی زیادہ اُن کی عزّت کرتا تھا۔

اُس نے اپنے ابا کی اِس دلیل کو مان لیا تھا کہ کمبلوں کے بیوپار میں ساجھے داری اِس لئے ختم کر دی گئی تھی کہ اُنہیں صدر بازار میں چینی کے برتنوں کی دُکان میں لگانے کے لئے پیسوں کی ضرورت تھی اور رامیشور دیال خود کوئی دوسرا کاروبار کرنے کی سوچ رہے تھے۔ اُس نے اپنے ابا کی بات پر یقین تو کر لیا تھا پھر بھی نہ جانے کیوں یہ بات

اُس کے گلے کے نیچے نہیں اُترتی تھی۔ اور جب چودھری محمد عمر نے اُسے نصیحت کرتے ہوئے کہا تھا کہ "اور پھر بیٹا تمہیں یہ بھی سمجھنا چاہیئے کہ مسلمانوں کو اپنا اتحاد بنانا چاہیئے اور اِن کافروں کا ساتھ چھوڑ دینا چاہیئے" تو اُسے اُن کی نفرت بھری مسکراہٹ بالکل اچھی نہیں لگی۔

(۶)

جیسے جیسے شادی کا دن قریب آتا گیا انور کا زیادہ وقت اُسی میں صَرف ہونے لگا اور اُس کی دلچسپی بھی بڑھتی گئی۔ شادی کی تیاری میں بہت سا کام کرنے کو تھا ___ پُورے گھر پر سفیدی اور رنگ روغن ہونا تھا۔ بیٹھک کو پھر سے سجانا تھا۔ شادی میں آنے والے سب ہی لوگوں کے لئے کئی طرح کی منوں مٹھائی تیار کروانی تھی۔ بہت ہی پُرتکلّف زبان میں سینکڑوں دعوت نامے، خوبصورت کارڈوں پر چھپوا کر اکبر علی کے رشتے داروں، دوستوں اور اُن لوگوں کو بھیجے گئے تھے جن کے ساتھ بیوپار کے سلسلے میں اُن کا لین دین تھا۔ انور نے بھی ضِد کر کے اپنے سکول کے بہت سے ساتھیوں اور دوستوں کے پاس یہ دعوت نامے بھجوائے تھے۔ وہ ایک دعوت نامہ امرتسر میں اپنے دوست رتن کے پاس بھیجنا بھی نہیں بھُولا تھا۔ اُسے اُمیّد تھی کہ شاید اِس دعوت نامے کو وہ اُس دن کانگریس کے پنڈال میں نہ پہنچنے کے لئے معافی کا خط سمجھ لے۔

اگلے چاند کی بارہویں تاریخ کو تایا امجد علی اپنے بہت سے رشتہ داروں اور دوستوں کے ساتھ دو لاریوں پر گُڑگاوٴں سے دِلّی پہنچ گئے۔ لیکن اس بار وہ سب لوگ ایک دوسرے گھر میں ٹھہرے اور صرف تایا امجد علی کچھ آخری انتظامات کے سلسلے میں اپنے بھائی سے بات چیت کرتے وہاں آئے۔ انور، رؤف اور بلقیس سے ملنے جانا

چاہتا تھا کیونکہ وہ کئی سال سے اُن دونوں سے نہیں ملا تھا لیکن پھوپی اماں نے یہ کہہ کر اُسے نہیں جانے دیا کہ نکاح کی رسم پوری ہو جانے سے پہلے دُلہن کے بھائی کا براتیوں سے ملنے جانا مناسب نہیں ہے۔

شام کو سُورج ڈوبنے کے بعد مہمان آکر صحن میں بیٹھنے لگے۔ صحن میں قالین بچھے ہوئے تھے جن پر تکیے رکھے ہوئے تھے اور جگہ جگہ حُقے رکھے ہوئے تھے۔ زنان خانے میں پھوپی اماں کُنبے کی آدھے درجن بڑی بوڑھیوں کی مدد سے بھی اُن عورتوں کے بیٹھنے کا انتظام نہیں کر پا رہی تھیں جو بچوں کے غول لیکر وہاں آگئی تھیں اور جن کی زبان قینچی کی طرح چل رہی تھی۔ انور بھی اپنی نئی چمکدار ریشمی شیروانی میں بہت اچھا لگ رہا تھا۔ دُبلا اور چھوٹے قد کا ہونے کی وجہ سے کوئی اُسے تیرہ برس کا نہیں کہہ سکتا تھا اور اِس لیئے اُسے زنان خانے میں جانے کا "فری پاس" ملا ہوا تھا اور وہ خوشی میں مگن ہو کر بار بار اندر سے باہر اور باہر سے اندر آجا رہا تھا۔ ایک کونے میں بیٹھی ہوئی ڈومنیاں ڈھولک پر شادی کے گیت گا رہی تھیں لیکن مہمانوں کے قہقہوں اور مستقل بولنے کی آواز میں اُن کی باریک کھنک دار آواز مشکل سے ہی سُنائی دیتی تھی۔ عورتوں کے اور خاص طور پر جوان لڑکیوں کے لباس بس رنگوں کی بہار تھی —— ہر قسم کے شوخ، لال، نیلے اور ہرے رنگ۔ اِس موقع کے لئے خاص طور جو گیس کے ہنڈے لگوائے گئے تھے اُن کی روشنی میں اُن کے زیور جھلملا رہے تھے۔ ہوا میں طرح طرح کے عطروں کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ ہر بار جب انور کسی کام سے —— پان سُپاری لینے یا کار امیشور دیال کی طرف سے دُلہن کو دیئے گئے جوڑے اور گہنے پہنچانے —— اندر جاتا تھا تو اُسے ایسا لگتا تھا کہ وہاں کا سارا ماحول اُسے اپنی

طرف کھینچ رہا ہے۔ کبھی کوئی بڑی بوڑھی اُس کے سر پہ ہاتھ پھیر کر یا سینے سے لگا کر جب یہ کہتی کہ "ارے میرا بچہ اتنا بڑا ہو گیا" تو وہ کھسیا جاتا۔ جوان لڑکیاں کن انکھیوں سے اسے دیکھتیں پر کچھ شرما کر اُس سے دُور ہی رہتیں۔ بلقیس بھی جو پچھلے دو برسوں میں کئی انچ بڑھ گئی تھی اور اپنے نیلے غرارے کرتے اور کامدانی کے دوپٹے میں بالکل شہزادی لگتی تھی، انور سے کچھ شرما شرما کر ہی بات کرتی اور انور کو اُس کا یہ انداز بہت اچھا لگتا۔

برات قریب نو بجے آئی اور انور کو اپنے بھائی رؤف سے رشک ہونے لگا کیونکہ سب کی توجہ اسی کی طرف تھی۔ اُس کا قد اُس کی عمر کے لحاظ سے کچھ زیادہ ہی لمبا تھا۔ زری کی شیروانی اور گلابی پگڑی میں وہ بہت ہی شاندار لگ رہا تھا۔ اُس کے مُنہ پر پھُولوں کا سہرا پڑا ہوا تھا جس کی وجہ سے اُس کا چہرہ صاف نہیں دکھائی دیتا تھا۔ سجی ہوئی گھوڑی پر سے اُتر کر وہ بہت سنبھل سنبھل کر قدم رکھتے ہوئے اندر آیا اور اُسے صحن کے بیچ میں مخملی مسند کے پاس بٹھایا گیا۔ تھوڑی دیر میں دونوں طرف کے دو مولویوں نے شادی کی رسمیں شروع کیں۔ عربی میں قرآن کی جو آیتیں پڑھی گئیں اُنہیں چھوڑ کر باقی ساری رسمیں بہت ہی چھوٹی اور سیدھی سادی ثابت ہوئیں۔ انور کے ساتھ ایک مولوی صاحب اندر گئے اور کافی شور و غل کے بعد دُلہن کے کمرے کی طرف بڑھے۔ چھ سات بڑی بوڑھیوں کے بیچ میں گھری ہوئی لال کپڑوں کی ایک گٹھری کو مخاطب کر کے مولوی صاحب نے پوچھا۔ "انجم بیگم بنت اکبر علی، کیا تمہیں مبلغ پانچ ہزار روپے کے عوض عبدالرؤف ولد امجد علی کے ساتھ نکاح منظور ہے؟" لال کپڑوں کی گٹھری چُپ چاپ بیٹھی رہی، بلکہ وہ تو ہلی تک نہیں لیکن کسی بڑی بوڑھی نے چلّا کر کہا۔ "وہ کہتی ہے ہاں منظور ہے" اب کیا وہ بے حیا بن کر چلّا کر

لجے گی؟" اُس چھوٹی سی کوٹھری میں انور کا دم گھٹ رہا تھا اور وہ بالکل بوکھلا گیا تھا۔ وہ مولوی صاحب کے ساتھ باہر نکلنے کے لئے مُڑا ہی تھا کہ دُلہن کے جوڑے کی پرتوں میں سے ایک ہاتھ باہر نکلا اور اُس نے انور کو روک لیا اور انجم نے بہت آہستہ سے اُس کے کان میں کہا۔ "جب یہ سب کام ہو جائے تو ذرا آکر مجھ سے مل جانا"۔ اِس ڈر سے کہ کہیں وہ باقی رسم دیکھنے سے رہ نہ جائے انور بھاگ کر باہر پہنچا اور اُس نے سُنا کہ مولوی صاحب پوچھ رہے تھے۔ "عبدالرؤف ولد امجد علی کیا تمہیں پانچ ہزار روپے کے مہر پر انجم بیگم بنت اکبر علی کو اپنی بیوی بنانا منظور ہے؟" اور جب نوشہ نے تین بار کہہ دیا کہ "ہاں مجھے منظور ہے" تو فوراً چھوہارے بانٹے گئے اور دونوں سمدھیوں کو مبارکباد دی جانے لگی۔

(۷)

دُولہا اور اُس کے کچھ چُنے ہوئے دوستوں نے رات کو بیٹھک میں اڈّا جمایا۔ دُوسرے دن وہ لڑکی کو رخصت کرا کے اُس کے ساتھ جانے والے تھے۔ ہر طرف موج اور خوشی کا دور دورہ تھا اور کسی کو سونے کا خیال بھی نہیں آرہا تھا۔ نوجوان آپس میں ہنسی مذاق کر رہے تھے اور رؤف کی خوشی کا تو کہنا ہی کیا تھا۔ وہ اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ بیٹھا تاش کھیل رہا تھا اور باقی لوگ بڑی دلچسپی سے کھڑے تماشہ دیکھ رہے تھے

گھر کے اندر کچھ عورتیں تو جا چکی تھیں لیکن قریب کے رشتے دار رہ گئے تھے اور ڈومنیاں اب رات کے سنّاٹے کا فائدہ اُٹھا کر انہیں جی بھر گانا سُنا رہی تھیں۔ پھوپی اماں باورچی خانے میں تھیں اور مہتروں، بھشتیوں، کہاروں، نائیوں اور دوسرے نوکروں کو گلابو سے کھانا اور مٹھائی دلوا رہی تھیں۔ انور کیلئے اپنی بہن کے پاس جانے کا یہ اچھا موقع تھا۔

انجم اپنے پلنگ پر گٹھڑی بنی لیٹی تھی۔ بیاہ کے جوڑے کی اَن گنت پرتوں میں وہ

کھو کر رہ گئی تھی۔ انور دبے پاؤں اُس کے پاس گیا اور بولا "باجی! میں ہوں انور۔"

"ذرا دروازہ بند کر لو۔" انجم نے دبی آواز میں کہا۔ "نہیں تو میں تم سے کھُل کر بات نہیں کر پاؤں گی۔"

جب انور چٹخنی لگا کر مُڑا تو اُس نے دیکھا کہ انجم پلنگ کے کنارے پر بیٹھی ہوئی تھی اور میز پر رکھے ہوئے لیمپ کی روشنی میں اُس کا چہرہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔

انجم کا بدن چھریرا اور رنگ گورا تھا۔ عمر کے لحاظ سے اُس کا قد کچھ زیادہ لمبا تھا۔ اُس کی بڑی بڑی بادامی آنکھوں میں ابھی تک بچوں جیسی معصومیت تھی۔ اس کے ہاتھ بہت نازک تھے اور ہتھیلیوں پر رچی ہوئی مہندی کی وجہ سے اور بھی سفید لگتے تھے۔ اُس کی اُنگلیوں پر بہت سی نگوں والی انگوٹھیاں اور پتلی گردن میں سونے کا ایک بھاری سا ہار تھا۔ اُس کے سر پہ لگا ہوا جھومر ایسا لگتا تھا جیسے کوئی سُنہری تتلی آکر اُس کے بالوں میں پھنس گئی ہو۔

انور حیرت سے اُسے دیکھتا رہ گیا۔ کیا یہ آسمانی پری اُس کی وہی بہن تھی جس کے ساتھ وہ ہمیشہ سے کھیلتا اور لڑتا آیا تھا؟

انجم نے ہاتھ پکڑ کر اُسے اپنے پاس بٹھا لیا۔ اب جا کر انور نے دیکھا کہ اُس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔

"لیکن باجی تم تو رو رہی ہو۔" انور کو بہت تعجب ہو رہا تھا۔ اُس نے پوچھا "کیا تم اِس شادی سے خوش نہیں ہو؟"

انجم نے بڑے پیار سے انور کو گلے سے لگا لیا اور جواب دیا "تیری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ کل میں اِس گھر سے چلی جاؤں گی، ابّا سے، پھوپی اماں سے اور تم سے الگ ہو جاؤنگی۔

انور مجھے تو بہت ڈر لگتا ہے۔" اور یہ کہہ کر انجم کی آنکھوں سے گرم گرم آنسو اُس کے گالوں پر ڈھلکنے لگے۔

انور کے لئے یہ حالت بہت مشکل تھی کیونکہ وہ اپنی بہن کو ہمیشہ سے دانائی اور سنجیدگی کا مجسمہ سمجھتا آیا تھا اور اِس لئے اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح اُسے اطمینان دلائے۔ اُسے یہ تو پتہ نہیں تھا کہ وہ کس بات سے ڈر رہی تھی لیکن شادی کی ساری خوشی اُسی وقت غائب ہو گئی۔ اُس کے لئے اب یہ خوشیاں منانے، اچھّے اچھّے کپڑے پہننے اور دعوت اُڑانے کا موقع نہیں رہ گیا تھا۔ ایک پل میں اُسے اِس حالت کا اصل مطلب سمجھ میں آ گیا جس سے وہ اب تک اپنی معصومیت میں بے خبر تھا اُس کی خوشی میں اب ایک درد بھی شامل ہو گیا تھا —— اپنی پیاری بہن سے الگ ہو جانے کا درد —— کل انجم چلی جائے گی اور وہ گھر میں اکیلا رہ جائے گا۔ وہ کس کے ساتھ کھیلے گا؟ اب وہ کِسے چھیڑے گا؟ اب سکول سے لوٹنے پر کون پیار بھری مسکراہٹ سے اُس کا استقبال کرے گا۔ یہ سب سوچ کر وہ بھی انجم سے لپٹ کر رونے لگا۔ انجم پھر بڑی بہن کی طرح اُس کو دلاسا دینے لگی۔

(۸)

مکان میں سب سے اُوپر والی منزل پر ایک کوٹھری تھی جس میں گھر کا سارا غیر ضروری سامان بھرا رہتا تھا۔ انور چپ چاپ وہاں چڑھ گیا اور ایک ٹوٹی ہوئی چارپائی پر لیٹ گیا۔ وہ تنہائی چاہتا تھا۔

کھڑکی سے اُسے آسمان دکھائی دے رہا تھا جس پر ستارے جگمگا رہے تھے لیکن انور کے دل کو اُن سے کوئی سکون نہیں ملا۔ نیچے آنگن میں ڈومنیاں بہت

درد بھری آواز میں بابُل گا رہی تھیں۔ انور نے یہ گیت پہلے بھی کئی شادیوں میں سُنا تھا لیکن آج اِس گیت کا اثر خود اُس کے دل پر ہو رہا تھا۔ اُسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اُس کی بہن اپنے ابّا سے رو رو کر کہہ رہی ہے۔

کاہے کو بیاہی بدیس
ارے لکھّی بابُل میرے
ہم تو رے بابل بیلے کی کلیاں
گھر گھر مانگی جائیں
ہم تو رے بابُل کھونٹے کی گئیاں
ہانکو جدھر ہانک جائیں
ہم تو رے بابُل، چھاپے کی چڑیاں
رین بسے اُڑ جائیں۔

آدھی رات کو ڈومنیوں کا گانا بند ہوا لیکن انور کے دماغ میں وہ گیت گُونجتا رہا اور یہ سیانا لڑکا اِس مسئلے پر سوچتا رہا کہ خوشی اور درد ایک ساتھ کیوں رہتے ہیں۔

۹

اور خُدا سوتا رہا.....

(۱)

دِلّی کی گرمی۔ سارے شہر پر گرمی ایک بھٹکتے ہوئے بھوت کی طرح چھائی ہوئی تھی۔ تارکول کی سڑکوں سے، دکانوں پر پڑی ہوئی ٹین کی چھتوں سے، پکّی دیواروں سے، سڑک کی بتّیوں کے لوہے کے کھمبوں سے، غرض یہ کہ ہر چیز سے گرمی نکل رہی تھی۔ سنسان سڑکوں پر لُو کے گرم جھونکے چل رہے تھے اور دُھول اور کوڑا کرکٹ جمع کر کے بگولوں کی شکل میں اُڑا رہے تھے۔ آسمان پگھلے ہوئے تانبے جیسا لگ رہا تھا اور سُورج خود اپنی چکا چوند کرنے والی تیز روشنی میں گُم ہو گیا تھا۔ آسمان سے انگارے برس رہے تھے اور زمین سے آگ کی لپٹیں اُٹھ رہی تھیں۔ اور دونوں نے مل کر سارے شہر کو ایک جہنّم بنا دیا تھا، وہی جہنّم جس کے بارے میں انور نے مولوی صاحب سے بہت کچھ سُن رکھا تھا۔ دوپہر کے بعد تین چار گھنٹے تک سارا شہر سوتا تھا۔ دُکاندار اپنی

دکانوں کے آگے موٹے موٹے بھاری پردے ڈال کر اندر سو جاتے تھے۔ خوش حال لوگ خس کے خوشبودار پردے لگا کر اپنے اپنے گھروں کے سب سے اندر والے ٹھنڈے اندھیرے کمروں میں سو جاتے تھے اور ان پردوں پر پانی چھڑکنے کے لئے باہر ایک آدمی مقرر کر دیتے تھے۔ سڑک پر آمد و رفت بالکل بند ہو جاتی تھی۔ کبھی کبھی کوئی بیل گاڑی چرچر کرتی ہوئی سڑک پر سے گذرتی تھی اور پیاسے بیلوں کی سوکھی زبانیں باہر نکلی رہتی تھیں۔

اکبر علی کے مکان میں ایک ٹھنڈا اندھیرا تہہ خانہ تھا جس میں ہر وقت سیلن کی بُو آتی رہتی تھی۔ روز گیارہ بجے سکول سے لوٹ کر کھانا کھانے کے بعد انور اسی تہہ خانے میں بند ہو جاتا۔ اکبر علی شاید ہی کبھی تہہ خانے میں جاتے۔ اُنہیں اپنی بیٹھک زیادہ پسند تھی۔ وہ وہیں خس کا پردہ لگا کر لیٹتے تھے۔ لیکن پھوپی اماں کو تو ہر وقت یہ ڈر لگا رہتا تھا کہ اُن کا لاڈلا بھتیجا کہیں دھوپ میں کُمہلا نہ جائے، ٹھیک اسی طرح جیسے جاڑے بھر اُنہیں اس بات کی فکر رہتی تھی کہ کہیں اُسے زکام نہ ہو جائے، اِس لئے آنگن میں لگے ہوئے کُٹھل کا سایہ پوری طرح سمٹ کر اُس کی جڑ میں آجانے سے پہلے ہی وہ ہمیشہ انور کو تہہ خانے میں بھیج دیتی تھیں۔

(۲)

انور اپنی پھوپی اماں کا کہنا مان کر فوراً تہہ خانے میں چلا جاتا تھا۔ تہہ خانے میں قدم رکھنے سے پہلے وہ تھوڑی دیر آنکھیں بند کر کے سیڑھیوں پر کھڑا رہتا تھا تاکہ اُسے اندھیرے کی عادت ہو جائے۔ جب وہ آنکھیں کھولتا تھا تو چاروں طرف پھیلے ہوئے اندھیرے میں اُسے چارپائیوں پر بچھے ہوئے بستروں کی سفید چادریں دکھائی

دیتیں۔ وہ جاکر اپنی چارپائی پر لیٹ جاتا۔ ٹھنڈے تکیئے پر جب وہ اپنے گرم گال رکھتا تو اُسے بہت مزا آتا تھا۔

انور چارپائی پر لیٹ گیا اور اُس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں پر اُسے نیند نہیں آئی۔ اُس کے خیالات اِدھر اُدھر بھٹک رہے تھے۔ انور کو اِس بات پر ہمیشہ تعجب ہوتا تھا اور اس کے سکول کے ماسٹروں کو بھی اُس سے یہ شکایت تھی کہ وہ تیز تو بہت تھا پر کسی چیز میں دیر تک دھیان نہیں لگا سکتا تھا۔ اس کی کیا وجہ تھی؟ جب وہ حساب کا کوئی سوال کرتا تھا یا جیومیٹری کے کسی مسئلے کو حل کرتا تھا تو کبھی کبھی اُس کا دھیان بھٹک کر باہر تار کے کھمبے پر بیٹھی ہوئی چڑیوں کی طرف چلا جاتا تھا اور وہ اُن بڑے بڑے کبوتروں کے بارے میں سوچنے لگتا تھا جو اُس نے کئی بار آسمان پر اُڑتے دیکھے تھے ــــ اب وہ اتنا تو جان گیا تھا کہ ان بڑے بڑے کبوتروں کو ہوائی جہاز کہتے ہیں۔ وہ اپنے تصوّر میں اُن دُور کے ملکوں کے بارے میں سوچنے لگتا تھا۔ جہاں ان کبوتروں کی پیٹھ پر بیٹھ کر جایا جا سکتا تھا۔ وہ انگلینڈ اور امریکہ کے بارے میں سوچتا رہتا تھا اور یہ اندازہ لگانے کی کوشش کرتا تھا کہ وہاں کس طرح کے لوگ رہتے ہوں گے۔ اُس نے اپنے سکول کی کتابوں میں انگلینڈ کے بارے میں بہت کچھ پڑھا تھا۔ وہاں بادشاہ رہتا تھا اور سب وائسرائے وہیں سے آتے تھے۔ وہاں بہت بڑے بڑے شہر تھے دلّی سے بھی بڑے اور ان میں سب سے بڑا شہر تھا لندن۔ اور امریکہ! وہ تو پریوں کا دیس تھا۔ وہاں سے جادو کی "چلتی پھرتی" تصویریں آتی تھیں جنہیں اُس نے بائیسکوپ کے پردے پر دیکھا تھا ــــ ہاں ایسی تصویریں جو سچ مچ چلتی تھیں اور عجیب عجیب حرکتیں کرتی تھیں۔ بھاگتی ہوئی موٹریں، سرپٹ

دوڑتے ہوئے گھوڑے اور خوبصورت عورتوں کے پیچھے بھاگتے ہوئے لمبی لمبی مونچھوں والے جنگلی مرد۔ سچ مچ یہ بائیسکوپ بہت ہی عجیب سی چیز تھی اور انور یہ جاننا چاہتا تھا کہ یہ تصویریں آخر "چلتی" کیسے ہیں؟

یہ تصویریں بالکل سچ مچ کے آدمیوں جیسی لگتی تھیں۔ اُسے ایک بہت ہی مسخرا آدمی اچھی طرح یاد تھا جس کی تصویریں اُس نے دیکھی تھیں ــــ اُس کے چھوٹی چھوٹی مونچھیں تھیں، وہ اوندھے پیالے جیسی ہیٹ پہنتا تھا، اُس کی پتلون تھیلے کی طرح لٹکتی رہتی تھی اور وہ ہمیشہ ہاتھ میں چھڑی لیے رہتا تھا اور وہ منہ ایسا بناتا تھا کہ ہنسی روکنا مشکل ہو جاتا تھا۔ انور کو اپنے ان خیالوں پر بے ساختہ ہنسی آ گئی۔

اُس کے خیالوں کو توڑتی ہوئی ماسٹر صاحب کی سخت آواز گونج اٹھی۔ "انور! ہنس کس بات پر رہے ہو؟ سوال کر لیا اپنا؟"

انور انہیں کس طرح سمجھاتا کہ کھڑکی کے باہر نظر جاتے ہی اُس کے دماغ میں کبوتروں اور ہوائی جہازوں اور "چلتی پھرتی" تصویروں کے خیالات گھومنے لگے تھے اور اپنا سوال کرنے کی بجائے وہ اُس مسخرے آدمی کی حرکتوں پر ہنس رہا تھا جسے اُس نے پچھلے ہفتے بائیسکوپ میں دیکھا تھا؟ اس لئے اُس نے چپ چاپ ماسٹر صاحب کی ڈانٹ سن لی۔

(۳)

ہاں اُس کے خیال سچ مچ بہت زیادہ بھٹکنے لگے تھے۔ تہہ خانے میں لیٹے لیٹے سب سے پہلے تو اُسے اپنی بہن انجم کا خیال آیا۔ انجم کی شادی کو چھ مہینے ہو چکے تھے لیکن انور ابھی تک گھر میں اُس کی غیر موجودگی کا عادی ہو نہیں پایا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ اُس کی زندگی

کا ایک گوشہ خالی ہو گیا ہے جسے انجم کے ہر ہفتے آنے والے خط بھی نہیں بھر سکتے۔
وہ اپنے بھائی کو بڑے پیار بھرے خط لکھتی تھی لیکن اُس میں وہ اپنے نئے گھر میں اپنی زندگی کے بارے میں کچھ نہیں لکھتی تھی۔ اب وہ لوگ گڑگاؤں میں نہیں تھے۔ امجد علی دلّی سے کوئی سو میل دُور سلام پور نام کی ایک ریاست میں وزیر لگ گئے تھے، یہ بہت بڑا عہدہ تھا اور اب امجد علی جب بھی دلّی آتے تھے تو اُن کے ساتھ سنہری اور لال وردی پہنے ہوئے دو چپراسی ہوتے تھے اور وہ بہت بڑھیا موٹر میں گھومتے تھے جس کی نمبر پلیٹ پر اُس ریاست کا نام بھی لکھا ہوتا تھا۔ انور کو یقین تھا کہ سلام پور میں انجم بہت خوش ہوگی کیونکہ وہاں اتنے بہت سے نوکر چاکر، بڑھیا موٹر اور بے شمار روپیہ پیسہ وغیرہ تھے۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد رؤف نے کالج میں نام لکھوانے کا ارادہ چھوڑ دیا تھا اور ریاست کی پولیس میں ایک نوکری کے لئے عرضی دی تھی کیونکہ پولیس کا محکمہ اُس کے ابّا کے ہی ماتحت تھا اِس لئے اُسے یہ نوکری مل جانے میں کوئی شک نہیں تھا۔

رؤف کے خیال سے انور کو کبھی خوشی نہیں ہوتی تھی۔ وہ نہ صرف اُس کا چچیرا بھائی تھا بلکہ اب تو بہنوئی بھی تھا لیکن پھر بھی نہ جانے کیوں انور اُس کے بارے میں پیار اور محبّت کے ساتھ نہیں سوچ سکتا تھا۔ اِس ضدّی اور گھمنڈی لڑکے کے بارے میں سوچتے ہی انور کے دل میں نہ جانے کیوں مخالفت کا جذبہ پیدا ہو جاتا تھا۔ اس لئے وہ رؤف کی طرف سے دھیان ہٹا کر اُس کی بہن بلقیس کے بارے میں سوچنے لگا۔ بلقیس کا خیال آتے ہی انور کے دل میں پیار اُمنڈ پڑتا تھا۔ اُسے اب تک گڑگاؤں کے کھیتوں کی وہ سیر یاد تھی اور یہ بھی یاد تھا کہ بھاگتے وقت بلقیس کی چوٹی کس طرح پھدکتی رہتی تھی

اُس وقت سے وہ بڑی ہو کر ایک اچھی خاصی خوبصورت لڑکی بن چکی تھی۔ لیکن انجم کی شادی میں بلقیس اُس سے اتنا شرماتی کیوں رہی اور اتنی کھنچی کھنچی کیوں رہی؟ ان تین برسوں میں کیا بات ہو گئی تھی جس کی وجہ سے اُن کے آپس کے تعلقات میں ایسی تبدیلی آ گئی تھی کہ وہ اب کھل کر بے جھجک ہنس بول بھی نہیں سکتے تھے؟ انور کافی دیر تک اس مسئلے کے بارے میں سوچتا رہا۔ پھر اُس کے سامنے خود اپنا مسئلہ آ گیا۔ تین سال پہلے اُسے بلقیس کے ساتھ کھیلنے اور بھاگنے دوڑنے میں اُس کی چوٹی کھینچنے میں اور اُسے چھیڑنے میں بہت مزا آتا تھا۔ لیکن اس بار جب اُس نے بلقیس کو دیکھا تھا تو اُس کا جی چاہا تھا کہ وہ دیر تک اُسے تکتا رہے اور جب اُس کی بڑی بڑی آنکھیں شرم سے جھکی ہوئی پلکوں کے پیچھے چھپی ہوئی نہ ہوں تب ان آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتا رہے۔ اس وقت بھی اُسے وہ سب پوشاکیں یاد تھیں جو بلقیس نے شادی کے دنوں میں پہنی تھیں....

وہ ان مسئلوں کو کسی طرح حل نہیں کر پا رہا تھا کہ انسان کے آپس کے رشتے کیوں بدلتے رہتے ہیں۔ اسی ادھیڑ بُن میں اُسے اپنے دوست رتن کا خیال آیا جس کے بارے میں اُسے کئی مہینے سے کوئی خبر نہیں ملی تھی، بس بیچ میں ایک بار اُس نے انجم کی شادی کی دعوت کے جواب میں شکریے کا ایک بہت ہی رسمی سا خط بھیجا تھا۔ اُس کے اس خط سے ظاہر تھا کہ اُس نے انور کو کانگریس کے پنڈال میں وعدے کے مطابق نہ پہنچنے کے لئے معاف نہیں کیا تھا۔ انور کچھ جھنجلا کر سوچنے لگا کہ "یہ رتن ضرورت سے زیادہ سیاسی ہو گیا ہے۔ وہ کسی دوسری چیز کے بارے میں نہ بات کر سکتا ہے، نہ لکھ سکتا ہے۔" پھر بھی وہ اپنے دوست سے ملنے کیلئے کتنا بے تاب تھا۔

جب سُورج ڈھل گیا تو شہر میں جیسے پھر سے جان آگئی۔ نہا دھو کر لوگ اپنے اپنے گھروں سے نکل آئے اور ایک بار پھر بازار میں چہل پہل ہو گئی۔ جامع مسجد کی سیڑھیوں پہ شربت کی دُکانوں پر اور قلفی والوں کے پاس بھیڑ جمع ہو گئی۔ جامع مسجد اور لال قلعہ کے بیچ میں جو میدان پڑا ہوا تھا، جہاں گورے سپاہی پریڈ کرتے تھے وہاں ایک اچھا خاصا تماشہ جم گیا۔ نٹ، بازی گر، ہر مرض کی دوا بیچنے والے کباڑی ہر مال ملے گا دو پیسے والے، اونچی آواز میں گا گا کر گانوں کی کتابیں بیچنے والے، پیتل کے کٹورے بجاتے ہوئے مشک سے برف کا ٹھنڈا پانی پلاتے والے ـــ یہ سب کے سب اچانک نہ جانے کہاں سے نکل پڑے۔ شاہ سرمد کے مزار کے پاس، جن کا سر مغل بادشاہ اورنگ زیب کے حکم سے اُڑوا دیا گیا تھا، ہمیشہ کی طرح فقیروں اور مُریدوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی اور قوّالی ہو رہی تھی۔ وہاں سے کچھ ہی دُور پہ ایک پادری اردو میں مسیحی لٹریچر کی کتابیں بانٹ رہے تھے۔

انور کو اپنا شام کا وقت اِس ہنگامے کے درمیان بِتانا بہت پسند تھا۔ شام کے دُھندلکے میں یہاں کا نظارہ آدھی حقیقت اور آدھا خواب معلوم ہوتا تھا۔ یہاں وہ بھیڑ کے ساتھ گھل مل جاتا تھا اور اِدھر اُدھر گھومتا رہتا تھا جیسے سمندر کی لہروں پر سوار ہو۔

آج انور ہمیشہ سے زیادہ خوش تھا۔ اُس کے ابا نے اُس سے کہا تھا کہ جب وہ میٹرک پاس کر لے گا تو اُس کا نام علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں لکھوا دیا جائے گا۔ انور نے اِس یونیورسٹی کی اجتماعی زندگی کے بارے میں بہت کچھ سُن رکھا تھا اور

یہ سوچ سوچ کر وہ پھولا نہیں سما رہا تھا کہ گھر کی پھیکی بے رنگ زندگی کی بجائے (جو انجم کی شادی کے بعد اور بھی بے رنگ ہو گئی تھی) اب اُسے اپنی ہی عمر کے سینکڑوں لڑکوں کے ساتھ زندگی بتانے کا موقع ملے گا۔

بہت خوش خوش وہ بھیڑ میں اِدھر اُدھر ٹہل رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اُس جگہ سے گذرا جہاں "دو سر اور پانچ ٹانگوں والا بچھڑا" دکھایا جا رہا تھا۔ پھر وہ گھومتا گھومتا ایک دوسری بھیڑ میں جا کھڑا ہوا۔ وہاں ایک بازی گر نے ایک آدمی کو مسمریزم سے بے ہوش کر دیا تھا اور اُس سے طرح طرح کے سوالوں کے جواب دلوا رہا تھا اور وہ بے ہوش آدمی نہ جانے کیسے ہر سوال کا جواب صحیح صحیح دیتا تھا۔ "سفید شیروانی اور لال ترکی ٹوپی والے لڑکے کی جیب میں کتنے پیسے ہیں؟" بازی گر نے پوچھا اور زمین پر بے ہوش لیٹے ہوئے آدمی نے چادر کے نیچے سے جواب دیا۔ "چودہ آنے!" انور نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر پیسے باہر نکالے ایک اٹھنّی، ایک چونّی، ایک اکنّی اور چار پیسے، پورے چودہ آنے تھے۔ ہر آدمی انور کو دیکھنے لگا۔ انور کچھ ایسا کھسیا گیا کہ اُس کے پسینہ چھوٹنے لگا اور وہ اِس بات پر حیرت کرتا ہوا وہاں سے چل دیا کہ اِس میں کتنی بازی گری ہے اور کس حد تک سچ مچ خفیہ باتوں کا پتہ لگا لینے کی طاقت۔ اُس کے ابّا جادوگروں، نجومیوں، مسمریزم کرنے والوں اور دوسرے بازی گروں کا ہمیشہ مذاق اڑایا کرتے تھے لیکن انور کے دماغ میں چودہ آنے والی پہیلی جوں کی توں قائم رہی۔

وہاں سے آگے بڑھ کر انور ایک دوسری بھیڑ میں جا پہنچا، جہاں بہت سے لوگ آدمی کے چاروں طرف گھیرا باندھے کھڑے تھے اور وہ آدمی گلا پھاڑ پھاڑ کر

کچھ کہہ رہا تھا۔ یہ ایک دوسری طرح کا مسمریزم تھا اور ہر آدمی اپنی جگہ پر مورتی کی طرح کھڑا ہوا اُس مقرّر کے الفاظ کے بہاؤ کو دنگ رہ کر سُن رہا تھا۔ انور نے سوچا کہ یہ کوئی سیاسی پرچارک ہوگا۔ جو کسی بہت انقلابی بات کا پرچار کر رہا ہے کیونکہ اُس آدمی کی آواز میں بے حد جوش تھا اور وہ بڑی لگن اور محنت سے اپنی بات سمجھا رہا تھا حالانکہ اُس کے میلے کچیلے سُوٹ، اور تیل میں چپڑے ہوئے بالوں کو دیکھنے سے وہ کسی طرف سے لیڈر نہیں معلوم ہوتا تھا۔ وہ بڑی روانی کے ساتھ لچھّے دار ہندوستانی میں تقریر کر رہا تھا "بھائیو، میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کسی قوم کی طاقت کا کیا راز ہوتا ہے؟ انگریز کس چیز کی بدولت آج ساری دنیا کے چودھری بنے بیٹھے ہیں؟ کس چیز نے آج امریکہ کو دنیا کا سب سے امیر ملک بنا دیا ہے؟ کس چیز کے بل پر جاپان دیکھتے دیکھتے دنیا کی ایک بڑی طاقت بن بیٹھا ہے؟" پھر وہ بڑے ڈرامائی انداز سے ایک لمحے کے لئے رُکا اور ہر آدمی، انور بھی دم سادھ کر ان سوالوں کے جواب کا انتظار کرنے لگا۔ "بھائیو میں آپ کو بتاتا ہوں۔ اس کا راز ہے اچھی صحت اور طاقتور جسم ہمارے بزرگ کہہ گئے ہیں کہ 'صحت لاکھ نعمت ہے' 'جان ہے تو جہان ہے' لیکن جب آپ اپنی نوجوانی کی غلطیوں سے اپنے ہاتھوں، اپنی صحت لُٹا دیتے ہیں، جب آپ اپنی پھُول جیسی جوانی کو مسل کر خاک میں ملا دیتے ہیں تو آپ کی صحت اچھّی کیسے بن سکتی ہے؟ میرے پاس یہ گولیاں ہیں۔۔۔"

تو یہ بات تھی! دھواں دھار تقریر کرنے والے یہ صاحب طاقت کی گولیاں بیچتے تھے! یہ معلوم کر کے انور مُسکرا دیا اور آگے بڑھ گیا۔

ایک پان والے کی دُکان پر اُسے گوپال دکھائی دیا جو پچھلے سال فیل ہو گیا تھا

اور اس لیے اب وہ انور کے ساتھ نہیں تھا لیکن اُن دونوں کی دوستی اب بھی باقی تھی۔ اُن کی دوستی ایک جیسی چیزوں کو پسند کرنے کی وجہ سے نہیں بلکہ اس وجہ سے تھی کہ اگر ایک پورب تھا تو دوسرا پچھم۔ گوپال مست اور بے فکرا قسم کا لڑکا تھا۔ اُسے اچھے کپڑے پہننے کا شوق تھا اور ہر وقت اُس کی جیب میں ڈھیروں پیسے کھنکتے رہتے تھے۔ انور دل ہی دل میں گوپال سے بہت متاثر تھا کیونکہ گوپال میں خود اعتمادی تھی اور وہ دنیا کو سمجھتا تھا اور زندگی کو ایک دلچسپ کھیل سمجھ کر اُس کا مزا لیتا تھا۔ دوسری طرف گوپال بھی اس دُبلے پتلے، بھولے اور جھینپو لڑکے کی طرف اس لیے کھنچتا تھا کہ اُسے کھیل کے مقابلے میں کتابوں میں زیادہ دلچسپی تھی۔

انور کو ایک دوست سے ملنے کی بہت خوشی تھی اور وہ لپک کر بڑے تپاک سے گوپال سے ملا۔ ٹھیکیدار کے بیٹے نے فوراً اُسے قُلفی کھانے کی دعوت دی۔

"بھئی شکریہ، مجھے تو قلفی کھانا منع ہے۔ میرا گلا خراب ہو جاتا ہے۔" انور کو اپنی کمزور صحت کا ذکر کرتے ہوئے بڑی شرم آتی تھی۔

"تو کم سے کم ایک پان تو کھاؤ۔"

"نہیں رہنے دو، میں پان نہیں کھاتا۔ ابّا پان کھانے کو منع کرتے ہیں۔"

"اوہ، تم بھی کیسے پھیکے آدمی ہو۔ اچھا، ہمارے ساتھ چلو گے تو؟ مجھے ذرا سائکل کا ایک لیمپ خریدنا ہے۔"

دونوں ساتھ ساتھ کئی دکانوں پر گئے۔ کبھی ایک دکان پر رُک کر کوئی چیز دیکھنے لگتے تو کبھی دوسری دکان پر۔ سائیکل کے لیمپ کا انہیں دھیان ہی نہیں رہا۔ دکانوں پر بتیاں جل گئی تھیں مگر ابھی تک اُن کی خریداری پوری نہیں ہوئی تھی

گھومتے گھومتے وہ مسجد کے مغرب کی طرف والی دکانوں پر پہنچے جہاں مسجد کی اونچی دیوار کے سامنے میں طرح طرح کے کپڑوں، رنگین رومالوں اور تولیوں وغیرہ کی دکانیں تھیں۔ گوپال نے ایک ریشمی رومال خریدا اور دکاندار پانچ روپے کے نوٹ کے باقی پیسے ابھی لوٹا بھی نہیں پایا تھا کہ بھاگتے ہوئے لوگوں کے قدموں کی آواز اور "مارو! مارو!" کا شور اُن کے کانوں میں پڑا اور اُس کے فوراً ہی بعد "مار ڈالا! مار ڈالا!" کی چیخیں سنائی دیں۔ اس سے پہلے کہ وہ سمجھ پاتے کہ ماجرا کیا ہے دکانداروں نے جلدی جلدی اپنی دکانیں بند کر دیں، اور لوگ ڈر کر ہر طرف بھاگنے لگے۔ جان کا خطرہ دیکھ کر، دونوں لڑکے چاوڑی بازار کی طرف بھاگے جہاں جلدی جلدی لوگ اپنی دکانیں بند کر کے بھاگ رہے تھے ——— یہ کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ کس چیز سے ڈر کر بھاگ رہا ہے۔ مسجد کے مینار پر سے مؤذن نے اذان دے کر مومنوں کو نماز کے لئے بلایا اور اُسی وقت پاس کے کسی مندر میں گھنٹہ بجنے لگا۔ ایک تانگا سرپٹ بھاگتا ہوا اُن کے پاس سے گزر گیا ——— لوگ تتر بتر ہو گئے ——— کوئی داہنے بھاگا، کوئی بائیں اور چاروں طرف اور زیادہ گڑبڑی پھیل گئی۔ کہیں کوئی بچہ رو اُٹھا، کوئی عورت چیخ پڑی اور کسی نے انور اور گوپال کو گھسیٹ کر ایک تنگ و تاریک زینے پر پہنچا دیا۔

"بیٹا، ہندو مسلم فساد ہو گیا ہے"۔ اُس آدمی نے بڑی ہمدردی سے کہا۔ سڑک کی دوسری طرف سے کوئی درد بھری آواز میں چلّایا۔ "مار ڈالا" اور اُس کے بعد ہی ایک عجیب سی گڑگڑاہٹ اور کراہ سنائی دی ——— اور پھر خاموشی چھا گئی۔ انور نے سوچا کہ "کوئی مارا گیا" اور یہ سوچتے ہی اُسے متلی ہونے لگی۔ لیکن وہ ہندو تھا کہ مسلمان؟ اندھیرے میں سے اُسی آواز نے پھر بڑے پیار سے کہا۔ "بیٹا اگر میں

تمہاری جگہ ہوتا تو اس وقت سڑک پر نہ نکلتا۔ تم لوگ تھوڑی دیر یہیں ٹھہرو۔ میں جا کر اپنی دکان پر دیکھتا ہوں کہ وہاں سب لوگ خیریت سے ہیں کہ نہیں۔" اندھیرے میں سے ایک پرچھائیں نکل کر سنسان سڑک پر غائب ہو گئی اور ایک بار پھر انور سوچنے لگا۔ اس آدمی نے ہماری ــــ ایک ہندو اور ایک مسلمان لڑکے کی ــــ جان بچائی ہے اور ہمیں یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ خود ہندو تھا یا مسلمان۔

(۵)

نہ جانے کتنی دیر تک وہ اُن تنگ و تاریک سیڑھیوں پر بیٹھے رہے۔ گوپال یوں تو بہت تیس مار خاں بنتا تھا لیکن وہ بہت بُزدل نکلا۔ وہ لگاتار گھگھیا کر یہی کہہ رہا تھا "ارے بھگوان! اب کیا ہو گا؟" ڈر تو انور کو بھی لگ رہا تھا لیکن ڈر سے زیادہ اُسے اِس حادثے کی دردناکی اور حماقت پر غُصّہ آ رہا تھا۔ ہندو مسلم فساد! لیکن آخر کیوں؟

اُس نے دوسرے شہروں میں اس طرح کے فسادات ہونے کی خبریں سُنی تھیں لیکن وہ بہت دُور کے حادثے معلوم ہوتے تھے جو دِلّی میں کبھی نہیں ہو سکتے تھے۔ ابھی کچھ ہی دیر پہلے تک کیا ہندو اور مسلمان آزادی سے اپنا اپنا کام نہیں کر رہے تھے؟ اُن کے دلوں میں ایک دُوسرے کی طرف سے کوئی مَیل نہیں تھا، اُنہیں اِس بات کا کوئی ڈر نہیں تھا کہ کوئی انہیں چھرا مار دے گا۔ لیکن ایکدم سے کیا ہو گیا تھا؟ آخر گوپال بھی تو ہندو تھا اور وہ خود مسلمان تھا؟ پھر بھی اُس کے دل میں گوپال کو مار ڈالنے کا کوئی خیال نہیں تھا اور اُسے یقین تھا کہ گوپال بھی اُس کی جان نہیں لینا چاہتا تھا۔ پھر دوسرے، گوپال اور انور بھی اسی طرح دوست

کیوں نہیں رہ سکتے تھے؟ آخر کیوں؟

ان کے پیچھے سے کوئی سیڑھیاں اُتر رہا تھا اور ابھی اِس حالت میں دونوں لڑکے دہشت کے مارے چیخ اُٹھے۔

"کون ہے؟ تم لوگ یہاں کیا کر رہے ہو؟"

وہ کسی عورت کی آواز تھی۔ یہ دیکھ کر دونوں کی ہمّت بندھی۔

"ہم۔۔۔ہم۔۔۔" انور نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ "آپ جانتی ہیں باہر فساد ہو رہا ہے۔ لوگ مارے جا رہے ہیں۔ اس لیئے۔۔۔اِس لیئے۔۔۔کسی نے ہم سے کہا کہ جب تک لڑائی دنگا ختم نہ ہو جائے ہم یہاں بیٹھے رہیں۔"

اب تک گوپال کی بھی جان میں جان آ چکی تھی۔ اُس نے اُس عورت سے جس کا چہرہ اُنہیں اب بھی نہیں دکھائی دے رہا تھا، کہا۔ "بائی جی اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو ہم کچھ دیر کے لیے اندر آ جائیں۔ اِن سیڑھیوں پر بیٹھے بیٹھے تو ہماری ٹانگیں اکڑ گئیں۔"

"اچھی بات ہے آ جاؤ۔ لیکن تم دونوں تو ابھی بچے ہو۔" اور جس ڈھنگ سے اُس نے انہیں "بچے" کہا اُس میں حقارت بھی تھی اور مایوسی بھی۔ انور نے اِس بات کو محسوس تو کیا پر وہ اس کا مطلب اُس وقت نہیں سمجھ پایا جب تک کہ گوپال نے اُس کے کان میں یہ نہیں کہا کہ "یار ہم لوگ بڑے قسمت والے ہیں یہ تو رنڈی کا گھر ہے؟"

رنڈی؟ اُن "دوسری عورتوں" میں سے ایک جنہیں انور نے ایک بار اسی بازار سے گذرتے وقت دیکھا تھا، لیکن اُس کے ابّا نے کہہ رکھا تھا کہ شریف آدمیوں

کو اُن کی طرف دیکھنا بھی نہیں چاہیئے، اُن کے گھر میں جانا تو دور رہا۔ سیڑھیوں کے اُوپر پہنچ کر اُس کے قدم اپنے آپ رُک گئے۔ لیکن گوپال اُسے کھینچ کر ایک کمرے میں لے گیا جو بجلی کی روشنی میں چمک رہا تھا۔ وہاں پہنچ کر جب انور بیوقوفوں کی طرح پلکیں جھپکانے لگا تو ایک زور کا بھونڈا قہقہہ پڑا۔

(۶)

اُس کمرے کی سجاوٹ کچھ عجیب ہی ڈھنگ کی تھی۔ فرش پر ایک سفید چاندنی بچھی ہوئی تھی جس میں بہت سے پیروں تلے روندے جانے کی وجہ سے بے شمار سلوٹیں پڑ گئی تھیں اور کئی جگہ اس پر پان کے دھبّے بھی پڑے ہوئے تھے دیواروں پر بڑے بڑے آئینے اور آدھ ننگی اور ننگی عورتوں کی تصویریں لگی ہوئی تھیں جنہیں دیکھ کر ہی انور کا منہ شرم سے لال ہو گیا۔ کمرے کے دُوسرے سِرے پر ایک دروازہ تھا جس پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ یہ دروازہ ایک دُوسرے کمرے میں جاتا تھا اور ایک بار جب کوئی نوکر اندر سے نکل کر آیا تو انور نے دیکھا کہ وہاں ایک مسہری پڑی ہوئی ہے۔

کمرے میں زیادہ لوگ نہیں تھے۔ وہ عورت جو اُن دونوں کو سیڑھیوں پر ملی تھی لگ بھگ پینتالیس برس کی بھرے بدن کی عورت تھی۔ وہ بیچ میں بیٹھی ہوئی سامنے ایک بڑا سا پاندان رکھے پان لگا رہی تھی۔ دو لڑکیاں جن میں سے ایک کی عمر لگ بھگ بیس برس کی تھی اور دُوسری کی اس سے بھی کچھ کم رہی ہو گی ایک طرف بیٹھی تھیں۔ وہ شلواریں اور تنگ کُرتے پہنے تھیں جن کی وجہ سے اُن کے جسم کی گولائیاں بہت زیادہ نمایاں ہو گئی تھیں۔ وہ دونوں

سانولی تھیں لیکن اُن کے گالوں پر ڈھیروں سُرخی اور پاؤڈر مُپتا ہوا تھا۔ وہ دونوں دکھاوے کے لئے بہت شرمائی ہوئی بیٹھی تھیں لیکن جس طرح وہ اُن دونوں لڑکوں کو کنکھیوں سے دیکھ رہی تھیں اُس میں شرارت صاف جھلکتی تھی۔ نہ جانے کیوں انہیں دیکھ کر انور کو اُس پھرتیلے چیتے کی یاد آگئی جسے اُس نے ایک بار سرکس میں دیکھا تھا۔ اُن دونوں لڑکیوں کے جسم بھی اُسی چیتے کی طرح تھے اور ایسا لگتا تھا کہ وہ کسی شکار پر حملہ کرنے کے لئے تیار ہو رہی ہیں۔ انور کو اُن کی طرف دیکھتے ہوئے بھی ڈر لگتا تھا کہ کہیں اُن سے اُس کی آنکھیں چار نہ ہو جائیں کیوں کہ اُس سے اُسے ایک عجیب سی اُلجھن ہوتی تھی اور اُس کے دل میں ایسی عجیب عجیب اُمنگیں اُٹھتی تھیں جن میں کشش بھی تھی پر جن سے اُس کا دُور بھاگنے کو جی چاہتا تھا۔ تھوڑی دور پر کچھ سازندے بیٹھے دھیمی آواز میں فسادات کے بارے میں باتیں کر رہے تھے اور یہ سوچ رہے تھے کہ وہ گھر کیسے واپس پہنچیں گے۔

انور نے دیکھا کہ گوپال کو اُس کی طرح گھبراہٹ نہیں ہو رہی تھی بلکہ ایسا لگتا تھا کہ ٹھیکیدار کا بیٹا اِس ماحول کا عادی ہے۔ اُس کی زبان جس میں ہمیشہ سے مٹھاس اور تیزی تھی اب پھر قینچی کی طرح چلنے لگی تھی۔ انور کو اِس بات پر کچھ ہنسی بھی آ رہی تھی کہ گوپال اُس گھر کی مالکن پر اپنی حیثیت اور دولت کا رُعب ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا اور بیچ بیچ میں اُن دونوں لڑکیوں سے نظریں بھی لڑاتا جا رہا تھا۔ دونوں لڑکیاں گوپال کی موٹروں، بنگلوں، ریشمی ساڑھیوں اور زیوروں کی باتیں سُن کر کافی رُعب میں آگئی تھیں۔ جب پان لگ گئے تو بائی جی نے انہیں چاندی کی طشتری میں رکھ کر چھوٹی والی لڑکی کو دے دیا۔ مٹکتی ہوئی وہ

پہلے گوپال کے پاس گئی اور بڑے ادب سے جھک کر اُس نے طشتری اُس کے آگے بڑھادی۔

گوپال نے لڑکی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔" اگر پان کھلانا چاہتی ہو تو اپنے ہاتھ سے کھلانا ہوگا۔"

لڑکی کھسیا کر ہنسی اور گلوری گوپال کے کھلے ہوئے مُنہ میں رکھ دی۔ اور اس کے پان مُنہ میں رکھتے ہی گوپال نے ایک زور کا چٹخارہ لے کر اس کی انگلیوں کو چوم لیا۔ انور سمجھا تھا کہ اس پر وہ گوپال کے مُنہ پر تھپڑ مار دے گی لیکن سب لوگ ہنس پڑے جیسے یہ بھی کوئی مذاق رہا ہو۔ گوپال نے اُسے ہاتھ پکڑ کر روکا اور جیب میں سے پانچ روپے کا نوٹ نکال کر اُس کی مٹھی میں رکھ دیا اور ایسا کرتے وقت وہ اُس کی ہتھیلی میں گدگدی کرنا نہیں بھولا۔

اب انور کی باری تھی۔ لڑکی کو اپنی طرف آتا دیکھ کر انور کا دل تو بیٹھنے لگا۔ جب وہ اُسے پان دینے کے لئے جھکی تو انور کی ناک میں بہت سستے عطر کی تیز خوشبو آئی۔ اس سے پہلے کہ انور یہ کہہ پاتا کہ وہ پان نہیں کھاتا اُس لڑکی نے اُس کے مُنہ کی طرف ہاتھ بڑھادیا۔ انور بوکھلایا ہوا مُنہ کھولے بیٹھا تھا۔

"یار تم بھی بڑے بیوقوف ہو۔" گوپال نے اُسے چھیڑتے ہوئے کہا۔ "ایسا موقع بھی کوئی ہاتھ سے جانے دیتا ہے۔" انور دُعا کر رہا تھا کہ زمین پھٹ جائے اور وہ اُس میں سما جائے۔

لیکن اُس لڑکی نے تو انور کے کھلے ہوئے مُنہ میں پان رکھ دیا تھا اور طشتری لیئے اُس کے سامنے کھڑی انتظار کر رہی تھی۔ اناڑیوں کی طرح پان چباتے ہوئے

انور کو یکا یک خیال آیا کہ اُسے طشتری میں کچھ پیسے رکھنا چاہیئے، اِس لئے اُس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر جو کچھ بھی تھا باہر نکالا ــــ ایک اٹھنّی، ایک چونّی، ایک اکنّی اور چار تانبے کے پیسے۔ جب پیسے کھنک کر طشتری میں گرے تو کمرے میں بیٹھے ہوئے سب لوگ قہقہہ لگا کر ہنس دیئے۔ موقع کا فائدہ اٹھا کر گوپال نے لڑکی کو اپنی طرف کھینچ لیا اور بڑی بے تکلّفی سے اُس کے گال مسلنے لگا۔

انور نے اپنی زندگی میں پہلے کبھی پان نہیں کھایا تھا۔ پان چباتے چباتے اُس کے مُنہ میں پیک بھر گئی اور اُس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اُسے نگل جائے یا تھوک دے۔ سُپاری اُس کے حلق میں اٹک گئی تھی اور اُس عورت نے شاید پان میں تھوڑا سا تمباکو بھی ڈال دیا تھا جس کی وجہ سے انور کا سر چکرانے لگا۔ دیوار پر ٹنگی ہوئی ننگی تصویریں، سازندے، پاندان کے پاس بیٹھی ہوئی وہ عورت اور چلیتوں جیسی وہ دونوں لڑکیاں جو اُسے ایسے گھور رہی تھیں جیسے اُسے ابھی کھا جائیں گی اور قہقہے لگاتا ہوا گوپال جس کے پان سے لال دانت دکھائی دے رہے تھے ــــ انور کو لگ رہا تھا کہ ہر شخص اور ہر چیز جھوم رہی ہے گھوم رہی ہے ناچ رہی ہے۔

کسی طرح انور اپنے جوتے ڈھونڈ کر سیڑھیوں کی طرف لپکا اور ایک سانس میں سیڑھیاں اُتر گیا جیسے اُس کے پیچھے ایک ساتھ کئی بھوت لگ گئے ہوں۔ اُسے یہ منظور تھا کہ وہ فساد میں کسی غنڈے کے ہاتھوں مارا جاتا پر وہ اُس گھر میں ایک پل کے لئے بھی نہیں رُک سکتا تھا۔

کچھ دن بعد فساد ختم ہو گیا۔ پتہ یہ چلا کہ شہر کے دو غنڈوں میں کوئی ذاتی جھگڑا ہو گیا تھا۔ اُن میں سے ایک ہندو تھا اور دوسرا مسلمان اور دونوں طرف کے کٹر مذہبی لوگوں نے اِس موقع کا فائدہ اٹھا کر جھوٹی افواہیں پھیلائی تھیں اور دونوں فرقوں کے بیچ جھگڑا کھڑا کر دیا تھا۔ انور نے چاوڑی بازار والی بات اپنے ابّا کو نہیں بتائی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اُسے مجبور ہو کر ہی وہاں جانا پڑا تھا لیکن اُسے ڈر تھا کہ اُس کے ابّا کہیں اس کا غلط مطلب نہ لگائیں۔

فساد تو ختم ہو گیا لیکن اُس کی وجہ سے دلوں میں جو دشمنی پیدا ہو گئی تھی وہ دُور نہیں ہوئی۔ دونوں ایک دوسرے پر الزام لگاتے تھے۔ اپنے ابّا کی بیٹھک میں انور نے طرح طرح کے بھیانک قصّے سُنے کہ سارے ہندوستان میں ہندو مسلمانوں پر کیسے کیسے ظلم ڈھانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ اکبر علی نہ تو چودھری محمد عمر کی طرح گالی بکتے تھے اور نہ ہی کبھی سختی سے بولتے تھے لیکن انور یہ محسوس کرنے لگا تھا کہ اُس کے ابّا کا دل اب اپنے ہندو دوستوں کی طرف سے ہٹنے لگا تھا اور اسی لئے جب کبھی کاکا ایشور دیال آتے تھے —— حالانکہ اُن دنوں انہوں نے آنا بہت کم کر دیا تھا۔ تو اکبر علی اُن سے بہت ہی رسمی طریقے سے ملتے تھے۔

انور عجیب مشکل میں پھنس گیا تھا۔ جب بھی وہ اپنے ابّا اور چودھری محمد عمر کے مُنہ سے سُنتا کہ فساد کے زمانے میں ہندوؤں نے مسلمانوں پر کیسے کیسے ظُلم کئے تھے تو اس پر پہلا ردِ عمل یہ ہوا تھا کہ وہ بھی سب ہندوؤں سے نفرت

کرنے لگے۔ لیکن جب وہ کاکا رامیشور دیال یا گوپال سے یا اپنے سکول کے اُن ماسٹر صاحب سے ملتا تھا جو اُسے جغرافیہ پڑھاتے تھے تو وہ کسی بھی طرح اُن سے نفرت نہیں کر سکتا تھا۔ سچ تو یہ تھا کہ وہ اُن میں سے کسی سے بھی ملتا تھا تو وہ یہ بھول جاتا تھا جس سے وہ باتیں کر رہا ہے وہ آدمی ہندو ہے۔ وہ اُن کے ساتھ پہلے کی طرح ہی ادب یا محبت سے پیش آتا۔ لیکن بعد میں وہ اپنے آپ پر الزام لگاتا کہ وہ چودھری صاحب یا اُن کے بیٹے شفیع کی طرح پکّا مسلمان نہیں ہے کیونکہ یہ لوگ تو کھُلے عام ہندوؤں سے نفرت کا اعلان کرتے تھے۔ پنجابی بیوپاری چودھری محمد عمر نے ایک تحریک شروع کی تھی جس کا نام تھا "مسلمان صرف مسلمان دُکانداروں سے خریدیں"۔ اِس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں میں تجارت کا شوق پیدا کیا جائے جسے وہ اب تک بہت گھٹیا کام سمجھتے تھے۔ اِس تحریک کے نتیجے کے طور پر اگر محمد عمر اور اکبر علی کی چینی کے برتنوں کی دُکان پر زیادہ گاہک آنے لگے تھے تو یہ صرف اِس بات کا ثبوت تھا کہ مسلمانوں میں آپس میں کتنا بھائی چارہ ہے۔ یہ سب اللہ کی شان تھی اور اِس کے لیے اللہ کا شکر ادا کیا جانا چاہیئے۔

ستمبر میں سکول کی چھٹیاں ہوئیں اور حالانکہ مارچ میں انور کو میٹرک کا امتحان دینا تھا لیکن وہ اس کے لیے ابھی تک کوئی خاص تیاری نہیں کر رہا تھا۔ اب وہ بھی بیٹھک کے اسی کونے میں لوگوں کی باتیں سُنتا رہتا تھا۔ ان دنوں عام طور پر اکثر فرقہ وارانہ سیاسی مسئلے پر بات چیت ہوتی تھی۔ اُس حساس لڑکے کے لیے فسادات کے بارے میں دل دہلا دینے والی باتیں سُننا ایک رونگٹے کھڑے

کر دینے والا تجربہ تھا۔ یہ آئے دن کے واقعات ہو گئے تھے پھر بھی اُن کا بھیانک پن اُسے دنگ کر دیتا تھا۔ وہ مختلف شہروں میں ہونے والے خون خرابے اور تباہی کی جتنی ہی زیادہ خبریں سُنتا تھا اتنی ہی زیادہ اُس کی دلچسپی اِس بات میں کم ہو جاتی جاتی تھی کہ ہندوؤں نے مسلمانوں کو مارا یا مسلمانوں نے ہندوؤں کو۔ اُسے تو صرف یہ سمجھ میں آتا تھا کہ جو کل تک آپس میں بھائی بھائی اور دوست تھے وہ آج ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے تھے۔ کیا اُس کے ملک والوں کی عقل ماری گئی تھی؟ انور کو یہ سب ویسی ہی بھیانک باتیں لگتی تھیں جیسے وہ جاکر کا کارامیشور دیال کے چھرا بھونک دے یا گوپال آکر اُن کے گھر کو آگ لگا دے۔ اِس نوجوان لڑکے کو ایسا لگتا تھا کہ کوئی آواز لگاتار اُس کے سر کے اندر ہتھوڑے سے چوٹ لگا رہی ہے --"اِسے روکنے کے لئے کچھ کیا جانا چاہیئے، ضرور کیا جانا چاہیے! فوراً کیا جانا چاہیئے!!" لیکن وہ کیا کر سکتا تھا؟ جب اتنے بڑے بڑے لیڈر کچھ نہیں کر سکے تو مشکل سے پندرہ برس کا ایک لڑکا کیا کر سکتا تھا؟

آخر کار اُس نے فیصلہ کر ہی لیا۔ چودھری محمد عمر نے ہمیشہ کی طرح اپنے حقارت بھرے لہجے میں کہا کہ گاندھی دِلّی آئے ہیں ---- وہ انہیں کبھی بھی مہاتما گاندھی نہیں کہتے تھے' اِس پر اکبر علی نے بھی کچھ مایوسی سے کہا" ایک زمانہ تھا جب وہ حالت کو سنبھال سکتے تھے"۔ انور کے دماغ میں یہ خیال بجلی کی طرح کوند گیا" میں جاکر مہاتما گاندھی سے ملوں گا' وہ ضرور کچھ کر سکتے ہیں' انہیں ضرور کچھ کرنا پڑے گا۔ کیا اُنہوں نے ہی مجھے خواب میں اُس آتشش سے نہیں بچایا تھا؟ کیا اُنہوں نے ہی ہندوستانیوں کو یہ نہیں سکھایا کہ انگریزوں کو نہ ماریں؟ اور لوگوں نے اُن کا کہنا

مارا۔ اس لئے اگر اب وہ ہندو مسلمانوں سے یہ کہیں گے کہ وہ ایک دوسرے کو نہ ماریں تو وہ یقیناً اُن کا کہنا مانیں گے۔" یہ خیال اُس کے دل میں اتنی تیزی سے اُٹھا اور اُس کا دل جوش کے مارے اتنے زوروں سے دھڑکنے لگا کہ وہ چپکے سے بیٹھک میں سے کھسک گیا۔ وہ ڈر رہا تھا کہ کہیں اُس کے ابا کو اُس کے اِس ارادے کا پتہ نہ چل جائے اور اُسے روک نہ لیں۔

(۸)

مہاتما گاندھی دریا گنج کے پاس ہی کوچہ چیلاں میں مولانا محمد علی کے گھر پر ٹھہرے ہوئے تھے۔ بہت سی چکردار گلیوں کو پار کرتے وقت انور سوچ رہا تھا کہ یہ تو بہت ہی اچھا شگون ہے۔ وہ جانتا تھا کہ مولانا اور مہاتما بہت گہرے دوست تھے اور جیل سے چھوٹنے کے بعد مولانا کانگریس کے صدر چُنے گئے تھے۔ دو اتنے بڑے بڑے لوگوں کی دوستی کا نتیجہ، جن میں سے ایک ہندو تھا اور دوسرا مسلمان، اچھا ہی ہو سکتا تھا۔

مولانا محمد علی کے گھر پر ہی اُن کے دو اخباروں کا دفتر بھی تھا ـــــ ایک اُردو کا "ہمدرد" اور دوسرا انگریزی کا "کامریڈ"۔ جس وقت انور نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھٹکھٹایا، مولانا بیٹھے اپنے اخبار کا اداریہ لکھ رہے تھے۔ اپنے ڈھیلے ڈھالے کالے لبادے میں اُن کا جسم بہت بڑا لگ رہا تھا۔

"کون ہے؟" مولانا نے نظر اُٹھائے بغیر گرج کر پوچھا۔

انور کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اپنا تعارف کیا کرائے۔ اُس نے ہکلا ہکلا کر کہا۔ "میں ہوں... معاف کیجئے گا... میں... میں..."

مولانا نے لکھنا بند کر دیا اور اپنا خوبصورت ڈاڑھی والا رُعب دار چہرہ اُوپر اُٹھا کر دیکھا کہ کون آیا ہے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ ایک سکول کا لڑکا دروازے پر بوکھلایا ہوا کھڑا ہے تو اُن کے چہرے پر ایک مسکراہٹ دوڑ گئی اور وہ بولے "صاحبزادے آجاؤ اندر آجاؤ۔"

انور کی ہمت بندھی اور وہ بولا "میں نے ایک بار آپ کو ڈاکٹر انصاری صاحب کے یہاں دیکھا تھا۔ میں وہاں اپنے ابّا کے ساتھ گیا ہوا تھا۔۔۔" لیکن اُس کی بات بیچ میں ہی کاٹ دی گئی۔

"اچھا، تو تمہارے ابّا انصاری کے دوست ہیں۔ بیٹھو بیٹا بیٹھو۔ کہو اِس وقت کیسے آنا ہوا؟"

"میں مہاتما گاندھی سے ملنا چاہتا ہوں۔" انور نے بے جھجک کہہ دیا اور اپنے آنے کا مقصد بتا کر اُسے بڑی تسلّی ہوئی۔

"اچھا تو تم اِس کام سے آئے ہو؟ اُوپر چلے جاؤ، بیٹا۔ ویسے گاندھی جی آج کسی سے ملنا نہیں چاہتے تھے لیکن نوجوانوں سے مل کر انہیں ہمیشہ بڑی خوشی ہوتی ہے۔"

"شکریہ مولانا صاحب۔ آداب عرض۔" انور نے کمرے سے باہر نکلتے ہوئے کہا "جیتے رہو بیٹا۔" مولانا نے جواب دیا اور انور کمرے سے باہر نکل بھی نہیں پایا تھا کہ مولانا پھر سر جھکا کر لکھنے لگے۔

اُوپر پہنچ کر انور نے دیکھا کہ گاندھی جی فرش پر پالتی مارے بیٹھے چرخا کات رہے تھے۔ وہ کسی گہرے خیال میں ڈوبے ہوئے تھے، اِس لئے تھوڑی دیر تک تو انہیں انور کے آنے کا پتہ ہی نہیں چلا اور انور کو بہت قریب سے اِس چھوٹی سی عظیم

شخصیت کو غور سے دیکھنے کا موقع ملا۔ گول گنبد کی طرح گھٹا ہوا سر، لمبی نکیلی ناک اور باہر کو نکلے ہوئے دو بڑے بڑے کان۔ گول گول شیشوں والی عینک کے پیچھے سے دونوں آنکھیں چرخے پر جمی تھیں۔ اُن کا جسم ایک لڑکے سے بھی چھوٹا اور دُبلا پتلا تھا اور زندگی میں پہلی بار انور کو اپنے چھوٹے قد اور دُبلے پتلے جسم کے بارے میں کچھ تسلّی ہوئی۔

چرخے کی ریں ریں کے علاوہ کمرے میں بالکل سنّاٹا تھا۔ انور ڈرتے ڈرتے کھانسا اور چرخا چلنا فوراً بند ہو گیا۔ دو اُداس آنکھیں اُوپر اُٹھیں اور انور کو دیکھنے لگیں۔ یکایک اُس چہرے پر سے اُداسی دُور ہو گئی اور بُوڑھے نے مسکرا کر دیکھا، بالکل اسی طرح جیسے ڈاکٹر انصاری کے بنگلے کے لان پر اُس نے انور کی طرف دیکھا تھا۔

"بیٹھو، بیٹھو۔" مہاتما گاندھی نے انور سے بیٹھنے کو کہا۔ انور کے کان دلّی کی میٹھی ہوئی زبان سُننے کے عادی تھے، اُسے گاندھی جی کی ہندوستانی گجراتی کی صاف جھلک سُنائی دی۔ لیکن اُن کی آواز میں بے حد نرمی تھی۔ انور اب بالکل گھبرا نہیں رہا تھا، وہ جُوتے اُتار کر فرش پر بیٹھ گیا۔ چرخا پھر چلنے لگا کیونکہ مہاتما گاندھی چرخا چلاتے چلاتے باتیں کرنے کے کافی عادی معلوم ہوتے تھے۔

انور کا کھدّر کا پاجامہ اور شیروانی دیکھ کر گاندھی جی بہت خوش ہوئے اور انہوں نے یہ بتانا شروع کیا کہ ہاتھ کے کتے ہوئے سُوت سے ہاتھ کا بُنا ہوا کپڑا پہننے میں کتنے فائدے ہیں ۔۔۔ یہ ایک ایسا مسئلہ تھا جس پر وہ گھنٹوں باتیں کر سکتے تھے۔ لیکن انور تو فسادات کے بارے میں بات کرنے آیا تھا۔ مگر اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح بات شروع کرے۔ کھادی کی اہمیت کے بارے میں گاندھی جی کی باتیں سُنتے سُنتے اُس کے خیالات بھٹکنے لگے۔ وہ اُن تمام عجیب نک باتوں کے

بارے میں سوچ رہا تھا جو اُس نے فسادات کے بارے میں سُنی تھیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کا ایک دُوسرے کو قتل کرنا، ایک دُوسرے کے گھروں میں آگ لگانا، اور مندروں اور مسجدوں کی بے حُرمتی کرنا اور گاندھی جی کی دھیمی آواز اور چرخے کی ریں ریں کو روندتی ہوئی اُسے وہ بھیانک آوازیں پھر سُنائی دینے لگیں۔

"مارو! مارو!" اور "مار ڈالا! مار ڈالا!" وہ اپنے دل کا درد گاندھی جی کو کیسے بتائے؟ وہ اُنہیں کس طرح بتائے کہ اُس کے ابّا مسلمان ہیں اور اُن کی وہ بے حد عزّت کرتا ہے اور اُس کے ایک ہندو کاکا ہیں جنہیں چاچا کی طرح پیار کرنا اور چاچا کی طرح ان کی عزّت کرنا اُسے ہمیشہ سے سکھایا گیا تھا۔ لیکن اب وہ دونوں ویسے گہرے دوست نہیں رہ گئے تھے جیسے کہ وہ اب تک اپنی زندگی میں رہے تھے؟ وہ اُنہیں کس طرح بتائے کہ گوپال اپنی تمام خرابیوں کے باوجود اُس کا اچھا دوست تھا اور وہ اُس کی دوستی کھونا نہیں چاہتا تھا؟ وہ اُنہیں رتن کے بارے میں بتانے کے لیے بیتاب تھا۔ وہ اُنہیں بتانا چاہتا تھا کہ رتن کی دوستی نے اُس کی زندگی کے رُخ کو کس طرح موڑ دیا تھا۔ لیکن اب ان ساری دوستیوں میں فرقہ پرستانہ مُنافرت کا زہر گھُل گیا تھا۔ کاش وہ یہ ساری باتیں مہاتما گاندھی کو سمجھا سکتا! کاش وہ ایسا کر پاتا! . . . لیکن اُسے الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ اُس کا گلا رُندھ گیا تھا اور وہ بہت لاچار اور دُکھی محسوس کر رہا تھا۔ اُس کے آنسو بہہ نکلے۔

پھر چرخا چلنا بند ہو گیا اور گاندھی جی ایک لفظ بھی کہے بغیر انور کے پاس آئے اور اُس کی ترکی ٹوپی اُتار کر بڑے پیار سے اُس کے سر پہ ہاتھ پھیرنے لگے۔ اُن کے چھُونے میں اتنا پیار تھا کہ انور اور بھی لاچار محسوس کرنے لگا اور پھُوٹ پھُوٹ کر

رونے لگا۔ "مہاتما جی۔" اُس نے اپنی سسکیوں کے بیچ کہنا شروع کیا۔ "اِن ہندو مسلم فسادات کے بارے میں کچھ کیجیے! خدا کے لیے کچھ کیجیے! آپ ہی ہم سب لوگوں کو بچا سکتے ہیں۔"

اپنے آنے کا مقصد اِس طرح بتا کر اُس کے دل کا بوجھ ہلکا ہوا اور آنسو پونچھ کر جب اُس نے نظر اوپر اُٹھائی تو مہاتما جی کے چہرے پر ایک نیا ہی جذبہ تھا۔ اب انور کی سمجھ میں آ گیا کہ لوگ اُنہیں مہاتما کیوں کہتے ہیں۔ اُن کے چہرے پر اتنا درد، اتنی مہربانی اور اتنا رحم تھا کہ جیسے ہر انسان کا دکھ درد وہ خود محسوس کر رہے ہوں لیکن ساتھ ہی اُن کے چہرے پر بے حد سکون اور سنجیدگی بھی تھی اور جب انور نے اُن نرمی بھری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا تو اُس کے دل کو سکون ملا۔ اُسے ایک ایسا آدمی مل گیا تھا جو بنا سمجھائے اُس کی بات سمجھ سکتا تھا۔ اُسے ایک ایسا آدمی مل گیا تھا جو ایک دکھی اور روتے ہوئے لڑکے کا مذاق اُڑانے کی بجائے اُس کے جذبات کو سمجھ کر مسکرا کر اُسے دیکھتا تھا۔ انور کے گال ابھی تک آنسوؤں سے تر تھے پر اُس کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ کی ایک لکیر دوڑ گئی۔

"ہاں بیٹا۔" مہاتما جی نے پیار بھرے لہجے میں دُور اُفق کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "میرے دل کو بھی ویسی ہی چوٹ لگی ہے جیسے تمہارے دل کو۔ اگر بھگوان نے مجھے راستہ دکھایا تو میں ضرور کچھ کروں گا۔"

(۹)

دوسرے دن صبح حکیم بیدل بیٹھک میں زور زور سے اخبار پڑھ کر سنا رہے تھے۔ انور چپکے سے آ کر ہمیشہ کی طرح ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ گاندھی جی کے بیان پڑھ

جس میں اُنھوں نے اکیس دن کا برت رکھنے کی بات کہی تھی، ہر آدمی کافی جوش میں تھا۔ گاندھی جی نے کہا تھا کہ ہندو اور مسلمان اب تک جس اتحّاد کے ساتھ کام کرتے آئے تھے اُسے وہ آگے چل کر بھی جاری رکھیں تاکہ آخر میں سارا ملک اِس اتحّاد سے پورا فائدہ اُٹھا سکے۔

"گاندھی جی نے آخر کار حل نکال ہی لیا! انھوں نے راستہ ڈھونڈ ہی لیا!" انور دل ہی دل میں سوچنے لگا۔ اُنھوں نے اتنا بڑا جو قدم اُٹھایا ہے کیا اُس میں انور کی اُن کے ساتھ ملاقات کا بھی کچھ ہاتھ ہے؟ کیا تاریخ کی رفتار کو اُس نے سچ مچ ایک نیا موڑ دیا تھا؟

کیا یہ سچ ہو سکتا ہے؟

دل میں اِس خیال کے آتے ہی اُس کا رُواں رُواں کھِل اُٹھا۔ وہ روز بڑی بے صبری سے اخبار پڑھتا تھا اور یہ دیکھ کر اُس کا حوصلہ بہت بڑھتا تھا کہ گاندھی جی کے اِس قدم پر سارے مُلک میں جوش کی ایک لہر دوڑ گئی تھی۔ فسادات فوراً بند ہو گئے تھے، اتحّاد کی تحریک پھر شروع ہو گئی تھی، ہر جگہ جلسوں میں گاندھی جی کی درازیٔ عمر کی دُعائیں مانگی جا رہی تھیں، تجویزیں پاس کی جا رہی تھیں اور جلسے ہو رہے تھے۔ ایک ہفتے کے اندر ہی دِلّی میں مختلف فرقوں کے لیڈروں نے اتحّاد کی کانفرنس کی۔ اکبر علی کو بھی کانفرنس میں بُلایا گیا اور انور نے ضِد کر کے اُنھیں اِس بات پر راضی کر لیا کہ وہ اُسے بھی ساتھ لے چلیں گے۔ کیا یہ اُس کی اپنی کانفرنس نہیں تھی؟

اب لیڈر آآ کر ڈائس پر بیٹھنے لگے۔ اکبر علی نے ایک ایک کر کے انور کو بتانا شروع کیا کہ ان میں کون کون ہیں ــــ شیروانی اور چوڑی دار پاجامہ پہنے ہوئے

جو رعب دار ہستی بیچ میں بیٹھی ہوئی تھی وہ موتی لال نہرو تھے جو اِس کانفرنس کے صدر تھے۔ کالا چشمہ لگائے ہوئے بنگال کے بڑے نیتا سی۔آر۔داس تھے۔ ادھر سروجنی نائیڈو بیٹھی تھیں جنہیں لوگ "بُلبلِ ہند" بھی کہتے تھے۔ اور وہ پھرتیلا سا نوجوان جو اِدھر اُدھر بہت بھاگ دوڑ کر رہا تھا وہ موتی لال نہرو کے بیٹے جواہر لال تھے۔ انور کو یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ ڈائس پر سفید بالوں والی ایک انگریز عورت بھی بیٹھی تھی۔ پر اُس کے ابّا نے اُسے بتایا کہ وہ مسز بیسنٹ تھیں جو ہندوستان کی دوست تھیں اور سوراج کی مانگ کو صحیح مانتی تھیں۔

تقریر شروع ہونے کا وقت ہو گیا اور انگریزی کی دھواں دھار تقریروں کی رَو میں انور بہا چلا جا رہا تھا لیکن مولانا محمد علی اُردو میں بولے اور اپنی تقریر ختم کرتے ہوئے جن الفاظ میں اتّحاد کی اپیل کی اُنہیں انور کبھی نہیں بھول سکتا تھا

"میں بہت مذہبی آدمی ہوں لیکن میں یہ اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ اِن فسادات کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہمارے دلوں میں جو تلخی اور کدورت پیدا ہو گئی ہے وہ صرف رواداری اور اہنسا سے دُور ہو سکتی ہے۔ ہمیں کتنا بھی اُکسایا جائے پر ہمیں پُر امن رہنا چاہیئے۔ ایک دوسرے سے بدلہ لینے کا جو یہ خونی سلسلہ چل رہا ہے اُسے ختم کرنے کے لیے ہمیں کچھ کرنا ہوگا ورنہ ہم اپنی آزادی کی منزل سے دُور ہوتے جائیں گے اور ہمارے دشمنوں کو ہماری اس بیوقوفی پر ہنسنے کا موقع ملے گا کہ ہم ایسے وقت پر آپس میں لڑ رہے ہیں جبکہ ہمیں آزادی کی لڑائی میں اپنا اتّحاد قائم رکھنا چاہیئے۔"

جب لوگوں نے مولانا کی تقریر پر تالیاں بجائیں تو انور نے مُڑ کر اپنے ابّا کی طرف دیکھا، اُن کی آنکھوں سے آنسو بہہ کر داڑھی پر گر رہے تھے۔ نہ جانے کیوں یہ دیکھ کر انور کو خوشی ہوئی کیونکہ اب وہ سمجھ گیا تھا کہ گاندھی جی کا مشن کامیاب رہا۔ محبّت اور انسانیت کے خدا کو پھر اُس کے تخت پر بیٹھا دیا گیا تھا اور لوگوں کے دلوں میں پھر اُس کے لئے جگہ پیدا ہو گئی تھی۔

۱۰

(۱)

میٹرک کا امتحان ختم ہو چکا تھا۔ دماغ پر سے ایک بوجھ اُتر گیا تھا ——

امتحان تو ختم ہو گیا تھا پر نتیجہ نکلنے میں ابھی کم سے کم دو مہینے کی دیر تھی۔ اتنے دن تک انتظار کرنے اور وقت کاٹنے کا کوئی اچھا طریقہ ڈھونڈ لینے کے علاوہ کام ہی کیا تھا۔ انور کو تو دوسروں سے بھی زیادہ وقت کاٹنا تھا کیونکہ علی گڈھ یونیورسٹی میں تو اکتوبر میں نام لکھے جاتے تھے۔ انور کو تو پوری گرمیاں کاٹنے کے لئے کوئی بہانہ ڈھونڈنا تھا۔

انور کی زندگی کی طرح ملک میں بھی ایک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اس وقت تو سیاسی حلقوں میں بھی کوئی خاص ہلچل نہیں تھی۔ بیٹھک میں اب بات چیت بھی زیادہ تر مقامی یا نجی معاملوں کے بارے میں ہوتی تھی۔ چلینی کے برتنوں کی دکان زوروں پر چل رہی تھی۔ زیادہ تر مال جاپان سے آتا تھا۔ جاپان نے بے حد کم داموں پر چینی اور کانچ

کی چیزیں تیار کرنے کا کوئی گُر حاصل کر لیا تھا۔ کاکا رامیشور دیال نے کپڑے کی بہت بڑی دُکان کھول لی تھی اور چونکہ بدیسی کپڑے کے بائیکاٹ کی تحریک لگ بھگ بالکل ٹھپ ہو گئی تھی اور کھدّر کے کپڑے سے شوقین اور خوش حال لوگوں کا کام نہیں چلتا تھا اِس لئے وہ زیادہ تر بدیسی کپڑا ہی بیچتے تھے ــــ ساٹن، مخمل، ریشم، ململ اور وائل۔

انور اپنا زیادہ تر وقت کتابیں پڑھنے میں بتاتا تھا۔ وہ ہر طرح کی کتابیں پڑھتا تھا ــــ اپنے ابا کی لائبریری سے اُردو کی نثر اور نظم کی لافانی کتابیں، جاسوسی ناول، انگریزی میں لڑکوں کے لئے بہادری کے قصّے اور شیکسپیئر کی کہانیاں۔ روز شام کو وہ جامع مسجد کے پاس پُرانی کتابوں کی دُکانوں کے چکّر لگاتا تھا اور گھنٹے بھر تک پُرانی کتابوں کے دُھول سے اَٹے ڈھیر میں ڈھونڈنے کے بعد اگر وہ دو تین آنے میں کوئی اچھّی سی کتاب پا جاتا تو اُسے ایسی خوشی ہوتی جیسے کوئی خزانہ مل گیا ہو۔

لیکن کوئی صرف کتابوں کے سہارے کتنا وقت کاٹ سکتا ہے۔ اِس لئے کبھی کبھی گرمیوں کے پہاڑ جیسے دن کاٹنا اس کے لئے دشوار ہو جاتا تھا۔ انور کے دوست بہت تھوڑے سے ہی تھے اور اُن کے گھر جانے میں بھی اُسے جھجک ہوتی تھی۔ اِس لئے ایک دن جب گوپال اُس کے یہاں آیا اور بہت دیر تک اپنے خاص ڈھنگ سے باتیں کرنے کے بعد جب اُس نے انور کو اُس کے اور اُس کے پتا جی کے ساتھ چل کر رائے سینا میں جسے وہاں کے لوگ نئی دلّی کہنے لگے تھے، وائسرائے کی کوٹھی اور دُوسری عمارتیں دیکھنے کی دعوت دی تو انور بہت خوش ہوا۔

دُوسرے دن بہت ہی سویرے ٹھیکے دار صاحب کی کھٹارہ فورڈ گاڑی آ

پہنچی اور ہارن کی آواز سُنتے ہی انور خوشی سے بے چین ہو کر بھاگا بھاگا باہر پہنچا۔ گوپال کے پتاجی لالہ کِشن لال بہت ہی موٹے آدمی تھے اور اُن کی آواز بھی اتنی ہی موٹی تھی۔ اُن کی ٹھوڑی کے نیچے موٹاپے کی وجہ سے کھال لٹک آئی تھی اور جب وہ بولتے تھے تو سونے کا ایک دانت چمک اُٹھتا تھا۔ اُنہیں اپنے مذاقیہ ہونے پر بڑا ناز تھا اور وہ تھے بھر وہ اپنے چُٹکلوں اور مزیدار کہاوتوں سے دونوں لڑکوں کو ہنساتے رہے۔ اپنی بات چیت کے دوران وہ بار بار "سالا" اور "سسرا" اور اُس سے بھی زیادہ موٹی موٹی گالیاں استعمال کرتے تھے۔ انور کو اُن کے مُنہ سے گالیاں سُن کر بُرا بھی لگتا تھا اور مزا بھی آتا تھا اور وہ دل ہی دل میں رامیشور کاکا کے ساتھ اُن کا مقابلہ کرتا رہتا تھا جو بہت شرافت اور نرمی سے بولتے تھے۔

پندرہ منٹ بھی نہ لگے ہوں گے کہ موٹر لال اینٹوں کی نئی پکّی نا مکمل عمارتوں کے سامنے سے گزر رہی تھی اور کِشن لال نے بڑے فخر کے ساتھ اُن ادھورے بنگلوں کی طرف اشارہ کیا جو اُن کی ملکیت تھے۔ بیچ بیچ میں موٹر کسی بنتے ہوئے مکان کے سامنے رُکتی تھی اور موٹو ٹھیکیدار صاحب اُتر کر اپنے مستریوں کو ہدایتیں دیتے تھے اور اِس طرح اپنا رُعب جتاتے تھے۔ اُس کے بعد وہ دوسری زیادہ رُعب دار عمارتوں کے سامنے سے گزرے۔ ابھی کچھ سال پہلے یہاں دُور دُور تک بنجر ریگستان تھا اور اب وہیں پرانے بھولے بسرے شہروں کے کھنڈروں کے بیچ ایک بالکل نئی راجدھانی بن کر تیار ہو رہی تھی۔ نئی اور پُرانی عمارتیں، نا مکمّل اور ٹوٹی ہوئی عمارتیں ایک دوسرے کے پاس کھڑی تھیں اور اکثر تو یہ بتانا بھی مشکل ہو جاتا تھا کہ ان میں سے کس کا تعلّق ماضی کے ساتھ ہے اور کس کا مستقبل کے ساتھ۔

ایک بڑی سی گول عمارت کے سامنے پہنچ کر موٹر رک گئی اور لالہ کشن لال نے لڑکوں کو بتایا کہ وہ اسمبلی چیمبر کی عمارت تھی جہاں آگے چل کر ہندوستان کے مستقبل کے قانون داں بیٹھیں گے۔ لالہ کشن لال پی۔ ڈبلیو۔ ڈی کو تھوڑا بہت عمارتی سامان سپلائی کرتے تھے اس لیئے وہ ہر عمارت میں آزادی سے آجا سکتے تھے۔ وہ دونوں لڑکوں کو لیکر اُس عمارت کے اندر گئے۔ وہاں گیلی مٹّی، چُونا اور سمنٹ کی بُو بسی ہوئی تھی اور وہ بنا چھت کے بڑے بڑے ہال عجیب بھیانک لگتے تھے۔ برآمدوں اور چھوٹے چھوٹے گلیاروں کی بھُول بھُلیّوں میں اُن کے پیروں کی آہٹ بڑے بھیانک ڈھنگ سے گونج رہی تھی۔ انور کو نہ جانے کیوں ایسا لگا کہ وہ کسی پُرانے محل کے کھنڈروں میں گھوم رہے ہیں جس کی چھتیں سینکڑوں برس پُرانی ہو کر گر گئی تھیں۔ اور پتھّر کی دیواروں پر سے پلستر چھوٹ گیا تھا جس کی وجہ سے وہاں ایک عجیب سی سیلن کی باسی باسی بُو پیدا ہو گئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ پھر کھُلی جگہ میں نکل آئے تو انور کو ایسا لگا کہ وہ ماضی کے اندھیرے سے نکل کر پھر حال میں آ گئے ہیں۔

اسمبلی چیمبر سے وہ لوگ موٹر میں بیٹھ کر قلعہ جیسی دیواروں سے گھری ہوئی والسرائے کی کوٹھی دیکھنے گئے۔ لالہ کشن لال کے ایک انجینئر دوست نے اُن لوگوں کے ساتھ جا کر اُنہیں سمجھایا کہ ہر ہال اور کمرہ کس کام کے لئے بنایا جا رہا تھا۔ انور کے لیئے اُن سب کمروں کی فہرست یاد رکھنا بھی مشکل تھا — لاٹھ صاحب کا صبح کے وقت بیٹھنے کا کمرہ، اُن کی میم صاحب کا تیسرے پہر آرام کرنے کا کمرہ، لاٹھ صاحب کا بیڈ روم — اُن کی میم کا بیڈ روم، اُن دونوں کا پرائیویٹ

ڈائننگ روم، سٹیٹ ڈائننگ روم، بینکویٹ ہال، بال روم، بلو روم، لکھنے کے کمرے، بڑے کمروں سے لگے ہوئے چھوٹے کمرے، ریسپشن روم، گیسٹ روم اور پھر سیکریٹریوں، باڈی گارڈوں، گھریلو نوکروں، خانساماؤں اور ڈرائیوروں کے رہنے کے کمرے، کچن، جو خود پورے پورے بنگلوں کے برابر تھے، اس کے علاوہ موٹرخانوں کی ایک قطار جن میں موٹریں رکھی جائیں گی اور تہہ خانے جن میں دنیا کی بہترین شرابوں کا ذخیرہ رہے گا... انجینئر صاحب بڑے فخر کے ساتھ سمجھا رہے تھے کہ اس پورے محل کی سجاوٹ کس ڈھنگ کی ہوگی۔ انہوں نے بتایا کہ دنیا کی بہترین لکڑی کا بنایا ہوا فرنیچر ولایت سے منگایا گیا تھا۔ کمروں میں اور یہاں تک کہ برآمدوں میں ایرانی قالین بچھائے جائیں گے، دیواروں پر بڑی بڑی تصویریں ہوں گی کھانے کے کمروں میں بہترین چینی اور کانچ کے برتن ہوں گے۔ بینکویٹ ہال میں بلوری فانوس ہوں گے....

انور اپنے اس باتونی گائیڈ کی آدھی باتیں ہی نہیں سُن رہا تھا۔ وہ تو اس بات پر تعجب کر رہا تھا کہ ان تمام چیزوں کا فائدہ صرف دو آدمی اُٹھائیں گے ــــ ایک وائسرائے اور دوسری اُن کی میم صاحب۔ آخر یہ کس قسم کے لوگ ہیں جنہیں رہنے کے لئے سو کمرے چاہئیں؟ وہ مغل زمانے کے محل دیکھ چکا۔ اس زمانے کے بادشاہ اور شہنشاہ بھی اس سے زیادہ سادگی سے رہتے تھے۔ کیا یہ نئے حکمراں جان بوجھ کر پرانے زمانے کے بادشاہوں سے شان و شوکت میں بڑھ جانا چاہتے تھے؟ لیکن وہ اپنے ان خیالوں کو اپنے دل میں ہی چھپائے رہا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس رعب دار عمارت کے اندر اُن خیالوں کو ظاہر کرنا نہ صرف بدتمیزی ہو گی

بلکہ ایسا کرنا خطرناک بھی ہو سکتا تھا۔

جس وقت وہ باہر نکل کر اُس میدان کی طرف چلے جہاں بہت بڑا باغ لگایا جا رہا تھا۔ اُسی وقت کہیں زور سے گھنٹہ بجا اور مزدوروں کے گروہ کے گروہ باہر نکل کر دوپہر کا کھانا کھانے کے لیے کوئی سایہ دار جگہ ڈھونڈنے لگے۔ وہ لوگ کچھ مزدوروں کے پاس سے ہو کر گذرے اور اُنہوں نے دیکھا کہ وہ صرف پیاز کے ساتھ روکھی روٹی کھا رہے تھے۔ باغ کی کھُدی ہوئی زمین کے اُس پار، جہاں پھولوں کی جھاڑیاں نکلنے لگی تھیں، ٹین کی نیچی نیچی چھتوں والی جھونپڑیوں کی ایک قطار تھی جس میں یہ مزدور رہتے تھے۔ حالات کا یہ فرق انور کو بُری طرح کھٹکنے لگا اور وہ یہ سوچنے لگا کہ اِس محل کو بنانے والے یہ مزدور کیا سوچتے ہوں گے لیکن کیا اُن میں سوچنے کی طاقت ہے بھی؟

(۲)

امتحان کا نتیجہ نکلا۔ انور فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوا تھا — اچھا خاصہ نتیجہ تھا۔ اُس کے علاوہ کوئی سو لڑکے اور تھے جنہیں فرسٹ ڈویژن ملا تھا اور چالیس لڑکوں کا نتیجہ تو اُس سے بھی اچھا رہا تھا۔ اُنہوں نے اسّی فیصدی نمبر پا کر امتیاز حاصل کیا تھا۔ اُس کے ابّا کا یہی کہنا تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ بہت زیادہ تعریف کرنے سے اُن کے بیٹے کا دماغ ساتویں آسمان پر پہنچ جائے لیکن بیٹا اچھی طرح جانتا تھا کہ اُس کے ابّا بہت خوش ہیں اور یہی اُس کے لیے سب سے بڑی بات تھی۔

سیاسی مورچے پر جو فرسودگی آ گئی تھی وہ ایک دوسری تحریک سے ٹوٹ گئی۔ ایک دن چودھری محمد عمر اِس بات پر بہت گرم ہوتے ہوئے آئے کہ نال تھ

ویسٹرن ریلوے کی لائنوں پر عام ہڑتال ہو گئی تھی اور پنجاب کی طرف کوئی گاڑیاں نہیں جا رہی تھیں اس لئے وہ اپنے گھر لدھیانے نہیں جا سکتے تھے۔ ریلوے مزدوروں نے اپنی مزدوری اور کام کرنے کے حالات کے بارے میں اپنی ناراضگی ظاہر کرنے کے لئے ہڑتال کر دی تھی اور اس طرح ریلوں کا آنا جانا بالکل بند کر دیا تھا۔ چودھری صاحب کو اس بات پر بڑا غصہ تھا کہ دو کوڑی کی اوقات والے لوگ ___ سگنل مین، سوئچ مین اور قلی ___ اس طرح ہڑتال کر کے گھر جانے کے اُن کے سالانہ پروگرام میں رُکاوٹ ڈالیں "چیونٹیوں کے پر نکلنے لگے ہیں"۔ اُنہوں نے بڑی نفرت سے تھوکتے ہوئے کہا "یہ مزدور اپنی اوقات بھولتے جا رہے ہیں۔ یہ سب اُس گاندھی کی وجہ سے ہے ___ آٹا دال بیچنے والے اُس بنیے کی وجہ سے!"

اِس درمیان رتن کے پاس سے ایک چٹھی آئی جس میں اِس حالت کی بالکل ہی دوسری تصویر پیش کی گئی تھی۔ وہ سیاسی کارکنوں کے گروپ میں شامل ہو گیا تھا جو ہڑتال میں ریلوے مزدوروں کی مدد کر رہے تھے۔ اُس نے ہمیشہ کی طرح بہت جوشیلے الفاظ میں انور کو لکھا تھا "کاش تو یہاں لاہور میں ہوتا اور دیکھتا کہ کل رات ریلوے مزدوروں نے کتنا شاندار جلوس نکالا۔ دس ہزار لوگ انقلابی نعرے لگاتے ہوئے جلوس میں چل رہے تھے اور اُن کے ہاتھوں میں مزدوروں کا انقلابی لال جھنڈا تھا جسے اُنہوں نے اپنے ہاتھ سے رنگا تھا۔ اُنہیں دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ دیش میں ایک نئی طاقت پیدا ہو رہی ہے ___ مزدور طبقے کی طاقت! اور ایک بار جب اُن میں جوش پیدا ہو گیا تو وہ گاندھی جی کی بزرگانہ باتوں سے رُکنے والے نہیں۔ اُن کے قدم ایک بار بھی نہیں جھجکیں گے، وہ کوئی آگا پیچھا

نہیں سوچیں گے۔"

انور فطرتاً ہی بہت ہی ڈرپوک تھا اور جب سے اُس کے ابّا سیاست سے الگ ہو گئے تھے تب سے قومی تحریک کی طرف سے اُس کا جوش ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ لیکن اُسے اِس بات پہ فخر تھا کہ اُس کا دوست رتن اِس تحریک میں جٹا ہوا تھا اور اپنے پنجابی دوست کے خط کو پڑھ کر وہ بھی بغاوت کا جذبہ محسوس کر سکتا تھا۔

(۳)

پھوپی امّاں کی عمر اب ساٹھ کے قریب پہنچ چکی تھی، اُنہیں وقت اور تاریخ میں کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی تھی لیکن یکایک اُنہیں نہ جانے کیوں کیلنڈر میں دلچسپی پیدا ہو گئی تھی اور وہ اکثر اپنے بھتیجے سے پوچھتی رہتی تھیں کہ انگریزی مہینے کی کونسی تاریخ ہے؟ ایک دن انور سے نہ رہا گیا، اُس نے پوچھا "لیکن پھوپی امّاں آپ کو پہلے تو کبھی تاریخ اور مہینے کی اتنی فکر نہیں رہتی تھی؟" اُس کی بوڑھی پھوپی امّاں نے جواب دیا "یہ تو ٹھیک ہے بیٹا، لیکن تجھے نہیں معلوم کہ یہ جُون کا مہینہ ہے، اگلے مہینے تُو ماما بن جائے گا۔" انور کو اِس بات کا مطلب سمجھنے میں کچھ دیر لگی۔

انور اور انجم کو پھوپی اماں نے ہی پالا پوسا تھا، وہ چاہتی تھیں کہ بچہ دلّی میں اُن کی دیکھ بھال میں پیدا ہو۔ ہر مہینے وہ انور سے اپنے بھائی کے نام خط لکھواتی تھی کہ بچہ پیدا ہونے کے وقت انجم کو دِلّی بھیجنا نہ بھولیں۔ جُون کے آخر میں انجم کئی نوکر نوکرانیوں کے ساتھ دِلّی آ پہنچی۔ انور کو یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ رؤف اُس کے ساتھ نہیں آیا تھا۔ سال بھر بعد وہ اپنی بہن سے مل کر بے حد خوش ہوا لیکن اُس کا پیلا چہرہ اور آنکھوں کے گِرد سیاہی کے گھیرے دیکھ کر اُسے کچھ فکر ہوئی۔ وہ پہلے سے بہت

دُبلی ہو گئی تھی اور پیٹ کے بوجھ سے اُس کے پیر لڑکھڑا جاتے تھے۔

" ارے میں تجھ پر قربان جاؤں"۔ گلابو بوا نے انجم کو گلے سے لگانے کے لئے لپکتے ہوئے بڑے پیار سے کہا۔ "میری بٹیا کتنی دُبلی ہو گئی ہے، بٹیا سسرال میں کیا پیٹ بھر کھانا نہیں ملتا تھا؟"

اکبر علی نے اندر آ کر بیٹی کو گلے لگایا اور اُس کا سر سہلاتے ہوئے پوچھا کہ رؤف کیوں نہیں آیا۔ انجم نے شرماتے ہوئے سر جھکا کر جواب دیا "انھیں کوئی سرکاری کام تھا۔ اِس لئے نہیں آئے، لیکن وہ کچھ دن بعد آئیں گے"۔

جب سب لوگ چلے گئے تو انجم نے انور کو اکیلے میں اپنے پاس بُلایا اور بڑے پیار سے اُسے گلے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ انور نے محسوس کیا کہ وہ اِس طرح نہیں رو رہی تھی جیسے کوئی بہن بہت دن بعد اپنے بھائی سے ملنے پر روتی ہے، وہ تو سِسک سِسک کر رو رہی تھی اور آنسوؤں کے اُمنڈتے ہوئے طوفان کی وجہ سے اُس کا سارا بدن کانپ رہا تھا۔ لاکھ کوشش کرنے پر بھی انور اُسے خاموش نہ کر سکا۔ وہ مضبوطی سے اُس سے چمٹی رہی، اُس نے اپنے ناخن مضبوطی سے اُس کی باہوں میں گڑا رکھے تھے لیکن کچھ دیر بعد وہ چُپ ہو گئی اور اُس نے اپنے بھائی کی باہہ چھوڑ دی۔ اس سے پہلے کہ انور سمجھ پاتا کہ انجم کو کیا ہوا ہے، وہ بے ہوش ہو کر اُسکی گود میں گر پڑی۔

" پھوپی اماں! ابا! گلابو!" انور گھبرا کر چلایا " دیکھو تو باجی انجم کو کیا ہو گیا ہے!"

(۴)

اس کے بعد کچھ دن ایسے بیتے کہ انور کو ایسا لگتا تھا کہ وہ کوئی بھیانک خواب دیکھ رہا ہو، انور کے سارے شعور میں ایک بھیانک تناؤ رہا۔ وہ نہ ٹھیک سے

کھاتا تھا، نہ اُسے ٹھیک سے نیند آتی تھی اور نہ ہی وہ کچھ پڑھ سکتا تھا۔ اُس سے نہ اپنی بہن کے پلنگ کے پاس بیٹھا جاتا تھا اور نہ وہاں سے دُور ہونے پر بھی اُسے چین ملتا تھا اگر انجم زور سے کراہتی تو وہ ڈر سے کانپ اُٹھتا اور اگر وہ نڈھال ہو کر چُپ چاپ پڑی رہتی تو وہ بالکل ہی گھبرا جاتا اور سوچنے لگتا کہ کہیں وہ مر تو نہیں گئی۔

ڈاکٹر انصاری اور انگریز ڈاکٹرنی کو اُسے دیکھنے کے لیے بُلایا گیا تھا۔ دونوں لگ بھگ گھنٹے بھر تک اُسے دیکھتے رہے۔ بعد میں جب دونوں ہاتھ دھو رہے تھے تو انور نے اُنہیں انجم کی بیماری کے بارے میں باتیں کرتے سُنا۔ ساری باتیں تو اُس کی سمجھ میں نہیں آئیں کیونکہ درمیان میں وہ ڈاکٹری کے بہت سے موٹے موٹے لفظ بول رہے تھے اور انگریز ڈاکٹرنی کا بولنے کا ڈھنگ بھی کچھ عجیب تھا لیکن جو تھوڑا بہت اُس کی سمجھ میں آیا وہی کافی تھا۔

"ہیمرج ہو گیا ہے ... یہی تو مشکل ہو گئی ہے .... خُون رُک جائے تو کمال ہے۔"

"بیچاری لڑکی ... کتنی کمسن اور پیاری ہے ... میں اُس کے باپ کو جانتا ہوں، بہت ہی اچھے آدمی ہیں۔"

"بہت کم عمر میں شادی کر دی گئی ... اتنی چھوٹی عمر میں بچہ ہونا ہی نہیں چاہیئے تھا ... یہ تو جان بُوجھ کر مار ڈالنا ہے۔"

"جہالت ہے، بلا کی جہالت ہے، نہ جانے کتنی عورتوں کی جان اِسمیں جاتی ہے۔"

"بچہ نکالنا ہوگا نہیں۔۔۔ آپریشن کرنا ہوگا ۔۔۔ نہیں تو ۔۔۔ ہو جانے کا ڈر ہے۔"

بعد میں انور نے ڈاکٹر انصاری کو اپنے ابّا سے یہ کہتے سُنا کہ اب اتنی دیر ہو چکی ہے کہ ہسپتال لیجانا نا ممکن ہے گھر پر ہی آپریشن کرنا پڑے گا۔

دوسرے دن ڈاکٹر انصاری اور وہ انگریز ڈاکٹرنی اپنے کمپونڈروں اور ایک سفید پوش نرس کو لے کر آئے۔ وہ اپنے ساتھ لوہے کے کچھ چمکدار بکس بھی لائے تھے، جن میں چیر پھاڑ کے اوزار رکھے ہوئے تھے۔ انور ان اوزاروں کی طرف دیکھ بھی نہ سکتا تھا اور یہ سوچ کر ہی اس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے کہ اس کی بہن کا پیٹ چیرا جائے گا۔ وہ بھاگ کر ایک کونے میں چھپ گیا۔

انجم کے پیٹ کا آپریشن کر کے اس میں سے مرا ہوا بچّہ نکالا گیا۔ انور نے گلابو کو جس کی آنکھیں روتے روتے لال ہو گئی تھیں، کپڑے کی پوٹلی میں گڑیا جیسی کوئی چیز لپیٹ کر لے جاتے ہوئے دیکھا۔ گلابو نے چپ چاپ وہ پوٹلی اکبر علی کے ہاتھوں میں تھما دی۔ غم کے بوجھ سے دبے ہوئے اکبر علی چپ چاپ مرے ہوئے بچّے کو دفن کرنے کے لئے پوٹلی لیکر باہر چلے گئے۔ جب ڈاکٹر انصاری اور وہ انگریز ڈاکٹرنی لمبے لمبے ربر کے دستانے اُتارتے ہوئے کمرے سے نکلے تو دونوں بہت تھکے ہوئے تھے اور ان کے چہرے کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔

انور نے دھڑکتے ہوئے دل سے ڈاکٹر انصاری سے جا کر پوچھا "ڈاکٹر صاحب باجی اچھّی تو ہو جائیں گی نا؟"

ڈاکٹر صاحب نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے انور کی پیٹھ پر آہستہ سے ہاتھ رکھ کر جواب دیا "ہاں بیٹا ضرور اچھّی ہو جائیں گی۔۔۔ انشاء اللہ!"

انشاء اللہ! اگر اللہ نے چاہا۔ تو اس کا مطلب ہے کہ آخری فیصلہ اُس کی عدالت میں ہوگا۔ اسی لئے اُس کے ابّا اتنی دیر تک جانماز پر بیٹھے اللہ سے اپنی بیٹی کی جان کے لئے دُعا مانگتے رہتے تھے، اسی لئے پھوپی امّاں اُس وقت بھی تسبیح پر اللہ کے ہزار

نام لیکر دُعا پڑھ رہی تھیں یا قہار! یا جبار! یا غفار! اللہ رحیم ہے، کریم ہے، وہ انجم جیسی معصوم لڑکی کی جان کبھی نہیں لیگا۔ بہرحال انور کے لئے یہی سب سے اچھا راستہ یہی تھا کہ وہ اپنے ابّا اور پھوپی کے ساتھ مل کر دُعا مانگے۔ اُسے یہی تو بتایا گیا تھا کہ اللہ بچّوں کی دُعا زیادہ جلدی قبول کر لیتا ہے کیونکہ بچّے معصوم ہوتے ہیں۔ اِس لئے اُس نے سوچا کہ اُس کی دُعا فوراً قبول ہو جائے گی۔

وہ گھر سے نکل کر سیدھے جامع مسجد کی طرف چل پڑا۔ اگر اُسے دُعا ہی مانگنی ہے تو وہ خدا کے گھر میں جاکر دُعا مانگے گا۔ جون کی دوپہر میں ہانپتا کانپتا وہ دو دو زینے پھاند کر جامع مسجد کی سیڑھیوں کو پار کر گیا۔ دروازے پر جوتے اُتار کر وہ سیدھا بھاگتا ہوا منبر پر جا پہنچا جہاں کھڑے ہو کر اُس نے امام صاحب کو وعظ کرتے دیکھا تھا۔ قاعدے کے مطابق مغرب کی طرف منہ کر کے اُس نے اپنے دونوں ہاتھ اوپر اُٹھائے اور دبی زبان میں بولا "یا خدا، مجھے دُعا مانگنا نہیں آتا ہے، لیکن تو تو سب کے دل کی بات جانتا ہے تو میری دُعا قبول کرنے اور میری بہن کی جان بچالے، وہ ابھی کم عمر کی ہے اور ابھی اُس کی شادی ہوئی ہے اور اُس نے کبھی کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا ہے، رحم کر، اُسے موت سے بچالے۔" مسجد کے کھوکھلے گنبد سے ٹکرا کر اُس کی آواز لوٹ آئی اور انور کو ایسا لگا کہ اللہ میاں نے اُس کی بات سُن لی ہے اور اُس کی مُراد پوری کرنے کا وعدہ کر رہا ہے وہ گھر لوٹا۔ اُس کے دل کا بوجھ یکایک نہ جانے کیوں ہلکا ہو گیا تھا۔ اُس نے جھانک کر مریضہ کے کمرے میں دیکھا اور اُسے یہ دیکھ کر تسلّی ہوئی کہ نرس انجم کو دوا پلا رہی تھی۔
اُس رات کئی دن بعد اُس نے ٹھیک سے کھانا کھایا اور اطمینان کے ساتھ سویا۔ اُس کے دل میں کوئی کھٹکا نہیں تھا۔

(۵)

ابھی پو بھی نہیں پھٹی تھی کہ انور رونے کی آواز سُن کر جاگ پڑا۔ کچھ دیر تک تو وہ سوچتا رہا کہ شاید وہ سپنا دیکھ رہا ہے لیکن جب اُس نے آنکھیں کھول کر غور سے دیکھا تو اوپر تاروں بھرا آسمان اور اُس کے پس منظر میں پاس ہی آنگن میں لگے ہوئے نیم کے پیڑ کا خاکہ دکھائی دیا پھر اُسے پھوپی اماں کے رونے کی آواز سُنائی دی اور اُن کے خوفناک الفاظ سُن کر اُس کی نیند بالکل غائب ہو گئی۔ پھوپی اماں رو رو کر کہہ رہی تھیں "ارے انجم تو مجھے چھوڑ کر کہاں چلی گئی؟ تیری جگہ میں کیوں نہ مر گئی؟" انور بھاگا ہوا دالان میں پہنچا جہاں انجم کا پلنگ پڑا ہوا تھا۔ پاس ہی میز پر ایک لیمپ رکھا ہوا تھا جس کی روشنی کا گھیرا اُس سفید چادر پر پڑ رہا تھا جس سے انجم کا جسم ڈھکا ہوا تھا۔

"انجم سو رہی ہو گی" انور نے دل ہی دل میں اپنے آپ کو تسلّی دینے کی کوشش کی۔ "پھوپی اماں کو شاید دورہ پڑ گیا ہے"۔ لیکن اُس بوڑھی نرس کے چہرے پر ایسے جذبات تھے جنہیں دیکھ کر اُمید کی آخری کرن بھی بُجھ جاتی تھی۔ "بیٹا" اُس نے بڑی دھیمی آواز میں کہا۔ "اپنی بہن کو آخری بار دیکھ لے"۔ اور پھر انور کے دل کی دھڑکن جیسے یکایک رُک گئی۔ چادر کا کونا دھیرے دھیرے ہٹا تو اُس کی پیاری بہن کا چہرہ اُس کے سامنے آ گیا، کتنا سکون تھا اُس کے چہرے پر، بالکل ایسے لگتا تھا جیسے سو رہی ہو! انور اور قریب سے دیکھنے کے لئے آگے بڑھا لیکن یکایک ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ دہشت کے مارے وہ دم بہ خود کھڑا رہا، نہیں! نہیں! یہ اُس کی بہن نہیں تھی، یہ اُس کی بہن نہیں ہو سکتی۔ یہ کوئی اور چیز تھی، ایسی چیز جو نہ ہلتی جلتی ہے، نہ سانس لیتی ہے، جو زندہ نہیں ہے، یہ ایک جھوٹ تھا، ایک فریب تھا، زندگی کا چھلاوہ تھا، یہ موت تھی!

انور چاہتا تھا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر روئے لیکن موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بھی وہ نہ رو سکا۔ اُداس ہو کر وہ چُپ چاپ پیچھے مُڑا اور پہلی بار اُس نے وہاں منہ لٹکائے بیٹھے ہوئے لوگوں کو دیکھا۔ اُس کے ابّا اِس مُصیبت کے وقت بھی خشوع و خضوع کے ساتھ بیٹھے دُعا پڑھ رہے تھے۔ اُن کے پاس ہی پھوپی اماّں تھیں جو روتے روتے نڈھال ہو گئی تھیں۔ پھر بابا امجد علی بیٹھے تھے جو شاید رات کی گاڑی سے آئے ہوں گے اور اُن کی بغل میں سر جُھکائے رؤف بیٹھا تھا۔ رؤف! روف! ڈاکٹر کی بات چیت کے کچھ الفاظ انور کے دماغ میں بجلی کی طرح کوند گئے اور اُس پر ایک عجیب جنون چھا گیا۔

"تم! تُم!" اُس نے رؤف کو مخاطب کر کے چلّا کر کہا۔ "تُم نے میری بہن کو مار ڈالا!" اور اتنا کہہ کر وہ گھر سے اِس طرح بھاگا جیسے کسی بھوت سے یا کسی ناپاک چیز سے بھاگ رہا ہو۔

سڑک پر بالکل سناّٹا تھا۔ درمیان میں کہیں کوئی دودھ کی بالٹی لئے ہوئے جاتا دکھائی پڑ جاتا تھا۔ انور دائیں بائیں دیکھے بغیر سیدھا بڑھتا جا رہا تھا۔ ننگے سر اور ننگے پاؤں۔ اپنے تن بدن کی سُدھ بُدھ بھُلا کر وہ کہاں جا رہا تھا اور کیوں جا رہا تھا یہ تو خود اُسے بھی نہیں معلوم تھا۔ اُس کے دل میں بے حد تلخی تھی لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ یہ تلخی کس کے خلاف تھی۔ وہ ایک بہت بڑی طاقت کا مقابلہ کرنے جا رہا تھا — دنیا کی سب سے بڑی طاقت کا — لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ طاقت کیا ہے؟

جامع مسجد کا پھاٹک صبح کی نماز کے لئے ابھی کھلا تھا۔ انور اندر چلا گیا۔ جلدی جلدی اتنی اُونچی سیڑھیاں چڑھنے کی وجہ سے وہ ہانپ رہا تھا۔ پانی کے حوض کے پاس

پہنچ کر وہ رُک گیا۔ مسجد کے پاکیزہ سفید گنبدوں اور اونچی اونچی میناروں کی پرچھائیاں حوض کے گہرے پانی میں پڑ رہی تھیں اور صبح کی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے بار بار کانپ جاتی تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ ساری عمارت جیسے زلزلے کی وجہ سے لرز رہی تھی۔ مسجد کی پرچھائیں کی طرح ہی انور کا دماغ بھی جیسے گہرے اندھیرے خیالوں میں ڈوبا ہوا تھا اور اُس میں بھنور اُٹھ رہے تھے۔

مینار پر سے مؤذّن نے اذان دی اور اُس کی تیز آواز سنّاٹے کو چیرتی ہوئی گونج اُٹھی۔ انور کے خیالوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ دُعا مانگوں! دُعا مانگوں! وہ جھنجھلا کر سوچنے لگا۔ لیکن کس سے دُعا مانگوں؟ اور کس لئے دُعا مانگوں اور کیوں دُعا مانگوں؟ اُس نے دُعا مانگی تھی لیکن پھر بھی اس کی بہن مر گئی۔ خدا نے بھی اُسے نہیں بچایا! اُس کے دل میں اِن تلخ خیالات کا طوفان اُٹھتے ہی اُسے محسوس ہوا کہ اُس کے اندر کوئی چیز ٹوٹ گئی۔ یہ اُس کا اعتقاد تھا، یہ اُس کا ایمان تھا۔

آخر کار وہ رو پڑا، اور اُس کے دل میں جتنا غم تھا وہ آنسوؤں کی شکل میں بہہ نکلا۔ وہ مسجد کے لمبے چوڑے ویران صحن میں اونچی اونچی میناروں کے سائے تلے ایک چھوٹے سے بونے کی طرح کھڑا تھا۔ وہ اکیلا اور لاچار محسوس کر رہا تھا اور اُسے اُس بڑی طاقت سے ڈر لگ رہا تھا جسے اُس نے ابھی بُرا بھلا کہا تھا اور جس کے خلاف اُس نے بغاوت کی تھی۔ اپنے آنسو پونچھ کر وہ تھکے ہوئے بیجان قدموں سے لڑکھڑاتا ہوا باہر نکل آیا۔ کیا ایمان اور اعتقاد کے بغیر کوئی زندہ رہ سکتا ہے؟

مشرق کی طرف والے پھاٹک سے باہر نکل کر سیڑھیاں اُترنے سے پہلے کچھ دیر تک وہ اوپر کھڑا رہا۔ اُس کے سامنے اُفق پر صبح کی لالی کا سُنہرا اور گلابی رنگ

جھلک رہا تھا۔ نیچے لوگوں کی آمد و رفت شروع ہو گئی تھی۔ سفید ساڑھیاں پہنے عورتوں کی ٹولیاں دریائے جمنا کی طرف جا رہی تھیں۔ سڑکوں پہ ایک ٹرام کھڑکھڑاتی ہوئی گذر گئی۔ اچانک ایک سنسنی سی اُس کے بدن میں دوڑ گئی اور اُس نے محسوس کیا کہ اُس کی بہن کی موت کے ساتھ زندگی ختم نہیں ہو گئی ہے اور یہ محسوس کر کے اُسے بڑی تسلّی ہوئی کہ زندگی اب بھی بدستور چل رہی تھی۔ اب بھی صبح کو سُورج نکلتا تھا اور لوگ اپنے اپنے کام پر جاتے تھے۔ زندگی کے درمیان موت تھی اور موت کے درمیان زندگی۔

اب اُسے غالبؔ کے اُس شعر کا مطلب سمجھ میں آیا جسے وہ اب تک لاکھ کوشش کرنے پر بھی نہ سمجھ سکا تھا۔

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں

موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟

چٹان سے ٹکرا کر لوٹتی ہوئی آواز کی طرح اُس کے خیالات پھر اُس کے پاس واپس آ گئے۔ انسان پیدا ہوتا ہے اور انسان مر جاتا ہے اور اِس زندگی اور موت کے درمیان وہ تکلیفیں اُٹھاتا ہے۔ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے زندگی کے کھلتے ہوئے پھول دیکھ رہا تھا۔ چلتے پھرتے مرد اور عورتیں، سکول جاتے ہوئے بچے، مسافروں سے بھری کھڑکھڑاتی ٹرام، صبح کی خبریں چلّا چلّا کر اخبار بیچنے والا ——— انجانے ہی اُس پل میں انور کے دل میں ایک نیا اعتقاد پیدا ہوا۔ زندگی میں اعتقاد انجانے ہی انور اُس پل جوان ہو گیا ...

کتاب تیسری

بادل کی گرج بجلی کی کڑک

۱۱

ہلال اور تاج

(۱)

جس دُور اندیش بزرگ نے اپنی برادری کے دقیانوسی لوگوں کی سخت مخالفت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے محمڈن اینگلو اورینٹیل کالج کی بنیاد ڈالی تھی، اُس نے اُس کے لئے نشانی بھی بہت سوچ سمجھ کر چُنی تھی۔ اِس نشانی کے بیچ میں ایک کھجور کا درخت تھا جس کے ذریعے طالب علموں کو یہ یاد دلایا جاتا تھا کہ اُن کے دین کی جڑیں عربستان سے متعلق ہیں۔ اِس پیڑ کے ایک طرف ایک ہلال بنا ہوا تھا اور دوسری طرف تاج ـــــ بائیں طرف بنا ہوا ہلال اسلام کا روایتی نشان تھا اور دائیں طرف بنا ہوا تاج انگریز حکومت کی وفاداری کا مظہر تھا۔ اِس طرح ملک کے نئے حکمران اپنے ساتھ جو مغربی سائنس لائے تھے اُس کے ساتھ ایک تیرہ سو برس پُرانی روایت کو جوڑنے کی تجویز بنائی گئی تھی۔ اِس طرح ہندوستان کے مسلمانوں میں

جو اپنی حکومت ختم ہو جانے کے بعد گہری مایوسی میں ڈوبے ہوئے سب سے الگ تھلگ ہوتے جا رہے تھے، اُن کو دوبارہ اُبھارنے کی تجویز بنائی گئی تھی تاکہ وہ مُلک کی حکومت میں اپنا حصّہ مانگ سکیں۔

یہ کالج، جو اب بڑھ کر ایک یونیورسٹی بن گیا تھا، شروع شروع میں آکسفورڈ اور کیمبرج کے نمونے پر بنایا گیا تھا۔ ایک سَو کھلے رتیلے میدان میں بڑے بڑے ہال، چوک، پڑھائی کے کمرے اور لیبارٹریز بنوائی گئی تھیں۔ اُس بنجر زمین پر بڑی محنت سے گھاس اُگائی گئی تھی تاکہ داڑھی والے بزرگ شیخوں، سیّدوں اور مرزاؤں کے بیٹے کرکٹ، ہاکی، ٹینس اور فٹ بال کھیل سکیں۔ کرکٹ کا میدان اونچے گنبد والی مسجد کے ٹھیک نیچے تھا اور اکثر شام کو لارڈ کے میدان کے کرکٹ کے کھلاڑیوں کے انداز میں "ہاؤز دیٹ امپائر؟" چلّانے کی مشق کرتے ہوئے نوجوان لڑکوں کی آواز پر مسجد میں اذان دینے والے مولوی صاحب کی آواز چھا جاتی تھی۔ ہلال اور تاج کو اپنا نصب العین ماننے والے تعلیم کے اِس مرکز کی کئی انوکھی اور اجتماع بالضّدین باتوں میں سے ایک یہ بھی تھی!

(۲)

انور کو علی گڑھ آئے ہوئے یہ تیسرا سال تھا۔ پھر بھی وہ ابھی تک کچھ اُکھڑا اُکھڑا رہتا۔ یہاں پہنچنے پر اُس کی جو بُری حالت بنائی گئی تھی اُسے یاد کر کے اب بھی اُس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ اُسے ستایا گیا تھا، اُسے گالیاں دی گئی تھیں اور دوسرے طریقوں سے بے وقوف بنایا گیا تھا۔ یہاں کے پُرانے لڑکوں نے اُسے بتایا تھا کہ علی گڑھ میں نئے آنے والے لڑکوں کا اسی طرح استقبال کیا جاتا تھا

لیکن انور اتنا جذباتی تھا اور اُس کی پرورش اتنے ناز و نعم سے ہوئی تھی کہ وہ ایسے پھوہڑ اور بھونڈے مذاق کو پسند نہیں کر سکتا تھا۔ اُس نے اِن مستی کرنے والوں کے آگے ہتھیار تو ڈال دیے تھے، پر وہ اُس سے خوش نہیں تھا۔ وہ ہر وقت رُوٹھا رُوٹھا سا رہتا تھا اور کبھی کبھی جب وہ اپنے کمرے میں اکیلا ہوتا تھا تو اپنی لاچاری پر آنسو بھی بہاتا تھا۔ اُسے وہاں کے ماحول میں گھل مل جانے میں دوسروں سے زیادہ وقت لگ گیا۔ کیونکہ وہ جتنا زیادہ چِڑتا تھا، پُرانے لڑکوں کو اُس کا مذاق اُڑانے میں اُتنا ہی زیادہ مزا آتا تھا۔ تیسرے سال میں بھی لوگ اُسے اکثر "انور نواب" یا "لاڈلا انور" کہتے تھے۔ اِس طرح کی جتنی ہی باتیں اُس کے خلاف کی جاتی تھیں اُتنا ہی زیادہ وہ دوسروں سے الگ تھلگ رہتا تھا۔

دو برس میں انور صرف ایک لڑکے کو اپنا دوست بنا پایا تھا۔ عثمان فضل بھائی اس کے ساتھ ہی پڑھتا تھا، پر عمر میں اس سے ایک سال بڑا تھا۔ اُس نے بھی انور کی طرح ہی اکنامکس اور پولٹیکل سائنس کے مضامین لے رکھے تھے۔ اُس کے باپ بمبئی میں صابن اور خوشبوؤں کا بیوپار کرتے تھے۔ اُس میں اور انور میں ایک بات مشترک تھی۔ دونوں ہی کوئی کھیل نہیں کھیلتے تھے۔ لیکن عثمان کی پرورش ایک بہت بڑے شہر میں ہونے کی وجہ سے اُس میں انور سے زیادہ خود اعتمادی تھی اور اپنے رہن سہن کے معاملے میں وہ شوقین بھی زیادہ تھا۔ کھیل کُود کی طرف اُس کا رویّہ نفرت کا تھا اور اس کی طرف سے وہ اِس طرح بے پرواہ رہتا تھا جیسے وہ کوئی بہت ہی گھٹیا چیز ہو۔ اُسے صرف ادب اور سیاست میں دلچسپی تھی، باقی ہر چیز کو وہ وقت کی بربادی سمجھتا تھا۔ پیسے والا ہونے کی وجہ سے وہ نئی سے نئی

کتابیں خرید سکتا تھا اور خوشی خوشی انور کو بھی کتابیں پڑھنے کو دیتا تھا۔ وہ ڈاک سے اپنا پسندیدہ اخبار "بمبئی کرانیکل" منگاتا تھا اور اسی اخبار سے دونوں لڑکے تیزی سے بدلتے ہوئے سیاسی حالات کے بارے میں معلومات حاصل کرتے تھے۔

انور کو ہمیشہ سے اپنے قوم پرست ہونے پر ناز تھا لیکن عثمان کے ساتھ اس کی دوستی نے ہی اس کے سیاسی نظریے کو ایک مکمل صورت دی۔ شام کو جب دوسرے لڑکے کرکٹ یا ٹینس کھیلتے ہوتے اس وقت یہ دونوں ریل کی پٹری کے اس پار ادھر ادھر کے کھیتوں میں سیر کرتے رہتے ...... کلاس میں جو کچھ انہیں پڑھایا جاتا تھا اسے وہ ہندوستان کے سیاسی حالات پر لاگو کرنے کی کوشش کرتے تھے اور اکثر وہ اسی نتیجے پر پہنچتے کہ کتابوں میں لکھے ہوئے اصولوں اور زندگی کی حقیقتوں میں بہت فرق ہوتا ہے۔ عثمان ہمیشہ بڑے یقین کے ساتھ اپنی بات کہتا تھا اور وہ اپنے عقیدے کا بہت پکا تھا۔ کبھی کبھی وہ انور کے پیدائشی دبو پن پر، اس کی ڈانواڈول طبیعت پر اور ہر سوال کے دونوں پہلوؤں پر غور کرنے کی عادت پر جھنجھلا اٹھتا تھا۔ انور اپنے دوست کی صاف گوئی اور قوتِ ارادی کی تعریف تو کرتا تھا مگر وہ خود ذاتی تعلقات کے بندھنوں میں اتنی مضبوطی سے جکڑا ہوا تھا کہ وہ جن لوگوں کی عزت کرتا تھا یا جن سے وہ پیار کرتا تھا ان کے بارے میں وہ فوراً کوئی آخری فیصلہ نہیں کر پاتا تھا۔ عثمان کی رائے میں گوپال کے پتا جی جیسے لوگ ٹوڈی اور خوشامدی تھے، کاکا امیشور دیال غیر وطن پرست مہاجن تھے جو ولایتی کپڑا بیچتے تھے اور اس طرح "دشمن" کی مدد کرتے تھے اور حالانکہ وہ انور کا دل نہ دکھانے کے خیال سے کبھی ایسا کہتا

نہیں تھا۔ پر اُس کے رویّے سے یہ صاف ظاہر تھا کہ وہ اکبر علی جیسے لوگوں کو کٹّر رجعت پسند سمجھتا تھا۔ انور جانتا تھا کہ واقعیت کے مطابق عثمان کا خیال ٹھیک ہی تھا لیکن انور تو کسی ایسے داخلی جذبے کے شکنجے میں جکڑا ہوا تھا جو واقعیت سے زیادہ طاقتور تھا!

لیکن وہ ہمیشہ سیاست پر ہی باتیں نہیں کرتے تھے۔ عثمان اکثر بمبئی اور وہاں کی چہل پہل کی بھی باتیں کرتا تھا اور علی گڑھ کی "مُردہ" زندگی سے اُس کا مقابلہ کرتا تھا۔ اُس کی باتوں سے صاف ظاہر تھا کہ اگر اُس کے بابا کی یہ ضِد نہ ہوتی کہ وہ ایک مُسلم "ادارے میں پڑھے تو وہ بمبئی ہی میں پڑھنا زیادہ پسند کرتا۔ وہ اکثر بہت کُڑھ کر شکایت کرتا تھا۔ "لعنت ہے، یہاں نہ کوئی زندگی ہے، نہ کوئی چہل پہل ہے، نہ کوئی سوسائٹی ہے، کہیں لڑکی کی صُورت بھی دکھائی نہیں دیتی۔"

اِس یونیورسٹی میں ویسے تو کسی چیز کی کمی نہیں تھی لیکن "لڑکی" یہاں کے لئے ایک نایاب چیز تھی۔ لڑکوں اور لڑکیوں کے ساتھ پڑھنے کو بُرا سمجھا جاتا تھا یونیورسٹی کے ساتھ ایک مسلم گرلز کالج تھا لیکن وہاں بہت سخت پردہ کرایا جاتا تھا اور کالج کی لڑکیوں کو ۔۔ "شریف" مسلم گھرانے کی بیٹیوں کو ۔۔ مردوں کی نظروں سے بچانے کے لئے کالج کے چاروں طرف بیس بیس فٹ اونچی دیواریں تھیں۔ یونیورسٹی کا علاقہ شہر سے کچھ دُور تھا اور ہاسٹل کے وارڈن سے اجازت لئے بنا کوئی شہر نہیں جاسکتا تھا۔ اِس لئے سٹیشن ہی ایک ایسی جگہ تھی جہاں کسی عورت کی صورت دیکھنے کی اُمیّد کی جاسکتی تھی۔ سٹیشن پر آنے جانے والی گاڑیوں کو تاکنا یونیورسٹی کے طالب علموں کی ایک خاص تفریح تھی جس میں کسی طرح کی روک

ٹوک نہیں تھی۔

انور اور عثمان جیسے لڑکوں کے لئے جو شام کو بالکل خالی رہتے تھے، کئی وجہ سے سٹیشن ایک اڈّا بن گیا تھا۔ وہی ایک ایسی جگہ تھی جہاں ریستوراں میں کچھ ڈھنگ کی چائے مل سکتی تھی اور بُک سٹال پر نئی کتابیں، رسالے اور اخبار مل سکتے تھے اور پھر یہ لالچ تو رہتا ہی تھا کہ پلیٹ فارم کا چکّر لگاتے وقت گذرتی ہوئی ٹرین میں کوئی اچھی صورت دکھائی دے جائے۔

(۳)

چھٹّیوں کے بعد اکتوبر میں یونیورسٹی پھر کھلی اور انور جب گھر سے لوٹا تو اُسے پتہ چلا کہ عثمان ایک دو ہفتہ بعد آئے گا۔ اسی درمیان اُسے رہنے کے لئے سرسیّد کورٹ میں جگہ دی گئی۔ اُس کے ساتھ دو نئے لڑکے بھی اُن ہی کمروں میں رکھے گئے تھے جس کی وجہ سے اُسے کافی مایوسی ہوئی کیونکہ وہ تو یہ اُمیّد لگائے بیٹھا تھا کہ عثمان سے اُس کا دو سال پُرانا ساتھ اِس سال بھی جاری رہے گا۔ جن دو لڑکوں کے ساتھ اُسے رہنا تھا اُن سے مل کر بھی اُسے کوئی خاص تسلّی نہیں ہوئی۔

اُن میں سے ایک لڑکا لکھنؤ کا تھا۔ کالی رنگت، دُبلا پتلا جسم اور آنکھوں پر چشمہ۔ نام تھا مشتاق احمد۔ لیکن شاعر ہونے کی وجہ سے رآز تخلّص کرتے تھے، چال ڈھال میں زنانہ پن، ہر وقت لمبی لمبی زلفوں سے گھٹیا خوشبودار تیل کی مہک آتی رہتی تھی جس کی وجہ سے اُن کے تکیے کے غلاف پر ہمیشہ تیل کا چکنا دھبّہ پڑا رہتا۔ دُوسرا تھا اصغر حُسین، جو رآز سے بالکل اُلٹ تھا۔ ہٹّا کٹّا کسرتی جسم شاعروں پڑھنے لکھنے والوں اور اِس قسم کے دوسرے گھٹیا انسانوں سے سخت نفرت جسے

وہ چھپاتا نہیں تھا۔ انور سے وہ عمر میں کافی بڑا تھا اور کئی بار فیل ہونے کے بعد ابھی سال اُس نے بی۔ اے پاس کیا تھا پھر اُسے اتنی بار فیل ہونے پر بھی کوئی فکر نہیں تھی۔ اب بھی اُسے امتحان پاس کرنے کے مقابلے میں کھیل کود کا چیمپئن بن جانے کی زیادہ فکر تھی۔

اِن تینوں کی بنگرام بھی عجیب و غریب تھی۔ اصغر رات کو دس ہی بجے سو جاتا تھا اور صبح چھ بجے سے اُٹھ کر ڈمبل گھمانے لگتا تھا اور تین میل لمبی دوڑ لگانے نکل جاتا تھا۔ رازؔ صاحب کبھی دو بجے سے پہلے نہیں سوتے تھے۔ راتوں کو جاگ کر وہ شاعری کرتے رہتے تھے اور غالبؔ کے انداز میں غزلیں کہنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ صبح دس بجے سے پہلے اگر جگا دیا جائے تو انہیں سخت ناگوار گذرتا تھا۔ اصغر کھانے کے معاملے میں شیر تھا۔ صبح ناشتے پر ہی سیر بھر دودھ آدھے درجن مکھن لگے ہوئے توسٹ اور تلے ہوئے تین انڈے صاف کر جاتا تھا۔ رازؔ ایک ایک کر کے کتنے ہی چائے کے پیالے پی جاتا تھا اور بیچ بیچ میں میٹھا بسکٹ کترتا رہتا تھا۔ پہلوان بولتا نہیں گرجتا تھا۔ شاعر بولتا نہیں ممیاتا تھا۔ ایک کا خیال تھا کہ دنیا میں سینڈو سے بڑا کوئی آدمی نہیں ہوا۔ دوسرے کا یہ پکّا یقین تھا کہ جس نے لکھنؤ کے انیسؔ اور آتشؔ اور مومنؔ جیسے شاعروں کو نہیں پڑھا اُس نے اپنی زندگی میں کچھ نہیں کیا۔ ان دونوں کے درمیان انور کی جان مصیبت میں رہتی تھی۔ وہ پوری طرح دونوں میں سے کسی سے بھی اتفاق نہیں کر سکتا تھا پھر بھی اکثر اُسے دونوں کے جھگڑے میں بیچ بچاؤ کرنا پڑتا تھا۔

اصغر اور رازؔ میں سے وہ دل ہی دل میں اصغر کو زیادہ پسند کرتا تھا کیونکہ اصغر میں ہر وہ چیز تھی جو انور میں نہیں تھی ــــ اچھی تندرستی، ہر وقت کی مستی؛ اور پھر وہ ایک اچھا کھلاڑی بھی تو تھا جو تیرنا جانتا تھا، گھوڑسواری جانتا تھا اور اُسے کرکٹ

کھیلنے یا "ہرڈل" پھاندنے ہر کھیل میں مہارت حاصل تھی۔ اصغر کو بھی یہ دُبلا پتلا جھینپو لڑکا بہت پسند تھا۔ اُس کی حفاظت کرنا وہ اپنا فرض سمجھتا تھا اور اُس نے ہاسٹل کے تمیس مار خانوُں کو یہ بات اچھی طرح سمجھا دی تھی کہ اگر کوئی انور کو ستائے گا یا چھیڑے گا تو اُس کی خیر نہیں ہے۔ جہاں تک شاعر صاحب کا سوال تھا انور کو انہیں دیکھ کر نہ جانے کیوں سانپ کا خیال آتا تھا۔ اُسے اُن کی زنانی چال ڈھال سے، اُن کے تیل سے چپڑے ہوئے بالوں سے اور گھنٹوں بیٹھ کر چھت کو تاکتے رہنے یا خیالوں میں ڈوُبے ہوئے خلاء میں تکتے رہنے سے سخت چڑھ تھی۔

(۴)

آخر کار عثمان بمبئی سے واپس لوٹا۔ وہ اپنے ساتھ بہت سی سیاسی خبریں لایا تھا حالانکہ اُسے رہنے کے لیئے دوسرا کمرہ دیا گیا تھا۔ پھر بھی وہ پہلا موقع ملتے ہی اپنے دوست سے باتیں کرنے پہنچ گیا۔ اُسے انور کو بہت سی باتیں بتانی تھیں، اس لئے دونوں کھیتوں کی سیر کو نکل پڑے اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ واپسی میں وہ چلتے پیتے سٹیشن جائیں گے۔ اکتوبر ختم ہو رہا تھا اور ہوا میں تھوڑی خنکی آ چلی تھی۔ مٹر کے کھیت بیگنی اور لال رنگ کے پھولوں سے لدے ہوئے تھے اور ڈوُبتے ہوئے سورج کی کرنوں نے ہر چیز پر سونا بکھیر دیا تھا۔

عثمان نے اپنی چھُٹیاں دُوسرے طالب علموں کی طرح کتابیں پڑھنے یا واہی تباہی وقت برباد کرنے میں نہیں بتائی تھیں۔ وہ بہت اہم سیاسی تحریکوں کے ساتھ گہرے طور پر وابستہ رہا تھا۔ سب سے پہلے تو اس نے انور کو باردولی کی کسان ستیہ گرہ کے بارے میں بتایا جس نے پورے گجرات کے دیہات میں بغاوت کی آگ بھڑکا

دی تھی۔ عثمان کا آبائی گھر اُسی ضلع میں تھا۔ عثمان نے بڑے جوش کے ساتھ بتایا کہ وہاں کے کسان اپنے حقوق کے لئے کس بہادری کے ساتھ سرکار اور زمینداروں کی طاقت کے خلاف لڑے تھے، انہیں گرفتار کر کے جیلوں میں بند کر دیا گیا۔ انہیں پیٹا گیا، اُن کی جائداد ضبط کر لی گئی لیکن انہوں نے ہار نہیں مانی۔ آخر میں جیت اُن ہی کی ہوئی۔ سارے قیدی رہا کر دیے گئے اور سرکار کو کسانوں کی شکایتوں کے بارے میں جانچ کرنی پڑی۔ جس وقت عثمان کسانوں کی اِس لڑائی کی تفصیلات بیان کر رہا تھا اُس وقت انور کے تصوّر میں ایک جوشیلا منظر اُبھر آیا جیسے ہزاروں جیالے کسان اپنے حقوق کے لئے کمر کس کر میدان میں اُتر آئے تھے اور ظلم و جبر کی ظالم طاقتوں کے سامنے سر جھکانے سے انکار کر رہے تھے۔ انور اور عثمان ایک چھوٹے سے گاؤں سے ہو کر گذر رہے تھے۔ درجنوں چولھوں سے اُٹھتا ہوا نیلا دھواں بل کھاتا ہوا نیلے آسمان کی طرف اُٹھ رہا تھا۔ کسان کندھوں پر اپنے ہل رکھے اپنے بیلوں کی جوڑی ساتھ میں لئے ہوئے چلے آرہے تھے ـــــ سیدھے سادے دُبلے پتلے لوگ جن کے بدن پر ایک میلی کچیلی لنگوٹی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ جب وہ اِن دونوں نوجوانوں کے پاس سے گذرتے تو انہیں سلام کرتے۔ جب دونوں دوست گاؤں کی گندی بدبودار گلی پار کر کے باہر نکلے اور ریل کی پٹری کی طرف مُڑے تو انور سوچنے لگا کہ باردولی میں جو آگ بھڑک اُٹھی ہے وہ یو۔پی کے اِن گاؤوں تک کب پہنچے گی؟

اتنے میں عثمان نے ایک دُوسری سیاسی جدّوجہد کا ذکر شروع کر دیا تھا جو اُس نے بمبئی میں اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ کپڑے کی ملوں کے ہزاروں مزدوروں نے ہڑتال کر دی تھی اور یہ کہا تھا کہ جب تک اُن کی مانگیں پوری نہیں کی جائیں گی تب

تک وہ ایک بھی کارخانہ نہیں چلنے دیں گے۔ انھوں نے بھی اپنی مانگیں منوالی تھیں۔

عثمان کا دعویٰ تھا کہ کسانوں اور مزدوروں کی یہ جدّوجہد لگان گھٹوانے یا مزدوری بڑھوانے کی چھوٹی موٹی جدوجہد نہیں تھی بلکہ اُن سے ہندوستان میں ایک نئی عظیم طاقت کے پیدا ہونے کا پتہ چلتا تھا۔ اُس کا کہنا تھا کہ اب کانگریس وانگریزی حکومت کے اندر ڈومینین سٹیٹس کی مانگ کرتے ہوئے صرف تجویز پاس کروانے والے دَبّو وکیلوں کی تنظیم نہیں رہ جائے گی۔ اُس نے بتایا کہ جواہر لال نہرو اور سبھاش چندر بوس جیسے نوجوانوں کی رہنمائی میں "انڈی پنڈنس آف انڈیا لیگ" بن گئی ہے جو کانگریس کے پُرانے لیڈروں کو مکمّل آزادی کے انقلابی مقصد کی طرف لے جانے کے لئے ملک کے نوجوانوں کو تیّار کر رہی تھی۔ انور ادھر کئی برسوں سے رتن سے نہیں ملا تھا اور اُس کے خط بھی کبھی کبھار ہی آتے تھے اور وہ بھی بہت چھوٹے۔ لیکن عثمان کی باتیں سُن کر اُس کے دل میں فوراً یہ خیال اُٹھا کہ "یہ رتن سے کتنا ملتا ہے! ۔ کاش میں ان دونوں کی ملاقات کروا سکتا۔"

(۵)

جب وہ سٹیشن پہنچے تو تھک کر بالکل چور ہو چکے تھے لیکن وہ بہت خوش تھے اور اُن کا جوش اُمنڈ پڑ رہا تھا۔ سُورج ڈُوب چکا تھا اور پنجاب میل اُسی وقت پلیٹ فارم پر آئی تھی۔ یہ ٹرین، جو بہت دُور ہگلی کے کنارے بسے ہوئے کلکتہ شہر سے آتی تھی اور دلّی سے ہوتی ہوئی پنجاب کے میدانوں کو پار کر کے بہت دُور آگے تک چلی جاتی تھی، نہ جانے کیوں اتنی رُومانی لگتی تھی کہ اُسے دیکھتے ہی دل میں نہ جانے کیوں ایک ہلچل سی مچ جاتی تھی۔ انور کے لئے یہ ٹرین اُن تمام جگہوں کی علامت تھی جن کی وہ

سیر کرنا چاہتا تھا، وہ اُن تمام جوشیلے امُور کی علامت تھی جو وہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ لمبی سی ہری گاڑی ہانپتی کانپتی دھیرے دھیرے پلیٹ فارم کے کنارے آ کر رک گئی۔

پلیٹ فارم پر ایک اچھی خاصی بھیڑ تھی۔ انور اور عثمان بھی اُس بھیڑ میں کھڑے مسافروں کو تاک رہے تھے۔ اُن کی نظریں کسی اچھی صورت کی تلاش میں تھیں۔ اتنے میں انور نے ایک ایسا خوبصورت چہرہ دیکھا جیسا اُس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اُس کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ کھڑکی سے باہر سر نکالے جھانک رہی تھی۔ سفید کپڑے پہنے ہوئے کوئی پندرہ یا سولہ سال کی لڑکی رہی ہوگی جس کے خوبصورت لمبوترے چہرے کے چاروں طرف گھنگھریلے بالوں کا ایک گھیرا تھا۔ انور صرف اتنا سمجھ پایا کہ اُس کی بڑی بڑی معصوم کالی آنکھیں کسی آدمی کو یا کسی چیز کو ڈھونڈ رہی تھیں، لیکن اُس کے فوراً ہی بعد وہ ڈبہ آگے نکل گیا تھا اور اِدھر اُدھر بھاگتے ہوئے سینکڑوں مسافروں کے شور و غل اور دھینگا مشتی میں وہ مکھڑا اُس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔

اچانک اُن کی مڈبھیڑ پولیٹیکل سائنس ڈیپارٹمنٹ کے پروفیسر سلیم سے ہو گئی۔ لمبا چوڑا ڈیل ڈول، لال چہرہ، کپڑوں کے معاملے میں بے حد محتاط۔ لگتا تھا وہ کسی کو ڈھونڈ رہے تھے۔

اُس تمام گڑبڑ اور بھاگ دوڑ میں اُنہوں نے کسی کی مدد چاہتے ہوئے بہت گھبراہٹ میں پوچھا۔ "لڑکو، تم نے میری بیٹی کو تو نہیں دیکھا ہے؟"

دیکھنا تو دُور رہا، انور اور عثمان کو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ پروفیسر سلیم کے کوئی بیٹی بھی ہے، لیکن انور کو ایک دم سے اُن بڑی بڑی معصوم کالی آنکھوں کی یاد آ گئی جنہیں اُس نے کچھ ہی دیر پہلے کسی کو کھوجتے دیکھا تھا۔ اُس نے اندھیرے میں تیر چھوڑا۔ "جی ہاں دیکھا ہے، وہ آگے والے ڈبے میں ہے۔" اور جب لڑکی کے باپ گھبرائے ہوئے

اُس ڈبّے کی طرف بڑھے تو انور بھی بھیڑ کو چیر کر اُن کے ساتھ ہولیا۔ خوش قسمتی سے اُس کا تیر ٹھیک نشانے پر بیٹھا تھا کیونکہ اُس نے دیکھا کہ وہ لڑکی اپنے ابّا کے گلے میں بانہیں ڈال کر اُن سے لپٹ گئی۔ قلی نے سامان اٹھالیا اور وہ سب سٹیشن سے باہر نکلنے کیلئے پھاٹک کی طرف چلے۔ چلتے چلتے وہ لڑکی بہت ہنس ہنس کر کانپور سے یہاں تک کے اپنے لمبے سفر کے بارے میں اپنے ابّا کو بتا رہی تھی۔ انور کو بیچ میں ٹانگ اڑانے کی کوئی ضرورت تو نہیں تھی مگر وہ لپک کر پروفیسر صاحب کے پاس پہنچا اور چاروں طرف کے شور غل سے زیادہ اونچی آواز میں بولا "میرے لائق کوئی اور خدمت؟ ٹانگہ لے آؤں؟"۔ پروفیسر صاحب نے جواب دیا "نہیں نہیں، ٹھیک ہے انور، تم تکلیف نہ کرو، میں اپنی موٹر میں آیا ہوں" اور اتنا کہہ کر وہ بھیڑ کو چیرتے ہوئے اپنی بیٹی کے ساتھ آگے بڑھ گئے۔ دیکھتے دیکھتے وہ آنکھ سے اوجھل ہو گئے۔ اُس لڑکی نے شاید انور کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھا بھی نہیں۔

"چلو یار، ایک پیالی چائے پئیں گے"، عثمان نے کہا۔ گارڈ نے سیٹی دی تھی، اور گاڑی چلنے والی تھی۔ مسافروں کی بھیڑ چھٹ گئی تھی ـــــ کچھ گاڑی کے ڈبّوں میں گھس گئے تھے اور کچھ سٹیشن سے باہر نکل رہے تھے۔ بس کالی شیروانیاں پہنے ہوئے کچھ لڑکے پلیٹ فارم کا چکّر لگا رہے تھے اور زنانہ ڈبّے کے سامنے پہنچ کر اُن کے قدم دھیمے ہوتے ہوتے اپنے آپ رُک جاتے تھے۔ ریفریشمنٹ رُوم کی طرف بڑھتے ہوئے عثمان کہہ رہا تھا "بمبئی میں جتنے بھی بڑے بڑے کانگریسیوں سے میں ملا اُن سب ہی نے یہی کہا کہ لڑائی تو ہوگی ـــــ ایسی آخری لڑائی جس میں جیت اور ہار کا فیصلہ ہو جائے گا اور انہوں نے یہ بھی کہا کہ تمہارے اور میرے

جیسے لوگوں کو تیار رہنا چاہیئے ..." لیکن یہ پہلا موقع تھا کہ انور اپنے دوست کی سیاسی باتوں میں کوئی دلچسپی نہیں لے رہا تھا۔ وہ اُس کی باتیں سُن تک نہیں رہا تھا۔

(۶)

اُس رات انور سو نہ سکا۔ اِس لئے جب اصغر خرّاٹے لینے لگا اور راز صاحب مشقِ شعر و شاعری کے لئے پیچھے والے کمرے میں چلے گئے تو وہ چپکے سے کمرے کے باہر نکل آیا۔ وہ کسی کھُلی جگہ میں جانا چاہتا تھا جہاں کوئی نہ ہو۔ اُسے ایسا پہلے کبھی محسوس نہیں ہوا تھا جیسا کہ اب ہو رہا تھا۔

باہر آنگن میں سنّاٹا چھایا ہوا تھا۔ صرف ایک دو کمروں میں بتّیاں جل رہی تھیں۔ چوتھائی چاند کی مدھم روشنی میں مسجد کے گنبد اور مینار تاروں بھرے آسمان کو چُوم رہی تھیں اور انور کو ایسا لگا کہ اُس نے پہلے کبھی اِن سب چیزوں کی پُوری خوبصورتی کو نہیں سراہا تھا ــــ چاند، ستارے، وہ سڈول مینار، شاندار گنبد اور اندھیرے میں گھنٹہ گھر کی دُھندلی دُھندلی شکل۔

رات میں نہ جانے کتنے پھُولوں کی خوشبو بسی ہوئی تھی ــــ گلاب کی بھینی بھینی خوشبو، چنبیلی کے پھُولوں کی مست مہک اور شب دُلہن کی نشیلی تیز خوشبو۔ وہ گھاس پر لیٹ گیا۔ گھاس ابھی حال ہی میں کاٹی گئی تھی اور اُس میں سے ایک عجیب سوندھی سوندھی خوشبو نکل رہی تھی۔ اوس سے بھیگی ہوئی زمین سے بھی سوندھے پن کی خوشبو آ رہی تھی۔

چاروں طرف خاموشی تھی اور ایک عجیب خوشی جسے بیان کرنا مشکل تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں اُس کے دل میں درد بھی تھا، نہ جانے کیوں اُسے ایسا لگ

رہا تھا کہ وہ اکیلا ہے۔ ساری دنیا اُسے خاموش لگ رہی تھی پھر بھی اُس کے دل میں ایک عجیب بے چینی تھی۔ اُسے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اپنے دل میں جو گہری تمنا چھپائے ہوئے تھا وہ کسی دن پوری بھی ہو گی۔

انور اسی طرح گھاس پر لیٹا رہا ــــ ایک گھنٹہ ــــ دو گھنٹے ــــ نہ جانے کتنی دیر وہ جاگ رہا تھا پھر بھی اُس کا دماغ سو رہا تھا۔ اُوپر گھنٹہ گھر کی گھڑی نے جب کچھ بجائے تو وہ یہ بھی نہ گن سکا کہ کتنے بجے ہیں۔ وہ سوچ نہیں سکتا تھا، وہ صرف محسوس کر سکتا تھا۔ وہ رات کا حُسن، اُس کی خاموشی اور اُس کا درد پی جانا چاہتا تھا، اُسی طرح جیسے پیاسی زمین برسات کے پہلے چھینٹے کا سارا پانی جذب کر لیتی ہے۔

وہ گھاس میں مُنہ دے کر لیٹ گیا۔ وہ اپنے چکنے گالوں پر زمین کی ملائمت محسوس کر رہا تھا۔ گھاس کی نوکیں اُسے گُدگُدا رہی تھیں۔ ایک دم سے اُس کا جی چاہا کہ وہ کوئی بہت بڑا کام کر ڈالے۔ اُس نے اپنی مُٹھی میں کچھ گھاس پکڑ کر اُسے جڑ سے اُکھاڑ لیا۔ گھاس اُکھڑنے سے جو ہلکی سی کھُردری آواز پیدا ہوئی جیسے کوئی جسم سے جسم کا کوئی حصّہ نوچ لے، اُس سے انور کو نہ جانے کیوں بہت تسلّی ہوئی۔ اُس نے اپنے ناخن نرم گیلی مٹّی میں دھنسا دیئے۔ اچانک اُس کا جی چاہا کہ وہ مٹّی کو کھود دے، اُس کی شکل بگاڑ دے، اپنا سارا بدلہ اُس سے چُکا لے۔ اُس نے پاس کی ایک جھاڑی سے گلاب کا ایک پھُول توڑا اور ایک ایک کر کے اُس کی ساری پنکھڑیاں نوچ کر زمین پر بکھیر دیں۔

پھُول توڑتے ہوئے اُس کی اُنگلی میں کانٹا چبھ گیا اور جب اُس نے اُنگلی

کو مُنہ میں ڈال کر چُوسا تو خون، اُس کا اپنا خون اُسے کڑوا لگا، کڑوا لیکن میٹھا!

جب وہ اپنے کمرے میں واپس لوٹا تو بالکل تھک چکا تھا پھر بھی اُسے ایک عجیب سا اطمینان تھا لیکن کوئی سوتے میں بھی اُس کا پیچھا کر رہا تھا۔ یہ وہی "دوسری عورت" تھی جسے اُس نے بچپن میں دیکھا تھا اور اب بھی وہ چلا کر کہہ رہی تھی۔ "میں عورت ہوں، عورت کی بیٹی ہوں۔ تُم مجھ سے بچ کر کہاں جاؤ گے؟" لیکن جب وہ پاس آئی تو انور نے دیکھا کہ اُس کا چہرہ لمبوترا تھا اور چہرے کے چاروں طرف گھنگھریالے کالے بالوں کا گھیرا تھا اور بڑی بڑی معصوم کالی آنکھیں تھیں۔

(۷)

دُوسری صبح جب انور نے بال بنانے کے لئے آئینہ دیکھا تو اُس کے اپنے گالوں پر اور ٹھُڈّی پر اُگے ہوئے بال یکایک بہت بڑے معلوم ہوئے۔ بال تھے تو بہت کافی عرصے سے، پر اُن کی طرف اُس نے اب تک کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ اُس کے چکنے صاف سُتھرے چہرے پر وہ کتنے ملائم اور ریشمی معلوم ہوتے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ ایک بار جہاں اُس نے داڑھی بنانا شروع کر دی تو پھر اُس کی کھال بھی اصغر اور راز کی طرح سخت اور کھُردری ہو جائے گی کیونکہ وہ دونوں روز داڑھی بناتے تھے۔ لیکن آج اُسے اپنی داڑھی کے بالوں سے نہ جانے کیوں اُلجھن ہو رہی تھی۔ وہ اُن کی وجہ سے نہ جانے کیوں شرمندہ تھا۔ اُن کی وجہ سے وہ بالکل لونڈا لگتا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ وہ مرد لگے۔ اور اس لئے ایک خالی پیریڈ میں وہ اپنے کمرے میں واپس آیا اور کمرہ اندر سے بند کر کے اصغر کا داڑھی بنانے کا سامان نکال لایا اور گال پر صابن رگڑنے لگا۔ پہلی بار جب اُس نے اپنی داڑھی پر ریزر چلایا اور صابن کے

جھاگ کے ساتھ کچھ بال اُتر آئے تو اُس کے تن بدن میں جیسے جھرجھری سی دوڑ گئی۔ جب اپنی ناتجربہ کاری کی وجہ سے اُس کی ٹھڈی ایک جگہ سے کٹ گئی تب بھی اُسے کوئی پروا نہیں تھی۔ ٹھڈی پر خون کی ایک پتلی سی لکیر اُبھر آئی لیکن اُسے ذرا بھی فکر نہیں ہوئی کیونکہ اُس نے بڑی ہوشیاری سے پرانے داڑھی بنانے والوں کی طرح اُس پر پھٹکری مَل دی۔ پھٹکری لگاتے ہی کٹے ہوئے زخم میں ایک ہلکی سی چبھن ہوئی جس میں انور کو بہت مزہ آیا اور خون بہنا ایک دم بند ہو گیا لیکن زخم کا نشان باقی رہ گیا۔ یہ اُس کی جوانی کا پہلا گھاؤ تھا!

اُس دن سے انور اپنے کپڑوں کی طرف بھی زیادہ توجہ دینے لگا۔ وہ اپنے چہرے کو غور سے دیکھنے کے لئے جو پہلا ضرور تھا لیکن دیکھنے میں اتنا بُرا نہیں تھا آئینے کے سامنے کچھ دیر کھڑا رہتا۔ اب عثمان کے ساتھ ٹہلنے جانا بھی پہلے سے کم ہو گیا اور اکثر وہ کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر اکیلے سیر کو نکل جاتا تھا اور جب وہ عثمان کے ساتھ جاتا بھی تھا تو موقع پاتے ہی بات چیت کا رُخ سیاست کی طرف سے نجی باتوں کی طرف موڑ دینے کی کوشش کرتا تھا۔

"عثمان، اچھا ایک بات بتاؤ"، اُس نے ایک دن اچانک پوچھا "محبت کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟"

بمبئی کے آزاد ماحول میں پلے ہوئے عثمان نے جواب دیا "میں محبت کو بالکل بکواس سمجھتا ہوں۔ میں تو سیاسی کام کروں گا۔ میں کسی بیوقوف لڑکی کے گلے سے بندھنا نہیں چاہتا۔"

"لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ لڑکی بیوقوف ہی ہو؟" اُردو کے پرانے شاعروں

کی غزلوں سے محبت کا سبق سیکھنے والے انور نے فوراً اعتراض کیا۔ "وہ تمہارے کام میں تمہیں انسپیریشن بھی دے سکتی ہے۔"

"لڑکیاں سب ہی بیوقوف ہوتی ہیں۔" عثمان نے اپنا آخری فیصلہ دیتے ہوئے کہا اور پھر یکایک چپ ہو گیا حالانکہ چپ ہو جانا عثمان کے لئے ایک عجیب بات تھی۔ ــــ شاید وہ اپنی اِس رائے کے بارے میں ثبوت ڈھونڈنے کے لئے اپنے تجربے کی گہرائیوں میں غوطے لگا رہا تھا۔

دُوسرے دن انور عثمان کے آنے سے پہلے ہی ہوسٹل سے کھسک گیا۔ کرکٹ کے کھلاڑی سفید پتلونیں پہنے ہوئے مسجد کے پیچھے والے میدان میں کرکٹ کھیل رہے تھے۔ سٹاف کلب میں موٹی موٹی توندوں والے یا دُبلے پتلے گنجے پروفیسر ٹینس کھیل رہے تھے۔ انور نے اُن کے درمیان پروفیسر سلیم کو بھی دیکھا جو اپنے زمانے میں کیمبرج میں ٹینس کے ایک مانے ہوئے کھلاڑی رہ چکے تھے۔ ادھیڑ عمر میں جسم کچھ بھاری ہو جانے کے باوجود وہ اب بھی کافی زور سے بلّا چلا لیتے تھے۔ پھر وہ سول سروس کلب کے سامنے والی سڑک سے ہوتا ہوا سٹیشن کی طرف چل دیا لیکن لال ڈگی کے پاس پہنچ کر وہ میرِس روڈ کی طرف مُڑ گیا۔ اُس نے سوچا کہ میل بھر کا چکّر تو پڑ جائے گا لیکن اتنی دُور زیادہ چل لینا میرے لئے فائدہ مند ہو گا۔ گرلس کالج کی اُونچی اُونچی دیواریں جن میں کہیں ایک کھڑکی بھی نہیں تھی، سنتریوں کی طرح اُس کا راستہ روکے کھڑی تھیں۔ اُس کے دل میں یہ خیال کیوں اُٹھا کہ پروفیسر سلیم کی بیٹیا سلمیٰ دن میں یہیں پڑھنے آتی ہو گی؟ اور اُس کے کچھ ہی دیر بعد جب وہ ایک بنگلے کے سامنے سے گذر رہا تھا جس کے پھاٹک پر پیتل کی ایک تختی لگی تھی

اپنے آپ ہی اُس کی چال دھیمی اور دل کی دھڑکن تیز کیوں ہو گئی تھی! ظاہر ہے مخملی لان کی ہری ہری گھاس اور مہندی کی باڑ کے اُس پار پھولوں کی خوبصورت کیاریوں کو دیکھنے کے لئے ہی اُس کی نظریں اُدھر اُٹھ گئی تھیں۔ اگر لگے ہاتھوں اُسے سفید غرارہ، آسمانی کُرتا اور اُسی رنگ کا ڈوپٹہ پہنے کوئی اکہرے بدن کی لڑکی برآمدے میں آرام کرسی پر بیٹھی کتاب پڑھتی دکھائی دے گئی تھی تو اِس میں اُس کی کوئی بدتمیزی یا بے ہودگی تو نہیں تھی۔ اور اگر سٹیشن تک جانے کی بجائے انور کچھ دیر بعد واپس لوٹ گیا تھا تو اُس کی وجہ صرف یہی تھی کہ سٹیشن پہنچتے پہنچتے بہت دیر ہو جاتی اور واپسی میں شاید اُسے زُکام ہو جاتا۔

اُس ہفتے انور نے میرِیس روڈ کے کئی چکّر لگائے۔ وہ بہت ہی سُہانی اور خاموش سڑک تھی، شاید ہی کبھی کوئی موٹر یا اِکّہ تانگا اُدھر سے دھول اُڑاتا ہوا گذرتا تھا۔ لیکن ایسا لگتا تھا کہ انور کی ہی طرح اور بہت سے لڑکے وہاں ایسے ہی صحت بنانے کے لئے ٹہلنے آتے تھے اور لگے ہاتھوں اگر اُنہیں یہاں وہاں جوان شانوں پر لاپروائی سے پڑا ہوا دھنک کے رنگ کا کوئی ڈوپٹہ، ساڑی میں لپٹا ہوا کوئی سڈول جسم، کوئی خوبصورت ہرن جیسی آنکھیں یا کالی کالی گھٹاؤں جیسے بالوں کی چوٹی گوندھتی ہوئی دکھائی دے جاتی تو اُنہیں اِس میں اعتراض ہی کیا ہو سکتا تھا۔ یہ بھی علی گڑھ کی ایک بہت مقبول تفریح تھی جس کا بہت سارے لوگوں کو شوق تھا اور اِسی لئے ظاہر ہے کہ اُنہوں نے انور کو بھی اپنے ہی جیسا سمجھ لیا۔

"ہیلو انور، کوئی پنچھی دکھائی دیا؟" ایک دن شام کو پروفیسر سلیم کے بنگلے کے سامنے ٹہلتے وقت ایک دوسرے لڑکے نے اُس کے پاس آکر پوچھا۔

"پنچھی؟ کیسا پنچھی؟" انور اِس سوال پر سچ مچ چکرا گیا۔

"پنچھی نہیں جانتے کیا ہوتا ہے ـــــ پنچھی یعنی فیشیا ـــ یہی میریس روڈ کی چڑیاں یا جل پریاں ـــــ"

انور اُس کا مطلب سمجھ گیا۔ لیکن اُسے یہ مذاق پسند نہیں آیا اور یہ بات اُس نے اُس دُوسرے لڑکے سے صاف صاف کہہ بھی دی۔

"یار! اب اتنے پاکباز نہ بنو۔" اُس لڑکے نے جواب دیا۔ "ہم سب ایک ہی ناؤ میں ہیں۔ کیا تم بھی یہاں اپنی نظریں سینکنے نہیں آتے؟ لیکن اگر مجھ سے پوچھو تو پروفیسر سلیم کی بیٹی سلمیٰ کی ایک جھلک کے آگے باقی سب لڑکیاں مل کر بھی پھیکی پڑتی ہیں۔ ہے نا پٹاخہ؟" اور یہ کہہ کر اُس نے اپنے موٹے موٹے ہونٹوں سے بہت ہی بیہودہ ڈھنگ سے بوسہ لینے کی آواز پیدا کی۔

انور کا چہرہ تمتما اُٹھا۔ اُس کا جی چاہا کہ اُس لفنگے کی ناک پر ایک گھونسہ جڑ دے جو اتنی بے ہُودہ باتیں کر رہا تھا۔ لیکن اپنے پیدائشی دبّو پن کی وجہ سے وہ ایسا نہ کر سکا۔ وہ اچانک مُڑا اور دائیں بائیں دیکھے بغیر سیدھا ہوسٹل کی طرف چل دیا۔ اُس کی اِس حرکت پر اُن مجنوں صاحب کو بہت حیرت ہوئی اور وہ وہیں پتّھر کی طرح گڑ کر رہ گئے۔

اِس چھوٹے سے حادثے کا انور کے دل پر بہت گہرا اثر پڑا، اُس کے دل پر گہری چوٹ لگی۔ کیا لوگ لڑکیوں کے بارے میں اِسی طرح باتیں کرتے ہیں؟ جو چیز اُس کے لئے خوبصورتی تھی ـــ کیا خوبصورت چیزیں اِس لئے نہیں ہوتیں کہ اُنہیں دیکھ کر تعریف کی جائے؟ ـــ وہی ایک پل میں پُر شہوت اور فحش ہو گئی تھی۔

اُس نے، انور علی نے، اکبر علی کے بیٹے نے، جو ایک شریف گھر کا بیٹا تھا، ایسی غیر شریفانہ حرکت کی تھی۔ اُس کی نیت خراب نہ بھی رہی ہو تو اُس سے کیا ہوتا ہے۔ سب کی نظروں میں تو وہ بھی اُن ہی لفنگوں میں سے تھا جو بُری نظر سے لڑکیوں کو تاکتے ہیں ـــ ہاں، بالکل اُن ہی آوارہ لوگوں اور شرابیوں کی طرح جو رات کے وقت چاوڑی بازار سے اُن "دوسری عورتوں" کو پرکھتے ہوئے اور اُن کے بارے میں گندی گندی باتیں بکتے ہوئے گذرتے ہیں۔ انور اپنے آپ پر لعنت بھیجنے لگا، اور اپنے اِس "گناہ" کا مقابلہ بُری سے بُری باتوں سے کرنے لگا۔ وہ دل ہی دل میں بار بار کہتا رہا "اب میں کبھی میریس روڈ پر ٹہلنے نہیں جاؤں گا، کبھی نہیں"۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ جان بُوجھ کر اپنے آپ کو اُس سُکھ سے محروم رکھنے کا اُس نے جو فیصلہ کیا تھا، اُس میں اِس بات کی رضامندی بھی چھپی ہوئی تھی کہ اب تک وہ میریس روڈ پر صرف مہندی کی صاف سُتھری کٹی ہوئی جھاڑیوں اور رنگ برنگے پھولوں کی کیاریوں کو ہی دیکھنے نہیں جاتا تھا بلکہ اُن سے پرے بھی کوئی چیز تھی جسے وہ دیکھنے جاتا تھا۔

(۸)

نومبر میں علی گڈھ کا موسم بہت اچھا رہتا ہے ـــ تھوڑی تھوڑی ٹھنڈ پڑنے لگتی ہے لیکن بہت سردی نہیں پڑتی۔ پڑھائی پورے زوروں پر جاری رہتی ہے لیکن امتحان کافی دُور ہوتے ہیں۔ یہ زمانہ اُن کاموں کے لئے سب سے زیادہ مناسب ہوتا ہے جنہیں آکسفورڈ اور کیمبرج کے نمونے پر بنائی گئی یونیورسٹی کے طالب علموں کے خاص حقوق سمجھے جاتے ہیں۔ سارے میچ اور ٹورنامنٹ اسی زمانے میں ہوتے ہیں، ڈبیٹ ہوتی ہے، باہر سے بڑے بڑے لوگ آکر لیکچر دیتے ہیں، ڈرامے ہوتے

ہیں اور پکنکس ہوتی ہیں اور اِس بدلیسی نمونے سے ذرا ہٹ کر اُسے کچھ حد تک ہندوستانی رنگ دینے کے لئے ایک مشاعرہ بھی ہوتا ہے جس میں دُور دُور سے بڑے بڑے شاعر بُلوائے جاتے ہیں اور لڑکوں میں سے بھی شاعری کا دم بھرنے والوں کو اپنی شعری قابلیت ہونے یا نہ ہونے کا ثبوت دینے کا موقع ملتا ہے۔

مشاعرہ کا دن آیا اور شعر و شاعری کا شوق رکھنے کی وجہ سے انور نے مشاعرہ ہونے سے گھنٹہ بھر پہلے آ کے آگر ایک سیٹ گھیر لی۔ وہیں کے مقامی مُبتدی شاعروں کی شاعری سے وہ کافی بور ہو چکا تھا۔ اُن کے بعد جو پُرانے شاعر آئے اُن کی فرسودہ شاعری سے تو وہ اور بھی بور ہوا لیکن اُس کے بعد دو باتیں ایسی ہوئیں جن کی وجہ سے اُس کی دلچسپی بڑھ گئی۔ ایک تو یہ کہ پروفیسر سلیم اپنی بیٹی سلمیٰ کے ساتھ وہاں تشریف لائے اور اُنہیں اتفاق سے ٹھیک انور کے سامنے ڈائس پر بیٹھنے کی جگہ دی گئی اور دوسری بات یہ ہوئی کہ رازؔ نے اپنی نظم پڑھی۔

انور کو بے ساختہ غالبؔ کا یہ مصرع یاد آیا "یہ جنّتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے"۔ شروع شروع میں تو اُسے سلمیٰ کی طرف دیکھنے میں کچھ ہچکچاہٹ ہو رہی تھی۔ میریس روڈ والے اُس حادثے کے بعد سے سلمیٰ کا خیال آتے ہی نہ جانے کیوں وہ جھینپ سا جاتا تھا۔ "اگر اُس نے مجھے اپنے گھر کے سامنے لفنگوں کی طرح ٹہلتے دیکھ لیا ہو گا تو کیا ہو گا؟" لیکن جیسے ہی رازؔ نے کھڑے ہو کر اپنی نظم کا پہلا مصرع پڑھا اُس کے یہ خیالات دُور ہو گئے۔ وہاں پر بیٹھے ہوئے سب لوگوں کی نگاہیں یہاں تک کہ سلمیٰ کی نگاہیں بھی رازؔ پر جم گئیں۔ اب انور بنا کسی جھجک کے سلمیٰ کو دیکھ رہا تھا اور اُس کے کان اپنے ساتھی کی نظم کو سُن رہے تھے۔

انور راز کو ہمیشہ سے یونیورسٹی کا سب سے بدصورت لڑکا سمجھتا تھا۔ لیکن جب اُس نے اپنی نظم "محبوبہ سے شاعر کا خطاب" پڑھی تو اُس میں ایک عجیب تبدیلی آگئی انور کے سامنے اب بالکل ہی دوسرا راز تھا۔ وہ بہت لمبا بلکہ اونچا ہو گیا تھا۔ دُبلا پتلا ہونے پر بھی وہ اُس وقت بڑا سُورما لگ رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں ایک نئی لَو چمک رہی تھی۔ وہ اپنے سُوکھے ہوئے پتلے پتلے ہاتھوں کو نظم پڑھتے وقت جذبات کے مطابق ہلا رہا تھا۔ اُس کی آواز کے اُتار چڑھاؤ سے ہر دل میں ایک لہر سی پیدا ہو رہی تھی — کبھی اُس کی آواز اتنی دھیمی ہو جاتی کہ ایسا لگتا تھا جیسے وہ کسی سے الگ بات کر رہا ہو اور کبھی پُورے جوش کے ساتھ گُونج اُٹھتا۔ یہ انسان کی رُوح تھی جو سراسر شعلہ بن کر لہک اُٹھی تھی۔ یہ جسمانی بدصورتی پر انسان کی ذہانت کی فتح کا معجزہ تھا۔ اُس کی نظم کے ہر بند پر تالیاں بج رہی تھیں۔ پہلے تو شاعر نے اپنی شان میں گیت گایا جس کا مطلب کچھ اس طرح تھا — "میری جڑیں اِس دھرتی میں جمی ہوئی ہیں لیکن میرا سر آسمان کو چھُو رہا ہے، میں ستاروں کو اِس دھرتی کے راز بتاتا ہوں، میں عوام کا شاعر ہوں" — اور پھر اُس نے اپنی محبوبہ کی شان میں قصیدہ گایا تھا، کچھ اِس طرح کہ "تُم گلاب کے پھُول کی مہک ہو، تُم پہاڑی جھرنے کا گیت ہو، تُم میں ہمالیہ کی برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیوں کی شان اور دھرتی کی زرخیزی ہے۔" انور نے ہر طرح کی نظم پڑھی تھی اور اُس کا لُطف اُٹھایا تھا، لیکن یہ کوئی اور ہی چیز تھی، کوئی ایسی چیز تھی جس میں تصوّر کی بے حد اُڑان تھی پھر بھی وہ اِس زمین سے تعلق رکھتی تھی، اُس میں قُدرت کی بُنیادی طاقتوں جیسا زور تھا پھر بھی وہ نازک تھی، یہ ایسی نظم تھی جس سے خون کی رفتار تیز

ہو جاتی تھی اور اُس کی گونج ہر دل میں سُنائی دیتی تھی۔ یہ نظم بے جان نہیں تھی اُس میں جان تھی، اُس میں نا اُمیدی نہیں بلکہ اُمید تھی، وہ شربت کی طرح نہ تو میٹھی تھی اور نہ ہی اُسے سُن کر نیند آنے لگتی تھی، بلکہ اُس میں تو جد و جہد کی للکار تھی۔

انور نے راز کی نظم سُنی اور دیکھی بھی۔ اُس نے اُس نظم کو سلمیٰ کے چہرے میں دیکھا۔ شاعر کے ہر لفظ، ہر فقرے اور ہر جذبے کے مطابق اُس کے چہرے کا رنگ بدل رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ ایک باجے کا سنگیت دُوسرے باجے میں بھی اپنے ہی سنگیت کی لَے پیدا کر رہا ہو۔ اُس کا چہرہ کتنا ذہین، کتنا حساس تھا، اُس پر نازک سے نازک چیز کا کتنی جلدی اثر ہوتا تھا۔ جب اُس چہرے پر مُسکراہٹ کھیلنے لگتی تھی تب تو وہ خوبصورت لگتا ہی تھا۔ پر جب وہ خاموش ہوتا تھا تب بھی وہ کچھ کم خوبصورت نہیں لگتا تھا۔ انور کو ایسا لگا کہ اُن بڑی بڑی کالی معصوم آنکھوں میں اُداسی تھی اور وہ سوچنے لگا کہ شاید وہ اکیلی تھی اور ساتھی کی تلاش میں تھی۔ اُس کے دل میں جذبات کا ایک طوفان اُمنڈ آیا اور سلمہ کے لئے ہمدردی سے بے چین ہو اُٹھا وہ اُس کے لئے کچھ کرنا چاہتا تھا، وہ اُس کے لئے کچھ کر بھی سکتا تھا! بس اُس کے کہنے کی دیر تھی — راز اپنی نظم کا آخری بند پڑھ رہا تھا۔

"میری محبوب بس تمہارے کہنے کی دیر ہے — میں آسمان سے چاند توڑ کر تمہارے ماتھے پر سجا دوں گا — اور ستاروں کو نوچ کر اُن کی بالیاں تمہارے کانوں میں پہنا دوں گا — لیکن میری زندگی، تم چاند ستاروں کی تمنّا نہ کرو — شاعر کا دل اِن چاند ستاروں سے کہیں زیادہ قیمتی ہے — اور یہ صرف تمہارا ہے اور ہمیشہ تمہارا رہے گا۔"

راز کی نظم ختم ہوتے ہی سارا ہال تالیوں سے گونج اُٹھا۔ انور نے دیکھا کہ ایک

لمحہ کے لئے سلمہ اپنے خیالوں میں ایسی ڈوبی رہی کہ اُسے اِس بات کا پتہ بھی نہ چلا کہ نظم ختم ہوگئی ہے۔ شاعر کی نظم شاید ابھی تک اُس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ یہ محض اُس کا خیال تھا یا سچ مچ سلمہ نے اداس ہو کر ایک دبی ہوئی آہ بھری تھی اور آہ بھرتے ہی اُس کی آنکھوں میں ایک پردہ سا چھا گیا تھا۔ لیکن دوسرے ہی پل وہ بھی اوروں کی طرح زور سے تالیاں بجا رہی تھی اور اُس کا چہرہ خوشی سے کھل اُٹھا تھا۔ انور کے دل میں حسد ایک کانٹا بن کر چبھنے لگا۔ کاش یہ نظم رازؔ نے نہیں بلکہ اُس نے پڑھی ہوتی!

رازؔ نے مشاعرہ لوٹ لیا تھا لیکن رات کو جب انور اپنے کمرے میں واپس لوٹا تو اُس نے دیکھا اصغر گہری نیند سو رہا ہے ـــــ وہ مشاعروں، ڈبیٹوں اور لیکچروں میں اپنا وقت خراب کرنے کا قائل نہیں تھا۔ رازؔ اپنی چارپائی پر ویسے ہی کپڑے پہنے لیٹا ہوا چھت کو تاک رہا تھا اور سگریٹ کے دھوئیں کے چھلّے بنا رہا تھا۔ انور رازؔ کو بتانا چاہتا تھا کہ اُسے اُس کی نظم بے حد پسند آئی تھی اور اُسے اِس بات کا بہت افسوس تھا کہ اُس نے اِس سے پہلے اُس کی ادبی اہمیت کو نہیں پہچانا تھا۔ وہ اُس کے سامنے اپنی یہ دلی خواہش ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ آگے چل کر دونوں میں گہری دوستی بنی رہے گی۔ لیکن اُسے اِس طرح کی باتیں کہنے میں ہچکچاہٹ ہو رہی تھی۔ اِس طرح جذبات کا اظہار کرنے میں اُسے بے حد ڈر لگتا تھا۔ اِس لئے اُس نے بُدبُدا کر صرف اتنا ہی کہا "بہت ہی عمدہ نظم تھی رازؔ ہر شخص تعریف کر رہا تھا"۔ لیکن اُس کے جواب میں رازؔ نے جو کہا اُسے سُن کر انور چکّر میں پڑ گیا۔ اپنی سگریٹ سے دوسری سگریٹ جلاتے ہوئے کہا شاعر نے کہا۔ "سچ؟ لیکن لوگوں کی تعریف سے مجھے کیا غرض؟"

اُس رات انور کو بڑی دیر تک نیند نہیں آئی۔ وہ یہ سمجھنے کی کوشش کرتا رہا کہ

رازؔ نے جو کہا تھا اُس کا کیا مطلب تھا۔ اگر لوگوں کی تعریف سے اُسے کوئی غرض نہیں ہے تو پھر کس کی تعریف سے اُسے غرض ہے؟

(۹)

آکسفورڈ میں ایک یونین سوسائٹی تھی، اِس لئے علی گڈھ میں بھی ایک تھی۔ مسلم یونیورسٹی یونین ایک زبردست تنظیم تھی جس کا ہر سال الیکشن ہوتا تھا۔ سال بھر میں یونین کی طرف سے دس بارہ ڈبیٹ اور لیکچر ہوتے تھے۔ یونین کی ایک چھوٹی سی لائبریری اور ریڈنگ رُوم بھی تھا اور باقی وہ صرف شاندار روایتوں پر قائم تھا لیکن یونین میں ایک بات بہت اچھی تھی۔ اُس کا انتظام چلانے ــــ یا بگاڑنے ــــ کا سارا کام لڑکے خود کرتے تھے اور اُس کی حدوں کے اندر اُنہیں بولنے کی پُوری آزادی تھی۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے کچھ بہترین مُقرّر اور بڑے بڑے سیاسی لیڈروں کو پہلی ٹریننگ اِسی چھوٹی سی پارلیمنٹ میں ملی۔ یونین ہال میں چاروں طرف لگی ہوئی تختیوں پر کالے پڑتے ہوئے سُنہری حرفوں میں اُن کے نام آج بھی درج ہیں۔

علی گڈھ آنے کے بعد پچھلے دو برسوں میں انور نے اکثر اِن ناموں کو بڑے حسد سے دیکھا تھا، لیکن اُس کے دل میں یہ خواہش کبھی نہیں ہوئی تھی کہ وہ بھی اُن میں سے ایک ہو۔ لیکن اب وہ اِس بات کو اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر کبھی اُسے شہرت ملی تو اِسی ہال میں ایک مُقرّر کے طور پر ملے گی۔ ڈبیٹ عام طور پر سیاسی مسئلوں پر ہوتی تھی۔ شروع شروع میں اپنے ابا کی بیٹھک میں کافی وقت گذار کر اور اِدھر حال ہی میں ہر بات کی معلومات رکھنے والے عثمان کے ساتھ رہ کر اُس نے بہت کچھ

سیکھ لیا تھا اور اب وہ سیاست کے کسی بھی سوال پر باتیں کر سکتا تھا لیکن کیا وہ سٹیج پر کھڑے ہو کر بول سکے گا؟ یونین اس بات کے لئے بدنام تھی کہ وہاں نئے اور نو آموز بولنے والوں کو چٹکیوں میں اُڑا دیا جاتا تھا۔ کچھ لڑکے تو یونین کی ڈبیٹوں میں صرف بلّی کی بولی بولنے اور مقرّر کا مذاق اُڑانے میں اپنا کمال دکھانے کے لئے ہی آتے تھے۔ اِن لوگوں کو اِس بات میں کمال حاصل تھا کہ بڑے موقع سے قہقہہ لگا کر یا غلط موقع پر تالیاں بجا کر وہ بولنے والے میں گھبراہٹ پیدا کر دیتے تھے۔ اِن سُننے والوں کا خیال آتے ہی بڑے بڑے سُورماؤں کا دل کانپ جاتا تھا۔ انور ان لوگوں سے کے زبردست حملوں کا مقابلہ کس طرح کر پائے گا؟

"اب مسٹر انور علی اِس تجویز کے خلاف تقریر کریں گے۔"

یونین کے پریسیڈنٹ کی آواز کہیں بہت دُور سے کسی دُوسری دنیا سے آتی ہوئی معلوم ہوئی۔ انور کو ایسا لگا کہ جیسے وہ خواب میں کسی کی آواز سُن رہا ہے۔ "اُٹھو، اب تمہارے بولنے کی باری ہے۔" کسی نے اُسے کہنی مار کر کہا اور وہ اُٹھ کھڑا ہوا اُس کے گال اور کان کی لویں گھبراہٹ کے مارے سُرخ ہوئی جا رہی تھیں، اُس کے پیر کانپ رہے تھے اور زبان سُوکھ گئی تھی۔ اِس عالم میں وہ پریسیڈنٹ کے داہنی طرف سٹیج کے اُس حصّے کی طرف چلا جہاں سے کھڑے ہو کر اُسے تقریر کرنا تھا۔ وہ بار بار اپنے دل کو سمجھا رہا تھا کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ اُس نے ساری دلیلیں خوب اچھی طرح تیار کر رکھی تھیں اور عثمان کی دی ہوئی کتابوں کی مدد سے اُس نے اُن کی تائید میں بے شمار سیاسی حقائق بھی جمع کر لئے تھے۔ وہ کوئی ایک درجن بار اپنی تقریر پڑھ چکا تھا۔ اُسے بالکل رٹ لیا تھا اور کئی بار وہ اِس کی بھی مشق کر چکا تھا کہ

وہ کس طرح تقریر کرے گا۔ پھر اُسے بولنے میں ڈر کس بات کا؟

"مسٹر پریسیڈنٹ، سر۔" اُس نے خاص پارلیمنٹری انداز میں کہنا شروع کیا۔ "آج ہمارے سامنے بحث کا موضوع یہ ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا سیاسی مستقبل بالکل مختلف ہے اور اِس لئے اُن کی سیاسی جماعتیں بھی مختلف ہونی چاہئیں۔ میں اِس تجویز کی شدید مخالفت کرتا ہوں کیونکہ ----"

اور اتنا کہہ کر اُس نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے لوگوں کو دیکھا — کوئی ایک ہزار سفید پاجامے، اتنی ہی کالی شیروانیاں اور لال ترکی ٹوپیاں، ایک ہزار دشمن، ایک ہزار تنگ نظر اور متعصّب جو اپنے طنز کے تیر کسی بھی وقت اُس پر چلانے کے لئے نشانہ سادھے بیٹھے تھے۔ انور نے اُنہیں دیکھا تو اُسے ایسا لگا کہ وہ الگ الگ لوگ نہیں ہیں بلکہ ایک بپھرا ہوا سمندر ہے۔ جو کسی بھی وقت اُسے اپنی طوفانی لہروں کی لپیٹ میں لے لے گا۔ اُس کی زبان سُوکھ گئی، اُس کا گلا گھُٹنے لگا اور کنپٹیوں میں دھمک ہونے لگی ---

"مسٹر پریسیڈنٹ سر ..." وہ بار بار یہی کہتا رہا لیکن اُس کے آگے کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ پُوری تقریر وہ بھُول گیا۔ اُسے اُس کا ایک بھی فقرہ، ایک بھی لفظ نہیں یاد آرہا تھا۔ ہال میں ایک بے رحم قہقہہ گُونج اُٹھا اور تھوڑی ہی دیر میں ایسا محسوس ہوا کہ ہزار راکشس ایک ساتھ مل کر قہقہہ لگا رہے ہیں۔ جب اُسے کوئی راستہ نہ سُوجھا تو بالکل لاچار ہو کر اُس نے مدد کے لئے پریسیڈنٹ کی طرف دیکھا اور اُسی وقت اُس نے محسوس کیا کہ دو بڑی بڑی کالی معصوم آنکھیں اُسے دیکھ رہی ہیں۔ اُن آنکھوں میں مُسکراہٹ تھی لیکن اُس کا مذاق اُڑانے والی مُسکراہٹ نہیں۔

اُس مُسکراہٹ میں ہمدردی تھی، وہ مُسکراہٹ اُسے اُکسا رہی تھی۔ اُسے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ مُسکراتی ہوئی آنکھیں اُس سے کہہ رہی ہیں۔" بولو، ہمّت کرو، ڈرتے کیوں ہو؟ اتنے بڑے ہو کر بچّوں کی طرح بھیڑیئے سے ڈرتے ہو؟" اُن آنکھوں میں اتنی دوستی تھی، اتنا بھروسہ تھا، انسانی بھائی چارے کی اتنی سادگی تھی کہ انور بھی مُسکرائے بغیر نہیں رہ سکا۔ وہ بھیڑیئے کا مقابلہ کرنے کے لئے مُڑا۔ اب اُس کے سامنے بھیڑیا نہ تھا۔ اُس کے سامنے ایک ہزار لڑکے بیٹھے ہوئے تھے جن میں سے ایک درجن بھی مشکل سے ایسے رہے ہوں گے جو اُٹھ کر اتنے لوگوں کے سامنے بولنے کی ہمّت رکھتے ہوں۔ ان لوگوں نے اُس کی ہنسی اُڑانے کی ہمّت کی! اچھّی بات ہے، وہ اُنہیں دکھا دے گا! یہ سچ ہے کہ اُس نے جو کچھ بولنے کے لئے یاد کیا تھا اُسے وہ بھُول چکا ہے مگر اُس کی زبان تو اُس سے نہیں چھِن گئی ہے۔

جب قہقہہ لگانے والے راکشس دم لینے کے لئے تھوڑی دیر کو رُکے تو انور نے پھر بولنا شروع کیا۔" مسٹر پریسیڈنٹ سر، میں آپ لوگوں کو ایک راز کی بات بتاتا ہوں۔" وہ ایک پل کے لئے رُکا اور سُننے والے بھی اِس سوچ میں پڑ گئے کہ آخر وہ ایسی کیا بات بتانے والا ہے۔ انور نے کہنا شروع کیا۔" بات یہ ہے کہ میں نے اپنی تقریر لکھ لی تھی اور اُسے طوطے کی طرح رٹ لیا تھا، لیکن جب میں یہاں بولنے کے لئے کھڑا ہوا تو میں نے دیکھا کہ مجھے اُس کا ایک لفظ بھی یاد نہیں رہ گیا ہے۔"

لوگ ہنس پڑے ــــ لیکن اِس بار اُن کی ہنسی میں وہ پہلے والا زہر نہیں تھا انہیں اُس کی لاچاری دیکھ کر سچ مچ مزا آ رہا تھا بلکہ وہ اُس کی ہمّت کی داد بھی دے

رہے تھے کہ اُس نے سب کے سامنے اِس بات کو مان لیا۔

"تقریر رٹنا میری غلطی تھی، اب میں یہ غلطی کبھی نہیں کروں گا۔ میں اپنی تقریر کے الفاظ البتہ بھُول گیا ہوں لیکن میں یہ تو نہیں بھُولا ہوں کہ میں کیا کہنا چاہتا تھا اور وہ سب میں سیدھے سادے الفاظ میں آپ کے سامنے پیش کر دوں گا۔ میں اُن بھاری بھرکم الفاظ کا استعمال نہیں کرسکوں گا جو میں نے آپ لوگوں پر رُعب ڈالنے کے لئے رٹ لئے تھے۔ میں آپ لوگوں کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ لوگ بہت سی بکواس سے بچ گئے۔" سُننے والوں میں ایک بار پھر ہنسی کی لہر دَوڑ گئی اور انور کی اِس بات میں اُنہیں بہت مزا آیا۔

"لڑکا ہے بڑے جگرے والا ــــ اور سُوجھ بوجھ والا بھی ہے۔" سُننے والوں نے اپنے دل میں کہا۔

اُس کے بعد تو سُننے والے انور کی مٹھّی میں تھے اور وہ اُنہیں اپنے اشاروں پر نچا سکتا تھا۔ لیکن اُس نے اُن کے سامنے کوئی سیاسی دلیلیں پیش نہیں کیں، سیاست اور فلسفے کے بڑے بڑے مستند ماہروں کے رُعب دار فقرے نہیں پیش کئے۔ کوئی لمبے چوڑے اعداد و شمار اُن کے سامنے نہیں رکھے، اُس نے اُن کے سامنے لیکچر جھاڑنے کی کوشش نہیں کی، وہ تو اُن سے زندگی کی سیدھی سادی حقیقتوں کے بارے میں باتیں کر رہا تھا۔ وہ اُن کے سامنے اپنے تجربے کی باتیں کر رہا تھا۔ وہ اس بات کو بھُول گیا کہ وہ ڈبیٹ میں حِصّہ لے رہا ہے، اُس نے لچھّے دار زبان استعمال نہیں کی، اپنے مخالفوں کی دلیلوں کو کاٹنے کی کوشش نہیں کی، اُس نے تو بس یہ کیا کہ حقیقت کو جس شکل میں اُس نے دیکھا تھا ویسا ہی اُن کے سامنے پیش کر دیا۔ اُس نے اُنہیں کا کا

رامیشور دیال کے ساتھ اپنے ابّا کی دوستی کے بارے میں اور گوپال اور رتن کے ساتھ خود اپنی دوستی کے بارے میں بتایا۔ اُس نے انہیں دِلّی کے فرقہ وارانہ فساد کے بارے میں بتایا۔ حالانکہ وہ انہیں یہ نہیں بتا سکا کہ اُس رات اُسے اور گوپال کو کہاں پناہ ملی تھی۔ اُس نے اُنہیں مہاتما گاندھی کے ساتھ اپنی ملاقات کے بارے میں بتایا اور یہ بھی بتایا کہ اُس چھوٹے سے عظیم شخص نے فرقہ وارانہ فساد کو روکنے کے لیے کس طرح اپنی جان کی بازی لگا دی تھی۔ آخر میں اُس نے اُنہیں بتایا کہ اُس نے جلیانوالہ باغ میں خود اپنی آنکھوں سے کیا دیکھا تھا اور سُننے والوں کے سامنے اُس خوفناک حادثے کی ایک جیتی جاگتی تصویر کھینچ دی ۔۔۔ مست، بے فکرے لوگوں کی بِھیڑ میں گھومتے ہوئے دو لڑکے، دیش بھگتی کے نعرے اور تقریریں، "وہ آگئے، وہ آگئے" کی آوازیں، اپنا پستول دکھاتا ہوا وہ لال مُنہ والا جرنیل، آگ اُگلتی ہوئی بندوقیں، درد سے کراہتا ہوا نندو اور سینہ تان کر جرنیل کی طرف بڑھتا ہوا اجیت سنگھ جو گولیوں کی آواز سے بھی اُونچی آواز میں چلّا کر گولی چلانا بند کرنے کو کہہ رہا تھا اور جس کے دل میں اُس تمغے کو چیرتی ہوئی ایک گولی لگی تھی جو اُسے ایک انگریز افسر کی جان بچانے کے لئے انعام میں دیا گیا تھا۔ اِس کے بعد انور نے بہت ہی دھیمی آواز میں کہا" اور پھر مسٹر پریسیڈنٹ پورے باغ پر موت کا سناٹا چھا گیا اور صرف زخمی اور مرتے ہوئے لوگوں کی کراہیں سُنائی دے رہی تھیں۔ مجھے وہ آوازیں آج تک سُنائی دیتی ہیں۔ ہم سب لوگوں کو اُس دردناک واقعہ کے نو برس بعد آج وہ کراہیں سُنائی دے سکتی ہیں۔" اِس کے بعد اُس کی آواز یکایک اُونچی ہوگئی" جن لوگوں نے جلیانوالہ باغ میں اپنا خون بہایا تھا اُن کا خون بیکار نہیں جائے گا۔ اُنہوں نے اپنی جان اِس لئے دی کہ ایک دن ہم آزاد انسانوں کی طرح

زندگی بسر کر سکیں۔ اُس دن ہندوؤں اور مسلمانوں اور سِکھوں کا خون ایک ساتھ بہا تھا اور جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہمارا مستقبل الگ ہے اُنہیں پہلے مستقبل کی اِس دھارا میں سے سب کو الگ الگ کرنا ہوگا!"

جب وہ اپنی تقریر ختم کر کے بیٹھا تو سب نے تالیاں بجائیں۔ انور کو اپنی تقریر کے جوش کی وجہ سے چکر آرہا تھا اور اُس نے جیسے دُھندلکے کے ایک پردے کے پیچھے دیکھا کہ آنسوؤں سے ڈبڈبائی ہوئی دو خوبصورت آنکھیں بڑی تعریف کے انداز میں اُسے دیکھ رہی ہیں۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی تقریر بہت کامیاب رہی اور یہ کہ اُس لمحے سے دنیا میں اُس کی بھی پوچھ ہوگی، دنیا میں اُس کی بھی ایک ہستی ہوگی اور یہ کہ اب اُسے کسی بھی بھیڑ کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے جیسے انسانوں سے سیدھے سادے الفاظ میں بات کرنے میں کبھی کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہوگی۔

(۱۰)

کئی دن تک انور کے دوست اور اُس کی کلاس کے لڑکے اِس شاندار تقریر پر اُسے مبارکباد دیتے رہے۔ کچھ لوگ دل ہی دل میں اُس سے جلنے بھی لگے تھے اور اِنہی لوگوں نے انور کو بدنام کرنے کے لئے جھوٹی سچی باتیں اُڑا کر اُس کی شہرت کو ختم کر دینے کا بیڑہ اُٹھا لیا۔ انور نے محسوس کیا کہ اُس کے بارے میں ہر طرف کچھ کانا پھُوسی چل رہی ہے۔ لوگ اُس سے آکر بڑی معصومیت سے پوچھتے تھے کہ اپنی تقریر کے لئے یہ تخلیقی تحریک کیا اُسے میریس روڈ کے چکر لگاتے وقت ملی تھی۔ دوسرے لوگ اِس بات کا ذکر کرتے کہ سلمیٰ اسلم نے اُس کی تقریر کے بعد بہت زوروں سے تالیاں بجائیں تھیں اور انور کو مبارکباد دیتے کہ انور کے مداحوں میں ایسی خوبصورت لڑکی بھی

تھی۔ انور کو ان باتوں پر غصّہ ضرور آتا تھا پر وہ اپنا غصّہ پی جاتا تھا۔ لیکن ایک دن جب وہ پولیٹیکل فلاسفی کے لیکچر کے لئے کلاس رُوم میں گھُسا تو اُس نے دیکھا کہ بلیک بورڈ پر ایک کارٹون بنا ہوا ہے۔ جو یقیناً اُس کے اور سلمٰی کے بارے میں تھا۔ کارٹون میں دکھایا گیا تھا کہ سلمٰی کہہ رہی ہے "میرے رومیو، تم نے کتنی اچھی تقریر کی" اور جواب میں یہ لکھا تھا۔ "یہ سب تمہاری ہی تخلیقی تحریک کے باعث ہوا، میری جولیٹ"۔ انور نے ایک نظر کارٹون کو دیکھا اور جب وہ پیچھے مُڑا تو ساری کلاس اُس پر ہنس رہی تھی۔ وہ غُصّے سے پاگل ہو اُٹھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی کو مار بیٹھے، کسی کی جان لے لے۔

"کس نے بنایا ہے یہ کارٹون؟" اُس نے گرج کر پُوچھا۔ "اگر ہمّت ہے اُس میں تو وہ سامنے آئے!"

"کاٹے گا!" کسی نے پیچھے سے کُتّے کی بولی کی نقل کرتے ہوئے کہا۔ اور انور اُس کی طرف بڑھا ہی تھا کہ اتنے میں پروفیسر سلیم آگئے اور وہ لپک کر اپنی سیٹ پر جا بیٹھا۔

ہر شخص یہ سوچ رہا تھا کہ اب کوئی دھماکہ ہونے والا ہے مگر کچھ بھی نہ ہوا۔ پروفیسر سلیم بلیک بورڈ کو استعمال کرنے سے پہلے کسی لڑکے سے اُسے صاف کروا لیتے تھے۔ آج بھی انہوں نے ایسا ہی کیا۔ پروفیسر سلیم بہت اچھا پڑھاتے تھے اور بولتے بہت ہی عمدہ تھے، اِسی لئے لڑکے اُن کا لیکچر بڑے غور سے سُنتے تھے۔ اُس دن وہ یہ پڑھا رہے تھے کہ فرانس میں انقلاب کے وقت کون کون سے سیاسی اُصول مروّج تھے۔ پورے لیکچر کے دوران کسی طرح کی کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی لیکن انور لیکچر میں اپنا دھیان نہ لگا سکا۔ اُس کے دماغ پر اب بھی اُسی گندے کارٹون کا خیال چھایا ہوا تھا۔

گھنٹہ بجا اور پیریڈ ختم ہو گیا۔ پروفیسر سلیم نے کھٹ سے کتاب بند کر دی۔ دروازے کی طرف جاتے ہوئے انھوں نے پیچھے مُڑ کر انور کو بُلایا اور کہا "انور، تم ذرا میرے کمرے میں آکر مجھ سے مل لو۔"

تو اِس سکینڈل کی خبر پروفیسر صاحب کے کانوں تک پہنچ چکی ہے۔ انور برآمدے میں اُن کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ وہ جانتا تھا کہ کلاس میں لڑکے کیا کہہ رہے ہوں گے۔ وہ خوش ہو کر یہ سوچ رہے ہوں گے کہ اب اُس کی ایسی خبر لی جائے گی کہ عمر بھر یاد رکھے گا۔ لیکن وہ اِس معاملے میں کر ہی کیا سکتا تھا؟ اِس لئے وہ سیمینار والے کمرے میں کچھ اِس طرح گھسا جیسے قربانی کا بکرا حلال ہونے کے لئے جاتا ہے۔

"بیٹھو انور"۔ وہ کُرسی کے کنارے بیٹھ گیا۔

"اُس دن تم نے بہت اچھّی تقریر کی' تم آگے چل کر بہت اچھّے مُقرّر بن سکتے ہو۔"

"تھینک یو' پروفیسر!" اُس نے کہا لیکن دِل ہی دِل میں وہ کہہ رہا تھا "اِن سب باتوں سے کیا فائدہ' یہ تو ویسی ہی بات ہے جیسے بکرے کو حلال کرنے سے پہلے اُسے کھِلا پِلا کر موٹا کیا جاتا ہے' کیوں نہیں آپ چھُری نکال کر اِس قصّے کو ختم ہی کر دیتے؟ یہ کشمکش و پیچ تو مجھے یوں ہی مار ڈالے گا۔"

"تُم دلّی کے اکبر علی صاحب کے بیٹے ہو نا؟"

"جی ہاں"

"بہت مشہور خاندان ہے۔"

اور انور سوچ رہا تھا کہ یہ سب تو تمہید ہے' اِس کے بعد اُسے اتنے بڑے

خاندان کے بیٹے کی ذمہ داریوں کے بارے میں لیکچر دیا جائے گا، لیکن پروفیسر صاحب کا دوسرا سوال سُن کر وہ دنگ رہ گیا۔

"ہاں انور، تم نے میری بیٹی سلمیٰ کو دیکھا ہے نا؟"

"نو سَر — میرا مطلب ہے یس سر — مطلب یہ ہے کہ میں نے اُسے سٹیشن پر دیکھا تھا۔"

"وہ اُس دن ڈبیٹ میں بھی تھی۔" سلیم صاحب نے اُسے یاد دلایا۔

"جی ہاں جی ہاں، یس سر" اور یہ سوچ کر کہ اب اس کے بعد پروفیسر صاحب کیا کہنے والے ہیں، اُس کا دل بیٹھنے لگا۔ لیکن پروفیسر صاحب نے تو بالکل ہی دوسری بات کہی۔ "کل اُس کی سالگرہ ہے اور اُس کی خواہش ہے کہ کل تیسرے پہر چار بجے تم ہمارے یہاں چائے پیئو۔" انور کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ "کیا تمہارے لئے آنا ممکن ہو گا؟"

یہ بھی کوئی سوال تھا کیا جنت میں جانا اُسکے لئے ممکن ہو گا؟ کیا قوسِ قزح پر ناچنا اُس کیلئے ممکن ہو گا؟ کیا اُس کیلئے یہ ممکن ہو گا کہ وہ ایک ہی وقت میں روسو، شیکسپیئر اور غالب بن جائے؟

"یا کہیں اور جانا ہے تمہیں؟"

انور جو مخبوط الحواس بنا کھڑا ہوا تھا اُس نے اپنے جذبات کو چھپائے بغیر کہا۔ "جی نہیں کہیں نہیں جانا ہے مجھے، مجھے بیحد خوشی ہو گی آکر۔ میری طرف سے اپنی بیٹی کا شکریہ ادا کیجئے گا، میں وہاں چار بجے پہنچ جاؤں گا۔"

"لیکن میرا گھر معلوم ہے تمہیں؟"

"جی ہاں۔" انور نے سچ سچ کہہ دیا۔ "میں نے ادھر سے گذرتے ہوئے آپ کے نام کی تختی لگی ہوئی دیکھی ہے۔"

۱۲

دَردِ بے دوا......

(۱)

پروفیسر محمد سلیم بی۔ اے آنرز (آکسن) نے تین سال تک انگلینڈ میں رہ کر جو بھی ولایتی رسم یا روایت اپنائی تھی اُس سے اُنہیں بے حد پیار تھا اور اسی لئے اُنہیں اپنی اِس ولایتی ڈِگری سے بھی بہت پیار تھا۔ حالانکہ وہ ادھیڑ عُمر کے رنڈوے تھے مگر اُنہیں اب بھی اپنا ٹرینیٹی کالج والا ٹینس بلیزر پہننا بہت پسند تھا جس کی اُوپر والی جیب پر کالج کا نشان کڑھا ہوا تھا، لگاتار دُھلتے رہنے کی وجہ سے کوٹ کا کپڑا بالکل گھس گیا تھا اور جیب پر کڑھے ہوئے نشان کا سُنہرا کام کالا پڑنے لگا تھا۔ اور حالانکہ کوٹ کئی بار ڈھیلا کیا جا چکا تھا لیکن اب وہ پروفیسر صاحب کی لگاتار بڑھتی ہوئی توند پر کسی طرح آتا ہی نہیں تھا۔ حالانکہ پروفیسر صاحب کے پاس اور بھی بہت سے کوٹ تھے لیکن پھر بھی یہ اُن کا سب سے زیادہ پسندیدہ لباس تھا اور روز شام کو اسٹاف کلب میں ٹینس کھیلنے جاتے وقت

وہ پابندی سے یہی کوٹ پہنتے تھے۔ کیونکہ ایک تو یہ کوٹ اُن کی جوانی کے دنوں کی یادگار تھا اور دوسرے وہ اُس مغربی تہذیب کی نشانی تھا جسے وہ اپنے آکسفورڈ کے دنوں سے پسند کرنے لگے تھے۔

علی گڈھ میں پروفیسر سلیم اپنی "پکی صاحبیت" کے لئے بدنام تھے۔ دوسرے پروفیسروں کی طرح وہ نہ صرف مغربی ڈھنگ کے کپڑے پہنتے تھے بلکہ انہوں نے سولھوں آنے مغربی رہن سہن اپنا لیا تھا۔ عید بقرعید جیسے موقعوں پر بھی وہ شیروانی پہننا پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ مسجد میں کبھی نماز پڑھنے نہیں جاتے تھے اور انہوں نے کبھی روزہ نہیں رکھا تھا۔ وہ اپنے آپ کو 'ریشنلسٹ' کہتے تھے اور کھلے عام قدامت پسندی اور پردے کا مذاق اڑاتے تھے اور ہندوستانی مسلمانوں میں جو ایک سے زیادہ شادیاں کرنے کا رواج تھا اُس کی مذمت کرتے تھے۔ اُن کے بارے میں یہ بھی سنا جاتا تھا کہ جب کبھی وہ انگریز افسروں کی یا انگریزی ڈھنگ سے رہنے والے اپنے دوسرے دوستوں کی دعوت کرتے تھے تو انہیں ایک آدھ پیگ شراب پی لینے میں بھی کوئی اعتراض نہیں ہوتا تھا۔

جو لوگ پروفیسر سلیم کے شروع شروع کے دنوں میں علی گڈھ میں رہ چکے تھے اُن کا کہنا تھا کہ پروفیسر صاحب کو اپنی زندگی میں ایک بات کا بے حد افسوس تھا ــــــ وہ کسی بھی طرح اپنی کٹر مذہبی بیوی کو پردہ چھوڑنے اور مغربی ڈھنگ کا رہن سہن اپنانے پر راضی نہیں کر سکے تھے۔ کئی برس تک انہیں اِس بات کا بہت دکھ رہا اور اکثر ایسا ہوتا تھا کہ اپنے ساتھیوں سے عورتوں کے پردہ کرنے کے بارے میں بحث کرتے وقت جب کوئی اُن کی بیوی کی مثال اُن کے سامنے رکھ دیتا تھا تو اُن سے کوئی جواب دیتے نہ بن پڑتا تھا۔ ظاہر ہے اِس میں اُن کا کوئی قصور نہیں تھا۔ بہت کم عمر میں جب

وہ کالج میں پڑھتے تھے تب ہی اُن کی شادی ہو گئی تھی اور تین سال ولایت میں رہنے کی وجہ سے اُن کے اور اُن کی بیوی کے درمیان ایک وسیع دماغی خلیج حائل ہو گئی تھی جسے وہ لاکھ کوشش کرتے پر بھی نہیں مٹا سکے تھے۔ لیکن چھ برس پہلے جب انفلوئنزا کی بیماری پھیلی تھی تب اُس میں اُن کی بیوی اپنی اکلوتی بیٹی سلمہ کو چھوڑ کر اللہ کو پیاری ہو گئی تھیں۔ سلمہ اُس اَن مل بے جوڑ شادی کا اکلوتا شگفتہ نتیجہ تھی۔ سلیم صاحب اُن لوگوں میں سے نہیں تھے۔ جو اپنی بے چاری جاہل بیوی کے مرجانے کے بعد اُس سے نفرت کرتے جب تک وہ زندہ رہی تب بھی اُنہیں اُس پر ترس ہی آتا تھا لیکن اُس کے مرتے ہی اُنہوں نے دِل ہی دِل میں مُصمّم ارادہ کر لیا تھا کہ وہ اپنی بیٹی پر اُس کی ماں کی ذرا سی بھی چھاپ نہ پڑنے دیں گے۔ اُنھوں نے فیصلہ کیا تھا کہ اُن کی دیکھ ریکھ میں سلمیٰ ایک نئی آزاد عورت بنے گی۔

سلمہ کا بچپن اکیلے میں گذرا تھا اور وہ کافی دُکھی بھی رہتی تھی۔ اُس کی یادداشت کی تہہ میں اُس کے ماں باپ کے جھگڑوں کی تصویر نقش ہو کر رہ گئی تھی کیونکہ دونوں ہی اپنی بیٹی کو اپنے اپنے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ اگر ماں چاہتی کہ بیٹی قرآن شریف پڑھے تو باپ کی کوشش یہ رہتی کہ وہ اُن کے دوستوں کی محفل میں ٹوئنکل ٹوئنکل لِٹل سٹار سُنائے اور اِس طرح اپنی ہونہار اور بے حد تیز بیٹی کے کمال دکھا کر وہ اپنی بیوی کی غیر موجودگی کی کمی پوری کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ باپ چاہتے تھے کہ اُن کی بیٹی انگریز بچّوں کی طرح سیدھی سادی فراک پہنا کرے اور ماں اُسے چمک دار زری اور ریشم کے کپڑوں سے لاد دیتی اور اوپر سے بھدّے اور بھاری بھاری زیور پہنا دیتی جنہیں پروفیسر صاحب برداشت بھی نہ

کر سکتے تھے۔ اُن دونوں کے بیچ سلمیٰ اپنے آپ کو بالکل لاچار اور بیکس محسوس کرتی تھی
ایک ایسے گھر میں پلنے کی وجہ سے جہاں ہر وقت لڑائی جھگڑا رہتا تھا، جہاں کسی بھی
چیز کے بارے میں ماں باپ کی رائے ایک نہیں تھی، سلمیٰ بچپن سے ہی بہت "بڑی بڑی"
باتیں کرنے لگی تھی۔ اکلوتی بیٹی ہونے کی وجہ سے اُسے اپنی عمر کے لڑکے لڑکیوں کے ساتھ
رہنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اور اِس لئے اپنے اِس اکیلے پن سے بچنے کے لئے اُس نے
اپنے آپ میں ہی گھُٹ گھُٹ کر رہنا سیکھ لیا تھا۔ دوسروں کی دوستی نصیب نہ
ہونے کی وجہ سے اُس نے اپنے تصوّر میں دن میں خواب دیکھنا سیکھ لیا تھا۔ اُس کے
ابّا اُسے پڑھنے کے لئے جو کتابیں لا کر دیتے تھے اُن میں اُس نے خوبصورت سنڈریلاؤں
اور جانباز شہزادوں کے کتنے ہی قصّے پڑھے تھے اور اِنہیں پڑھ پڑھ کر وہ اپنے دِل میں
نہ جانے کتنے جوشیلے واقعات کے بارے میں سوچا کرتی تھی، جن میں ظاہر ہے سب
کی ہیروئن وہ خود ہوتی تھی۔

(۲)

ماں کے مرجانے پر سلمیٰ بالکل اپنے ابّا کے ہاتھوں میں آگئی۔ اُنہوں نے فوراً
اُسے نینی تال کے ایک کانوینٹ سکول میں بھرتی کرا دیا جہاں انگریز، اینگلو انڈین
اور انگریزی ڈھنگ سے رہنے والے امیر ہندوستانی گھروں کی لڑکیوں کے ساتھ
اُس نے بھی اپنی انگریز مشنری ٹیچروں سے انگریزوں کی طرح انگریزی بولنا سیکھ لیا لیکن
سات سو لڑکیوں کے درمیان رہ کر بھی سلمیٰ اکیلی تھی۔ وہ اُن میں گھُل مل نہ سکی۔ شروع
شروع میں تو اُسے اُن کے بھونڈے اور بھدّے طور طریقوں سے، اُن کے زور دار
قہقہوں سے، اُن کے بولنے کے اینگلو انڈین طریقے سے اور چوروں کی طرح جنس کی

معاملوں میں اُن کی کھسر پھسر سے اُسے کچھ نفرت سی ہوتی تھی۔ ماں کی تربیت کی وجہ
سے اُس کی نشوونما میں خالص ہندوستانیت آگئی تھی جس کو اُس کا باپ اُسے کانوینٹ
میں بھیج کر ختم کر دینا چاہتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چھ سال تک نینی تال میں رہنے کی وجہ
سے وہ لگ بھگ بالکل انگریزوں کی طرح انگریزی تو بولنے لگی اور انگریزی ادب میں
اُسے دلچسپی پیدا ہو گئی۔ لیکن وہ اینگلو انڈین ڈھنگ کا رہن سہن کبھی نہ اپنا سکی۔
زندگی کی طرف ۔۔۔ اور محبت کی طرف ۔۔۔ اُن لڑکیوں کا جو بھونڈا اور بے کیف
رویّہ تھا وہ سلمہ کے رومانی مزاج کے بالکل خلاف تھا اور اُسے اُن اینگلو انڈین
لڑکوں کے درمیان جنہیں سالانہ سوشل پروگراموں اور ایسے ہی دوسرے موقعوں
پر لڑکوں سے ملنے دیا جاتا تھا' اُس کے اپنے سپنوں کا شہزادہ کہیں دکھائی نہ دیتا تھا۔

سلمہ نے بہت کم عمر میں سینیئر کیمبرج پاس کر لیا۔ اُس وقت وہ سولہ سال کی
تھی۔ اُس کے بعد وہ علی گڑھ کے گرلز کالج میں داخل ہو گئی کیونکہ اُس کے ابّا چاہتے
تھے کہ وہ اُن کے پاس رہ کر گھر کی دیکھ بھال کرے اور اپنے خوشگوار مستقبل کے
لئے ۔۔۔ کامیاب شادی کے لئے ۔۔۔ تیاری کرے۔ پروفیسر صاحب بہت دُور
کی سوچتے تھے اور بیٹی کے مستقبل کے بارے میں وہ کسی طرح کا جُوا نہیں کھیلنا چاہتے
تھے۔ وہ اُس کے لئے اچھا شوہر ڈھونڈنے کا کام نہ تو اس رومانٹک لڑکی کی ہر پل
بدلنے والی پسند پر چھوڑ سکتے تھے اور نہ ہی پُرانے ڈھنگ سے وہ اُس کے لئے لڑکا
تلاش کروانے کو تیار تھے۔ اُن کی تجویز یہ تھی کہ وہ کسی اچھے نوجوان کو ڈھونڈ کر اُسے
پڑھنے لکھنے میں مدد دے کر کوئی ایسی اچھی نوکری دلا دیں گے جو سلمہ جیسی خوبصورت
اور ہوشیار لڑکی کے شوہر کے لائق ہو۔ اُن کی نظر میں انور بہت اچھا "کچا مال" تھا

اُس میں تازگی، بول چال میں بہت تمیز دار تھا، سمجھ دار تھا اور پڑھائی میں اچھا تھا وہ نئے خیالات کا تھا اس لئے سلیم صاحب کو یقین تھا کہ وہ اپنی بیوی کو پردے میں نہیں رکھے گا۔ تھوڑی سی مدد سے وہ آئی سی ایس کا امتحان آسانی سے پاس کر سکتا تھا اور کچھ دن بعد سلمہ ایک کلکٹر کی بیوی بن سکتی تھی۔ ایک لڑکی کو اس سے زیادہ اور کیا چاہیئے۔

لیکن پروفیسر صاحب کافی چالاک تھے اس لئے وہ اپنی بیٹی کو اپنے پلان کا پتہ نہیں لگنے دینا چاہتے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ اُس کے رومانی خوابوں کی دنیا اُجڑ جائے۔ وہ چاہتے تھے کہ وہ یہی سمجھے کہ وہ اپنا شوہر خود پسند کر رہی ہے۔ "زبردستی کی شادی" کا خیال پروفیسر صاحب کے لئے ناقابل برداشت تھا کیونکہ انہیں اپنے "معقول" ہونے پر بڑا ناز تھا، لیکن اگر ہوشیاری سے کام لیا جائے تو محبت کی شادی بھی "طے" کرائی جا سکتی ہے۔ پروفیسر صاحب اتنے بیوقوف بھی نہیں تھے کہ شروع سے ہی انور کا دماغ خراب کر دیتے۔ اِس لئے سلمہ کی سالگرہ کی دعوت میں کچھ اور چُنے ہوئے لڑکوں کو بھی دعوت دی گئی تھی جن میں راز بھی تھا۔ اِس لئے نہیں کہ پروفیسر صاحب یہ سمجھتے تھے کہ اُس چلتے پھرتے شاعر کو کبھی بھی سلمہ کے ساتھ شادی کرنے کے خواب دیکھنے کی اجازت دی جا سکتی تھی، بلکہ اس لئے کہ شاعروں کو ہمیشہ سے فیشن ایبل عورتوں کا دل بہلانے کے لئے استعمال کیا جاتا رہا ہے، وہ دو چار نظمیں پڑھ کر سُنائے گا تو محفل میں رنگ آ جائے گا۔

(۳)

انور دعوت میں تو گیا لیکن وہ سارا وقت بہت دُکھی رہا۔ اُسے یقین تھا کہ پروفیسر صاحب اور سلمہ دونوں ہی پر اُس کا 'امپریشن' اچھا نہیں پڑ رہا ہے حالانکہ

وہ جان لڑا کر اِس کوشش میں تھا کہ وہ اِس سُنہرے موقع کا فائدہ اُٹھا کر سلمہ سے دوستی پیدا کرلے۔ عثمان کو بھی بُلایا گیا تھا۔ وہ بڑی بے تکلّفی سے باتیں کر رہا تھا۔ انور کو یہ دیکھ کر بڑا صدمہ پہنچا کہ عثمان درمیان میں سلمہ پر فقرے بھی کستا جاتا تھا۔ سلمہ اپنے سفید لباس میں کسی دیوی کی طرح خوبصورت اور سنجیدہ لگ رہی تھی۔ راز ایک کونے میں بیٹھا ہوا تھا اور چونکہ پروفیسر صاحب نے خود اپنی طرف سے لڑکوں کو سگریٹ پینے کی اجازت دے دی تھی اِس لئے وہ بڑے اطمنان سے سگریٹ کے کش لے رہا تھا اور دھوئیں کے چھلّے بنا کر چھت کی طرف پھینک رہا تھا۔ دوسرے لڑکے بڑی بے حیائی سے سلمہ کی چاپلوسی کر رہے تھے، اُس کے ہر لفظ کو بڑے غور سے سُن رہے تھے اور اگر وہ کوئی ذرا سی بھی ہنسی کی بات کہہ دیتی تھی تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس دیتے تھے۔ پروفیسر صاحب اپنا عجیب شکل کا پائپ جو وہ پچھلی بار سوٹزرلینڈ سے لائے تھے، منہ میں لگائے ہوئے بڑی دریا دلی سے مُسکرا کر یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ جب کوئی لڑکی پہلی بار اپنے آدھے درجن مدّاحوں سے ملے تو اُس کے شریف باپ کو یہی صورت اختیار کرلینی چاہیئے۔

انور کو کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ وہ سلمہ کو دیکھ رہا تھا۔ اُس کا جی چاہتا تھا کہ وہ اِسی طرح اُسے دیکھتا رہے ــــــ لیکن کچھ دیر بعد اُس نے سوچا کہ اِس طرح سے گھورنا بہت بیوقوفی ہے، اِس لئے وہ دیوار پر لگی ہوئی ایک تصویر کو دیکھنے لگا۔ اُس نے بھی بات چیت میں حصّہ لینے کی کوشش کی لیکن اپنی گھبراہٹ کی وجہ سے وہ اتنی زور سے بولا کہ سب نے بھویں چڑھا کر اُسے دیکھا اور وہ شرما کر چُپ ہوگیا۔ سلمہ اُس پر بہت مہربان تھی اور درمیان

میں اُس سے پوچھ لیتی تھی "مسٹر انور علی آپ کچھ کھا نہیں رہے ہیں" اور یہ کہہ کر وہ سموسے یا کیک کی پلیٹ اُس کی طرف بڑھا دیتی تھی۔ انور اِس ڈر سے انکار نہیں کر پاتا تھا کہ کہیں اِسے اُس کی بدتمیزی نہ سمجھ لیا جائے اور اس لئے وہ ہر چیز کو "تھینک یو سو مچ" کہہ کر قبول کر لیتا تھا۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُس کی پلیٹ اوپر تک بھر گئی تھی اور وہ اپنی گھبراہٹ کی وجہ سے کچھ کھا بھی نہیں پا رہا تھا۔ اِس پر سب سے بڑا غضب یہ ہوا کہ اُس کے ہاتھ سے گر کر ایک پلیٹ ٹوٹ گئی۔ ہوا یہ کہ سلمہ نے اُسے چائے بنا کر دی اور اُس کی بڑی بڑی معصوم آنکھوں کو دیکھتے میں وہ کچھ ایسا کھویا ہوا تھا کہ اُس نے پیالی تو پکڑلی مگر پلیٹ نیچے گر گئی۔ سلمہ اور پروفیسر سلیم دونوں ہی نے اُس سے کہا کہ کوئی بات نہیں ہے لیکن وہ اتنا شرمندہ ہوا کہ اُس کا جی چاہ رہا تھا کہ کسی بہانے سے اُٹھ کر وہاں سے چلا جائے۔ لیکن اتنے میں کسی لڑکے نے یہ تجویز پیش کی کہ رازؔ اپنی کچھ نظمیں سُنائے اور انور کے وہاں سے اُٹھ کر چلے جانے کی نوبت نہیں آئی۔ اور جب سلمہ نے بھی بہت جوش کے ساتھ اِس تجویز کی تائید کی تو رازؔ کے سامنے بھی نظمیں سُنانے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ گیا۔

رازؔ نے شروع شروع میں جو غزلیں سُنائیں اُن میں تو انور کو کوئی خاص مزا نہیں آیا۔ آخر غالبؔ، ذوقؔ اور مومنؔ جیسے پُرانے اُستاد اس سے کہیں اچھی غزلیں کہہ گئے تھے اور وہ اُن سب کو پڑھ چکا تھا۔ غزل میں سوال اِس چیز کا نہیں ہوتا کہ کیا بات کہی گئی ہے بلکہ کس انداز سے اور کتنے خوبصورت لفظوں میں کہی گئی ہے۔ اور یہ ظاہر تھا کہ برسوں محنت کرنے کے بعد ہی رازؔ کی غزلوں میں وہ اُستادانہ مہارت آسکتی تھی۔ لیکن اتنے میں کسی نے "محبوبہ سے خطاب" کی فرمائش کی۔ پہلے

تو رازؔ کو کچھ ہچکچاہٹ ہوئی۔" وہ نظم تو آپ سب لوگ مشاعرے میں سن چکے ہیں۔"
"مشاعرے کی بات الگ تھی رازؔ صاحب۔" سلمہ نے کہا" چھوٹی سی محفل میں سُننے میں کچھ اور ہی لُطف آئے گا۔" اور عثمان جو ہمیشہ کوئی نہ کوئی فقرہ کسنے کی تاک میں رہتا تھا، بولا کہ اِس قسم کی نظمیں تو صرف ایک کو سُنانے کے لئے ہوتی ہیں۔ سلمہ شرما گئی۔ اُس کے گورے گورے گالوں پر لالی دوڑ گئی۔ رازؔ نے عثمان کو گھُور کر دیکھا، لیکن پروفیسر صاحب کے ساتھ سب لوگ اِس مذاق پر کھِلکھلا کر ہنس دیئے۔

رازؔ نے نظم پڑھی لیکن اِس بار کچھ دھیمی آواز میں، اور حالانکہ لفظ وہی تھے، لیکن انور کو اُس میں ایک نیا ہی لُطف آیا۔ کیا اس کی وجہ یہ تھی کہ آواز دھیمی ہونے کی وجہ سے اُس میں یہ انداز پیدا ہو گیا تھا جیسے کوئی بہت رازداری کی بات کہہ رہا ہو؟ اب اِس نظم کو سُن کر ایسا نہیں لگتا تھا کہ شاعر دنیا کو چیلنج دے رہا ہے بلکہ ذاتی طور پر کسی سے فریاد کر رہا ہے، اب اُس میں لفظوں کا زور نہیں تھا بلکہ سچّے جذبات اُبھر کر سامنے آگئے تھے یا اُس کی وجہ یہ تھی کہ سلمہ کی موجودگی سے ـــــ جو اتنا قریب ہوتے ہوئے بھی اتنی دُور تھی ـــــ اُن لفظوں میں انور کے لئے ایک نئے معنی پیدا ہو گئے تھے؟ اُس نے کہیں پڑھا تھا کہ شاعری بلّور کی طرح ہوتی ہے اور ایک ہی نظم میں الگ الگ وقتوں پر ہم اپنے مُوڈ اور ماحول کے مطابق نئے حُسن کی جھلک دیکھ سکتے ہیں اور اُس میں نئے معنی پیدا کر سکتے ہیں۔ اب اُس کی سمجھ میں آگیا کہ یہ بات کتنی سچ ہے کیونکہ کچھ ہی دن پہلے جن الفاظ کو سُن کر اُس کا دل لرز اُٹھا تھا اُن ہی کا اثر اس وقت اُس کے دل پر بالکل اُلٹا پڑ رہا تھا۔ اُسے اکیلے پن کا احساس ہو رہا تھا، اُس کے دل میں ایک عجیب سی میٹھی بے چینی اُبھر رہی تھی۔ وہ کسی ایسی چیز

کے لئے تڑپ رہا تھا جو اُس کی سمجھ کے باہر تھی۔ جتنی دیر راز اپنی نظم پڑھتا اُتنی دیر انور نے سلمہ کی طرف نہیں دیکھا کہ کہیں وہ اسے اُس کی گستاخی نہ سمجھ بیٹھے۔ وہ تمام وقت شاعر کی طرف ہی دیکھتا رہا۔ راز بھی نظریں پھیرے ہوئے لگاتار چھت کے ایک کونے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ لیکن جب نظم ختم ہونے کو آئی تو اُس کی نظریں بھی بھٹکنے لگیں۔ اور جس وقت اُس نے یہ مصرع پڑھا "تمہارے اک اشارے پر میری جاں ..." تو انور نے دیکھا کہ اُس نے جلدی سے ایک نظر سلمہ کی طرف دیکھا جو دونوں ہتھیلیوں پر ٹھوڑی ٹکائے بڑے غور سے نظم سُن رہی تھی۔

راز کی نظم ختم ہونے کے بعد کوئی ایک منٹ تک کمرے میں سناٹا چھایا رہا۔ کوئی بھی نہیں بولا۔ ایسا لگتا تھا کہ نغمہ ابھی تک فضا میں گونج رہا ہے۔ اتنے میں پروفیسر سلیم نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھا اور کسی لڑکے نے کہا کہ اب چلنا چاہیئے۔ اچانک کمرہ طرح طرح کی آوازوں سے گونج اُٹھا۔ کوئی کہہ رہا تھا "پروفیسر صاحب آپ کا بہت بہت شکریہ"۔ اور پروفیسر صاحب سب سے باری باری کہہ رہے تھے۔ "تمہارے آنے کا شکریہ۔ یہ پارٹی بہت اچھی رہی"۔ اور عثمان اپنے خاص انداز میں کہہ رہا تھا "میں تو چاہتا ہوں کہ مس سلیم سال میں کئی بار اپنی سالگرہ منایا کریں اور ہمیں ایسی پارٹیوں میں آنے کا موقع ملا کرے"۔ جس کے جواب میں سلمہ نے فوراً کہا "تب تو میں بہت جلد بوڑھی ہو جاؤں گی"۔ لیکن انور کو اس موقع پر کہنے کے لئے ایک بھی فقرہ نہیں سُوجھا اور اُس نے رسمی طور پر شکریہ ادا کر کے ہی صبر کر لیا۔

انور سب سے بعد میں وہاں سے چلا اور جب اُس نے پروفیسر سلیم سے ہاتھ ملایا تو اُنھوں نے انور سے کہا "پھر آنا انور" اور اس کے بعد کافی زور دے کر یہ بھی

کہا: "جب جی چاہے آجایا کرو۔ مجھے یقین ہے کہ تمہارے آنے سے سلمہ بھی خوش ہو گی۔ بات یہ ہے کہ یہاں اُس کا کوئی بھی تو دوست نہیں ہے"۔ اِس پر سلمہ نے بھی کہا: "ضرور ضرور، جس دن بھی شام کو آپ کو کوئی خاص کام نہ ہو آپ یہاں آجایا کیجئے"۔ اس کے جواب میں انور بار بار صرف باپ بیٹی کا شکریہ ہی ادا کرتا رہا۔ انور کو یقین نہیں تھا کہ جوان لڑکیوں سے ہاتھ ملانا چاہیئے یا نہیں، اِس لئے اُس نے ہاتھ اُٹھا کر آداب عرض کیا اور کمرے سے باہر چلا آیا۔

(۴)

انور نے اس کھلی دعوت کا فائدہ اُٹھایا اور دو دن بعد پھر وہاں جا پہنچا۔ پروفیسر صاحب ہمیشہ کی طرح بڑے مہربان تھے اور انہوں نے جس تپاک سے اپنے اِس نوجوان طالب علم کا استقبال کیا اُسے دیکھ کر انور سچ مچ متاثر ہوا۔ تھوڑی دیر بعد سلمہ کمرے میں آئی اور اُس کے ساتھ ہی سینٹ کی بھینی بھینی خوشبو کا ایک جھونکا بھی آیا۔ اُس کے رویے سے بھی یہ ظاہر تھا کہ وہ انور کا استقبال کر رہی ہے۔ چائے منگوائی گئی لیکن پروفیسر صاحب کو کلب میں ایک پارٹی میں جانا تھا اِس لئے وہ موٹر لے کر چلے گئے اور اِن دونوں کو وہاں اکیلا چھوڑ گئے۔

انور کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ وہ کسی جوان لڑکی کے ساتھ اکیلا تھا۔ اُس نے سوچا یہ تو بہت انہونی بات ہے۔ اُس کا خیال تھا کہ جب کوئی لڑکی ——— وہ نئے ڈھنگ کی لڑکی ہی کیوں نہ ہو ——— کسی انجان مرد سے ملتی ہے تو اُس کا باپ یا ماں یا کوئی چچا ماموں یا کم سے کم کوئی بھروسے والا نوکر ہمیشہ آس پاس منڈلاتا رہتا ہے لیکن یہاں تو وہ سلمہ کے ساتھ ایک ہی صوفے پر بیٹھا چائے پی رہا تھا اور باورچی خانے

میں جونو کر کھانا پکا رہے تھے اُن کے علاوہ گھر میں کوئی بھی نہیں تھا۔ بہت ہی خوشگوار صورت تھی لیکن ساتھ ہی انور کو کچھ پریشانی بھی ہو رہی تھی۔ وہ کچھ شرما رہا تھا اور کچھ اُسے اُلجھن بھی ہو رہی تھی۔ وہ سلمہ کے سوالوں کا جواب ہاں یا نا میں دیتا اور بیچ بیچ میں بڑی دیر تک چپ بیٹھا رہتا۔ انور نے دیکھا کہ بات کرنے کے معاملے میں سلمہ بہت تیز تھی۔ فرّاٹے دار انگریزی بولتے بولتے وہ ایک دم سے صاف ہندوستانی بولنے لگتی تھی۔ وہ دو تہذیبوں کے درمیان پلی تھی اور مغرب اور مشرق کی تہذیب کے ملے جُلے اثر نے اُس کی شخصیت کو نکھار دیا تھا۔ اُس میں انگریزی سکول کی پڑھی ہوئی لڑکی کی بیباکی بھی تھی جس کی وجہ سے وہ بہت سی چیزوں کے بارے میں کھُل کر بات کر سکتی تھی، لیکن ساتھ ہی چونکہ وہ اپنی ماں کی بیٹی تھی اس لئے اُس کی آنکھوں میں ایک قدرتی حیا تھی جس کی وجہ سے اُس کا بے جھجک بات کرنے کا ڈھنگ کچھ اور ہی خوبصورت ہو گیا تھا۔

انور نے پہلی مرتبہ سلمہ کو اتنے قریب سے اتنی اچھی طرح دیکھا تھا۔ چُست ریشمی کُرتے پر وہ پیلے رنگ کا ایک تنگ اُونی سویٹر پہنے تھی جس کی وجہ سے اُس کے جوان جسم کے باغی اُبھار اور نمایاں ہو گئے تھے۔ اُس کا رنگ گورا تھا اور انور کو یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اُس کے چہرے پر جو گلابی پن تھا وہ پاؤڈر یا سُرخی کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ یہ اُس کی اچھی صحت کی نشانی تھی۔ اُس نے اپنے کالے کالے گھنگھریالے بالوں کی دو موٹی موٹی چوٹیاں گوندھ رکھی تھیں جو اُس کے چہرے کے دونوں طرف اُس کے سینے پر پڑی ہوئی تھیں اور اُس کا سر ذرا سا بھی ہلنے پر سانپ کی طرح لہرا جاتی تھیں۔ اُس نے بڑی بے پرواہی سے ہلکے آسمانی رنگ کا جارجٹ کا دوپٹہ اپنے

کندھوں پر ڈال رکھا تھا اور انور، جو ابھی شام کی ٹھنڈی ہوا کے تیر کی طرح چبھتے ہوئے تھپیڑے کھا کر آیا تھا، اِس بات پر تعجب کر رہا تھا کہ آخر وہ اتنی سردی میں اُونی شال کیوں نہیں اوڑھتی۔

"مسٹر انور، یونین میں تو آپ اتنا اچھا بولتے ہیں لیکن یہاں تو آپ مُنہ بھی نہیں کھولتے۔" سلمیٰ نے اچانک کہا اور انور یہ دیکھ کر شرما گیا کہ اُس کی کھسیانی ہوئی خاموشی کو اِس طرح للکارا جا رہا ہے۔

"ارے ہاں، معاف کیجیے گا۔" اُس نے معافی مانگتے ہوئے ہکلا کر کہا۔ "میں تو آپ کی باتیں سُننے میں بالکل کھو گیا تھا اور پھر ـــــ" سچ بات کہنے سے پہلے وہ ایک لمحہ کے لئے رُکا۔ "مجھے آپ سے تھوڑا سا ڈر بھی لگ رہا تھا۔"

"مجھ سے اور ڈر؟" سلمیٰ نے سوچا کہ انور مذاق کر رہا ہے۔

"دیکھئے بات یہ ہے کہ میں آپ جیسی لڑکی سے اِس سے پہلے کبھی نہیں ملا۔" اِس بھولے پن سے کی گئی تعریف پر سلمیٰ بہت خوش ہوئی۔ اپنی تعریف سُن کر کون خوش نہیں ہوتا۔ پھر سلمیٰ ہی کیوں نہ خوش ہوتی؟۔ اُسے یہ پیلی رنگت کا دُبلا پتلا لڑکا اچھا لگنے لگا تھا جو اتنا سیدھا سادہ اور بھولا تھا، لیکن یونین میں اُس کی تقریر سے یہ ثابت ہو گیا تھا کہ وہ بیوقوف نہیں تھا۔ سلمیٰ نے پوچھا کہ وہ تقریر بیچ بیچ بھول گیا تھا یا اپنی دلیلوں میں زیادہ اثر پیدا کرنے کے لئے اُس نے جان بوجھ کر ایسا کیا تھا اور جب انور نے یہ منظور کر لیا کہ وہ سچ مچ مشکل میں پھنس گیا تھا تو سلمیٰ نے اُسے بتایا کہ اپنے سکول کے "یومِ والدین" کے جلسے میں وہ بھی ایسی ہی مشکل میں پھنس گئی تھی۔ اُسے "مرچنٹ آف وینس" کے عدالت والے سین میں پورشیا کی تقریر

سُنانا تھا جسے اُس نے اچھّی طرح رٹ لیا تھا لیکن اُس نے وہ رٹی ہوئی تقریر سُنانا شروع ہی کیا تھا " دی کوالٹی آف مرسی اِز ناٹ اسٹرینڈ۔ اِٹ ڈراپیتھ فرام ہیون آن دی پلیس بنیتھ ۔۔۔ اِٹ اِز ٹوائس بلسیڈ " کہ اتنے میں اُسے ایک ویٹر دکھائی دیا جو اسٹرابیری آئس کریم کی پلیٹیں مہمانوں کو دے رہا تھا۔ سلمہ یہ سوچ کر کہ اُس کے لیے آئس کریم نہیں بچے گی، اتنی فکرمند ہوئی کہ وہ پورشیا کی تقریر بالکل بھول گئی۔ اُس کی آنکھیں ابھی تک آئس کریم کے چھوٹے چھوٹے گلابی پہاڑوں پر جمی ہوئی تھیں اور وہ ٹوٹے ہوئے ریکارڈ کی طرح بار بار یہی دُہرا رہی تھی کہ " اِٹ بلیتھ ہم دیٹ گیوز، اینڈ ہم دیٹ ٹیکس " اُس نے یہ واقعہ اتنے دلچسپ طریقے سے بیان کیا کہ انور کو بے ساختہ ہنسی آگئی۔ سلمہ بھی ہنس پڑی۔ اُس کے چہرے پر سُرخی دوڑ گئی اور وہ پہلے سے بھی زیادہ خوبصورت لگنے لگی۔ جوانی کی اُمنگوں سے بھرپور اِس ہنسی سے انور کی ہچکچاہٹ بالکل دُور ہوگئی اور اب اُسے اپنے قریب بیٹھی ہوئی اِس خوبصورت لڑکی سے بالکل ڈر نہیں لگ رہا تھا۔ اب وہ دونوں دوست ہوگئے تھے ۔۔۔ جیسے وہ اور گوپال یا وہ اور رتن دوست تھے یا شاید اُس سے بھی زیادہ گہرے دوست!

اور وہ اسی طرح ہنستے رہے، باتیں کرتے رہے اور ایک دوسرے کو قصے سُناتے رہے یہاں تک کہ کمرے میں اندھیرا ہوگیا اور اُس دُھندلکے میں صرف سلمہ کی دو آنکھیں چمکتی رہیں۔ کسی نوکر نے آکر بتّی جلادی اور اُنہیں یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ اتنی دیر ہوگئی تھی۔ پروفیسر سلیم نے کلب سے آکر اُن دونوں کو دوستوں کی طرح باتیں کرتے دیکھا تو بہت خوش ہوئے۔ انور اُٹھا اور جانے کی اجازت مانگنے لگا

لیکن وہ سلمہ کا مہمان تھا اور سلمہ اُس کی ایک بھی بات سُننے کو تیار نہ تھی۔ وہ بولی "ناممکن ہے، تمہیں ہم لوگوں کے ساتھ کھانا کھا کر جانا ہوگا۔"

انور اب روز شام کو پروفیسر سلیم کے گھر پہنچ جاتا اور جب بھی وہ شام کی چائے پینے وہاں جاتا تو ہمیشہ رات کا کھانا کھا کر ہی لوٹتا۔ انہیں بات چیت کرنے کے لئے روز کوئی نہ کوئی بہانہ مل ہی جاتا۔ سلمہ کو شاعری کا خاص شوق تھا اور انور اقبال یا جوش کی یا کسی نئے شاعر کی کوئی کتاب لے آتا اور اُسے اپنی پسند کی کوئی نظم پڑھ کر سُناتا اور جب سلمہ بھی اُسے پسند کرتی تو اُسے اُس میں ایک نیا ہی مزا آتا۔ کبھی کبھی وہ رازؔ کی غیر مطبوعہ نظمیں اور غزلیں بھی لاتا، جو رازؔ اُسے پڑھنے کے لئے دیتا تھا۔ سلمہ اکثر کہا کرتی تھی کہ رازؔ جیسے نوجوان شاعروں کی شاعری میں ایک ولولہ اور جوش ہوتا ہے، جو پُرانے اُستادوں کی شاعری کی باریکیوں میں نہیں ملتا۔ ہفتے میں ایک بار وہ سینما دیکھنے جاتے اور سینما کے پردے پر دوسروں کی خوشی دیکھ کر خوش اور اگر تصویر اچھی نہ بھی ہوتی، ٹین کی چھت والے اُس گھُٹے ہوئے ہال میں شاید ہی کبھی اچھی تصویر آتی تھی، تب بھی سلمہ کے پاس رہنے کی وجہ سے انور کو بُری تصویر بھی اچھی لگتی۔ کیونکہ پردے پر ہیروئن کی شکل میں اُسے سلمہ ہی دکھائی دیتی۔

انور اس طرح خوشی کے گلابی دھندلکے میں اپنے دن بِتا رہا تھا۔ اُسے اِس بات کا ہوش نہیں تھا کہ سلمہ کے ساتھ اُس کی دوستی کو لے کر لوگ کیسی کیسی باتیں کرتے ہیں اور اُنہیں بدنام کرنے کی کتنی کوششیں کرتے ہیں۔ اُس نے سلمہ کے بارے میں اپنے جذبات کا جائزہ لینے کی کبھی کوشش نہیں کی تھی اور اگر کوئی اُس سے کہتا کہ اُسے سلمہ سے عشق ہوتا جارہا ہے تو وہ اُس بات کو بدنیتی سے معمور ایک الزام کہہ کر ٹال دیتا۔ ابھی

طرح ہر نوجوان مرد اپنے آپ کو پھنسانے کے لئے خود جال بُنتا ہے اور کمال یہ ہے کہ جب وہ اُس جال میں پھنس جاتا ہے تو اُسے حیرت اور پریشانی ہوتی ہے۔

(۵)

یونیورسٹی میں دیکھتے دیکھتے ہر طرف "انور سلمہ رومانس" کا چرچا ہونے لگا۔ انور کے کمرے میں رہنے والے اُس کے ساتھیوں پر اُس رومانس کا ردِ عمل بالکل ہی الگ الگ ہوا۔ اصغر نے اُسے پروفیسر سلیم کے گھر پابندی سے جانے کے بارے میں ایک آدھ بار چھیڑا ضرور، لیکن اس سے زیادہ کچھ نہ کیا۔ راؔ اپنی الگ ہی ایک دنیا میں کھویا رہتا تھا۔ وہ نہ کبھی کسی کے بھید جاننے کی کوشش کرتا تھا، نہ کسی کو اپنا راز بتاتا تھا۔ لیکن ہر چیز کا مذاق اُڑانے والا عثمان زیادہ کھُل کر کہتا تھا۔ جب بھی اُسے موقع ملتا وہ انور کو ایک لڑکی کی وجہ سے اپنی پڑھائی اور اپنے دوستوں کی طرف سے لاپروائی برتنے کے لئے لتاڑتا تھا۔ وہ بڑی سنجیدگی سے کہتا "مائی ڈیئر انور میری بات مانو کوئی بھی لڑکی اِس لائق نہیں ہوتی"۔ اگر کسی اور نے یہ بات کہی ہوتی تو انور اُسے مُنہ توڑ جواب دیتا اور بڑی سختی سے اُس سے کہہ دیتا کہ اُسے اُس کے ذاتی معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے، لیکن بمبئی والا یہ لڑکا اِن معاملات کے بارے میں اپنی رائے اتنے دعوے کے ساتھ دیتا تھا اور اتنے یقین کے ساتھ اپنا فیصلہ سُناتا تھا کہ اُس کے آگے انور کو کوئی جواب دیتے نہ بن پڑتا تھا۔ اِس کے علاوہ وہ جانتا تھا کہ عثمان ایک سچا دوست ہے اور اگر وہ کوئی بات سختی سے بھی کہتا تھا تو دل دکھانے کے لئے نہیں کہتا۔

لیکن پوری یونیورسٹی میں سینکڑوں لوگ جو باتیں کر رہے تھے اور اُسے اور

سلمہ کو بدنام کر رہے تھے، اُن کے بارے میں انور کا رویہ یہی نہیں ہو سکتا تھا جب وہ لڑکوں کے کسی گروہ کے پاس سے گذرتا تھا اور اُسے آتا دیکھ کر وہ یکایک چپ ہو جاتے تو وہ فوراً سمجھ جاتا کہ اُسی کے بارے میں باتیں ہو رہی تھیں۔ ایک دن اُس نے اپنے کانوں سے سُنا کہ وہ لوگ اُس کے بارے میں کس طرح کی باتیں کرتے ہیں اُس دن شام کو وہ پروفیسر سلیم کے گھر نہیں گیا تھا۔ وہ کھیتوں کی طرف ٹہلنے چلا گیا تھا۔ اور وہاں سے سُورج ڈھلے لوٹا تھا اور پھر چائے پینے سوئمنگ باتھ ریستوراں میں چلا گیا تھا۔ وہ جا کر چپ چاپ ایک کونے میں چھوٹی سی میز پر بیٹھ گیا۔ اُس نے دیکھا کہ بیچ والی بڑی سی میز کے چاروں طرف کوئی آدھے درجن لڑکے باتیں کرنے میں اتنے مشغول تھے کہ انہیں اُس کے آنے کا پتہ بھی نہ چلا۔ اُس نے چائے کا آرڈر دیا ہی تھا کہ اتنے میں اُن لڑکوں کی بات چیت کے دوران بار بار اپنا نام سُنا۔ پہلے تو اُس نے سوچا کہ چپ چاپ وہاں سے اُٹھ کر چلا جائے۔ اُسے کسی کے بارے میں جھوٹی سچی باتیں اُڑانے سے سخت نفرت تھی اور وہ جانتا تھا کہ اُس کے بارے میں ـــ اور سلمہ کے بارے میں ـــ جس طرح کی باتیں کی جائیں گی انہیں وہ برداشت نہیں کر سکے گا۔ وہ اِس چیز کو قطعی پسند نہیں کر سکتا تھا کہ اُس کی وجہ سے کسی بے قصور لڑکی کے نام پر کیچڑ اُچھالا جائے۔ انور وہاں سے چُپکے سے کھسک جانے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اتنے میں ویٹر چائے لے آیا اور انور کو اُن کی باتیں سُنتے رہنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اُس نے اپنے اوور کوٹ کا کالر کھڑا کر لیا تاکہ کوئی اُسے پہچان نہ سکے۔ اتنے میں انور کو کسی کو یہ کہتے ہوئے سُن کر بڑا تعجب ہوا کہ "دیکھو، تم لوگ انور اور سلمہ سلیم کے بارے میں جو کچھ کہہ رہے ہو وہ سراسر بکواس ہے"۔ اِن الفاظ

کو کہنے والا کونے میں اپنی میز پر سے اٹھا اور بیچ والی میز کے پاس پہنچ گیا" اور میں تم لوگوں کو یہاں اِس قسم کی باتیں کرنے نہیں دوں گا۔ سمجھ گئے؟" وہ بہت لمبا چوڑا چھ فٹ کا جوان تھا جو ایک ڈھیلا ڈھالا اوور کوٹ پہنے تھا اور اُس پر ایک پُرانی کالے رنگ کی فیلٹ ہیٹ لگائے تھا۔ ریستوراں کی دُھندلی روشنی میں اُس کی صورت بہت بھیانک لگ رہی تھی۔ اُس کی آواز میں بڑا رُعب تھا اور چیلنج بھی تھا، جس کی وجہ سے کوئی اُس کی بات ٹالنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ انور اور سلمہ کے بارے میں بیہودہ باتیں کرنے والے لڑکے چُپ ہو گئے۔ صرف ایک لڑکے نے دبی زبان میں کھسیا کر کہا کہ "ہم تو مذاق کر رہے تھے!" اپنا بِل دے کر کچھ ہی منٹ بعد وہ اُٹھ کر چلے گئے۔

انور نے کالا اوور کوٹ پہنے ہوئے اُس آدمی کو پہچان لیا۔ وہ ایم۔ اے میں پڑھتا تھا۔ اُس کا نام سُبحان تھا۔ وہ اُس چھوٹے سے گروہ سے تعلق رکھتا تھا جس کا نام لڑکوں نے "روسی" رکھ چھوڑا تھا کیونکہ یہ لوگ ہمیشہ بڑے جوش کے ساتھ باتیں کیا کرتے تھے کہ سوویت یونین میں کیسی ترقی ہو رہی ہے۔ یہ ایک عجیب اور خفیہ سا گروہ تھا جس میں آسانی سے کسی کو گھسنے نہیں دیا جاتا تھا۔ اِس گروہ کے لوگ اُونچی اُونچی باتیں کرتے تھے اور عام طور پر باہر کے لوگوں سے بہت کم ملتے جلتے تھے۔ اُن کی اِس علیحدگی پسندی پر جھنجھلا کر دوسرے لڑکوں نے نہ صرف اُن سب کو ملا کر پورے گروہ کا ایک نام رکھ دیا تھا بلکہ الگ الگ بھی سب کے نام بگاڑ کر روسی ڈھنگ کے کر دیئے تھے۔ سُبحان کو لوگ "سبحانوسکی" کہتے تھے، موسٰی کا نام تھا موسٰی کوف اور ظہیر کا بدل کر ظہیروف کر دیا گیا تھا۔ انور اِن لوگوں سے پہلے کبھی نہیں ملا تھا لیکن اِس وقت

مشکور ہو کر "سبحانوسکی" کی میز پر گیا، اس بات کا شکریہ ادا کرنے کے لئے کہ اُس نے بڑی ہمت کا ثبوت دے کر اُسے اِن سکینڈل پھیلانے والوں کے حملے سے بچایا تھا۔

"السّلام علیکم! میرا نام انور ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔ بیٹھو"۔ "وعلیکم السلام۔ تشریف رکھئے!" اُس نے سیدھے سیدھے کہا۔ "میرا نام سُبحان ہے لوگ مجھے سبحانوسکی کہتے ہیں۔"

"آپ نے اُن لوگوں سے جو کچھ کہا وہ میں نے سُنا۔ میں آپ کا شکریہ ــــــ"

"ٹھیک ہے۔" سبحان نے اُسے اپنا جملہ پُورا کرنے کا بھی موقع نہیں دیا۔ "مجھے سکینڈل بازی سے سخت چڑ ہے، یہ متوسط طبقے کے اخلاقی زوال کی نشانی ہے۔"

"آپ نے بہت اچھا کیا... میرا مطلب ہے... یہ بہت ہی شرم کی بات ہے کہ دو آدمیوں کے پاک اور بے داغ تعلّقات کے بارے میں اِس طرح کی غلط باتیں کہی جائیں..."

"مرد اور عورت کے بیچ 'پاک اور بے داغ تعلّقات' جیسی کوئی چیز ہوتی ہی نہیں جب تک مرد نامرد نہ ہو۔ اُن کے تعلقات بالکل ویسے ہوتے ہیں جیسے بکرے اور بکری کے۔ بات صرف اتنی ہے کہ ایک خاص عمر میں پہنچ کر آدمی کے کچھ خاص گلینڈز GLANDS کام کرنا شروع کر دیتے ہیں اور اُس میں جنسی رغبت پیدا ہوتی ہے اور اِس جنسی رغبت کے مطابق ہارمون بننے لگتے ہیں۔ مجھے تو اعتراض اِس بات پر ہے کہ کوئی کسی دوسرے کی لیبیڈو (LIBIDO) پر بحث کیوں کرے۔"

بکرے! بکریاں! جنسی رغبت؟ انور دنگ رہ گیا۔ اب سے پہلے کسی نے بھی اُس سے اِس طرح باتیں نہیں کی تھیں۔ یہ باتیں کھُلے عام ریستوراں میں بیٹھ کر تھوڑے ہی

ہوتی ہیں۔ اُس کے دِل کو دھکا بھی لگا اور وہ حیران بھی ہوا۔ اور سب تو ٹھیک تھا لیکن یہ لیبیڈو کیا بلا ہوتی ہے۔

"لیبیڈو؟" اُس نے تعجب سے یہ لفظ دُہرایا۔

"جسے محبت کہتے ہیں۔ لیکن تمہارے جیسے رومانٹک لوگوں نے اِس لفظ کو اتنا رگڑا ہے کہ اُس کا کوئی مطلب ہی نہیں رہ گیا ہے۔ تم لوگ جسم کی ایک قدرتی بھوک کو بلاوجہ رُوحانیت کا رنگ دینے کی کوشش کرتے ہو۔"

"آپ کو کیسے معلوم کہ میں رومانٹک آدمی ہوں؟" زیادہ تر رومانٹک لوگوں کی طرح انور کو بھی اپنے حقیقت پسند ہونے پر ناز تھا۔

"میں نے تمہاری تقریر سُنی تھی۔ تم نے اُس میں دنیا بھر کی رومانٹک بکواس کی تھی ــــــ مستقبل کے دھارے' اور ہندوؤں اور مسلمانوں کا خون ایک ساتھ بہنا' وغیرہ وغیرہ۔ تم لوگ تو سمجھتے ہو کہ زندگی شاعری ہے ــــــ اور سامراجیوں کی توپیں سنگیت کی لَے پر چلتی ہیں۔"

اُس کے بعد پندرہ منٹ تک انور کو زندگی کے بارے میں اور محبت کے بارے میں ــــــ مارکس اور فرائیڈ کے اُصولوں پر مبنی ایک ایسا دھواں دھار لکچر سُننا پڑا کہ اُس کا سر چکرا گیا۔ پھر بھی اُسے یہ اکھڑ قسم کا دبلا پتلا آدمی بہت اچھا لگا۔ کیونکہ اُس میں اپنی بات کھُل کر کہنے کی ہمت تھی۔ اُس نے انور کے خیالات اور اُس کے اعتقاد کے کمزور پہلوؤں پر بھی جو حملے کئے اُن کا اثر بھی انور پر اچھا ہی پڑا۔ وہ دوستوں کی طرح ایک دُوسرے سے جُدا ہوئے اور چلتے ہوئے سُبحان نے بڑی بے تکلفی سے اُس کی پیٹھ پر ایک زور کی دھپ لگاتے ہوئے کہا "تمہارا دماغ کچھ اُلجھا ہوا ضرور ہے،

جیسا کہ سب ہی متوسط طبقے کے انٹلکچولس کا ہوتا ہے۔ لیکن اگر تھوڑا بہت پڑھ لوگے تو تمہاری یہ طبقاتی گھٹن دور ہو جائے گی۔ اب بھی تم اچھے خاصے مارکسٹ بن سکتے ہو۔"

(٦)

انور اپنے نئے دوست سے رخصت ہو کر سیدھا ہوسٹل کی طرف چل دیا۔ اُسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اُس کے دماغ میں ابھی کوئی طوفان اُٹھ چکا ہو۔ سبحانو سکی نے جو خیالات ظاہر کئے تھے وہ سچ مچ انقلابی تھے۔ کوئی بھی سماجی اقدار ایسی نہیں تھیں جن پر اُس نے حملہ نہ کیا ہو ___ مذہب، قومیت، اخلاقیات اور محبت۔ لینن کی رائے کے مطابق اُس نے کہا تھا کہ مذہب ایک افیم ہے جس کی مدد سے حکمران طبقہ عوام کو غافل کر دیتا ہے۔ حکومت اپنے ہاتھوں میں لے لینے کے لئے قوم پرستی سرمایہ داروں کا ایک ہتھیار ہے۔ اخلاقیات نری بکواس ہے اور محبت؟ ___ ویسی ہی چیز ہے جیسے کوئی ایک گلاس پانی پی لے۔ اُس نے بہت موٹے موٹے ڈراؤنے انگریزی الفاظ استعمال کئے تھے جیسے "ڈائلکٹس"، "بورژوازی"، "پرولتاری"، "اوڈی پس کامپلکس"، "فکسیشنز"، "اِن ہیبیشنز" وغیرہ۔ اِن لفظوں سے زیادہ ڈراؤنا اُس کا رویّہ تھا ___ ڈراؤنا بھی اور دلچسپ بھی۔ سبحان نے اپنے رویّے کو objectivity کہا تھا اور انور پہ ___ subjective ہونے کا الزام لگایا تھا۔ انور کی سمجھ میں یہ تو آتا تھا کہ سیاسی اور معاشی معاملات میں آدمی کو واقعیت پسند ہونا چاہیئے لیکن وہاں بھی آدمی کی ذات کا دخل ہوتا ہے لیکن کیا کوئی جمالیات اور جذبات کے معاملے میں واقعیت پسند ہو سکتا ہے؟ کیا گلاب کی خوشبو کا تجزیہ کرنے کے لئے اُسے کسی لیبارٹری میں جانچنا ضروری ہے، یا بلبل کے گیت میں بجلی کی لہروں کا پتہ لگانے کے لئے کسی تجربے کی ضرورت ہے؟۔

اِن ہی خیالوں میں اُلجھا ہوا جب انور اپنے کمرے میں پہنچا تو دیکھا کہ کھانا میز پر لگا ہوا ہے۔ اصغر کرکٹ کپتان کی پارٹی میں گیا ہوا تھا لیکن رازؔ ہمیشہ کی طرح اندر کے کمرے میں لیٹا لگاتار سگریٹیں پھونک رہا تھا۔ انور کھانا کھانے بیٹھا تو اُسے ایک درد بھرا راگ سُنائی دیا۔ رازؔ لیٹا ہوا گنگنا رہا تھا لیکن یہ اُس کی اپنی غزل نہیں تھی۔ انور نے پہچان لیا کہ وہ غالبؔ کی ایک بہت مشہور غزل تھی اور اُسے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ رازؔ بار بار ایک ہی شعر دُہرا رہا تھا

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی، دردِ بے دوا پایا

یہ عشق کی ایک نئی تعریف تھی جو سُبحان کی "پانی کے گلاس" والے نظریے سے کتنی مختلف تھی! غالبؔ کی رائے میں ــــ اور عشق کے بارے میں غالبؔ سے بڑھ کر کون جانتا تھا؟ ــــ عشق ایک "دردِ بے دوا" تھا پھر بھی اُس میں آدمی کو زندگی کا سچّا مزا ملتا ہے! پہیلی کے اندر ایک اور پہیلی لگتی تھی، پر اسی پہیلی میں کہیں سچائی چھپی ہوئی تھی۔

رازؔ کو یہ پتہ نہیں چلا تھا کہ دوسرے کمرے میں انور بیٹھا ہوا ہے، اِس لئے وہ بڑے ہی درد بھرے لہجے میں بار بار اِسی شعر کو دُہراتا رہا۔ نہ جانے کیوں انور کو ایسا لگا کہ اُس نے سلمہ کے سامنے اپنی نظم "محبوبہ سے خطاب" بھی اِسی انداز میں پڑھی تھی اور بار بار اِس شعر کو سُننے کے بعد انور کو دھیرے دھیرے اِس بات کا احساس ہوا کہ رازؔ بھی سلمہ سے محبّت کرتا ہے۔ رازؔ بھی؟ کیا مطلب اِس کا؟ اِس طرح کے خیال دِل میں لانے پر وہ اپنے آپ پر جھنجھلانے لگا۔ جس لڑکی کو وہ ابھی کچھ ہی ہفتوں سے جانتا ہے، وہ اُسے کتنی ہی اچھی کیوں نہ لگتی ہو، پر وہ یہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ وہ اُس سے محبّت کرتا ہے؟

وہ اُن جذباتی بیوقوفوں میں سے نہیں ہے جو کسی لڑکی کو دیکھتے ہی اُس پر عاشق ہو جائیں۔ وہ اور سلمہ تو بس دوست ہیں۔ کیا وہ خود سینکڑوں بار دوسروں سے یہ نہیں کہہ چکا تھا کہ وہ سلمہ سے عشق نہیں کرتا لیکن اُس کی بات پر یقین کون کرتا تھا۔

کیا وہ خود بھی اپنی بات پر یقین کرتا تھا؟

(۷)

انور نے اپنی قربانی کے پیشِ نظر یہ فیصلہ کیا کہ وہ سلمہ سے کہے گا کہ راز اُس سے محبت کرتا ہے، وہ راز کی طرف سے وکالت کرے گا اور اُن کی شادی کرا دے گا۔ اپنے تصوّر میں اپنے آپ کو ایک مضبوط، خاموش، تیاگ وادی کے رُوپ میں دیکھنے لگا جس نے ایک دوست کی خاطر اپنی محبت کو قربان کر دیا۔ سلمہ اور راز خوش رہیں۔ اُن کی خوشی اُس کے دِل میں روشنی کے لئے کافی ہو گی۔ ایک خوبصورت لڑکی اور ایک ذہین شاعر کی جوڑی بہت ہی اچھّی رہے گی۔ اِس لئے اُس کے جیسے ٹٹ پونجئے آدمی کو اُن کے راستے سے ہٹ جانا چاہیئے۔ لیکن اُسے یہ قربانی دینے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ بڑے دن کی چھٹیاں قریب آ گئی تھیں اور اکبر علی نے اپنے بیٹے کو لکھا تھا کہ وہ اِس بار اپنی چھٹیاں سلام پور میں گذارے کیونکہ وہ کئی برس سے اپنے تایا ابّا اور بھائی بہنوں سے نہیں ملا تھا۔ انور تو علی گڑھ میں ہی رہنا چاہتا تھا لیکن وہ اپنے ابّا کی بات نہیں ٹال سکتا تھا مگر جب سلمہ کو یہ بات بتائی تو اُس نے کہا "لیکن تُم تو ہمارے ساتھ آگرے چل رہے ہو نا؟"

"آگرہ؟"

"ہاں، اور کیا۔ ابّا نے تم سے کچھ نہیں کہا؟ ابّا بھی بالکل بھُول بھُلکڑ ہیں نا؟ تین دن بعد پورے چاند کی رات ہو گی اور ہم تاج محل کو اس کے بھرپور حُسن میں دیکھ سکیں گے۔"

انور نے تاج محل نہیں دیکھا تھا۔ چاندنی رات میں اور وہ بھی سلمہ کے ساتھ تاج محل دیکھنا ــــ سچ مچ جنّت کا لطف آئے گا لیکن وہ راز کو کیسے بھول سکتا تھا۔

"کیا ہم سب لوگ چلیں گے؟" انور نے سلمہ سے خود چلنے کا وعدہ کرنے کے بعد پوچھا۔

"ہاں، سب لوگ چلیں گے ـــ یعنی میں اور ابا اور تم"۔

"کیا راز ہمارے ساتھ نہیں چلے گا؟"

"میں نے اُس سے تو کہا نہیں ہے"۔ سلمہ کی آواز میں ہچکچاہٹ تھی۔

انور نے اصرار کیا "لیکن اُسے بھی ساتھ لے چلنا چاہیئے۔ تاج کے خوبصورت باغ میں اُس کی نظم سُننے میں بے حد مزا آئے گا"۔

اور انور کے اتنا کہتے ہی جیسے بندھ ٹوٹ گیا۔ سلمہ کے مُنہ سے لفظوں کی ایک زوردار دھارا پھُوٹ نکلی۔ راز نے اُسے بہت سے پیار بھرے خط لکھے تھے اور اُن کے ساتھ اپنی نظمیں بھی بھیجی تھیں جو سب اُسی کے بارے میں معلوم ہوتی تھیں۔ اُس نے سلمہ کو ایک عجیب مصیبت میں پھنسا دیا تھا۔ اُس کے لئے اِن خطوط کو اپنے ابّا سے چھُپانا ناممکن ہو گیا تھا، اور جب اُنہیں اِس بات کا پتہ لگا تو وہ بہت ناراض ہوئے۔ اُس نے بھرّائی آواز میں کہا "کتنی بُری بات ہے"۔ اور پھر کچھ سنبھل کر بولی۔ "اُس کا سارا رویّہ بہت شرمناک رہا ہے۔ مجھے تو کسی سے کہتے ہوئے بھی شرم آتی ہے لیکن تُم سے میں یہ سب اِس لئے کہہ رہی ہوں کہ تُم میرے دوست ہو اور میں تم پہ بھروسہ کر سکتی ہوں"۔

اُس وقت انور راز کی پیروی کرنے کا اپنا ارادہ بالکل بھول گیا۔ حُسن اور شاعرانہ تخیّل کی جوڑی ملانے کا خیال اُس نے چھوڑ دیا۔ وہ تو بس اتنا جانتا تھا کہ

سلمیٰ نے اُسے اپنا دوست کہا تھا جس پر وہ بھروسہ کر سکتی تھی۔
بلکہ اُسے خوشی ہی ہوئی کہ راز اُن کے ساتھ آگرہ نہیں جا رہا تھا۔

(۸)

پروفیسر صاحب کی کار آگرہ روڈ پر ایک کے بعد ایک میل کے پتھر پار کرتی ہوئی بھاگی چلی جا رہی تھی۔ پروفیسر صاحب موٹر چلانے میں بہت ہوشیار تھے اور حالانکہ شوفر اُن کے ساتھ رہتا تھا، پھر بھی وہ گاڑی ہمیشہ خود ہی چلاتے تھے۔ امریکہ سے یہ ماڈل ابھی نیا ہی آیا تھا اور اُس کے اسپرنگ بہت اچھے تھے لیکن اُس پرانی سڑک میں بے شمار گڈّھے تھے اور تھوڑی دیر بعد کار آلوؤں کی بوری کی طرح اُچھل پڑتی تھی۔ پیچھے کی سیٹ پر بیٹھے ہوئے انور اور سلمیٰ ہر تکلیف میں ایک نیا ایڈونچر محسوس کرتے تھے اور جب گاڑی کسی بڑے گڈّھے میں پھنس کر زور سے اُچھلتی اور اُن کے سر اُوپر لوہے کی چھت سے جا ٹکراتے تو دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑتے۔ لیکن کبھی کبھی جب پروفیسر صاحب اپنا کمال دکھانے کے لئے پوری رفتار پر گاڑی موڑتے، یا کسی بیل گاڑی سے بچنے کے لئے بریک لگاتے تو پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے انور اور سلمیٰ ایک دوسرے سے ٹکرا جاتے۔ جب بھی ایسا ہوتا تو سلمیٰ شرما کر ہنس پڑتی اور انور کے بدن میں بجلی کی ایک لہر سی دوڑ جاتی۔ اُسے آہستہ آہستہ یہ پتہ چلتا جا رہا تھا کہ خوبصورت لڑکی کے ساتھ رہنے میں جو سکھ ملتا ہے وہ صرف رُوحانی سُکھ ہی نہیں ہوتا۔
کیا مارکس اور فرائیڈ کے اصولوں کو ماننے والا انیچا توسکی ٹھیک کہتا تھا؟
راستے میں کار پنکچر ہو گئی۔ آگرہ روڈ پر یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ پروفیسر صاحب نے تجویز کیا کہ جتنی دیر میں ڈرائیور گاڑی کا پہیہ بدلتا ہے اُتنی دیر میں وہ لوگ پاس

کے گاؤں میں چل کر دیکھ لیں شاید کھانے کے لئے ٹماٹر یا کچھ دوسری سبزیاں مِل جائیں۔ ہنستے اور آپس میں مذاق کرتے ہوئے وہ بچھے ہوئے کھیتوں کو پار کر کے دُور دکھائی دیتی ہوئی جھونپڑیوں کی طرف چل پڑے۔

بچپن میں جب انور اپنے تایا ابّا کے یہاں جاتا تھا تو اُس نے گڑگاؤں کے پاس کچھ گاؤں دیکھے تھے۔ اُس نے علی گڈھ کے آس پاس بھی کچّی جھونپڑیاں دیکھی تھیں اور اُن کی غربت کو دیکھ کر اُس کا دِل رو اُٹھا تھا۔ لیکن اُس وقت اُنہوں نے جو گاؤں دیکھا اُس کی حالت تو بیان ہی نہیں کی جا سکتی تھی۔ اگر گلی میں دو چار کالے، دُبلے پتلے اور ننگ دھڑنگ بالکل ننگے لڑکے کھیل نہ رہے ہوتے تو ایسا لگتا کہ وہ گاؤں نہیں کسی ویران گاؤں کے کھنڈر ہیں۔

ایسا لگتا تھا کہ کنگالی اور اُداسی نے ہمیشہ کے لئے گاؤں میں اپنا گھر کر لیا ہے۔ ایک بھی جھونپڑی ایسی نہیں تھی جو ٹوٹی پھوٹی نہ رہی ہو۔ ایک بھی مرد یا عورت ایسی نہیں تھی جو چیتھڑے نہ پہنے ہو۔ ایک بھی بچّہ ایسا نہیں تھا جو تندرست ہو۔ اُنہوں نے کئی جگہ پوچھا پر اُنہیں کہیں اپنے مطلب کی سبزیاں نہیں ملیں۔ پروفیسر صاحب سوچنے لگے کہ یہ لوگ کیا اکال یا کسی بیماری کا شکار رہ چکے ہیں۔ اور اُن کی سماجی دلچسپی جاگ اُٹھی۔ اُنہوں نے ایک کسان سے پوچھا جس کی پسلیاں اُس کی تنی ہوئی کالی کھال میں سے جھانک رہی تھیں۔ اُس نے جواب دیا کہ فصل تو ہمیشہ جیسی ہی ہوئی تھی اور برسات میں ہمیشہ کی طرح ہیضہ سے اور سردیوں میں نمونیہ سے کچھ لوگوں کے مر جانے کے علاوہ گاؤں میں کوئی بیماری بھی نہیں پھیلی تھی۔ گاؤں میں اُنہوں نے جو بھیانک غریبی، تباہی اور موت جیسی اُداسی دیکھی وہ وہاں کی مستقل حالت تھی،

بالکل اسی طرح جیسے اُن کے سر پر سرمئی رنگ کا آسمان تھا یا اُن کے پیروں کے تلے گہرے مٹیالے رنگ کی سوکھی زمین۔ جب وہ واپس لوٹے تو دیکھا کہ اُن کی موٹر کو بھوکے بچّوں کے گروہ نے گھیر رکھا تھا۔ جو بھیک مانگ رہے تھے۔

انور کی ساری خوشی ختم ہو گئی اور جب وہ نہر کے کنارے دوپہر کا کھانا کھاتے کے لئے رُکے تو انور کو اُن شامی کبابوں اور پراٹھوں اور بھُنی ہوئی مُرغیوں میں کوئی مزا نہیں آیا جو سلمہ اپنے ساتھ بید کی ایک ٹوکری میں لائی تھی۔ جب موٹر سفر کی آخری منزل طے کر رہی تھی اُس وقت سلمہ نے اپنے ساتھی کے چہرے پر ایک اُداسی دیکھی لیکن وہ سمجھدار تھی اِس لئے اُس نے بیکار کے سوال پوچھ کر اُسے پریشان کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اُسے باتونی لڑکوں سے سخت چڑ تھی جو تمام وقت اپنا رُعب جمانے میں اتنا مصروف رہتے تھے کہ اُنہیں اپنے آپ کا ہوش نہیں رہتا تھا اور اُسے اُداس چہرہ بنائے اپنے پاس بیٹھا ہوا یہ لڑکا بہت اچھّا لگ رہا تھا وہ جانتی تھی کہ وہ اپنی ایک مُسکراہٹ سے اُس کی ساری اُداسی دُور کر سکتی ہے۔

(۹)

محراب دار پھاٹک میں سے تاج محل کو پہلی بار دیکھتے ہی انور تو خوشی کے مارے ہکّا بکّا رہ گیا۔ اُس کے لئے یہ یقین کرنا مشکل تھا کہ کوئی چیز اتنی خوبصورت اور حسین بھی ہو سکتی ہے۔ انور کی آتما اُس سے باتیں کر رہی تھی۔ ایک آواز نے کہا "یہ تو محض پتھر ہے، سلمہ کو دیکھو جیتا جاگتا تاج محل ہے"۔ ایک دوسری آواز نے کہا۔ "دو مُردہ لوگوں کے لئے اتنی بڑی اور شاندار عمارت جب کہ لاکھوں کروڑوں کسان اُن جھونپڑیوں میں رہتے ہیں جو تم ابھی آگرہ روڈ پر دیکھ آئے ہو۔"

رات کو وہ چاندنی میں تاج محل دیکھنے پھر آئے۔ اب انور کی اداسی اور ناامیدی دور ہو چکی تھی اور اس کی روح نے اس نظارے کی جادو بھری خوبصورتی کے آگے ہتھیار ڈال دیئے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے پیار کی یہ لازوال یادگار چاند کی کرنوں میں نہائی کھڑی تھی۔ یہ سچ ہے کہ ایک بادشاہ نے اپنی بیگم کی یاد کو امر کرنے کے لئے ہی اس کی تعمیر کرائی تھی لیکن جس جذبے سے متاثر ہو کر اس نے اس کی تعمیر کرائی تھی، وہ جذبہ عالمگیر تھا۔ وہ سیاست اور معاشیات کی حدوں سے پرے تھا، وہ وقت کی حدوں سے بھی آگے تھا اور امر! کئی صدیوں تک ہر ملک اور قوم کے عاشق۔ غریب اور امیر، رئیسوں کی بیٹیاں اور کسانوں کی لڑکیاں ۔۔ یہاں آ کر انسانی فن کے اس معجزے کو دیکھیں گی اور سراہیں گی۔ انہیں یہ یادگار ایسی لگے گی جیسے ان کے اپنے خوابوں کو پتھروں میں منجمد کر دیا گیا ہو، ان کے جذبات کو صاف ستھرے سنگِ مرمر کے مجسّمے کی شکل میں ڈھال دیا گیا ہو، ان کی آہوں اور آنسوؤں کو ایک جگمگاتے ہوئے بے داغ ہیرے کی شکل دے دی ہو۔ وہ یہاں سے واپس لوٹیں گے تو ان کے دل پر سے ایک بوجھ اتر چکا ہو گا اور ان کا عقیدہ پہلے سے زیادہ مضبوط ہو گا کیونکہ وہ پیار کی مسلسل بہنے والی دھارا کا امرت پی چکے ہوں گے اور خود اپنے آنسو اس دھارا میں ملا چکے ہوں گے۔ اپنے شعور کی کسی دھندلی سی تہہ سے اُسے پروفیسر سلیم کی آواز آتی سنائی دی "انور تم بی۔ اے پاس کرنے کے بعد کیا کرو گے؟"

"ابھی کچھ طے نہیں کیا ہے، پروفیسر صاحب"۔ انور نے ایک جھٹکے کے ساتھ اپنے تصوّرات کے تار کو توڑتے ہوئے جواب دیا۔ "ابّا تو چاہتے ہیں کہ میں تجارت کروں؛ لیکن مجھے اتنی زیادہ دلچسپی نہیں ہے اس میں۔"

"تم نے سول سروس کے مقابلے میں بیٹھنے کے بارے میں کبھی غور کیا ہے ؟"
انور نے سرکاری افسر بننے کی بات کبھی سوچی بھی نہیں تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ اُس نے کبھی سنجیدگی سے اِس سوال پر غور ہی نہیں کیا تھا کہ وہ آگے چل کر کیا کرنا چاہتا ہے۔ اُسے عام طور پر یہ خیال ضرور تھا کہ وہ سرکاری افسر شاہی کی مشین میں آسانی سے فٹ نہیں ہو سکے گا، پھر بھی اُس نے پروفیسر صاحب کے اِس سوال کے جواب میں صاف "نہیں" کہہ دینا بھی مناسب نہیں سمجھا کیونکہ اُنہوں نے یہ سوال ایک خیر خواہ کی حیثیت سے پوچھا تھا۔ وہ کوئی گول مول جواب دینے ہی جا رہا تھا کہ اتنے میں اُسے سلمہ کی آواز سُنائی دی "لیکن ابا بیٹھنا تو چاہیئے ہی۔ اور اُن کے کامیاب ہو جانے میں تو کوئی شک ہی نہیں ہے"۔

"ہاں، میرا بھی یہی خیال تھا۔ تم اگر چاہو تو میں اُس کے قاعدے قانون منگوا دوں۔ اور جو مضامین تم لو اُن میں سپیشل کوچنگ کا انتظام کروا دوں۔ اگر دو سال بعد بھی بیٹھنے کا ارادہ ہو تب بھی تیاریاں ابھی سے شروع کر دینی چاہئیں"۔

انور اِس کے علاوہ کر ہی کیا سکتا تھا کہ پروفیسر صاحب کا شکریہ ادا کرتا اور اُن سے یہ وعدہ کر لیتا کہ وہ اِس مسئلے پر سنجیدگی سے غور کرے گا۔ حالانکہ اُسے بالکل یقین نہیں تھا کہ وہ اتنے سخت مقابلے میں کامیاب ہو سکے گا۔

"نان سنس"۔ پروفیسر صاحب نے اُس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے کہا "اگر دوسرے لوگ کامیاب ہو سکتے ہیں تو تم بھی کامیاب ہو سکتے ہو۔ بلکہ دوسروں سے زیادہ آسانی سے کامیاب ہو سکتے ہو"۔

اور پھر موٹر میں سے کمبل نکالنے کے بہانے سلیم صاحب انور اور سلمہ کو اکیلا

چھوڑ کر وہاں سے کھسک گئے۔ دونوں سنگِ مرمر کی ایک بنچ پر بیٹھے ایک چوکور تالاب میں ہرے ہرے پانی کی گہرائی میں ایک دُوسرے تاج محل کا جھلملاتا ہوا عکس دیکھ رہے تھے۔ دونوں طرف صنوبر کے پیڑوں کے سیاہ سائے خاموش کھڑے سرد رات میں کانپ رہے تھے۔ وہ دونوں اکیلے تھے پھر بھی انور کو سلمہ کو دیکھنے کی ہمّت نہیں ہو رہی تھی۔ وہ سٹپٹایا ہوا بیٹھا تھا۔ اُس کی زبان پر جیسے کسی نے تالا لگا دیا تھا اور وہ سمجھ رہا تھا کہ کسی طرح پروفیسر صاحب لوٹ آئیں۔ اتنے میں بادل کا ایک ٹکڑا چاند پر سے گذرا اور تاج نے موتی کی طرح چمکتی ہوئی دُھندلے رنگ کی چادر اوڑھ لی جس میں اُس کا رُوپ اور نکھر آیا۔ اس دُھندلی روشنی میں انور نے ہمّت کر کے اپنا سر اُٹھایا اور سلمہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ سلمہ کی آنکھیں تو جیسے اُس کا انتظار ہی کر رہی تھیں۔ بس ایک نظر! لیکن اُس ایک ہی نظر نے کیا کچھ نہیں کہہ دیا۔ اُس ایک لمحے میں انور کے سارے شک، سارے ڈر، ساری غلط فہمیاں دُور ہو گئیں چاندنی میں تاج کی خوبصورتی اب اُس کے لئے کوئی باہر کی چیز نہیں رہ گئی تھی۔ یہی خوبصورتی اُس کے دل میں بھی اپنی چاندنی بکھیر رہی تھی۔ اُس نے جو بہت بڑی دریافت اس لمحے میں کی تھی اُس کے لئے یہی موزوں ماحول تھا۔ اُسے پتہ چل گیا کہ وہ سلمہ سے محبّت کرتا ہے۔ وہ یہ بھی جان گیا کہ وہ بھی اُس سے پیار کرتی ہے اور اُسے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ محبّت کیا ہوتی ہے درد کی دوا بھی اور دردِ بے دوا بھی۔

"سلمہ!" اُس نے دبی زبان میں کہا۔

"انور!" سلمہ نے بھی اُسی طرح دبی زبان میں جواب دیا۔

جب پروفیسر صاحب کمبل لے کر لوٹے اُس وقت تک اُن دونوں نے اِس

کے علاوہ ایک لفظ بھی نہ کہا تھا۔ پھر بھی ساری دنیا بدل گئی تھی۔

(۱۰)

اُن کی موٹر علی گڑھ کی طرف سرپٹ بھاگی جا رہی تھی۔ موٹر کی بتّی کی روشنی دو متوازی لکیروں میں دُور تک جا کر آگے اندھیرے میں کھو جاتی تھی۔ انور کو دوسرے دن گھر جانا تھا اور پروفیسر صاحب کو اکیڈمک کونسل کی میٹنگ میں شریک ہونا تھا، اس لئے اُن لوگوں نے سخت سردی کی پروا نہ کرتے ہوئے اُسی رات لوٹ جانے کا فیصلہ کیا تھا۔

سرد ہوا تیر کی طرح چبھ رہی تھی اور اُنہیں اوورکوٹ اور مفلر کس کر لپیٹ لینے پڑے۔ پروفیسر صاحب فیلٹ ہیٹ اپنی آنکھوں پر جھکائے اوورکوٹ کا کالر کھڑا کئے اور ہاتھوں میں فر کے استر والے دستانے پہنے موٹر چلا رہے تھے۔ ان کے مُنہ میں لگی ہوئی سگریٹ سے موٹر کے اندر دھیمی دھیمی روشنی ہو رہی تھی۔

پیچھے کی سیٹ پر سلمہ اور انور گھٹنوں پر کمبل ڈالے ایک دوسرے سے لگے بیٹھے تھے۔ انور کے ہاتھوں نے سلمہ کے نرم ٹھنڈے ہاتھوں کو ڈھونڈ لیا اور ملائمت کی لہریں اُن دونوں ہاتھوں کے بیچ بہنے لگیں۔ تھوڑی دیر بعد انور کے گالوں کو سلمہ کی ریشمی لٹوں نے چھُو لیا اور ایک بھینی بھینی مدہوش کرنے والی خوشبو اُس کے نتھنوں میں بس گئی۔ سلمہ نے اونگھ کر اُس کے کندھے کا سہارا لے لیا تھا۔

باہر اندھیرا اور سردی تھی۔ پیڑوں کی چوٹیوں کے درمیان چیختی ہوئی ٹھنڈی ہوا بہہ رہی تھی؛ باہر دُور تک جُتے ہوئے کھیت پھیلے ہوئے تھے؛ باہر اُن کسانوں کے گاؤں تھے جن میں وہ غریبی اور کنگالی اور گندگی کے درمیان اپنی زندگی بسر

کرتے تھے، بالکل ویسے ہی گاؤں جیسے انور نے اُسی دن دیکھا تھا۔ باہر ظُلم تھا اور ستم تھا اور کروڑوں بے زبان افراد آزاد ہونے کے منتظر تھے۔ باہر جنگلی جانوروں کا خطرہ تھا اور طوفان چیخ دے رہا تھا۔ اندر کا ماحول گرم اور آرام دہ تھا۔ بند موٹر میں ایک گدّے دار سیٹ پر بیٹھا ہوا اور کندھوں سے لگا ہوا کوئی نرم خوشبودار جسم اور دھیرے دھیرے سُلا دینے والی ایک مست خوشبو.....

۱۳

سنہری ناگن

(۱)

انور کے ابّا نے اتنا زور دیا کہ انور کو مجبور ہو کر اپنے نانا ابّا کے یہاں سلام پور جا کر رہنا پڑا۔ امجد علی کے یہاں جا کر رہنے کا مطلب تھا کہ جیسے کسی راجہ کے یہاں مہمان گئے ہوں۔ رہنے کو عالیشان مکان اور ہر وقت خدمت کرنے کے لئے نوکروں کی ایک پوری فوج... یہ سچ مچ شاہی ٹھاٹ باٹ تھا۔ انور کا دل اِن سب باتوں کو پسند نہیں کرتا تھا لیکن وہ پوری طرح اس سے نفرت بھی نہیں کر پاتا تھا۔

لیکن اس بار وہاں رہ کر اُس نے بہت مزے لُوٹے۔ وہ رُؤف کے ساتھ شکار کھیلنے گیا اور اُسے بے حد مزا آیا۔

اور پھر بلقیس کی بھی توکشش تھی۔ اب وہ چھوٹی سی شرارت کی پوٹلی نہیں رہ گئی تھی جس کے گالوں پر سیب جیسی لالی ہوا کرتی تھی۔ اور نہ وہ کس کر بندھی ہوئی

چوٹی رہ گئی تھی جو بچپن میں کھیتوں میں بھاگتے وقت اُوپر نیچے پھُدکتی تھی۔ انور نے دیکھا کہ اب وہ ایک بے حد خوبصورت نوجوان لڑکی ہو گئی ہے اور یہ محسوس کر کے وہ نہ جانے کیوں اُس کے سامنے کچھ سٹپٹایا سا رہتا تھا۔ انور دِل ہی دِل میں ہمیشہ اپنے آپ کو دُھتکارتا رہتا تھا کہ وہ اپنی اِس نوجوان تایا زاد بہن کی جوانی کو دیکھ کر آخر کھسیا کیوں جاتا تھا۔ ہر بار اُس کی آنکھیں جا کر اُس کے سڈول چہرے پر یا اُس کی ٹھوڑی کے گڈّھے پر جا کر ٹِک جاتی تھی۔۔۔ اور وہ نہ جانے کیوں اُس کے ہونے والے شوہر سے دِل ہی دِل میں جلنے لگتا تھا۔

ایک دن انور جب امجد علی کی کوٹھی پر لوٹا تو وہ تھک کر بالکل چُور ہو چکا تھا۔ پہنچتے ہی اُسے پتہ چلا کہ اُس کے دو خط آئے ہوئے ہیں۔ اُس نے پہلے وہ جانا پہچانا نیلا لفافہ کھولا۔ سلمہ کا بے حد پیارا الھیا سا خط تھا۔ اُس نے لکھا تھا کہ اُس کے دن کتنے بے رنگ گذر رہے ہیں اور جاڑے کی بھیانک لمبی شامیں کاٹنا اُس کے لئے کتنا مشکل ہو گیا تھا۔ اُس نے لکھا تھا کہ اُسے انور کی بے حد یاد آتی ہے اور اُس نے پُوچھا تھا کہ وہ علی گڈھ کب تک لوٹ کر آئے گا۔ "مجھے پہلے کبھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ تمہارا ساتھ میرے لئے کتنا ضروری ہو گیا ہے۔ تمہارے بِنا زندگی بہت سُونی ہے انور"۔ اور یہ پڑھ کر اُس کا دل سلمہ کے لئے تڑپ اُٹھا اور پیار، نرمی اور ممنونیت کے آنسو اُس کی آنکھوں میں چھلک آئے۔

سلمہ کا خط پھر لفافے میں رکھ کر اُس نے اپنے پلنگ پر گدّے کے نیچے رکھ دیا کہ سونے سے پہلے وہ اُسے ایک بار پھر فرصت سے پڑھے گا۔ پھر اُس نے دوسرا لفافہ اُٹھایا۔ وہ خط علی گڈھ سے ہوتا ہوا یہاں پہنچا تھا اور اُس پر پتہ ٹائپ کیا ہوا تھا اِس لئے وہ اندازہ نہیں لگا سکا کہ وہ کس کا خط ہو سکتا تھا۔ خط کھولا تو اُسے یہ دیکھ کر

بہت تعجب ہوا کہ اُس پر کسی کا نام بھی نہیں تھا نہ کوئی دستخط ہی تھے۔ لیکن خط پڑھنا شروع کرتے ہی اُسے کوئی شک نہیں رہ گیا کہ وہ خط کس نے لکھا تھا۔ لیکن اُس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر رتن نے اُسے اتنے گول مول طریقے سے خط کیوں لکھا ہے۔

لکھنے والے نے اِس بات کا خیال رکھتے ہوئے کہ کاغذ پر انور کا نام بھی نہ لکھا جائے خط اِس طرح شروع کیا تھا "میرے پیارے دوست۔ تمہارے لئے مجھے پہچاننا مشکل نہیں ہوگا۔ میں سنہرے گنبد والے شہر والا تمہارا دوست ہوں" ظاہر تھا کہ یہ امرتسر کا ذکر تھا۔ "میں تمہارا وہی ساتھی ہوں جس کے ساتھ بچپن میں ایک دن شام کو تم اُس باغ میں گئے تھے جہاں خون کے رنگ کے لال گلاب کھلے تھے" یہ تو جلیان والا باغ کا ہی ذکر ہو سکتا تھا۔ لیکن اس کے بعد کا مضمون گول مول ہوتا گیا۔ "جیسا کہ تم نے اخبارون میں پڑھا ہوگا ہم نے اس باغ کو پھر سے سجانا شروع کیا ہے خون کے رنگ کے یہ گلاب ایک ایک کر کے اُکھاڑ کر پھینک دیئے جائیں گے اور ایک دن وہ آئے گا جب اس میں صرف امن کے سفید گلاب کھلیں گے۔ یہ آسان کام نہیں ہے۔ زمین پتھریلی ہے اور کانٹے دار جھاڑیوں سے بھری ہوئی ہے۔ لیکن ہم نے پہلا کُدال مار دیا ہے اور ہمارے راستے میں کتنی ہی دشواریاں کیوں نہ ہوں پر ہمیں اِسی طرح کُدال چلاتے رہنا پڑے گا۔ اِس سلسلے میں مجھے کسی بھی دن تمہاری ضرورت پڑ سکتی ہے اور میں اُمید کرتا ہوں کہ تم میری مدد کرنے سے انکار نہیں کرو گے۔ تم کئی بار دعوت دے چکے ہو کہ میں آکر تمہارے ساتھ ٹھہروں۔ میں تمہاری اِس دعوت کا فائدہ اُٹھانے والا ہوں۔ لیکن پہلے میں یہ معلوم کر لینا چاہتا ہوں کہ کیا اب بھی تم مجھے اپنے یہاں بلا کر ٹھہرانے کے لئے تیار ہو۔ اس لئے مجھے اس پتے پر جواب ضرور بھیج دینا ہر سکھ لٹے معرفت پوسٹ

ماسٹر، جنرل پوسٹ آفس، لاہور۔ خط پر اپنا نام نہ لکھنا صرف یہ لکھ دینا۔۔۔ تمہیں بہت یاد کرنے والا دوست۔"

لاکھ کوشش کرنے پر بھی انور اِس پُراسرار خط کا پُورا مطلب نہیں سمجھ سکا۔ اتنا تو صاف تھا کہ رتن یہ جاننا چاہتا تھا کہ کیا وہ آ کر اُس کے ساتھ ٹھہر سکتا ہے۔ لیکن پھر یہ جاسوسی ناول جیسا راز کیوں پیدا کیا تھا اُس نے؟ کیا وہ کسی مصیبت میں پھنس گیا ہے؟ لیکن کیسی مُصیبت؟ کیا پولیس سے کچھ گڑبڑ ہے؟ یکایک اُس کے دماغ میں ایک چنگاری سی جل اُٹھی۔ وہ بھاگ کر اپنے تایا ابا کے کمرے میں گیا اور وہاں سے اخباروں کا ایک بنڈل اُٹھا لایا۔ اخبار روز وہاں ڈاک سے آتے تھے پر گھر میں انہیں کوئی نہیں پڑھتا تھا۔ انور جب سے یہاں آیا تھا تب سے اُس نے بھی کوئی اخبار نہیں دیکھا تھا۔ اُس نے جلدی جلدی خبروں کی سُرخیاں پڑھیں۔ اچانک ایک اخبار پر نظر پڑتے ہی اُس کا ماتھا ٹھنک گیا۔ اخبار کے پہلے ہی صفحے پر یہاں سے وہاں تک موٹے موٹے حرفوں میں کئی سُرخیاں لگی تھیں:

لاہور میں دہشت پسندوں نے انگریز انسپکٹر کا خون کر دیا۔

دن دہاڑے پولیس تھانے کے سامنے گولی چلائی۔

سی آئی ڈی انقلابی طلبا کی تلاش میں

سارے پنجاب میں تلاشیاں اور گرفتاریاں

اِس خبر کا رتن کے ساتھ اِس وجہ سے تعلق نہیں تھا کہ اُس نے اپنے خط میں ایسی کوئی بات لکھی تھی، بلکہ انور کے دماغ پر بچپن کا ایک واقعہ ہمیشہ کے لئے نقش ہو گیا تھا اور اُس وقت وہی تصویر اُبھر کر اُس کے سامنے آ گئی تھی۔ جلیانوالہ باغ

کے خوفناک حادثوں کی خوفناک تصویر اور اُس کے اوپر نقش ہوا رتن کا بچپن کا چہرہ جس پر اپنے باپ کے بے رحم خون پر نہ کوئی دُکھ تھا نہ رنج بلکہ اُس کی نظریں کھوئی کھوئی تھیں۔ اُس کی آنکھوں میں انتقام کی ٹھنڈی آگ دہک رہی تھی۔

تو رتن، اُس کا بچپن کا دوست جس کے مُلائم بالوں کی لٹیں اُس کی پیلی پگڑی کے باہر نکلی رہتی تھیں وہ آج دہشت پسند ہو گیا ہے وہ آج بم اور ریوالور کے راستے پر چل رہا ہے۔ اُس کے لئے اس مست شرارتی لڑکے کا تصوّر ایک قاتل کی شکل میں کرنا مشکل تھا۔ پھر بھی جلیانوالہ باغ کے اُس دن والے حادثے کے بعد سے انور کو خیال تھا بلکہ اُسے ڈر تھا کہ اسی طرح کی کوئی بات ہونے والی ہے۔ اب جب کہ اُسے اِس بات کا پتہ چل گیا تھا وہ یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس پر اُسے افسوس تھا یا خوشی تھی۔ انور کی حسّاس اور بنیادی طور پر عدم تشدّد والی فطرت سیاسی خون خرابے کے بالکل خلاف تھی۔ سینڈرس کا خون کر کے ــــ سینڈرس اُس نوجوان انگریز کا نام تھا جو لاہور میں مارا گیا تھا ــــ رتن کے باپ کی موت کا بدلہ کیسے لیا جا سکتا تھا؟ لیکن اِس طرح کے تشدّد بھرے کاموں سے اُسے اخلاقی طور پر جتنی نفرت تھی اُس سے کہیں زیادہ اُسے اپنے دوست کو بچانے کی فکر تھی۔ اگر رتن اِن دہشت پسند کاموں میں بہت آگے بڑھ کر حصّہ لینے لگا ہے تو سمجھنا چاہیئے کہ وہ کسی بھی دن اپنی جان سے ہاتھ دھو سکتا ہے۔ انور نے اپنے تصوّر میں اُسے دیکھا کہ اُس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پڑی ہیں، وہ جیل خانے میں سلاخوں کے پیچھے کھڑا ہے، وہ پھانسی کے تختے پر چڑھ رہا ہے، وہ پھانسی کے پھندے میں جھول رہا ہے! وہ ڈر کے مارے کانپ اُٹھا اور وہ جانتا تھا کہ وہ رتن کے خیالات سے کتنا ہی اتّفاق کیوں نہ کرتا ہو

پر اگر کسی دن وہ اُس کے یہاں پناہ لینے آیا تو وہ اُسے رکھنے سے انکار نہیں کر سکے گا۔

اُس رات انور دوبارہ فرصت سے پڑھنے کے لئے تکیے کے نیچے سے سلمہ کا خط نکالنا بھی بھول گیا۔ اُس کی بجائے اُس نے رتن کا خفیہ خط دوبارہ پڑھا اور فرضی "مسٹر ہر سکھ رائے" کو خط لکھ کر یہ یقین دلایا کہ وہ کسی بھی وقت آ سکتے ہیں اور یہ بھی لکھ دیا کہ وہ بڑی بے چینی سے اُن کا انتظار کرے گا۔

(۳)

سلام پور کی راجدھانی میں اور پوری ریاست میں نئے سال کے میلے کی تیاریاں بڑی دھوم دھام سے ہو رہی تھیں۔ ہر سال جاڑے میں اِس میلے کی بہار رہتی تھی۔ یہی ایک ایسا موسم تھا جو نواب صاحب اپنی ریاست میں بتاتے تھے ورنہ گرمیاں یا تو پیرس کے رنگین شہر میں یا پھر مسوری کے پہاڑوں پر گذرتی تھیں۔ اِس سال میلے کے ساتھ ہی ولی عہد صاحب بہادر کے بالغ ہونے کا بھی جشن منایا جا رہا تھا اور اس لئے ہر چیز کا انتظام ہمیشہ سے زیادہ بڑے پیمانے پر کیا گیا تھا۔

پچھلے پندرہ دن سے ریاست کا پورا عملہ اوپر سے لیکر نیچے تک اِس میلے کا انتظام کرنے میں جٹا ہوا تھا۔ سارے وزیر جن میں انور کے تایا امجد علی بھی تھے، خیمے لگوانے میں مصروف تھے جن میں بہت بڑا کارنیوال لگنے والا تھا۔ ظاہر ہے نواب زادہ صاحب کے لئے جو اپنے بالغ ہوتے پر پھولے نہیں سما رہے تھے بے حد خوشی کا موقع تھا اور کیونکہ اُنہیں علی گڑھ سے آیا ہوا یہ کتابی کیریکٹر کا بہت پسند آ گیا تھا اس لئے وہ ہر جگہ اُسے اپنے ساتھ لے جاتے تھے ــــ دربار میں، فوجی پریڈ میں جہاں کچھ سو سپاہیوں نے جن کی ڈھیلی ڈھالی وردیاں کسی نیلام سے خریدی گئی معلوم

ہوتی تھیں، بہت ہی بھونڈے طریقے سے انہیں سلامی دی تھی، سینما اور سرکس میں، جو نواب صاحب اور اُن کے مہمانوں کا دل بہلانے کے لئے خاص طور پر "کلکتے" سے منگوائے گئے تھے، انور کو شروع شروع میں تو کچھ مزا آیا کیونکہ وہ ہر چیز کو بڑے تعجب اور انہماک سے دیکھتا تھا لیکن یہ فضول خرچی اور ٹرک بھڑک اُس کے لئے ایک نیا تجربہ تھا اور کچھ ہی دن بعد وہ چھوٹے موٹے انگریز افسروں، نواب صاحب کے مصاحبوں، ولی عہد صاحب کے خوشامدیوں اور اُن کی ہر وقت کی چاپلوسی کی باتوں سے اُکتا گیا۔

"انور، میں تمہیں نشانہ لگانا سکھاؤں گا۔" نوجوان نواب زادہ کہتا اور ساتھ ہی بغیر کسی جھجک یا شرم کے یہ بھی کہتا کہ "جانتے ہو اس پوری ریاست میں مجھ سے اچھا نشانہ کوئی نہیں لگا سکتا۔"

"چھوٹے سرکار، اِس میں کیا شک ہے" کوئی مصاحب اُن کی ہاں میں ہاں ملا کر کہتا۔

اتنے میں دوسرا بول اُٹھتا "ایک دن میں نے خود چھوٹے سرکار کو ایک میل سے زیادہ کے فاصلے سے ایک فاختہ کو نشانہ بناتے دیکھا تھا۔"

اور یہ سُن کر تیسرا مصاحب، جو سب سے بلند تخیّل تھا، سر ہلا کر کہتا "مجھے بھی اچھی طرح یاد ہے، کیا نشانہ تھا! ہاتھ چوم لینے کو جی چاہتا تھا!" اور یہ کہہ کر وہ اپنی اُنگلیوں کے سِرے ہونٹوں پر رکھ کر زور کی ایک چٹخاری لیتا اور یہ بتاتا کہ وہ نشانہ کتنا اچھا تھا۔ "سُبحان اللہ! کیا نشانہ تھا! بجلی کی رفتار سے فاختہ اِس طرح جا رہی تھی" ــــ اس نے ہاتھ سے لہریہ بنا کر بتایا ــــ "اور گولی بھی اُس کا پیچھا کرتی ہوئی بالکل اسی طرح گئی"۔ اور پھر اُس نے ہاتھ سے بتایا کہ گولی کس طرح گئی تھی

یا پھر لڑکیوں کی باتیں ہوتیں۔ ویسی ہنسی مذاق کی باتیں نہیں جیسی کہ یونیورسٹی
کے لڑکے کرتے ہیں، بلکہ اُس قسم کی گندی اور بے ہودہ باتیں جیسی کہ عیّاش اور آوارہ لوگ
استعمال کرتے ہیں۔ چھوٹے سرکار کی عمر کو دیکھتے ہوئے اُنہیں ہر قسم کی جنسی زندگی کا ـــــ
اُس کے عام پہلو کا بھی اور غیر معمولی پہلو کا بھی ـــ بہت کافی تجربہ معلوم ہوتا تھا اور انور
جیسے اناڑی کے سامنے اپنے زیادہ غیر معمولی تجربوں کی تصویر کھینچنے میں اُنہیں بے حد مزا
آتا تھا۔ محل میں بے شمار خوبصورت اور جوان نوکرانیاں تھیں اور چھوٹے سرکار کی ایک
تفریح یہ بھی تھی کہ وہ کسی چھوکری کو بُلا کر اپنے ساتھ لفٹ میں لے جاتے تھے اور لفٹ
بیچ میں روک کر وہ مزا لُوٹ کر کچھ ہی منٹ بعد لوٹ آتے تھے، اُن کے گالوں پر لالی
ہوتی تھی اور بٹنوں جیسی آنکھوں میں ہوس کی چمک۔ آکر وہ اپنے مصاحبوں کو سارا
قصّہ سُناتے تھے اور سب سُننے والے واہ واہ کرتے تھے۔ یہ والی ذرا شرمیلی تھی! وہ
کافی کھائی کھیلی تھی! کسی تیسری کو اپنے جسم کی قیمت میں موتیوں کا ہار چاہیئے تھا!
چوتھی کسی دن چھوٹے سرکار کے حرم میں لے لیئے جانے کے خواب دیکھ رہی تھی! اور
اسی طرح کے نہ جانے کتنے چرچے ہوتے تھے ـــ یہاں تک کہ انور جو بہت ہی
شرافت کے ماحول میں پلا تھا، یہ محسوس کرنے لگتا کہ اُس کا دَم گھُٹ جائے گا۔

انور کو بھی اس رنگین دنیا کا لُطف اُٹھانے کا موقع دینے کی کوشش کی گئی۔
ایک بار تو یہاں تک کیا گیا کہ اُسے ایک چیٹپٹی چھوکری کے ساتھ لفٹ میں بند بھی
کر دیا گیا۔ اُس چھوکری کو بھی اس ہنس مکھ لڑکے کے ساتھ کچھ کرتے میں کوئی اعتراض
نہیں تھا۔ وہ تو خیریت ہوئی کہ عین وقت پر بیگم صاحبہ آگئیں تو انور کی جان چھوٹی۔
بعد میں ایک دن جب اُس کے اس نواب دوست نے اُس سے چل کر اُن پچاس

کے قریب طوائفوں کا ــــ اُن 'دوسری عورتوں' کا ــــ معائنہ کرنے کو کہا جو اِس میلے کے موقع پر مہمانوں کا دل بہلانے کے لئے سارے مُلک سے بُلوائی گئی تھیں تو انور کے تو ہوش اُڑ گئے۔

(۳)

لوسی لاٹوش ایک کیبرے ڈانسر تھی جس نے فرانسیسیوں جیسا نام رکھ چھوڑا تھا اور وہ بولتی بھی تھی کچھ فرانسیسیوں کی طرح' لیکن یہ بات ہر آدمی کو معلوم تھی کہ وہ کبھی بمبئی سے آگے نہیں گئی ہے۔ نواب صاحب نے اُسے مسوری کے کسی نائٹ کلب میں دیکھا تھا اور دیکھتے ہی اُس پر لٹّو ہو گئے تھے۔ وہ اُس پر بہت پیسہ لُٹاتے تھے' اُسے بہت قیمتی تحفے دیتے تھے زیور اور کپڑے' عطر اور پھول ہر چیز یہاں تک کہ اُنھوں نے اپنی ایک بہت پسندیدہ موٹر بھی اُسے دیدی تھی۔ وہ ہلکے آسمانی رنگ کی ایک ڈیملر روڈسٹر موٹر تھی اور یہ رنگ لوسی کو بے حد پسند تھا۔ انور نے اُسے بس ایک بار میلے میں دیکھا تھا۔ وہ ایک جوہری کی دُکان پر کھڑی موتی کے کچھ زیور پسند کر رہی تھی' جن کی قیمت ظاہر ہے نواب صاحب کو دینی تھی۔ پوڈر اور سُرخی سے پُتا ہوا چہرہ' اُس کی صفاچٹ بھَوئیں اور اُس کے ہونٹوں پر لپ سٹک کی لال لکیر ــــ یہ سب چیزیں دوپہر کی بے رحم روشنی میں پھیکی اور چیپچپی لگ رہی تھیں۔ انور اُسے دیکھ کر تعجب کرتا رہا کہ آخر اُس میں ایسی کیا بات تھی کہ بوڑھے نواب صاحب جیسا عورتوں کا پُرانا شوقین آدمی بھی اُس کے پھندے میں آ گیا تھا؟

لیکن اُس رات جب انور نے اُسے دربار ہال میں کچھ چُنے ہوئے مہمانوں کے سامنے ناچتے دیکھا تو وہ سمجھ گیا کہ لوسی کیونکر لوگوں کو اپنے پھندے میں پھانس لیتی ہے۔

جب وہ اچھی طرح سج بن کر کپڑے پہن کر روپ کو نکھار دینے والی روشنی میں آتی تھی اُس وقت وہ کسی بھی دوسری عورت سے زیادہ دلکش معلوم ہوتی تھی۔ اُس میں یہ خوبی تھی کہ اُس کے سامنے جتنے بھی مرد موجود ہوتے تھے سب اپنے کو زیادہ مرد سمجھنے لگتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ مرد اُس پر لٹّو ہو جاتے تھے اور عورتیں اُس سے نفرت کرتی تھیں۔

کسا ہوا چمکدار لباس پہن کر اور سر پہ سانپ کے پھن جیسی ٹوپی لگا کر اُس نے سُنہری ناگن کا ناچ کیا یہ اُس کا سب سے مشہور ناچ تھا۔ اُس کا لمبا نازک جسم سپیرے کی مست کر دینے والی دُھن پر ناچتے وقت بالکل سانپ کی طرح لہرا اُٹھتا تھا۔ اُس کا لوچدار جسم، اُبھرا ہوا سینہ، پتلی کمر اور بھرے ہوئے گول گول کولھے بالکل پانی کی لہروں کی طرح ہلنے لگتے تھے۔۔۔ جیسے اُس کے بدن میں ہڈّیاں ہوں ہی نہیں، جیسے وہ سچ مچ ایک ناگن ہو، زہریلی ناگن جو کسی کو ڈس کر اُسے ہمیشہ کے واسطے سُلا دینے کے لئے پھن پھیلائے بیٹھی ہو۔

لیکن ناگن کا روپ وہ اِس لئے نہیں بھرتی تھی کہ اُسے یہ پسند تھا بلکہ اِس لئے کہ وہ اس کے ذریعے کچھ اور حاصل کرنا چاہتی تھی۔ اُسے آرٹ سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ وہ تو ناچ کر صرف دوسروں کا دل اپنے قابو میں کرنا چاہتی تھی۔ ناچ میں وہ بالکل ویسی ہی ناگن تھی جس نے حضرت آدم کو سیب کھانے کی ترغیب دی تھی۔

بین کی دُھن پر وہ لہرا لہرا کر، اِٹھلا اِٹھلا کر، مست ہو کر ناچ رہی تھی، جذبات کا اظہار کر رہی تھی۔ دیکھنے والوں پر جادو سا چھا گیا تھا۔ وہ رقاصہ نہیں تھی وہ ناگن نہیں تھی، وہ تو ایک چھلاوہ تھی، ایک لبھانے والی طاقت تھی۔ انور بھی محسوس کر رہا تھا

کہ اُس پر بھی اُس کا جادو اثر کرتا جا رہا ہے اور وہ بین کی دُھن میں بالکل مست ہو گیا تھا کہ اتنے میں کسی نے زور سے اُس کے کہنی ماری اور اُس کا دھیان ٹوٹ گیا۔ یہ چھوٹے سرکار کی حرکت تھی۔

"اے" اُس نے اپنے باپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انور کے کان میں گھسر پھسر کرتے ہوئے کہا" ذرا بڑے میاں کو دیکھو۔ ایسا لگتا ہے کہ دورہ پڑنے والا ہے۔ لیکن یہ بات نہیں ہے۔ وہ تو بس اپنے پرائیوٹ سونے کے کمرے میں اِس تماشے کے دوسرے حصّے کے لئے گرما رہے ہیں۔"

بُوڑھے نواب صاحب گنگا جمنی کام کی ایک بہت بڑی کرسی پر بیٹھے جھوم رہے تھے اور ناچ کی دُھن کے ساتھ تال دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ اُن کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں ہوس کی آگ دہک رہی تھی اور ایسا لگتا تھا کہ اُن کی آنکھیں ابھی باہر نکل پڑیں گی۔ لوسی جانتی تھی کہ اُس کے جادو کا کتنا اثر پڑ رہا ہے' اس لئے وہ بار بار نواب صاحب کے اور قریب جا کر ناچ رہی تھی اور اُن کی طرف دیکھ کر جادو بھری مسکراہٹیں بکھیر رہی تھیں۔

اچانک نواب صاحب اُٹھ کھڑے ہوئے اور اِس سے پہلے کہ کوئی اُن کا ادب کرنے کے لئے کھڑا ہو پاتا' وہ کمرے سے باہر چلے گئے۔ ناچ ایک دَم سے رُک گیا۔ حالانکہ کونے میں بیٹھے ہوئے بین والے کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ ماجرا کیا ہے' اِس لئے وہ بین بجاتا رہا۔ اُس بڑے سے ہال میں گونجتی ہوئی اُس کی بین کی آواز بہت بھیانک لگ رہی تھی کیونکہ اچانک وہاں بالکل خاموشی چھا چکی تھی۔ نواب صاحب کے خاص مصاحب نے گھبرا کر جلدی سے لوسی کے پاس جا کر اُس کے کان میں کچھ کہا اور اُسے لے کر

چلا گیا۔

انور ڈر رہا تھا کہ کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے اور یہ کہ اب نواب کا غصہ کسی نہ کسی پر اُترے گا لیکن چھوٹے سرکار نے اُسے یقین دلایا "کوئی بات نہیں ہے اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ اب بڑے میاں زیادہ دیر اپنے اوپر قابو نہیں رکھ سکتے۔۔۔۔"

"تمہارا مطلب ہے۔۔۔"

"ہاں ہاں، بالکل یہی!" چھوٹے سرکار نے آنکھ مار کر حامی بھری۔ "دراصل، معاملہ اِس سے بھی نازک ہے، بات یہ ہے کہ بڑے میاں اب خود تو کچھ کر نہیں سکتے ـــ بس اپنے سامنے کسی دوسرے سے کروا کر ہی مزا لیتے ہیں۔"

(۴)

اُس رات کو جشن کے آخر میں، جو دعوت ہونے والی تھی وہ آٹھ بجے کی بجائے دس بجے شروع ہوئی اور انور سوچنے لگا کہ اُس نے اتنا بہت سا کھانا اپنی عمر میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ یہ گننے سے کچھ حاصل نہیں تھا کہ کتنی طرح کے کھانے اور پکوان وہاں موجود تھے کیونکہ کھانے پینے کے شوقینوں کے لئے تو جنّت کا سامان تھا۔ انگریزی ڈھنگ کا کھانا بھی تھا، ریذیڈنٹ صاحب اور دوسرے انگریزی افسروں کے لئے ہندوستانی کھانا بھی تھا، آس پاس کے کچھ راجاؤں کے لئے جو گوشت نہیں کھاتے تھے اُن کے لئے ویجیٹیرین کھانا بھی تھا۔ کوئی آدھے درجن قسم کا سوپ تھا، کوئی ایک درجن قسم کا مرغ بنایا گیا تھا، کم سے کم چھ قسم کے پلاؤ تھے اور پڈنگ اور مٹھائیوں کا تو شمار ہی نہیں تھا۔ نواب صاحب ہر چیز چکھتے تھے اور ایک دو نوالے کھانے کے بعد اپنی پلیٹ میں بچا ہوا کھانا میز پہ بیٹھے ہوئے کسی دوسرے آدمی کے آگے بڑھا دیتے

تھے اور جس کی طرف بھی وہ اپنی جھوٹی پلیٹ بڑھاتے وہ اُسے اپنے لئے بڑی عزت کی بات سمجھتا۔ لیکن اِس بیٹو عیاش کی پلیٹ میں سے جھوٹا کھانے کے خیال سے ہی انور کو متلی ہو رہی تھی۔ جہاں تک شراب کا سوال تھا، انور کو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ شرابیں اتنی قسم کی ہوتی ہیں۔ وہسکی، برانڈی، شمپین اور جن کے نام اُس نے سُن رکھے تھے، اُن کے علاوہ وہاں ہر رنگ کی بے شمار شرابیں اور تھیں۔ پورٹ اور شیری اور ورموتھ اور ووڈکا اور برگنڈی، فرانسسی شرابیں، اسپینی شرابیں اور پرتگالی شرابیں اور کئی دوسری شرابیں جن کے نام بھی لینا آسان نہیں تھا اور پھر کاک ٹیل تیار کرنے کے چاندی کے برتنوں میں اِن شرابوں کو طرح طرح سے ملا کر کاک ٹیل تیار کی جا رہی تھی اور لگاتار جام بھر بھر کر لوگوں کو دیئے جا رہے تھے۔

کیونکہ دعوت بہت باقاعدہ ہو رہی تھی، اِس لئے لوسی ایک نیا ڈِنر گاؤن پہن کر آئی تھی جس کا گلا اتنا گہرا کٹا ہوا تھا کہ اُس کا گورا گورا سینہ آدھے سے زیادہ دکھائی دیتا تھا۔ موقع ایسا نہیں تھا کہ وہ نواب صاحب کی بغل میں بیٹھتی حالانکہ نواب صاحب تو یہی چاہتے تھے۔ اُسے چھوٹے سرکار اور انور کے بیچ میں بٹھایا گیا اور جیسے ہی اُسے معلوم ہوا کہ اُس کی بغل میں بیٹھا ہوا لڑکا شراب نہیں پی رہا ہے تو اُس نے اُسے سوم رس کا مزا لینا سکھانے کی ذمے داری اپنے اُوپر لے لی۔

"کم آن، لوسی۔" چھوٹے سرکار نے بڑی خوشامد سے کہا۔ "انور کو بھی پلا دُنا۔ سارا مزا اُس کی وجہ سے کرکرا ہو رہا ہے۔"

"تھونچ یو وری، پرنس۔" اُس نے اپنے نقلی فرانسیسی لہجے میں کہا۔ "پیئے گا کیوں نہیں، لیکن صرف اپنی پیاری لوسی کے ہاتھ سے پیئے گا۔ وُونچو، مائی سوئیٹ لٹل بوائے ؟"

انور کو یہ اچھا نہیں لگا کہ اُسے اِس طرح سب کے سامنے "سوبیت لٹل بوائے" کہا جائے۔ شرم کے مارے اُس کا مُنہ لال ہو گیا اور اُس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ "نہ۔ نہ۔ نو، تھینک یو، میں۔ میں۔ آپ جانتی ہیں۔ میں پیتا نہیں۔"

"کام، کام، سوئیٹی، تمہیں میرے ساتھ تو پینا ہی پڑے گا۔" اور یہ کہہ کر اُس نے انور کی ران پر ہاتھ رکھ کر جو دھیرے سے دبایا تو انور کے جسم میں ایک جھرجھری سی دوڑ گئی۔

انور نے دیکھا کہ اُس لمبی سی میز پر ایک سرے سے دوسرے سرے تک بیٹھے ہوئے سارے لوگ اُسی کو دیکھ رہے ہیں اور وہ بُری طرح شرما گیا۔ لوسی نے کسی سے 'نہیں' سُننا تو سیکھا ہی نہیں تھا اور اِسی لئے اُس نے کاک ٹیل کا گلاس اُٹھا کر اُس کے ہونٹوں سے لگا دیا اور اُسے پھُسلا پھُسلا کر، اُس کی خوشامد کر کے اور اُسے دھونس دے کر شراب پلانے لگی۔ انور یا تو شراب پی لیتا یا پھر بدتمیزی پر اُتر آتا اور گلاس لے کر توڑ دیتا جس کا مطلب تھا کہ ایک ہنگامہ کھڑا ہو جاتا اور وہ اِس چیز کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اِس لئے انور نے لوسی کے ہاتھ سے گلاس لے لیا اور ایک ہی گھونٹ میں سارا گلاس خالی کر دیا۔ اِس پر وہاں موجود سارے مہمانوں کو بہت مزا آیا اور کچھ لوگوں نے تو اُس کی تعریف کرنے کے لئے تالیاں بھی بجائیں۔

(۵)

انور کو ایسے لگا جیسے دوہری دھار والا تیز اُسترا اُس کے گلے کے نیچے دھیرے دھیرے اُتر رہا ہو۔ اُسے ایسا لگ رہا تھا کہ یا تو اُس کا دم گھُٹ جائے گا یا پھر وہ خون کی قے کر دے گا۔ پر اُن دونوں میں سے کوئی بھی بات نہیں ہوئی۔ اُس کا حلق بہت

جلد ہی اچھا ہو گیا اور جب یہ دوہری دھار والا اُسترا پیٹ میں اُتر گیا تو اُس کے بدن کے اندر ایک آگ جیسی لگ گئی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ابھی تھوڑی دیر میں اُس کی سانس کے ساتھ اگر لپٹیں نہیں تو دھواں ضرور نکلے گا، لیکن وہ بھی نہ ہوا۔ یہی تو دلچسپ بات تھی: دلچسپ! بے حد دلچسپ!!

انور ہنس رہا تھا لیکن کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیوں یا کس بات پر ہنس رہا ہے۔ وہ خود بھی نہیں جانتا تھا۔ وہ صرف اتنا جانتا تھا کہ ہر چیز بہت دلچسپ تھی

اُس کے سر کے اُوپر فانوس بہت خطرناک طریقے سے لٹک رہا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ روشنیوں سے جگمگاتا ہوا کوئی پیڑ اُلٹا لٹک رہا ہے۔ سوڈے کی سائفن کی شکل بھی عجیب لگ رہی تھی جس میں سے سوڈا اِس طرح نکلتا تھا جیسے گھوڑا دبانے پر پستول میں سے گولی نکلتی ہے۔ کاک ٹیل بنانے کے برتنوں کی شکل بھی کچھ عجیب تھی اور سفید وردیاں پہنے ہوئے خانساماں بھی عجیب لگ رہے تھے جو ایک خاص دُھن کے ساتھ سنگیت پیدا کرتے ہوئے مست ہو کر کاک ٹیل بنا رہے تھے، جیسے یہ بھی کوئی انوکھا مذہبی کام ہو۔

دلچسپ! بے حد دلچسپ!! انور کے چہرے پر بیوقوفوں جیسی ہنسی کھیلنے لگی۔ وہ کھیسیں نکالے سب کو دیکھ رہا تھا اور اُس کی اِس شکل نے ہر آدمی اور چیز کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ ہر آدمی کتنا مضحکہ خیز لگ رہا تھا۔ نواب صاحب کی چمکتی ہوئی گنجی چاند کے دونوں طرف دو سینگ نکلے ہوئے تھے اور ریذیڈنٹ کا لال لال چہرہ بالکل بندر کا پچھواڑہ لگ رہا تھا۔ وسی بھی جس کی گلابی اور سفید چھاتیاں کھلے گلے والے گاؤن میں سے آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں ــــــ لیکن وہ اُس گاؤن کے اندر بس اتنی ہی چھپی

تھیں کہ اندھا چور بھی پکڑ لے۔ انور نے اپنے اِس مذاق پر خود زور کا قہقہہ لگایا لیکن ظاہر ہے وہ کسی کے سامنے اُسے دوہرا نہیں سکتا تھا۔

وہ تو دوسروں کو یہ بھی نہیں بتائے گا کہ وہ کیسی کیسی دلچسپ چیزیں دیکھ رہا تھا۔ نواب صاحب کا سینگ دار چہرہ بکری کا سر بن گیا تھا اور ریذیڈنٹ صاحب ایک پیڑ کی چوٹی پر بیٹھے بلڈاگ کی طرح بھونک رہے تھے' حالانکہ اُن کی صورت اب بھی بندر جیسی لگ رہی تھی۔ موٹے راجہ صاحب کی پگڑی میں ایک منحوس صورت زندہ گِدھ اٹکا ہوا تھا پر اُنہیں اُس کی خبر نہیں تھی اور ظاہر ہے انور اُنہیں کیوں بتانے لگا؟

"اے چھوٹے نواب' یہ اپنے دوست کو بڑھا دو۔ اب لوسی نے اُسے شراب کیا پلادی ہے کہ وہ کسی دوسرے کی طرف دیکھتا ہی نہیں!" جب نواب صاحب کی بھُنے ہوئے مُرغ کی چھوٹی پلیٹ انور کی طرف بڑھائی گئی تو سب لوگ قہقہہ لگا کر ہنس پڑے لیکن انور کھانا ہی کب چاہتا تھا۔ "لو جلدی سے کھالو"۔ چھوٹے نواب نے اُس کے کان میں چپکے سے کہا "نہیں تو بڑے میاں ناراض ہو جائیں گے"۔ انور کو بڑے میاں کے ناراض ہو جانے کی کوئی پرواہ نہیں تھی لیکن اُس وقت اُس کا دل بڑا ہو گیا تھا اِس لئے اُس نے ایک بوٹی اُٹھا کر اپنے مُنہ میں رکھ لی۔

(۶)

انور کو بالکل یاد نہیں تھا کہ وہ کب اور کیسے ڈائننگ ہال سے اُٹھ کر چلا آیا۔ اُسے یہ بھی پتہ نہیں چلا کہ وہ کب لڑکھڑاتا ہوا محل کے اُس برآمدے میں جا پہنچا جہاں بہت کم روشنی ہو رہی تھی۔ اور اُسے یہ بھی پتہ نہیں چلا کہ لوسی نے اُسے وہاں کیسے ڈھونڈ نکالا۔ لیکن اُسے صرف یہ محسوس ہوا کہ دو پتلی پتلی لیکن طاقتور بانہوں نے اُسے

بڑے جذباتی انداز میں اپنے شکنجے میں جکڑ لیا تھا اور ایک چہرہ اُس کے چہرے پر جھکا ہوا تھا۔ اس چہرے کے چاروں طرف نقلی طور پر سنہرے کئے گئے بالوں کا بڑا سا گُچھا تھا۔ اُس کی گرم گرم سانس میں شیمپین اور ہوس کی بو بسی ہوئی تھی۔ اُس نے اپنے لال لال گیلے ہونٹ اُس کے ہونٹوں پر رکھ دیئے۔ لپ سٹک کا مزہ، بھوکے، جذباتی اور تجربہ کار ہونٹوں کا مزہ۔ اور پھر ایک پتلی سی سانپ جیسی زبان اُس کے منہ پر پھیرنے لگی۔ پھر اُس کے ہونٹوں میں سے ہوتی ہوئی اُس کے منہ میں چلی گئی، پھر باہر نکلی، پھر اندر چلی گئی۔ بس اسی کی وجہ سے سب کچھ ہوا۔ انور کو متلی ہونے لگی۔ اُس نے اپنے آپ کو لوسی کے چنگل سے چھڑا لیا اور بھاگ کر سیدھا لان پر پہنچا۔ وہاں وہ اپنا دُکھتا ہوا سر اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر بیٹھ گیا اور قے کرنے لگا۔

قے کرتے ہوئے اُسے ایسا محسوس ہوا کہ کوئی اُس کا پیٹ اینٹھ کر نچوڑے دے رہا ہے لیکن ہر اُلٹی کے بعد اُس کی طبیعت کچھ ہلکی اور بہتر ہو جاتی تھی۔ اُس کے دماغ کے دُھندلے پن میں نہ جانے یہ انوکھا خیال کہاں سے آیا کہ قے کے ساتھ وہ نہ صرف کھانا اور شراب، نواب صاحب کی جھوٹی پلیٹ کا مُرغ اور کڑوی کاک ٹیل، لوسی کی لپ سٹک کا وہ باسی میٹھا مزہ باہر اُگل رہا ہے بلکہ سلام پور آنے کے بعد سے اُس نے جو کچھ دیکھا اور سُنا تھا وہ سب کچھ نکالے دے رہا ہے، وہ ایک پورے نظام کو، ایک پورے زندگی کے ڈھرے کو، ایک پورے زمانے کو، جو سڑ چکا تھا اور زہریلا ہو چکا تھا، باہر نکالے دے رہا ہے۔

۱۴

پیار کا پھندا

(۱)

علی گڑھ واپس پہنچ کر انور بہت خوش ہوا۔ دوستوں کے ساتھ برآمدوں کے چکّر یا پھولوں کی کیاریوں کے بیچ دھوپ میں نہائے ہوئے لان پر ٹہلنا اور دنیا بھر کی باتوں کا چرچا کرنا۔ کچھ ایسا لگتا تھا کہ سب ہی پر سیاست کا بھوت سوار تھا اور ہر طرف سائمن کمیشن کا چرچا ہو رہا تھا جو اس بات کا پتہ لگانے کے لئے سارے ملک کا دورہ کر رہا تھا کہ ہندوستانی کس حد تک اپنی حکومت خود چلانے کے قابل ہیں اور ساتھ ہی ملک میں پھیلی ہوئی دہشت پسندی کی لہر کی بھی جانچ کر رہا تھا۔ بیچ بیچ میں اس طرح کی باتوں کا بھی چرچا رہتا تھا کہ ایک نیا اینگلو انڈین سٹیشن ماسٹر آیا ہے جس کی دو بہت قاتل جوان لڑکیاں ہیں جن کے درشن کرنے کے لئے سٹیشن جانا ضروری ہے یا یہ کہ اپنا احمق جائنٹ مجسٹریٹ چھٹیوں میں گھر گیا تھا اور وہاں سے بڑی پیاری

بیوی لایا ہے، اِس لئے یونین کی اگلی ڈِبیٹ میں اُسے بُلانا ضروری ہو گیا ہے۔ لیکن اتنے میں کوئی اخبار ہاتھ میں لئے بھاگا بھاگا آتا اور ہانپتے ہوئے کہتا: "ایک اور بم پھٹا اِس بار منمارڈ کے پاس" اور نوجوان لڑکیوں کا جرچا چھوڑ کر اہنسا، دہشت پسندی اور مزدوروں کی ہڑتالوں کی باتیں کرنے لگتے....

انور کو یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ اُس کا دوست راز بھی جسے یوں دنیا کی کسی بات میں دلچسپی نہیں تھی، اِس بیماری کا شکار ہو گیا تھا۔ وہ چھٹیوں میں لکھنؤ گیا تھا اور اُس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ سائمن کمیشن کے خلاف پُرامن مظاہرہ کرتے ہوئے اور "سائمن واپس جاؤ" کا نعرہ لگاتے ہوئے کانگریسی والنٹیروں پر کس بے رحمی سے انگریز پولیس افسروں نے اپنے گھوڑے دوڑا دیئے تھے۔ اُس نے بتایا کہ جو لوگ گھوڑوں کی ٹاپوں کے نیچے آنے سے بچ گئے تھے اور اپنی جگہ پر ڈٹے رہے تھے، اُن کی کھوپڑیاں لاٹھی سے کھول دی گئی تھیں۔ اِس حادثے کو بیان کرتے وقت شاعر کا چہرہ غصّے سے نیلگوں پڑ جاتا تھا اور اُس کا گلا رُندھ جاتا تھا اور وہ مشکل سے ہی بول پاتا تھا: "یہ — یہ حرامی — انہوں نے جواہر لال تک کو نہیں چھوڑا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے ایک ایک پولیس افسر کو اُن پر گھوڑا دوڑاتے ہوئے دیکھا اور کچھ ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ بھیڑ میں تھے کہ وہ اُنہیں پہچان نہ پایا ہو۔ وہ سڑک کے بیچ میں اکیلے کھڑے تھے اور چاروں طرف پولیس والے والنٹیروں پر لاٹھیاں برسا رہے تھے۔ وہ چاہتے تو ایک طرف کو ہٹ جاتے اور اپنے آپ کو بچا لیتے لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ وہ شیر کی طرح بہادری کے ساتھ وہیں ڈٹے رہے۔ ایک گھوڑ سوار پولیس والا اپنی لاٹھی گھماتا ہوا اُن کی طرف بڑھا اور بڑی بے رحمی سے دو لاٹھیاں اُن کی پیٹھ پر جڑ دیں،

مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوئے۔ یہ ہے اپنا جواہر! میں سچ کہتا ہوں کہ اگر ایک والنٹیئر نے آگے بڑھ کر تیسرا وار۔۔۔ جو جواہر کے سر کو نشانہ بنا کر کیا گیا تھا اپنے اوپر نہ روک لیا ہوتا تو ان ظالموں نے انہیں مار ہی ڈالا ہوتا۔"

ہمارا جواہر! علی گڑھ کی طرح ہی سارے ملک کے نوجوان جواہر لال کو بڑے پیار سے اپنا جواہر کہتے تھے۔ وہ ان کے اپنے تھے، اور وہ سب ان کے تھے۔ انور کو یاد تھا کہ اس نے انہیں ڈاکٹر انصاری کے بنگلے پر دیکھا تھا۔ اس وقت وہ اپنے باپ کے ساتھ تھے۔ موتی لال کے چہرے پر رونق تھی اور ان کے سفید بال چاندی کی طرح چمکتے تھے۔ ان کی رعب دار شخصیت کے سامنے اس وقت انور کو اس خوبصورت اور خاموش نوجوان کی شخصیت کچھ ماند پڑ گئی تھی پھر بھی انور کو ایک پل کے لئے ایسا لگا تھا کہ خوبصورت چہرے اور کھلاڑیوں جیسے پھرتیلے بدن میں بہت طاقت چھپی ہوئی ہے۔ انور کو افسوس ہو رہا تھا کہ اس وقت اس نے ان سے جان پہچان کیوں نہ پیدا کر لی کیونکہ اس کے بعد ہی وہ نوجوانوں کے دل و دماغ پر چھا گئے تھے۔ سارے ملک میں لاکھوں نوجوان انہیں "ہمارا جواہر" کہنے لگے تھے۔ راز کی باتیں سنتے وقت انور کو اس بات پر تعجب ہوتا تھا کہ اتنے بہت سارے لیڈروں میں جواہر لال کی طرف ہی نوجوان کیوں کھنچے آتے تھے۔ کیا اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ تمام لیڈروں میں سب سے کم عمر کے تھے؟ یا اس کی وجہ یہ تھی کہ کھادی کے کپڑے پہن کر بھی وہ اتنے خوبصورت اور اسمارٹ لگتے تھے؟ انور نے کبھی انہیں تقریر کرتے نہیں سنا تھا لیکن جن لوگوں نے سنا تھا وہ انہیں بہت اچھا مقرر نہیں سمجھتے تھے۔ اصل میں نوجوان نسل کے لوگ ان کے بولنے کے ڈھنگ کی وجہ سے نہیں بلکہ جو باتیں وہ کہتے تھے ان کی وجہ سے

انھیں اپنا سمجھتے تھے۔ پرانے لیڈر بہت سوچ سوچ کر اور رک رک کر اپنی بات کہتے تھے اور انہوں نے برسوں کی کوشش کے بعد یہ طریقہ اپنایا تھا۔ لیکن ان کے مقابلے میں جواہر لال میں نوجوانوں جیسی بے چینی تھی بلکہ ان میں نوجوانوں جیسا جوش تھا۔ ان کی حال ہی کی ایک تقریر کے ایک حصّے کا انور پر بہت گہرا اثر پڑا تھا۔ اس نے اس حصّے کو اخبار سے نقل کر کے رٹ لیا تھا۔ بنگال سٹوڈنٹ ایسوسی ایشن کے صدر کی حیثیت سے تقریر کرتے ہوئے جواہر لال نے کہا تھا "نوجوانوں کی تحریک ایک بہت بڑا انقلاب پیدا کرے گی، اور ہر چیز کو بدل دیگی، ہر چیز کو سُدھار دیگی۔ یہ بغاوت کا جوش ہے، ہر اس چیز کے خلاف بغاوت جو بری ہو۔ یہ ایسی لہر ہے جو انتظار نہیں کرتی، کسی کا انتظار نہیں کرتی۔"

راز کہہ رہا تھا "اپنا جواہر ہی ایک ایسا لیڈر ہے جس کی بات پوری طرح ہماری سمجھ میں آتی ہے اور جس کے پیچھے ہم چل سکتے ہیں۔" راز میں سچ مچ کی تبدیلی آئی تھی۔ پہلے وہ جاڑوں میں بھی ململ کے بیلدار کرتے پہنا کرتا تھا لیکن اب اس نے موٹے سے موٹا کھدر پہننا شروع کر دیا تھا۔ کئی مہینے سے اس نے ایک بھی غزل نہیں لکھی تھی۔ اب وہ صرف انقلابی اور سیاسی نظمیں لکھتا تھا۔ انور نے دیکھا کہ راز اب بائیں ہاتھ سے کوئی چیز نہیں اٹھا سکتا تھا اس ہاتھ سے وہ چائے دانی بھی نہیں اٹھا سکتا تھا۔ لاٹھی چارج میں اس کی کلائی کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی اور حالانکہ راز کبھی اس بات کو مانتا نہیں تھا لیکن انور کو شک تھا کہ جواہر لال پر لاٹھی کا وہ تیسرا وار اسی نے روکا تھا۔

(۲)

سچ مچ یونیورسٹی واپس آکر دوستوں کے ساتھ، ان دوستوں کے ساتھ جن کی رگوں کے خون میں بھی وہی بے چینی کی دھڑکن تھی۔ گرما گرم سیاسی بحثیں کرنے میں انور کو بہت

مزا آتا تھا۔ لیکن اِس سے بھی زیادہ خوشی کی بات تو اُس کے لئے یہ تھی کہ وہ ایک بار پھر سلمہ کے پاس آگیا تھا، جس کے بنا زندگی کی ہر چیز بیکار تھی۔ انور نے اُردو اور انگریزی کی نظمیں بہت پڑھی تھیں لیکن جیسا کہ ایک بار راگھو سے بحث کرتے ہوئے اُس نے بڑی حقارت سے کہا تھا کہ اُسے اِن "عاشق مزاج لوگوں کی بکواس" سے سخت نفرت ہے۔ سلمہ نے نظم کا سارا راز اُسے سمجھا دیا تھا۔ وہ خود دنیا کی ساری شاعری تھی۔ لیکن جلد ہی انور یہ بھی محسوس کرنے لگا کہ اُن کے بڑھتے ہوئے تعلقات میں وقت کا عنصر بہت خلل انداز ہوتا تھا۔

سینما ہال کے جانے پہچانے اندھیرے میں سلمہ کے پاس بیٹھنے میں اتنا لطف تھا۔ سردی کا موسم آدھا بیت چکا تھا۔ سلمہ نے اپنے بدن پر ایک اُونی شال کس کر لپیٹ رکھا تھا۔ بتیاں بجھ گئیں اور پردے پر اشتہار دکھلائے جانے لگے۔ انور کا ہاتھ چپکے سے سلمہ کے چھوٹے سے ملائم ہاتھ تک پہنچ گیا اور اس سردی میں ایک دوسرے کے جسم میں خوشگوار گرمی کی ایک لہر سی دوڑنے لگی جس نے اُن دونوں کے دلوں کو پیار کے ہار میں گوندھ دیا۔ اشتہاروں کے بعد نیوز ریل دکھائی گئی جس میں سلمہ کو بہت ہی کم دلچسپی تھی۔ انور سوچ رہا تھا کہ شاید اُس میں قومی اہمیت کے بھی کچھ واقعات دکھائے جائیں اور نیوز ریل میں اِس طرح کا ایک سین تھا بھی ــــ کلکتہ میں کانگریس کا چونتیسواں اجلاس۔ یہ دو مہینے پہلے کا واقعہ تھا، لیکن سچ مچ یہ ایک تاریخی واقعہ تھا اور انور کے لئے اور سینما گھر میں بیٹھے ہوئے ہزاروں تماشبینوں کے لئے وہ کسی بھی طرح سے پُرانا اور غیر دلچسپ واقعہ نہیں تھا۔ لوگ پردے پر چلتی ہوئی تصویروں کے نیچے چھپے ہوئے الفاظ کو بُدبُدا کر پڑھ رہے تھے۔ جب پردے پر عوام کے مقبول لیڈروں کی صورت دکھائی دیتی تو سارا ہال تالیوں سے گونج اُٹھتا ــــ یہ تھے پنڈت موتی لال اور یہ رہے مہاتما گاندھی سبھاش بوس

جیسے جوشیلے دانشور لیڈر کے جسم پر کانگریس کے والنٹیروں کے کمانڈر ان چیف کی وردی کچھ بے تکی لگ رہی تھی۔ اُس کے بعد انور کو ڈاکٹر انصاری کی جانی پہچانی صورت دکھائی دی اور آخر میں جواہر لال نہرو آئے . . . . اپنے ہیرو کی صورت دیکھتے ہی تماشبین ایک دم نہ صرف تالیاں بجانے لگے بلکہ چند نوجوان تو نعرے لگانے لگے اور انور بھی پورے جوش کے ساتھ تالیاں بجاتے لگا۔

اپنا بایاں ہاتھ سلمہ کے ملائم گدگدے ہاتھ میں سے نکالتے ہی انور کو ایسے لگا کہ سلمہ پر ایک عجیب ردِّ عمل ہوا جس کی وجہ اُس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ اچانک اُسے ایسا لگا کہ سلمہ اُس سے دُور ہو گئی ہے اور حالانکہ وہ اُس کے پاس سے ذرا بھی نہیں ہٹی تھی پھر بھی انور کو ایسا لگا کہ ابھی ایک لمحہ پہلے وہ جذبات کے جس بندھن میں بندھے ہوئے تھے وہ ٹوٹ گیا۔ بغل میں بیٹھی ہوئی سلمہ میلوں دُور معلوم ہونے لگی۔

نیوز ریل میں دکھائے گئے تاریخی واقعات کا سارا جوش ٹھنڈا پڑ گیا اور جب نیوز ریل ختم ہوئی اور پردے پر اصلی فلم کے اداکاروں اور ڈائرکٹر وغیرہ کے نام آنے لگے تو اُس نے اطمینان کا سانس لیا۔ اُس فلم میں سلوچنا اور بلموریا کام کر رہے تھے۔ سلمہ اِس جوڑی کی دیوانی تھی اور انور سمجھتا تھا کہ سلمہ کے اُس عجیب ردِّ عمل کی جو بھی وجہ رہی ہو پر اب سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

لیکن پردے پر پہلی بار سلوچنا کا پورا چہرہ دکھائی دیتے ہی سلمہ نے اُسکی طرف مُڑ کر کہا۔ "آؤ چلیں"۔ اس سے پہلے کہ انور کچھ کہہ پاتا، سلمہ اٹھ کر چل دی۔ وہ لوگوں کے پیروں میں اُلجھتی اُن کی جھنجھلائی ہوئی باتوں کی پرواہ کئے بنا باہر چلی جا رہی تھی۔

"میں سمجھتا تھا کہ تم سلوچنا کی فلم دیکھنے کے لئے بہت بے قرار تھیں کہ ہے نا؟" اُس

نے تانگے پر چڑھتے ہوئے پوچھا۔ وہ ابھی تک بوکھلایا ہوا تھا۔

" ہاں تھی تو لیکن اب جی نہیں چاہتا " سلمہ نے کہا " اور پھر یہ بھی بات ہے کہ پاپا آج باہر کھانا کھا رہے ہیں۔ چلو گھر چل کر کھانا کھائیں گے۔ پھر مجھے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں "۔

بیٹھک کے آتشدان میں آگ جل رہی تھی۔ انور اور سلمہ نے صوفہ اُس کی خوشگوار آنچ کے سامنے کھینچ لیا اور بتّی جلائے بغیر ہی وہاں بیٹھ گئے ــــ کھانا کھاتے ہوئے تمام وقت اُس کا رویّہ تو دوستی کا رہا تھا لیکن وہ کچھ دُور دُور سی رہی تھی اور اس وقت بھی جبکہ وہ اُس کی بغل میں بیٹھی ہوئی تھی اور اُس کے چہرے پر ناچتی ہوئی لپٹوں کی دمک تھی انور کو اُس کے رویّے میں ایک خاص رُوکھا پن دکھائی دیا۔

" تمہیں سینما میں کیا ہو گیا تھا؟ " انور نے خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔ " میں تو بالکل ڈر ہی گیا تھا "

اُس نے اپنی کالی کالی شفاف آنکھوں سے اُسے اِس طرح دیکھا جیسے اُس پر الزام لگا رہی ہو۔ اُس کی آواز سے ایسا لگتا تھا کہ اُس کے وقار کو ٹھیس پہنچی ہے۔ انور کے سوال کے جواب میں اُس نے خود ایک سوال پوچھا " تم نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ سے کیوں کھینچ لیا تھا؟ "

" ظاہر ہے، نیوز ریل میں جواہر لال کو دیکھ کر تالیاں بجانے کے لئے! تم کیا سمجھیں؟ "

" تو تمہارے لئے جواہر لال کی اہمیت مجھ سے زیادہ ہے! " سلمہ نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ اُسے اِس بات کا احساس بھی نہ تھا کہ وہ کتنا مضحکہ خیز اور بے تُکا مقابلہ کر رہی ہے۔

انور قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ " تو تمہیں جواہر لال سے جلن ہو رہی ہے! "

سلمہ کا رُوٹھا ہوا مُوڈ ٹھیک ہوا اور اُس نے مذاق کرتے ہوئے کہا "کیوں نہیں"۔ اور پھر اس نے انور کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا "مجھے ہر اُس آدمی سے اور ہر اُس چیز سے جلن ہوتی ہے جو تمہیں ایک پل کے لئے بھی مجھ سے دُور ہٹاتی ہے"۔

ایک پل کے لئے تو انور اُس کی آنکھوں میں جذباتی قبضے کی وہ چمک دیکھ کر سہم گیا۔ وہ اُس کی جلن کو بے بنیاد ثابت کرنے کے لئے جتنی دلیلیں دینا چاہتا تھا وہ سب اس کی زُلفوں کی بھینی بھینی مہک کو محسوس کرتے ہی غائب ہو گئیں۔

سلمہ کا سر انور کی باہوں پر ٹکا ہوا تھا اور آگ کی ہلکی ہلکی روشنی میں وہ پہلے سے بھی زیادہ خوبصورت اور دلکش لگ رہی تھی۔ انور نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور اُن میں اپنے لئے پیار کا سمندر اُمڈتا دیکھ کر وہ بالکل اُس کے بس میں ہو گیا۔ سلمہ کے ہونٹ جن پر لپ سٹک کی ایک بہت ہی ہلکی سی تہہ تھی، آدھے کھلے ہوئے تھے۔ اور جب انور نے اُس کے سنگِ مرمر جیسے چکنے ماتھے پر سے اُس کے کالے ریشمی بالوں کی لٹ پیچھے ہٹائی تو سلمہ کی گرم سانس کا ایک جھونکا اُس کے گال کو گُدگُدا گیا۔ سلمہ کے ہونٹوں کو چُومنے کا اُس نے کوئی ارادہ نہیں کیا تھا لیکن نہ جانے کیسے اُس کے ہونٹ سلمہ کے ہونٹوں سے چپک گئے۔

اُس نے پہلے کبھی ہونٹ چُومے نہیں تھے۔ اُس نے کبھی اپنے ارادے سے کسی لڑکی کے ہونٹ نہیں چُومے تھے۔ شراب کے نشے میں لوسی نے جو کچھ اُس کے ساتھ کیا تھا وہ تو بہت ہی گھناؤنا تجربہ تھا جسے اُس نے قے کے ساتھ اُگل دیا تھا۔ اُسے صرف ایک دُھندلا دُھندلا اندازہ تھا کہ "ہونٹ سے ہونٹ لگانے" کا کیا مطلب ہوتا ہے۔ اب اُسے معلوم ہو گیا لیکن پھر بھی وہ اپنی خوشی کو نہیں بیان کر سکتا تھا۔ سلمہ نے بھی مست ہو کر اُس کا پوری

طرح ساتھ دیا اور اُس کے اِس ردِ عمل سے جوش پا کر انور نے کئی بار اُس کے ہونٹوں کو چوما اور اُسے ایسا لگا کہ اُس کی زندگی کے نازک اور سب سے پیارے تجربے اس ایک پل میں سمٹ آئے ہیں ــــ جتنے غروبِ آفتاب اُس نے اپنی زندگی میں دیکھے تھے اُن سب کی رنگینی، جتنے پھول اُس نے سُونگھے تھے اُن سب کی خوشبو، گیلی مٹّی کا مست کر دینے والا سوندھا پن، موسمِ گرما کی صبح میں بہتی ہوئی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں کا ملائم لمس، کہیں دُور بجتی ہوئی بانسری کی جادو بھری دُھن، رقّاصہ کے پیروں میں بندھے ہوئے گھنگھروؤں کی جھُن جھُن اور مجیروں کی آواز .... اُس ایک پل میں اُس کے سارے جرأت آمیز تصوّرات بھی سمٹ آئے تھے، اُڑنے والے گھوڑے اور دل کو رِجھانے والی حوریں، ستاروں جڑے کامدانی کے ڈُوپٹّے جیسے آسمان تک پہنچتے ہوئے ہاتھ جو اُسے بڑی ملائمت سے دھرتی پر اُتار کر لا رہے تھے۔ اُس ایک پل میں یہ سب تو تھا ہی، اُس کے علاوہ بھی بہت کچھ تھا کیونکہ اِس انتہائی خوشی کی گھڑی میں ایک غم کی ٹیس بھی ملی ہوئی تھی اور ایک خواہش کے خاتمے نے دُوسری خواہش کو جنم دیا تھا جو رہ رہ کر کانٹے کی طرح چُبھتی تھی اور جو پہلی خواہش سے زیادہ زوردار اور زیادہ ڈرا دینے والی تھی۔

آتش دان میں آگ بجھ چلی تھی۔ سلمہ نے اپنے آپ کو انور کی باہوں سے چھُڑایا تو وہ کچھ کپکپا اُٹھی اور بڑے پیار سے انور کے بالوں کو سہلاتے ہوئے بولی "اب تم جاؤ، نہیں تو ہم لوگ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھیں گے اور پاپا بھی اب آتے ہی ہوں گے۔"

اس ایک لمحے میں وہ کتنی سمجھدار ہو گئی تھی، کتنی بڑی ہو گئی تھی۔ سلمہ کی بات ... کا مطلب سمجھ کر انور شرما گیا۔ یہ خیال آتے ہی کہ وہ اپنے جذبات کے جوش میں سلمہ کو نقصان پہنچا سکتا تھا، اُسے ایک پل کے لئے ایسا لگا کہ کسی نے اُس کے سینے میں چھُرا اُتار دیا ہو۔

سلمہ نے جب اُسے راستہ دکھانے کے لئے برآمدے کی بتی جلائی تو انور کو ایسا لگ رہا تھا کہ ساری دنیا اُسی کو دیکھ رہی ہے اور سلمہ سے وداع ہوتے وقت وہ سوچ رہا تھا کہ اگر وہ اپنے جذبات کی رَو میں اور آگے بڑھ گیا ہوتا تو وہ عمر بھر اپنے آپ کو معاف نہیں کر سکتا تھا۔

"تمہیں دیکھ کر تو ایسا لگتا ہے جیسا تمہیں پچھتاوا ہو رہا ہو" سلمہ نے اُسے چھیڑتے ہوئے کہا۔ پچھتاوا! وہ سلمہ کو بتانا چاہتا تھا کہ اُس نے اُسے کس قدر سکھ دیا ہے وہ بتانا چاہتا تھا کہ وہ سلمہ کا کتنا احسانمند ہے۔ لیکن اُس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اِس بات کو کیسے کہے۔ اس لئے وہ سلمہ کی طرف دیکھتا رہا۔ اُسے معلوم تھا کہ وہ بیوقوفوں کی طرح اُسے تاک رہا ہے، پھر بھی وہ بغیر پلک جھپکائے اُسے دیکھتا رہا۔ لیکن سلمہ سمجھ گئی اور مُسکرادی۔ اور تب انور بھی مُسکرادیا۔

جس وقت وہ احاطے سے باہر نکل رہا تھا اُسے سلمہ کی آواز سُنائی دی "بھولنا نہیں، کل اتوار ہے ذرا جلدی آجانا۔"

(۳)

جس وقت انور ہاسٹل لوٹا اُس وقت اُس کے ہونٹوں پر بوسے کا مزہ باقی تھا۔ آدھی رات کا وقت تھا اور انور نے سوچا تھا کہ رازؔ اور اصغر سو گئے ہوں گے۔ کیونکہ انور رازؔ کے دل کی حالت جانتا تھا اِس لئے جب بھی وہ سلمہ کی کار سے واپس لوٹتا تھا اُسے ایسا لگتا تھا کہ وہ رازؔ کا گناہ گار ہے اور اب تو وہ لگ بھگ روز ہی سلمہ کے یہاں جانے لگا تھا۔ جہاں تک اصغر کا سوال تھا اُسے جذبات چھُو تک نہیں گئے تھے اور وہ ہر بات کا مذاق اُڑاتا تھا اِس لئے وہ انور کو بھی چھیڑتا رہتا تھا اور اُس سے پُوچھتا رہتا تھا کہ اُس کا رُومانس کس منزل میں ہے۔ لیکن وہ کچھ اِس طرح گھُما پھرا کر پُوچھتا تھا کہ اُس میں ایک قسم کا بیہودہ پن

آجاتا تھا، جب اُس نے دیکھا کہ اُس کے کمرے میں بتی ابھی تک جل رہی ہے تو وہ اِس بات کے لئے تیار ہو گیا کہ اب کم سے کم آدھے گھنٹے تک اُسے اصغر کے بے ہودہ سوالوں اور رازؔ کی بے تکی خاموشی کا سامنا کرنا پڑے گا۔

لیکن جب اُس نے دروازہ کھٹکھٹایا تو ایک بالکل ہی اجنبی آدمی نے دروازہ کھولا۔ وہ ایک دُبلا پتلا لڑکا تھا جس کے چہرے کا رنگ بالکل پیلا تھا۔ وہ ایک ڈھیلا ڈھالا اوور کوٹ پہنے ہوئے تھا اور اُس کے بال اُلجھے ہوئے تھے۔ ایک کونے میں بستر بند اور ایک چھوٹا سا سوٹ کیس رکھا تھا جس سے پتہ چلتا تھا کہ وہ ابھی شام کو ہی وہاں پہنچا تھا اور رات کو اُن کے کمرے میں ٹھہرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ "اصغر یا رازؔ کا کوئی دوست ہو گا"۔ انور نے سوچا لیکن یہ اجنبی اُسے دیکھ کر اس طرح مسکرا کیوں رہا تھا؟ شاید اصغر نے اپنی عادت کے مطابق اُسے بھی انور کے "رومانس" کے بارے میں بتا دیا ہو گا اور اسی لئے اُس کے چہرے پر ایسا ظاہر ہوتا تھا جیسے وہ انور کا مذاق اُڑا رہا ہو۔ صورت کچھ دیکھی ہوئی لگ رہی تھی پھر بھی انور اُسے پہچان نہیں پا رہا تھا۔ اُسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اُس نے یہ صورت کبھی خواب میں دیکھی ہو۔

"ہلو انور!"۔ آواز بھی پہچانی ہوئی تھی۔ "پہچانا نہیں؟"

"کون؟ رتن؟" وہ چلّا کر اپنے دوست کے گلے سے لپٹ گیا "لیکن تمہارے بال ؟" رتن نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اُسے چپ کر دیا اور خرّاٹے لیتے ہوئے اصغر اور پیچھے کے کمرے میں لیٹے ہوئے رازؔ کی طرف اشارہ کیا۔ "بعد میں سب کچھ بتاؤں گا"۔ رتن نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "پہلے یہ بتاؤ کیا میں کچھ دن تک یہاں تمہارے مہمان کی حیثیت سے رہ سکتا ہوں؟ مجھے تمہارا خط ملا تھا اور تم نے جو یقین دلایا تھا اُس کے بھروسے پر میں چلا آیا لیکن

شاید تم نے اپنا خیال بدل دیا ہو۔"

"کیسی بات کرتے ہو؟" انور نے جھڑک کر کہا۔ "اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے۔ تم ضرور ٹھہر سکتے ہو اور ٹھہرو گے یہاں۔ میں تمہارے لئے چارپائی کا انتظام کرتا ہوں۔"

"اور ہاں دیکھو میں تمہارے دوستوں کو اپنا نام پتہ بتا چکا ہوں۔ یہ رہا میرا کارڈ۔"

اور یہ کہہ کر رتن نے ایک مٹیالا سا کارڈ انور کے آگے بڑھا دیا جس پر چھپا ہوا تھا۔

"رام لال چوپڑا، انشورنس ایجنٹ۔"

تو اب رتن اس نام سے اِدھر اُدھر گھوم رہا تھا۔

"سمجھ گئے نا؟"

انور نے کارڈ واپس کرتے ہوئے سر ہلا دیا۔ اس نے دیکھا کہ داڑھی منڈوا دینے کے بعد رتن پہلے سے زیادہ دبلا اور پیلا لگنے لگا تھا لیکن اب اس کے بات کرنے کے ڈھنگ میں ایک نئی خود اعتمادی تھی اور وہ بہت نپے تلے الفاظ میں اپنی بات کہتا تھا۔ لڑکپن کا جوشیلا پن اب بالکل باقی نہیں رہ گیا تھا۔ یہ ایک ایسے آدمی کی آواز تھی جو یہ جانتا تھا کہ وہ کیا چاہتا ہے اور جو کچھ وہ چاہتا ہے اسے کیسے پا سکتا ہے۔ یہ ایک ایسے آدمی کی آواز تھی جس کے دل میں کوئی شبہہ نہیں تھا، کوئی ہچکچاہٹ نہیں تھی، صرف یقین تھا۔ پکا یقین — اٹل یقین — !!

اپنے دوست کو اس نئے روپ میں دیکھ کر انور اس سے متاثر بھی ہوا اور ساتھ ہی اسے اس سے کچھ ڈر سا بھی لگا۔

(۴)

اگلے دن اتوار تھا، اس لئے انور دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد اپنے دوست کو

لے کر مرا ٹھوں کے پُرانے قلعے کی طرف ٹہلنے چلا گیا۔ یہ قلعہ یونیورسٹی سے دو میل شمال کی طرف تھا۔ اُس سنسان جگہ میں شاید ہی کبھی کوئی آتا تھا، اس لئے وہ بڑی دیر تک بغیر کسی خلل کے دل کھول کر باتیں کر سکتے تھے۔

ریل کا پھاٹک پار کرنے کے بعد جب انور کو پکا یقین ہو گیا کہ کوئی اُن کی بات نہیں سُن سکتا تو اُس نے وہ سوال پوچھا جو کل رات سے اُسے پریشان کر رہا تھا۔ اُس نے کہا۔ "رتن، میں اس بات کی معافی چاہتا ہوں کہ کل رات میں تمہیں دیکھتے ہی پہچان نہیں سکا۔ بات یہ ہے کہ میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ تمہاری داڑھی مونچھ اس طرح بالکل صفا چٹ ہو گی۔ یہ تو بتاؤ کہ تم نے آخر اپنی داڑھی اور بال کیسے کٹوا دیئے تمہارے مذہب میں تو یہ منع ہے نا؟"

رتن کچھ دیر تک چُپ چاپ چلتا رہا پھر بولا "ایک بہت بڑے آدمی سے جب یہی سوال کیا گیا تھا تو اُس نے اِس کا جواب یہ دیا تھا کہ جب کوئی قوم کی خاطر سر کٹانے پر تیار ہو تو وہ بال کٹانے سے کیا ڈرے گا۔ داڑھی مونچھیں صفا چٹ کروا دینے سے اور بال کٹوا دینے سے ہمارا بھیس بڑی آسانی سے بدل جاتا ہے اور ہم پولیس کے پنجے سے بچے رہتے ہیں۔"

انور ابھی تک اُس دلیر آدمی کی بات سوچ رہا تھا جس کا حوالہ ابھی رتن نے دیا تھا۔ اُس نے پوچھا "کس نے کہی تھی یہ بات؟ بہت ہی کمال کا آدمی رہا ہو گا کوئی"۔

وہ ہے ہی کمال کا آدمی ۔۔ ہمارا لیڈر بھگت سنگھ"۔ اور یہ نام لیتے وقت رتن کی آواز میں عقیدت بھی تھی اور پیار بھی۔

بھگت سنگھ! انور نے اپنے ساتھ کے کچھ پنجابی لڑکوں سے اُس کا نام سنا تھا۔

اُس نے نو جوان بھارت سبھا کے نام سے نوجوانوں کی ایک انقلابی تنظیم بنائی تھی اور کہا جاتا تھا کہ پنجاب میں دہشت پسند تحریک کا کرتا دھرتا وہی ہے۔ کافی عرصے سے وہ کئی صوبوں کی پولیس کو تگنی کا ناچ نچا رہا تھا اور ابھی تک پولیس کے ہاتھ نہیں لگا تھا۔

"سینڈرس کو بھگت سنگھ نے ہی گولی ماری تھی نا؟" انور نے پوچھا۔ عام طور پر لوگوں کا یہی خیال تھا اور اُس نے اِسی خیال کو دُہرا دیا۔

"یہ بتانے کی مجھے اجازت نہیں ہے۔" رتن نے مضبوطی سے جواب دیا اور پھر انور پر اپنی اِس بات کا ردِ عمل دیکھ کر اُس نے کہا "تمہیں بھی نہیں، حالانکہ میں تم پر بھی اُتنا ہی وشواس رکھتا ہوں جتنا خود اپنے پر۔ مگر میں پارٹی کا ڈِسپلن نہیں توڑ سکتا۔ اِس کے علاوہ یہ بات بھی ہے کہ انقلابی کام میں اس بات کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہوتی کہ کوئی کام کس نے کیا ہے۔ جس اُنگلی سے پستول کا گھوڑا دبایا گیا تھا وہ کسی کی بھی اُنگلی ہو سکتی تھی، لیکن سینڈرس کو کسی ایک آدمی نے نہیں مارا، وہ ایک پوری قوم کے غُصّے کا شکار ہوا اور اِس طرح قوم نے سینڈرس سے اُس کے اُس وار کا بدلہ لے لیا جس نے لالہ لاجپت رائے کی جان لے لی تھی۔"

ایک سوال انور کو لگاتار پریشان کر رہا تھا اور اب اُسے وہ سوال پوچھنا ہی پڑا۔ "رتن، میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ تم مجھے اپنی پارٹی کا کوئی راز بتاؤ لیکن ایک بات میں تم سے ضرور جاننا چاہتا ہوں۔ اُس بات کی میرے لئے بہت اہمیت ہے۔ کیا تم نے — خود تم نے اپنے ہاتھوں سے ابھی تک کسی کا — ؟"

"خون کیا ہے؟" رتن نے یہ بھیانک الفاظ کہہ کر بات پوری کر دی جنہیں کہنے میں انور کو دِقّت ہو رہی تھی۔ "سچ پوچھو تو میں نے نہیں کیا ہے۔ ابھی تک مجھ سے یہ

کرنے کو کہا ہی نہیں گیا ہے۔ لیکن یہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ بس ابھی تک کوئی موقع نہیں نکلا ہے۔ جب وقت آئے گا تو میں پیچھے نہیں ہٹوں گا۔"

رتن نے جس ڈھنگ سے یہ بات کہی اُس میں ایک ایسی سنجیدگی تھی جسے سن کر انور کو بڑی فکر ہوئی۔ اُس کی یہ سنجیدگی اُس کی پرانی کڑواہٹ سے الگ تھی اور انور جانتا تھا کہ رتن نے جن حالات میں انگریزوں کے ہاتھوں اپنے باپ کو قتل ہوتے دیکھا تھا اُن ہی کی وجہ سے اُس کے جذبات میں کڑواہٹ آ گئی تھی۔ پھر بھی اُسے یہ جان کر تسلّی ہوئی کہ اُس کا دوست ابھی تک قاتل نہیں بنا ہے۔" اچھا انور اب تم مجھے ایک بات بتاؤ۔ مان لو اگر میں نے کسی انگریز کا یا کسی پولیس افسر کا خون کیا ہوتا تو کیا تم مجھ سے نفرت کرنے لگتے کیا تم مجھے پولیس کے حوالے کر دیتے؟"

"ہرگز نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ میں ایسا کبھی نہ کرتا۔" انور نے اُسے یقین دلاتے کہا۔" میں تمہارے دہشت پسندی کے اصولوں کے خلاف ضرور ہوں لیکن میں تمہارے مقصد کی عزّت کرتا ہوں"

اور اِس طرح وہ دونوں ہنسا اور اہنسا کے اخلاقی پہلو پر بحث کرنے لگے۔ اُن ہی کی طرح ہزاروں دوسرے نوجوان سارے ملک میں اسی سوال پر بحث کر رہے تھے۔ انور نے شروع شروع میں ہی بغیر کسی سوچ بچار کے گاندھی جی کے اُصول کو اپنا لیا تھا کیونکہ وہ اُسے اچھّا لگا تھا۔ بعد میں گاندھی جی کے مضامین اور کتابیں اور اُن کی تقریروں کا مطالعہ کرنے سے اُس کا یقین اور پکّا ہو گیا تھا۔ وہ زور دے کر رتن کو سمجھا رہا تھا کہ آزادی جیسے اچھّے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ذرائع بھی اچھّے ہی استعمال کئے جانے چاہئیں۔ رتن مقصد اور ذرائع میں اس قدر فرق کرنے کا ہی

مذاق اڑا رہا تھا اور یہ بحث کر رہا تھا کہ ظلم کا تختہ اُلٹنے کے لئے کوئی بھی ذریعہ مناسب ہے "سامراجیوں کی ہنسا کا جواب ہنسا سے ہی دیا جا سکتا ہے" اُس نے زور دیکر کہا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ گاندھی جی کی اہنسا بزدلوں کے لئے ایک آڑ ہے۔ گاندھی جی کے بارے میں رتن کے منہ سے ایسی بے ادبی کی بات سُن کر انور کو بہت دھکا پہنچا اور اُس نے اہنسا کے اصول کو معقول ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہوئے رتن کو یہ بتایا کہ تہذیب یافتہ زندگی کی بنیاد محبت ہے نفرت نہیں اور یہ کہ جو آزادی اہنسا کے ذریعے حاصل کی جائے گی وہ انتشار اور خون خرابے سے حاصل کی گئی آزادی سے زیادہ دیر پا ہوگی۔" اگر ہم سچ سچ گاندھی جی کے کہنے پر چلیں تو ایک دن ہمارے دشمن بھی ہماری بات کو ماننے لگیں گے اور یہ سمجھیں گے کہ ہماری مانگیں صحیح ہیں۔"

رتن اس کا جواب دینے ہی جا رہا تھا کہ یکایک اُسے اپنے اصول کے حق میں ایک عملی دلیل پیش کرنے کا موقع مل گیا اور اس کا خیال تھا کہ اِس عملی دلیل کے آگے باقی ساری دلیلیں بیکار ہو جائیں گی۔

(۵)

اب پرانے قلعے کی دیواریں اور چاروں طرف کی کھائی خوفناک دکھائی دینے لگی تھیں۔ انور نے چکر دار سڑک چھوڑ کر گھاس کی جھاڑیوں کے بیچ سے ہوتے ہوئے چھوٹے راستے سے چلنے کا فیصلہ کیا۔ وہ بحث میں کھوئے ہوئے اونچی اونچی گھاس کے بیچ سے ہو کر جا رہے تھے کہ اتنے میں انور کو ایسا محسوس ہوا کہ اس کا داہنا پیر کسی نرم اور چکنی چیز پر پڑا۔ وہ ابھی ٹھیک سے سنبھل بھی نہ پایا تھا کہ گھاس میں سرسراہٹ ہوئی اور دوسرے ہی پل انور نے دیکھا کہ ایک زہریلا کالا سانپ اپنی کنڈلی توڑ کر آگے بڑھ رہا ہے۔

یونیورسٹی کے آس پاس کے علاقے میں بے حد سانپ تھے اور انور جانتا تھا کہ وہ کتنے زہریلے تھے۔ انور پتھر کی مورت کی طرح وہیں کھڑا کا کھڑا رہ گیا جیسے کسی نے اُس پر جادو کر دیا ہو ڈر کے مارے انور کی آواز بند ہو گئی تھی اس لئے وہ رتن کو جو اُس سے کچھ ہی قدم آگے گیا ہو گا، پکار بھی نہیں سکتا تھا۔ سانپ نے حملہ کرنے کے لئے اپنا چتکبرا پھن اُوپر اُٹھایا اور انور ٹکٹکی باندھے اُسے دیکھتا رہا۔ اُس کے زہریلے دانتوں کے بیچ سے ایک پتلی سی دوہری زبان بجلی کی طرح لپکی اور اگلے ہی پل اُس کالے سانپ نے انور کو ڈس لیا ہوتا لیکن اتنے میں گولی چلنے کی آواز آئی اور سانپ موت کے درد سے تڑپتا ہوا زمین پر لوٹنے لگا۔ انور نے اطمینان کا سانس لے کر نظر اُوپر اُٹھا کر دیکھا لیکن اُس کا دل ابھی تک دہلا ہوا تھا۔ رتن ہاتھ میں پستول لئے کھڑا ہنس رہا تھا اور پستول میں سے ابھی تک دھواں نکل رہا تھا۔

"دیکھا تم نے، ان زہریلے کالے سانپوں کا دل محبت اور اہنسا سے نہیں بدلا جا سکتا۔" اپنے دوست کی جسمانی اور اخلاقی ہار پر رتن کو کچھ خوشی ہو رہی تھی۔ اُس نے کہا "ان زہریلے سانپوں کو گولی سے ہی اُڑانا ہو گا ـــــ اور یہی بات سامراجی سانپوں کے بارے میں بھی سچ ہے۔"

لیکن انور اُس کالے سانپ کو بھول چکا تھا اور وہ یہ بھی بھول چکا تھا کہ وہ ابھی موت کے مُنہ سے بال بال بچا ہے۔ وہ تو رتن کے ہاتھ کی پستول کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اُس کا دوست دہشت پسند ہے پھر بھی اُسے سچ مچ پستول چلاتے دیکھ کر ایک صدمہ سا پہنچا تھا، تو اُس نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ جب کسی کو مارنے کا وقت آئے گا تو وہ پیچھے نہیں ہٹے گا۔

"اچھا آؤ۔" رتن نے پستول اپنے اوور کوٹ کی اندر والی کسی چور جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔" تمہارے حق میں اچھا ہی ہوا کہ میں اہنسا کو نہیں مانتا لیکن مجھے اِس بات کا ڈر ہے کہ کہیں کسی نے گولی چلنے کی آواز سُن نہ لی ہو"۔

کھائی کو پار کرتے ہوئے انور نے اُسے یقین دلایا۔" تم فکر نہ کرو، اِس سُنسان قلعے میں کوئی نہیں آتا ہے"۔

(٦)

انور نے کہیں پڑھا تھا کہ دنیا میں عورت کا مُوڈ ایک ایسی چیز ہے جس کے بارے میں پہلے سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ شیکسپیئر نے کہا تھا۔" انسان کی زندگی میں جوار کی لہروں کی طرح اُتار چڑھاؤ آتا رہتا ہے"۔ اِس بات کو بدل کر کسی دل چلے نے اِس طرح کر دیا تھا کہ" عورت کے ساتھ انسان کی زندگی میں جوار کی لہروں کی طرح اُتار چڑھاؤ آتا رہتا ہے"۔ کیونکہ ایک پل تو عورت مرد کی پُوجا کر کے اُسے چوٹی پر پہنچا دیتی ہے اور دوسرے ہی پل جب لہر نیچے اُترتی ہے تو اُسے گھاس پھوس کی طرح کنارے پر لا پٹکتی ہے۔ انور نے ابھی تک جوار کی لہروں کو اترتے نہیں دیکھا تھا لیکن وہ جس اکیلی عورت کو جانتا تھا، سلمہ کو اُس کے ہر پل بدلتے ہوئے مُوڈ سے وہ اچھی طرح اندازہ لگا سکتا تھا کہ جوار کی لہروں میں چڑھاؤ اُتار کس طرح آتا ہوگا۔

ابھی سنیچر کی رات ہی کو تو اُس نے بوسہ لے کر، بلکہ لگاتار کئی بوسے لے کر پیار کے اِس بندھن کو پکا کیا تھا لیکن پیر کے دن ہی جب وہ شام کے وقت ان ہی خوشگوار لمحوں کے تجربے کو دُہرانے کے لئے سلمہ کے گھر پہنچا جو اُس کی زندگی کے سب سے خوشگوار اور یادگار لمحے بن چکے تھے تو اُس نے دیکھا کہ سلمہ نہ صرف رُکھائی سے پیش آ رہی ہے؛

بلکہ غصّہ بھی ہے۔

وہ تو بڑے تپاک سے سلمہ سے ملا لیکن جب اُس نے بہت ہی رسمی ڈھنگ سے بغیر کوئی دلچسپی دکھائے صرف "ہیلو" کہا تو انور بھی کھسیا کر چُپ ہو گیا کیونکہ وہ سلمہ کے موڈ سے اچھّی طرح واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ سلمہ اس وجہ سے رُوٹھی ہوئی ہے کہ وہ اتوار کو وعدہ کر کے نہیں آیا تھا، لیکن پھر بھی پہلے اس کی وجہ تو پوچھنا چاہیئے تھی اور اگر وہ کوئی ٹھیک جواب نہ دے پاتا تب ہی وہ سزا کے طور پر اُس سے ناراض ہو جاتی۔ سلمہ کی اِس ضد سے انور کو بہت دُکھ ہوا اور وہ اُداس ہو گیا۔ وہ ڈرائنگ روم کے ایک کونے میں خیالوں میں ڈوبا ہوا چُپ چاپ بیٹھا رہا اور سلمہ یہ جتاتی رہی کہ وہ اپنی بُنائی میں بہت مشغول ہے۔

آخر کار سلمہ نے یہ محسوس کیا کہ وہ شاید ضرورت سے زیادہ رُکھائی دکھا رہی ہے اِس لئے بُنائی الگ رکھ کر اُس نے بڑے طعنے سے کہا "کل شاید تمہیں دوستوں کے ساتھ سیاست پر بحث کرنے سے فرصت ہی نہیں ملی"۔

خاموشی ٹوٹ گئی تھی اور اب وہ سلمہ سے معافی مانگ سکتا تھا۔ اگر سلمہ نے اُسے موقع دیا ہوتا تو وہ پہلے ہی معافی مانگ لیتا کیونکہ وہ تو آیا ہی اِسی لئے تھا۔ "سلمہ مجھے بہت افسوس ہے لیکن دِلّی سے ایک بہت پُرانے دوست اچانک آ گئے تھے بس اُن ہی کے چکّر میں پھنسا رہا"۔

"اُنہیں بھی یہاں لے آتے"۔ سلمہ کو لڑکوں سے ملنے میں کبھی کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہوتی تھی کیونکہ اُن میں اُس کے چاہنے والے بھی ہو سکتے تھے، اس کے علاوہ وہ یہ بھی چاہتی تھی کہ انور اُسے اپنے دوستوں سے ملائے۔

"تم جانتے ہو کہ تمہارا کوئی بھی دوست خوشی سے یہاں آ سکتا ہے۔"

"یہ تو معلوم ہے مجھے لیکن وہ بہت ہی رُوکھے قسم کا آدمی ہے اور میں نے سوچا کہ شاید تمہیں اُس سے ملنے میں کوئی دلچسپی نہ ہو۔

"کیا نام ہے اُس کا؟"

"رام لال۔"

"رام لال؟ مجھے پتہ نہیں تھا کہ تمہارے ہندو دوست بھی ہیں۔"

سلمہ نے جس لہجے میں یہ بات کہی وہ انور کو اچھا نہیں لگا، اُس نے یہ بات کہہ کر بہت تنگدلی کا ثبوت دیا تھا جس پر انور کو بہت جھنجھلاہٹ ہوئی۔ اُس نے کچھ چڑ کر کہا۔ "خیر، چلو اب تو معلوم ہو گیا۔"

"ارے نہیں، میری بھی یادداشت کتنی خراب ہے۔ تمہارا ایک سکھ دوست بھی تھا جس کا ذکر تم نے ڈبیٹ میں کیا تھا، کیا نام تھا اُس کا؟"

"رتن۔"

اتنے میں پروفیسر سلیم وہاں آ گئے اور انور اُن کا ادب کرنے کے لئے کھڑا ہو گیا۔

"ہیلو انور، میں تم ہی سے ملنا چاہتا تھا، سلمہ ذرا چائے بھجوا دو۔" اور انور کو ابھی تک کھڑا دیکھ کر انہوں نے کہا۔ "بیٹھ جاؤ، بیٹھ جاؤ۔"

پروفیسر صاحب کے لاکھ کوشش کرنے کے باوجود انور پریشان ہی رہا۔ اُسے نہ جانے کیوں یہ ڈر تھا کہ پروفیسر صاحب اب رام لال کی بات چیت چھیڑیں گے اور ہُوا بھی یہی۔

اُنہوں نے بنا کسی لاگ لپیٹ کے انور سے سیدھا سوال کیا۔ "یہ رام لال کون

ہے ؟"

سوال اِس طرح اچانک پوچھا گیا تھا کہ ایک پل کے لئے تو انور کوئی جواب نہ دے سکا پھر اُس نے کہا "میرا دوست ہے، میں اُسے بچپن سے جانتا ہوں۔"

"یہ تو صحیح ہے لیکن تم اس کی سیاست کے بارے میں کیا جانتے ہو؟ آج کل زمانہ بہت خطرناک ہے جتنی بھی احتیاط کی جائے کم ہے۔ یونیورسٹی والوں کا خیال ہے کہ وہ کسی قسم کا انقلابی ہے، تمہیں ایسے لوگوں سے دُور ہی رہنا چاہیئے، ورنہ تمہارا سول سروس میں جانے کا چانس ختم ہو جائے گا۔"

لیکن انور کو سول سروس کی فکر نہیں تھی۔ اس وقت تو وہ یہ سوچ رہا تھا کہ وہ اپنے دوست کی طرف ایک آدمی کا کیا فرض ہونا چاہیئے۔ "مجھے افسوس ہے لیکن میں اپنے دوست کو اِس طرح نکال نہیں سکتا۔" اُس نے سوچ سوچ کر دھیرے دھیرے یہ بات کہی اور اُسے خود تعجب ہوا کہ اُس میں اتنی ہمت آئی کہاں سے؟

پروفیسر صاحب ہمیشہ کی طرح بہت نرمی سے باتیں کر رہے تھے۔ "تم خود ہی سوچ کر فیصلہ کر لو، اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو دوستی اور مہمان نوازی کی ان جھوٹی باتوں کی وجہ سے اپنی زندگی برباد نہ کرتا۔" اور یہ کہہ کر وہ کپڑے بدلنے چلے گئے۔

سلمہ چپکے سے کمرے میں آ کر یہ باتیں سُن رہی تھی۔ سلمہ کو وہاں دیکھ کر انور اُس کی طرف اِس اُمّید سے مُڑا کہ شاید وہ اُس کی بات کو سمجھے گی اور اُسے سہارا دے گی لیکن سلمہ اپنی نظریں پھیر کر اپنی بُنائی میں لگ گئی۔ تو وہ بھی اُس کی طرف نہیں تھی۔

کچھ بے چین ہو کر انور اُٹھ کھڑا ہوا۔ سلمہ نے بُنائی پر سے نظریں اُٹھا کر اُس کی طرف دیکھا اور مُسکرا کر بولی، "انور جانتے ہو میں کیا بُن رہی ہوں؟ تمہارے لئے سوئیٹر۔"

"شکریہ۔" تو سلمہ تجھے پھنسانے کے لئے یہ اُونی جال بھی سلائیوں سے بُن رہی ہے۔

"میں چلا۔"

"کھانا کھا کر نہیں جاؤ گے؟"

"نہیں۔"

"انور!"

"کیا ہے؟"

"ضد نہ کرو، ابّا نے تمہاری اپنی بھلائی کے لئے ہی اُس آدمی کا ساتھ چھوڑ دینے کو کہا ہے۔"

"میں جانتا ہوں لیکن میں ضد نہیں کر رہا ہوں۔ میں جو کچھ کر رہا ہوں ٹھیک ہی کر رہا ہوں۔"

اچانک سلمہ اپنی بنائی پھینک کر صوفے پر سے اُٹھ کھڑی ہوئی اور چلّا کر بولی۔

"ضد تو کر ہی رہے ہو، تُم بالکل خچر کی طرح اڑیل ہو۔"

"میں جا رہا ہوں۔" انور نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بس اتنا ہی کہا۔

تو وہ تمہارا رام لال تمہارے لئے سب کچھ ہے اور میں کچھ بھی نہیں ہوں، اگر ایسی بات ہے تو اُسی کے پاس جاؤ اور اب یہاں کبھی نہ آنا ــــ کبھی نہیں۔" اور اتنا کہہ کر وہ صوفے پر گر پڑی اور سسک سسک کر رونے لگی۔

انور احاطے کے پھاٹک سے باہر نکل چکا تھا۔ اُس کے دماغ میں ایک طوفان مچا ہوا تھا ــــ وہ کس کا ساتھ دے۔

لیکن اُس کے لئے اِس بات کا فیصلہ کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی کیونکہ ہاسٹل

واپس پہنچنے پر راز نے اُسے بتایا کہ اُس کا دوست رام لال اچانک بغیر کچھ کہے سُنے چلا گیا ہے۔ میز پر پرو وائس چانسلر کا ایک نوٹس پڑا ہوا تھا جس میں لڑکوں کو تاکید کی گئی تھی کہ وہ بِنا اجازت لئے کسی کو اپنے کمرے میں نہ رکھیں اور یہ کہ اگر کوئی مہمان آ جائے تو اُس کی خبر فوراً پراکٹر کو دی جائے۔

"کیا اُس نے اِسے دیکھا تھا؟" انور نے پوچھا۔

راز نے سر ہلا دیا۔ تو رتن اِسی لئے چلا گیا!

انور کو اپنے دوست کے اِس طرح چلے جانے کا بہت افسوس تھا کسی کو بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں گیا ہے اور کس طرح وہ اپنے آپ کو پولیس کے چُنگل سے بچائے گا۔ پھر بھی اُسے ایسا لگا کہ اُس کے سر سے ایک بوجھ اُتر گیا ہے۔ اب سلمہ سے اُس کے تعلقات ٹوٹنے کی نوبت نہیں آئے گی۔

اور اسی لئے وہ بے حیائی کر کے پھر میرس روڈ کی طرف چل دیا۔ وہ چل دیا۔ وہ جاکر اپنی بدتمیزی کے لئے سلمہ سے معافی مانگے گا۔ ابھی آدھے گھنٹے پہلے وہ سلمہ سے ٹکّر لینے چلا تھا لیکن اُس وقت بھی وہ جانتا تھا کہ وہ سلمہ کی بات ٹال نہیں سکے گا کیونکہ وہ اُسے پیار کرتا تھا۔ اُس نے اپنے جذبات کا یہ جال خود بُنا تھا اور وہ جانتا تھا کہ اُس سے بھاگ نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے اور وہ نکلنا چاہتا بھی نہیں تھا۔

۱۵

اِنقلاب زندہ باد

(۱)

فروری ختم ہوتے ہی اچانک بارش شروع ہوگئی اور مارچ کے شروع میں ایسی ٹھنڈی برفیلی ہوائیں چلنے لگیں کہ تیر کی طرح چبھتی ہوئی ہڈیوں تک جا لگتی تھیں — علی گڈھ کے چاروں طرف کے ریگستانی علاقوں سے دُھول کے بھنور اُٹھ اُٹھ کر سڑکوں پر اِس طرح منڈلاتے تھے جیسے مُردوں کی ارواح ناچ رہی ہوں۔ انور جیسے ایم۔ اے کے طالب علم کے لئے دن بھر میں دو تین لیکچروں میں حاضری دے آنے سے زیادہ اور کوئی کام نہیں تھا۔ کبھی کبھی کوئی ڈِبیٹ ہو جاتی تھی لیکن اُن میں بھی کوئی نئی بات نہیں تھی اور زیادہ تر بولنے والے کی بھتوں کے پٹے ہوئے مذاق بار بار دُہراتے رہتے تھے۔ نمائش کی چہل پہل بھی ختم ہو چکی تھی اور ٹورنامنٹس شروع ہونے میں ابھی کافی دن باقی تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ ان برفیلی ہواؤں سے بچنے کے لئے یونیورسٹی نے بھی بے حرکتی

بلکہ بے حسی کا کمبل اوڑھ لیا تھا۔

لیکن ملک میں سیاسی گرمی دن بہ دن بڑھتی جا رہی تھی اور اخباروں سے انور کو پتہ چلتا تھا کہ یہ گھرتی ہوئی گھٹائیں کسی دن بھی ٹوٹ کر برس پڑیں گی۔ ملک کے کونے کونے سے دہشت پسندوں کی سرگرمیوں کی خبریں آ رہی تھیں اور انور اکثر سوچا کرتا تھا کہ اُس کے دوست رتن عُرف رام لال کا اُن میں کتنا ہاتھ ہوگا۔ بمبئی میں ایک بار پھر فرقہ وارانہ فساد ہو گیا تھا۔ کسی نے یوں ہی افواہ پھیلادی تھی کہ پٹھان لوگ "بچے" چُرا کر لیجا رہے ہیں اور جب تک یہ پتہ چلا کہ یہ خبر جھوٹی تھی، اُس وقت تک کافی لوگ مارے جا چکے تھے اور سینکڑوں لوگ زخمی ہو چکے تھے۔ دُوسرے شہروں میں جہاں کہیں بھی سائمن کمیشن جانچ کرنے کے سلسلے میں دَورے پر گیا تھا، وہاں ہڑتالوں، کالے جھنڈوں، زبردست مظاہروں اور "سائمن، واپس جاؤ" کے نعروں سے اُس کا استقبال کیا گیا تھا۔ مہاتما گاندھی نے بدیسی کپڑے کے خلاف تحریک شروع کر دی تھی جس کی وجہ سے لنکا شائر اور مینچسٹر جیسے کپڑے کی صنعت کے مرکزوں کو بہت نقصان پہنچ رہا تھا۔ ۴ مارچ کو گاندھی جی ولایتی کپڑے کی ہولی جلانے کے جرم میں کلکتے میں گرفتار کر لئے گئے اور اُس کے کچھ ہی دن بعد پنڈت موتی لال نہرو نے کونسل میں سرکار کو کراری شکست دی اور کونسل میں سرکار کے خلاف "استعفیٰ دو! استعفیٰ دو!" کے نعرے لگائے گئے۔ کونسل کے ممبروں نے سرکار کا بجٹ گھٹا کر صرف ایک رُوپیہ کر دیا تھا اور سرکار نے بھی اس کے جواب میں گاندھی جی پر اتنی ہی رقم کا — ایک رُوپے کا — جُرمانہ کر دیا تھا۔

(۲)

اِن تمام ہنگاموں کے درمیان انور نے اِس بات کو کوئی اہمیت نہیں دی کہ بہت بڑی حد تک پروفیسر سلیم کے اثر کی وجہ سے اُسے یونیورسٹی کی ہسٹری سوسائٹی کا سکریٹری بنا دیا گیا۔ لیکن آگے چل کر اُسے پتہ چلا کہ یہ حالات کے اُس سلسلے کی پہلی کڑی تھی جس نے اُس کی ساری زندگی کا رُخ بدل دیا اور اُسمیں ایک نیا ہی رنگ پیدا کر دیا۔

پروفیسر سلیم نے انور کو اُس کے اِس نئے عہدے کے لئے مُبارکباد دیتے ہوئے اُسے یاد دلایا کہ اگلے مہینے سے وہ سِوِل سروِس کے امتحان کے لئے لڑکوں کو تیار کرنے کے واسطے ایک کلاس لینا شروع کریں گے اور انہوں نے انور سے کہا کہ وہ بھی اُس کلاس میں شامل ہو جائے۔ انور نے اُس امتحان میں بیٹھنے کا کوئی پکّا ارادہ نہیں کیا تھا لیکن نہ بیٹھنے کا بھی کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا۔ اِس لئے اُس نے سوچا کہ پروفیسر صاحب کو مایوس کرنے یا سلمہ سے بحث کرنے سے کیا فائدہ، کیونکہ سلمہ تو اُس دن کے انتظار میں تھی جب اُس کا انور سِوِل سروِس میں آ جائے گا۔

انور کی عمر اِس وقت اُنتیس برس سے کچھ زیادہ ہو چکی تھی۔ وہ گریجویٹ تھا اور محبت بھی کرتا تھا۔ لیکن ابھی تک اُس نے فیصلہ نہیں کیا تھا کہ آگے چل کر وہ زندگی میں کیا کریگا۔ اُسے بنیادی طور پر تاریخ کے بارے میں ریسرچ کرنے میں دلچسپی تھی اِس لئے اُس نے ایم۔ اے میں تاریخ لے لی تھی۔ اُس کے ابا چاہتے تھے کہ وہ وکیل بنے اور سب ہی مُسلموں کی طرح ہی اِس مسئلے پر بھی اپنی برادری کی بھلائی کے نقطۂ نظر سے سوچتے ہوئے اُنہوں نے ایک بار کہا تھا "مسلمانوں میں قابل وکیلوں کی بہت ضرورت ہے اور اِس لئے انور ایل ایل بی کے لئے بھی پڑھ رہا تھا۔ حالانکہ وہ شام کے وقت ہونے والی لاء کلاس میں کبھی

کبھی ہی جاتا تھا۔ پروفیسر سلیم جو اُس سے ہونے والے سُسر کی طرح رُعب سے بات کرتے تھے، چاہتے تھے کہ وہ سِوِل سروِس کے امتحان میں بیٹھے اور وہ اُس کے لئے بھی تیّار ہو گیا تھا۔

اُس کے دل کی گہرائی میں یہ سوال اُسے ہر وقت پریشان کرتا رہتا تھا کہ وہ آگے چل کر کیا کرے گا لیکن اُسے یہ نہیں معلوم تھا کہ اُس کے بہت سے ہم وطنوں کی طرح ہی اُس کی زندگی کے ڈھرے کا فیصلہ بھی کسی ایک آدمی کی مرضی کے مطابق نہیں ہوگا بلکہ اُس کی زندگی کا راستہ تو اُن واقعات کے مطابق طے ہوگا جو ابھی تک وقت کی کوکھ میں پل رہے تھے اور اُن طاقتوں کے ذریعے طے ہوگا جو تاریخ کی طرح پھیلی ہوئی تھیں۔

(۳)

۲۱ر مارچ کا دن تھا۔ گرمی کچھ کم تھی اور حالانکہ ہواؤں میں رات کے وقت اب بھی کچھ خنکی رہتی تھی پھر بھی میرِس روڈ سے دو میل پیدل چل کر آنے کی وجہ سے انور کے جسم میں کچھ گرمی آ گئی تھی۔ سلمہ اُس شام بہت خوش تھی۔ وہ دونوں بیڈمنٹن کھیلے تھے۔ انور سلمہ سے ہار گیا تھا اور اپنی اِس ہار پر بے حد خوش تھا۔ سلمہ نے اُسے اپنی بچپن کی تصویروں کا البم دکھایا اور اُس نے جوشؔ کی ایک نئی نظم پڑھ کر اُسے سُنائی تھی اور پروفیسر صاحب نے اُن دونوں کو اپنی آکسفورڈ کے زمانے کی زندگی کے دلچسپ قصّے سُنائے تھے۔ دونوں ہی بے حد خوش تھے اور جب پروفیسر صاحب اپنا پائپ لینے کے لئے اُٹھ کر چلے گئے تھے تو سلمہ نے انور کو ایک بوسہ بھی دیا تھا۔

جس وقت انور ہوسٹل پہنچ کر اپنے کمرے میں گیا اُس وقت وِکٹوریا گیٹ کے گھنٹہ گھر کی گھڑی نے گیارہ بجائے۔ اُس نے سوچا تھا کہ گھنٹہ بھر تک اپنے گرم بستر میں

لیٹ کر کوئی کتاب پڑھے گا اور پھر چین سے سو کر سنہرے خواب دیکھے گا۔ لیکن کمرے میں گھستے ہی اُس نے دیکھا کہ سُبحان کپڑے پہنے بیٹھا اُس کا انتظار کر رہا ہے۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ کہیں جانے کے لئے تیار ہو کر آیا ہے۔

"ہیلو، سبحانوسکی کیا انقلاب کی گھڑی آپہنچی ہے؟" اُس نے اپنے "روسی" دوست کا استقبال کرتے ہوئے مذاق میں کہا۔ سبحان بھی اِس مذاق کا کبھی بُرا نہیں مانتا تھا۔

"ہاں، اِس بار تو آہی پہنچی ہے۔" سُبحان نے جواب دیا "تم نے اخبار نہیں پڑھا آج کا؟"

"ہاں ہاں، پڑھا کیوں نہیں؟ صُبح اُٹھ کر پہلا کام یہی کیا تھا، لگتا ہے سارے کامریڈ ایک ہی ساتھ گرفتار کر لئے گئے ہیں، تُم اب ہم لوگوں سے کیا چاہتے ہو؟ کیا ہم لوگ اِس ظُلم کے خلاف اپنی آواز اُٹھانے کے لئے کوئی میٹنگ کریں؟"

"وہ تو بعد میں دیکھا جائے گا" سُبحان نے کہا "ابھی تو تُم میرے ساتھ دِلّی چلو، اُن سب لوگوں کو میرٹھ لے جایا جا رہا ہے اور اگر ہمارا داؤ لگ گیا تو ہم اُن کے ساتھ غازی آباد تک چلے جائیں گے۔ لیکچر کے وقت تک لوٹ آئیں گے۔"

"تو تیرتھ کرنے جا رہے ہو! اچھّی بات ہے کامریڈ۔ میں چلتا ہوں۔ لیکن یہ بتاؤ کہ تمہارے پاس ٹکٹ خریدنے کے لئے کافی "ماسکو گولڈ" ہے یا ہمیں بنا ٹکٹ کے ہی سفر کرنا پڑے گا؟"

اور اِس طرح ہنسی مذاق کرتے ہوئے وہ دونوں چل پڑے۔ انور اِس لئے راضی ہو گیا تھا کہ اُس نے سوچا کہ چلو مزا رہے گا لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ سُبحان نے اُسے اپنے ساتھ لے جانے کے لئے کیوں چُنا تھا۔ وہ اُن اِنے گنے لوگوں میں سے تھا جسے

سیاست میں دلچسپی تو تھی لیکن وہ کسی پارٹی کے ساتھ بندھا ہوا نہیں تھا اس لئے سیاست کے میدان کے سارے شکاری انور کو اپنے جال میں پھنسانے کی کوشش میں رہتے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ کانگریسی، کمیونسٹ، مسلم لیگی اور یہاں تک کہ سرکار کے ٹوڈی بھی جو اپنے آپ کو لبرل کہتے تھے، اُس کے ضمیر کو اپنے بس میں کرنے کے لئے لڑ رہے تھے۔ ان میں سجان سب سے زیادہ ہوشیار تھا اور انور کو وہ اچھا بھی سب سے زیادہ لگتا تھا۔ وہ سمجھدار تھا، خود اپنی بات کہنے کے ساتھ دُوسرے کی بات سُننے کو بھی تیار رہتا تھا۔ اگر وہ یہ سمجھتا ہے کہ 'لال' لیڈروں کی ایک جھلک دیکھ لینے سے انور جیسا گمراہ آئیڈیلسٹ، کمیونزم کے راستے پر لگ جائے گا تو اسے اسی میں خوش رہنے دو۔ جہاں تک انور کا سوال تھا وہ ان لیڈروں کو دیکھنے کے لئے اتنا خواہش مند ضرور تھا کہ ڈیڑھ سو میل کا سفر کرنے میں بھی اُسے کوئی اعتراض نہیں تھا۔

وہ اخباروں میں پڑھ چکا تھا کہ ان لیڈروں میں سے ایک لیجسلیٹو کونسل کے ممبر تھے، ایک ڈاکٹر تھے، کئی طالب علم تھے، کئی ایسے دانشور تھے جن کا کسی پارٹی سے تعلق نہیں تھا اور کلکتے اور بمبئی کی ٹریڈ یونینوں کے خاص عہدے دار تھے۔ اُن میں دو انگریز اور کئی مسلمان بھی تھے۔ کمیونسٹ تحریک ایک بین الاقوامی تحریک تھی اور اِس لحاظ سے جو لوگ پکڑے گئے تھے وہ اِس تحریک کی پوری طرح نمائندگی کرتے تھے۔

انور کو "لیڈروں" سے ایک پیدائشی چڑ تھی۔ اُسے ہمیشہ ایسا لگتا تھا کہ کچھ لیڈروں کو چھوڑ کر باقی سارے ہر وقت اپنی لیڈری کا رُعب ڈالنے کے لئے ایک خاص قسم کے کپڑے پہنتے تھے، خاص قسم کی باتیں کرتے تھے اور کچھ خاص بندھے ہوئے لفظ ضرور بولتے تھے اور عوام کے سامنے بناوٹی خاکساری دکھاتے تھے۔ اُسے یہ بات بہت ہی

عجیب لگتی تھی کہ اچھا کھانے اور اچھا پہننے والے لیڈر "بھوکے عوام" کی باتیں کریں اُسے کچھ ڈر تھا کہ جن قیدیوں سے ملنے وہ جارہا تھا وہ اسی طرح کے آرام کرسی پر بیٹھ کر سیاست بگھارنے والے انقلابی ہوں گے۔ فرانس، روس اور آئرلینڈ کے اُن انقلابیوں جیسے نہیں ہوں گے جن کے بارے میں اُس نے کتابوں میں اتنا پڑھ رکھا تھا۔

جس وقت اُن کی گاڑی دِلّی کے سٹیشن پر پہنچی اُس وقت جمنا پر سے صبح کا کہرا چھٹ رہا تھا۔ ابھی تک کافی اندھیرا تھا اور تیسرے درجے کے کھچا کھچ بھرے ہوئے ڈبے" میں کھلی کھڑکی کے پاس بیٹھے رہنے کی وجہ سے پلیٹ فارم پر اُترتے ہی اُنہیں ایک پیالی چائے کی فکر ہوئی۔ گھنٹوں اُبلی ہوئی اور کڑوی لیکن کھولتی ہوئی گرم چائے پی کر اُن کی جان میں جان آئی اور وہ میرٹھ والی گاڑی کی تلاش کرنے لگے۔ لیکن بمبئی سے آئے ہوئے قیدیوں کے لئے جو خاص ڈبہ" الگ کر دیا گیا تھا اُس میں گھسنا آسان کام نہیں تھا، اُس کے سامنے ہتھیار بند پولیس والوں کا بھاری پہرہ تھا جو ڈبے" کے دونوں طرف ٹہل ٹہل کر پہرہ دے رہے تھے۔

سُبحان کسی طرح گھس گھسا کر ڈبے" تک پہنچ ہی گیا اور انور نے پہلی بار اِن بدنام کمیونسٹوں کی جھلک دیکھی۔ اُن کے بارے میں سب سے پہلی بات تو اُس نے یہ دیکھی کہ وہ دیکھنے میں بالکل "لیڈر" نہیں لگتے تھے۔ وہ طرح طرح کے کپڑے پہنے تھے۔ کوئی سوٹ پہنے تھا تو کوئی دھوتی پر قمیص پہنے تھا، کوئی بند گلے کا سوئٹر پہنے تھا تو کوئی اوورکوٹ، کوئی شال اوڑھے تھا اور کسی کے سر پر ٹوپی تھی لیکن اُن میں سے کوئی بھی سفید کھدر کی "لیڈروں والی وردی" نہیں پہنے تھا۔ اتنے لمبے سفر کے بعد اُن کے بال بکھرے ہوئے، داڑھیاں بڑھی ہوئی اور کپڑے گندے تھے لیکن سب کے

سب بہت مست تھے۔ سُبحان نے سب سے پہلے جس سے ملاقات کی وہ ایک بہت ہی دُبلا پتلا لمبا سا پارسی تھا جس کی طوطے کی چونچ جیسی ناک پر بنا کمانی والی عینک ٹکی ہوئی تھی اور سفید بالوں کی لمبی لمبی لٹیں پیچھے لٹک رہی تھیں۔ اُس نے چھوٹتے ہی سامراجی نظام کے انجن کے ساتھ "ریڈ بوگی" جُڑ جانے کے بارے میں کوئی مذاق کیا۔ انور کو پتہ چلا کہ یہ جھاب والا صاحب تھے جو دراصل کمیونسٹ نہیں تھے، لیکن ہندوستان میں مزدوروں کے جتنے ٹریڈ یونین اُنہوں نے بنائے تھے اُتنے کسی اور نے نہیں بنائے تھے۔ اس سارے گروہ میں دو انگریز بہت چمک رہے تھے۔۔۔ ایک تو چارلی چپلن جیسی مونچھوں والا دُبلا پتلا سپریٹ SPRATT اور دوسرا بھاری بھرکم جسم والا بریڈلے BRADLEY، جو سرمئی رنگ کا ڈبل بریسٹ سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ اُن سب میں ایک ہی بھلا آدمی لگ رہا تھا۔ سبحان نے انور کو کچھ اور لوگوں کے نام بتلائے جنہیں وہ پہچانتا تھا۔۔۔ موٹے شیشے کا چشمہ لگائے ہوئے گھنے گھنے کالے بالوں والے دانشور جیسے نظر آنے والے ڈاکٹر اَدھیکاری جنہوں نے جرمنی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری لی تھی، ناٹے جیسے رنمکر، بکھرے ہوئے بالوں والے جوگلیکر اور کالج کے طالب علم لگنے والے مرجکر، یہ چاروں مراٹھے تھے اور آپس میں باتیں بھی مراٹھی میں کر رہے تھے۔۔۔ انور یہ بولی اپنی زندگی میں پہلی بار سُن رہا تھا۔ اس ڈبے کے لوگوں کو دیکھنے سے ایسا لگتا تھا کہ کسی کالج کی ٹیم کہیں میچ کھیلنے جا رہی ہو اور انور کو یہ دیکھ کر تسلّی ہوئی کہ کم سے کم یہ کمیونسٹ لیڈر بوڑھے تو نہیں تھے۔

آخر کار سبحان نے کسی طرح آگے بڑھ کر علی گڑھ یونیورسٹی کے مارکسسٹ سٹڈی سرکل کے سکریٹری کی حیثیت سے اپنا تعارف کرایا اور سب لوگ اُس سے

مل کر بہت خوش ہوئے اور کچھ نے تو مٹھی تان کر اُسے انقلابی سلام بھی کیا۔ کسی نے کہا۔ "تو یہ بیماری علی گڑھ میں بھی پھیل گئی ہے"۔ اور جب انور نے اپنی آٹوگراف بک نکال کر اُن سے سٹڈی سرکل کے لئے اُس پر کوئی پیغام لکھ دینے کو کہا تو سب نے ایک آواز سے کہا "ڈاک لکھیں گے"۔۔۔ اُن کا مطلب ادھیکاری سے تھا۔

"تم یونیورسٹی میں کیا پڑھتے ہو؟" ادھیکاری نے اپنا قلم کھولتے ہوئے پوچھا۔

"کلاس میں فلاسفی" سبحان نے جواب دیا "اور باہر مارکسزم"۔

"مارکسزم سے بڑھ کر کوئی دوسرا فلسفہ نہیں ہے"۔ ادھیکاری نے آٹوگراف بک واپس کرتے ہوئے کہا جس پر خوبصورت لفظوں میں لکھا ہوا تھا "اب تک فلسفیوں نے دنیا کی مختلف تشریحات کرنے کی کوشش کی ہے، ہمارا کام ہے اُسے بدلنا۔۔۔ کارل مارکس"

سبحان اُن کا شکریہ ادا کر ہی رہا تھا کہ اتنے میں گارڈ نے سیٹی بجادی اور انجن نے اُس کے جواب میں دوہری سیٹی بجائی۔ اب جا کر سبحان کو انور کا خیال آیا۔ "کامریڈ یہ ہیں ہمارے دوست انور علی ابھی مارکسسٹ تو ہیں نہیں لیکن جلد ہی راستے پر آجائیں گے"۔

"بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر کامریڈ" اور ایک بار پھر سب نے اُن دونوں سے ہاتھ ملائے۔ انور کو اِن مارکسسٹوں کے جوش اور اُن کی لگن کا اندازہ ہوا۔ اُن میں سے زیادہ تر اسی کے عمر کے تھے اور دیکھنے میں سب ہی متوسط طبقے کے دانشور معلوم ہوتے تھے۔ جو مزدوروں کے بیچ انقلاب کا پیغام لے کر جا رہے تھے۔ اُسے اِس بات پر تعجب ہو رہا تھا کہ اِن لوگوں نے ایک ایسے کام کا بیڑا کیوں اُٹھا لیا ہے جیسے

عام لوگوں میں مقبولیت حاصل نہیں تھی۔ اور دوسرا سوال اُس کے دل میں یہ اُٹھا کہ وہ کون سی چیز ہے جو اِن کی قوتِ ارادی کو بنائے رکھتی ہے۔

گاڑی چل پڑی تھی۔ "ریڈ بوگی" میں سے زوردار نعروں کی آواز سُنائی دی "سامراج واد مُردہ باد! اور انقلاب زندہ باد!" اور انور نے دیکھا کہ سپر یٹ اور بریڈلے یہ نعرے لگانے میں سب سے آگے تھے۔ دو انگریز ہندوستانیوں کے ساتھ مل کر "سامراج مُردہ باد" کا نعرہ لگا رہے تھے ـــــ یہ سچ مچ ایک انوکھی بات تھی اور انور نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا کہ وہ مارکس کی کتابیں بڑے غور سے پڑھے گا جس نے اِس ناممکن کو ممکن بنایا۔

(۴)

پہلے اُنہوں نے یہ پلان بنایا تھا کہ وہ کمیونسٹ لیڈروں کے ساتھ غازی آباد تک جائیں گے اور پھر وہاں سے علی گڑھ کی گاڑی پکڑ لیں گے۔ لیکن جب وہ لوگ اس میں کامیاب نہ ہو سکے تو وہ پنجاب میل کی جانی پہچانی ہر گاڑی کو ڈھونڈنے لگے۔ پلیٹ فارم پر کھدّر پوش لوگوں کی ایک بھیڑ جمع تھی۔ کچھ لوگوں کے ہاتھ میں کانگریس کے ترنگے جھنڈے تھے۔ ظاہر تھا کہ کوئی کانگریسی لیڈر وہاں سے جا رہا تھا اور وہاں کے کانگریسی اُسے وداع کرنے آئے تھے۔ جب وہ اُس ڈبّے کے پاس سے گذرے تو اُنہوں نے دیکھا، سفید کپڑے پہنے ہوئے ایک آدمی مُسکرا کر لوگوں کا خیر مقدم کر رہا تھا۔ دیکھتے ہی ان دونوں نے پہچان لیا یہ تو جواہر لال نہرو تھے۔ انور کے دل میں ہمیشہ سے ایک ہی لیڈر سے ملنے کی تمنّا تھی اور وہ تھے جواہر لال نہرو اور اس وقت وہ اُن کے اتنے پاس کھڑا تھا۔ یہ ایک ایسا موقع تھا جسے وہ ہاتھ سے نہیں جانے دے سکتا تھا۔ لیکن کیا جواہر لال نہرو اُس کے جیسے معمولی طالب علم سے ملنا گوارا کریں گے؟! اُس نے سُن رکھا تھا کہ اُن کا مزاج بے حد

تیز ہے اور جب اُنہیں کوئی بات ناپسند ہوتی ہے تو وہ بڑے سے بڑے لیڈر کو بھی یہاں تک کہ اپنے باپ کو بھی نہیں بخشتے۔ اگر انور اُن کے پاس جاکر اُن سے کہے کہ وہ اُن سے کچھ منٹ بات کرنا چاہتا ہے تو کہیں وہ اُسے گستاخی تو نہیں سمجھیں گے؟ شاید وہ اُسے ڈبّے سے باہر نکال دیں۔ اور اگر یہ ہوا تو سبحان اور یونیورسٹی کے سارے لڑکے اس کی ہنسی اُڑائیں گے۔

"آؤ گاڑی چل رہی ہے"۔ سبحان نے کندھا پکڑ کر اُسے جھنجھوڑا۔ انور جیسے سپنا دیکھتے دیکھتے جاگ پڑا۔ دونوں سب سے پاس والے تیسرے درجہ کے ڈبّے میں گھُس گئے۔

غازی آباد کے سٹیشن پر بھیڑ بہت بڑی بھیڑ۔ "پنڈت جواہر لال نہرو کی جے" کے نعرے لگا رہی تھی اور انور نے اتنی بڑی بھیڑ دیکھ کر جا کر اس عظیم لیڈر سے ملنے کا ارادہ چھوڑ دیا۔

اس کے بعد گاڑی خرجہ جنکشن پر رکی۔ وہاں بہت ہی تھوڑے لوگ تھے اور انور نے سوچا کہ یہ آخری موقع ہے۔ اُس کے بعد گاڑی علی گڑھ پر ہی رُکے گی اور اگر وہ اب نہیں گیا تو پھر یہ موقع اُس کے ہاتھ کبھی نہیں لگے گا۔

"آؤ سبحان"۔ اُس نے سبحان کو باہر گھسیٹتے ہوئے کہا "چلو، چل کر پنڈت جواہر لال سے ملتے ہیں"۔

پلیٹ فارم پر کھڑے ہو کر نعرے لگاتے ہوئے مقامی والنٹیروں کے درمیان سے راستہ بناتے ہوئے انور اور سبحان ڈبّے میں گھُس گئے۔ کیونکہ پنڈت جی ابھی تک والنٹیروں سے بات کر رہے تھے اِس لئے جب تک گاڑی چل نہیں دی تب تک اُن کی توجہ ان دونوں کی طرف نہیں گئی۔

کھڑکی سے سر ہٹا کر انہوں نے پاس کی سیٹ پر پڑی ہوئی کتابوں میں سے ایک اُٹھالی اور دو گھبرائے ہوئے نوجوانوں کو آنکھیں پھاڑ کر اپنی طرف گھورتے دیکھ کر اُنہوں نے انگریزی میں کہا۔ "ہیلو" اور پھر اپنے ساتھی کی طرف مُڑ کر بولے "محمود، یہ کون لوگ ہیں؟"

"میرا خیال ہے سٹوڈنٹ ہیں آپ سے ملنا چاہتے ہیں اور اِن کی کالی شیروانیوں سے تو پتہ چلتا ہے کہ علی گڑھ کے لڑکے ہوں گے میں بھی وہیں پڑھتا تھا۔" انور اور سُبحان کو پتہ چلا کہ یہ ڈاکٹر سیّد محمود تھے جو کیمبرج کے زمانے سے پنڈت جی کے پُرانے دوست تھے اور اب اُن کے ساتھ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جنرل سکریٹری تھے۔

پنڈت جی نے کتاب نیچے رکھ دی اور اُن کے خوبصورت چہرے پر جھُنجھلاہٹ کی ایک ہلکی سی لکیر دوڑ گئی اور پھر وہ ان بن بُلائے مہمانوں کی طرف مُڑ کر بولے: "تم لوگ بیٹھ کیوں نہیں جاتے؟" وہ چُپ چاپ سیٹ کے کنارے پر ٹِک کر بیٹھ گئے۔

انور جس آدمی کی پُوجا کرتا آیا تھا وہ اُس کے سامنے بیٹھا تھا۔ پنڈت جی تصویروں میں جتنے خوبصورت لگتے تھے سچ مچ وہ اتنے ہی خوبصورت تھے لیکن انور نے جیسا سوچا تھا اُس کے مقابلے میں اُن کا قد کافی چھوٹا تھا۔ اُن کی سفید گاندھی ٹوپی کافی ترچھی لگی ہوئی تھی اور کھدّر کی اُونی شیروانی کے تیسرے بٹن میں گلاب کا ایک تازہ سُرخ پھُول لگا ہوا تھا۔ ایک رئیس باپ کے اِس بیٹے کے بارے میں اَن گنت قِصّے مشہور تھے۔ جیسے یہ کہ وہ پرنس آف ویلز کے ساتھ پڑھتے تھے اور یہ کہ اُن کے کپڑے اکثر پیرس سے دُھل کر آتے تھے۔ لیکن یہ بات سب ہی لوگ جانتے تھے کہ انہوں نے قوم کی خاطر اپنی چلتی ہوئی بیرسٹری اور عیش و آرام کی زندگی چھوڑ دی تھی۔ کئی برس سے وہ کانگریس کے جنرل سکریٹری تھے لیکن اُن کا تعلّق کئی ایسے اداروں سے بھی تھا جو زیادہ انقلابی تھے جیسے

انڈیپنڈنس آف انڈیا لیگ اور یوتھ لیگ۔ کئی لوگوں کو یہ یقین تھا کہ وہی کانگریس کے پرانے دقیانوسی لیڈروں کو مکمّل آزادی کے اصول کی طرف ڈھکیل رہے تھے۔ کچھ لوگوں کا تو یہ بھی خیال تھا کہ جلد ہی وہ کانگریس کے پریسیڈنٹ بن جائیں گے۔

پنڈت جی کے خوبصورت ماتھے پر بے چینی کی وجہ سے بل پڑ گئے۔ بولے "کچھ تو بولئے۔ ظاہر ہے آپ لوگ اتنی دُور صرف مجھے گھورنے تو نہیں آئے ہیں۔"

انور کے دماغ میں سیکڑوں ایسے سوال مچل رہے تھے جن کے بارے میں وہ پوچھنا چاہتا تھا۔ مکمّل آزادی کے بارے میں، سوشلزم کے بارے میں، کمیونسٹوں کی گرفتاری کے بارے میں، ہنسا اور اہنسا کے بارے میں۔۔۔ لیکن اِس طرح اچانک اُس سے کچھ بولنے کو کہا گیا تھا کہ وہ صرف یہی پوچھ سکا۔ "پنڈت جی، کیا یہ سچ ہے کہ آپ پرنس آف ویلز کے ساتھ پڑھتے تھے؟"

"بکواس ہے۔" اُنھوں نے یہ دو لفظ اتنی زور سے اور اتنا جھنجھلا کر کہے تھے کہ انور کو تو ایسا لگا کہ اب اُنہیں چلتی گاڑی سے نیچے پھینک دیا جائے گا۔ "یہ سب بکواس ہے، میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر یہ سب بے ہودہ قِصّے پھیلاتا کون ہے؟ جیسے کسی ہندوستانی کے لئے، بادشاہ کے بیٹے کے ساتھ پڑھنا کوئی بہت بڑی عزّت کی بات ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ نہ صرف ہم کبھی ساتھ پڑھتے نہیں تھے بلکہ مجھے تو کبھی اُن سے ملنے یا بات کرنے کا بھی اتفاق نہیں ہوا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب آپ کا دُوسرا سوال یہ ہوگا کہ کیا میرے کپڑے پیرس سے دُھل کر آتے ہیں؟"

اِس قصّے کے بارے میں پوچھنے کی انور کی ہمت نہیں ہوئی تھی لیکن کیونکہ اب پنڈت جی نے خود ہی اِس بات کا ذکر کیا تھا تو انور نے بہت کھسیاتے ہوئے کہا "لوگ کہتے تو

بھی ہیں۔"

"لوگ! آخر یہ لوگ کون ہیں؟ جنہیں کوئی نہیں جانتا لیکن جو ہر بات جانتے ہیں۔" پنڈت جی نے جب طیفے سے بات کرتے تھے تو اُن کا لہجہ سخت ہو جاتا تھا۔ "جی ہاں، پیرس میں کپڑے دُھلوانے کی بات بھی ایک ہی کہی! اِس سے زیادہ بے تُکی اور بیوقوفی کی بات تو میں سوچ بھی نہیں سکتا اور اگر کوئی آدمی اتنا بڑا بیوقوف ہو کہ وہ ایسی شیخی کی حرکت کرے تو میری رائے میں تو اُسے دنیا کے سب سے بڑے بیوقوف کا انعام ملنا چاہیئے۔ لیکن میں آپ لوگوں کو کیوں ڈانٹ رہا ہوں؟" اور انور نے ایک بہت ہی عجیب بات دیکھی۔ پلک مارتے اُن کے چہرے پر سے جھنجھلاہٹ کے نشان غائب ہو گئے اور اُس کی جگہ ایک دوستانہ مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ "اچھا، ہم لوگ ایک دوسرے کو جان لیں۔ میرا نام تو شاید آپ لوگوں کو معلوم ہی ہو گا۔" اِس بات پر انور اور سبحان ہنس پڑے۔ "اور یہ ڈاکٹر محمود ہیں۔"

انور نے اپنا اور سبحان کا تعارف کرایا اور دونوں سے ہاتھ ملایا۔ اُس کے بعد دونوں نے سوچا کہ سیٹ پر آرام سے بیٹھ جانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ایک سگریٹ سُلگا کر پنڈت جی نے اُن دونوں سے پوچھا کہ وہ سگریٹ تو نہیں پئیں گے اور جب دونوں نے شکریہ کے ساتھ منع کر دیا تو انہوں نے کہا "تو پھر سنترہ یا سیب کھا لو" اور پھر ایک ٹوکری میں سے جو اُن کا کوئی چاہنے والا اُن کے لئے دے گیا تھا، سنترے اور سیب نکال کر اُنہوں نے ہوا میں اُچھالے۔ سبحان نے تو اپنا سیب کیچ کر لیا لیکن انور والا نیچے گر پڑا۔

"فیلڈنگ میں کچے ہو۔" کیمبرج کے پڑھے جواہر لال نے ہنس کر کہا۔ "معلوم ہوتا

ہے کبھی کرکٹ نہیں کھیلے۔" اور اس کے بعد ان کے درمیان تکلفات کی جو دیواریں کھڑی تھیں وہ ٹوٹ گئیں اور ایسا لگنے لگا کہ ایک "لیڈر" اور دو طالب علم نہیں بلکہ تین ایسے نوجوان آپس میں باتیں کر رہے ہیں جنہیں ایک جیسی باتوں میں دلچسپی ہے۔ جواہر لال بہت دوستانہ لہجے میں بات چیت کر رہے تھے لیکن ان کے اِس لہجے میں بھی ایک قدرتی جھجک تھی۔ وہ زیادہ تر کتابوں کے بارے میں، مصنفوں کے بارے میں، کالج کی عام زندگی کے بارے میں اور سیاست کی طرف لڑکوں کے رویتے کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔

"اچھا یہ بتاؤ تم نوجوانوں کا آجکل کے سیاسی حالات کے بارے میں کیا خیال ہے؟" انہوں نے پوچھا۔ انور کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ سب لڑکوں کا رویّہ موٹے طور پر کیسے بیان کرے۔ اِس لئے اُس نے کہا۔ "میں خود تو گاندھی جی کے اصولوں کو بہت اچھا سمجھتا ہوں۔ میرے یہ دوست سبحان مارکسسٹ ہیں اور میرا ایک اور دوست ہے جو ہتھیاروں کے بل پر انقلاب لانا چاہتا ہے، وہ انگریز افسروں کو جان سے مار ڈالنا چاہتا ہے۔" لیکن اُس نے رتن کا نام نہیں بتایا۔

ایسا لگا کہ یہ سُن کر جواہر لال کچھ سوچنے لگے اور تھوڑی دیر تک وہ بالکل چپ چاپ بیٹھے رہے اور پھر اُنہوں نے ایک ایسی بات کہی جس کا انور اُس وقت کوئی مطلب نہیں سمجھ سکا اور اس وقت جو بات چیت ہو رہی تھی اُس سے اُس کا کوئی تعلق بھی نہیں معلوم ہوتا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ کوئی بات سوچ رہے تھے جو اُن کے منہ سے نکل گئی تھی۔ اُنہوں نے کہا "طوفان آنے والا ہے" اور یہ کہہ کر وہ کھڑکی کے باہر دیکھنے لگے۔ اُن کی نظروں کے ساتھ ساتھ انور کی نظریں بھی باہر آسمان کی طرف اُٹھ گئیں اور وہ

دیکھنے لگا کہ کیا آسمان پر واقعی طوفان آنے کے آثار دکھائی دے رہے ہیں۔ جواہر لال دوسرے ہی قسم کے طوفان کی طرف اشارہ کر رہے تھے کیونکہ اس کے بعد ہی انہوں نے کہا "تم نوجوانوں کو چاہیئے کہ آزادی کی لڑائی کے لئے تیار رہو۔ کیونکہ جلد ہی وہ وقت آنے والا ہے جب بہادری کی اِن باتوں کو بہادری کے کاموں سے سچ کر کے دکھانا ہوگا۔"

سُبحان نے اپنی آٹوگراف بُک نکال کر اُن کے سامنے بڑھا دی اور اُس کے اوراق پلٹتے وقت انہوں نے ادھیکاری کے دستخط دیکھے۔ سُبحان نے انہیں بتایا کہ وہ ابھی کچھ ہی گھنٹے پہلے کمیونسٹ قیدیوں سے مل کر آئے ہیں۔ پنڈت جی نے اِس بات میں بڑی دلچسپی دکھائی اور سُبحان نے جیسے اپنے مارکسسٹ ساتھیوں کی طرف سے سوال کیا: "پنڈت جی ٹریڈ یونینوں کے جو یہ لیڈر گرفتار کئے گئے ہیں اُن کے سلسلے میں آپ کیا کرنے جا رہے ہیں؟"

"میں کہہ نہیں سکتا"۔ پنڈت جی نے صاف الفاظ میں اقرار کیا۔ "ہمیں ابھی تک اس سوال پر غور کرنے کا وقت نہیں ملا ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ ہمیں اُن کی پیروی کرنے کے لئے ایک کمیٹی بنانی چاہیئے اور انہیں پُوری قانونی مدد دینی چاہیئے۔"

اِس بات پر اُودے کو بہت تعجّب ہوا کیونکہ اُس نے سُن رکھا تھا کہ کمیونسٹ کانگریس کے کٹّر دشمن تھے اور اُسے رجعت پسند تنظیم سمجھتے تھے اور جواہر لال پر بھی حملہ کرنے سے نہیں چُوکتے تھے۔ اِس لئے اُس نے بے جھجک پوچھا "یہ لوگ آپ کے خلاف، گاندھی جی کے خلاف اور کانگریس کے خلاف جو پرچار کرتے ہیں کیا اس کے باوجود، آپ اُن کا ساتھ دیں گے؟"

پنڈت جی کے خوبصورت ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ "میں جانتا

ہوں، میں جانتا ہوں۔ کچھ کمیونسٹوں نے تو دوستوں کو بھی ناخوش کرنے کا ایک خاص طریقہ اپنا لیا ہے، لیکن یہ مت بھولو کہ یہ لوگ بہت آزمائے ہوئے لوگ ہیں اور انہیں بہت بڑی بڑی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ اگرچہ کہ ہم کو ان کے خیالات سے اتفاق نہیں ہے لیکن ہمیں ان کی ہمت کی اور ان کی قربانی کی تو تعریف کرنی ہی پڑے گی۔"

انہوں نے جلدی سے کچھ لکھ کر آٹوگراف بُک سبحان کو واپس کر دی اور پھر انور کی طرف مُڑ کر پوچھا "تم یونیورسٹی میں کیا پڑھ رہے ہو؟"

"ہسٹری میں ایم اے کر رہا ہوں۔"

"میرے خیال میں وہی پرانے ڈھنگ کی کتابیں پڑھائی جاتی ہوں گی ــــ فلاں سن، فلاں تاریخ، بادشاہوں اور لڑائیوں کا حال، عام لوگوں کا کوئی ذکر نہیں۔ بہت اچھا اور بہت ضروری سبجکٹ ہے۔ لیکن میری رائے میں ہماری یونیورسٹیوں میں بہت بُرے ڈھنگ سے پڑھایا جاتا ہے۔" انور نے کہیں پڑھ رکھا تھا کہ جواہرلال نے کیمبرج میں بیالوجی پڑھی تھی اور اسے اِس بات پر بڑا تعجب ہوا کہ وہ ہسٹری میں اتنی دلچسپی دکھا رہے تھے۔ اِس لئے اُس نے کہا کہ وہ ہندوستان کی تاریخ کے کسی ایک دَور کے بارے میں ریسرچ کرنا چاہتا ہے۔

"خیال تو اچھا ہے لیکن صرف کتابوں میں ہی اُلجھ کر نہ رہ جانا۔ ذرا باہر نکل کر تاریخ کی اور اپنی پرانی تہذیب کی شاندار یادگاروں کو بھی دیکھنا، جو کنیا کماری سے لیکر ٹکسیلا تک جگہ جگہ دکھائی دیتی ہیں ــــ لیکن ان سب چیزوں سے بڑھ کر عوام کو دیکھنا کیونکہ ان میں تمہیں جیتی جاگتی تاریخ کی جھلک ملے گی۔" عظیم لیڈر نے آخر میں اُسے یہ صلاح دی۔

اُن کی باتیں سنتے ہوئے انور کو خیال آیا کہ وہ ہسٹری سوسائٹی کا سکریٹری بھی تھا،

کیونکہ اب اُس کی سمجھ میں آگیا تھا کہ اُسے سکریٹری کی حیثیت سے کیا کرنا چاہیئے۔ وہ اپنی سوسائٹی کے سارے ممبروں کو تاریخی اہمیت کی جگہیں دکھانے لے جائے گا۔ سارناتھ اور بنارس، الہ آباد اور ایودھیا، آگرہ اور دِلّی.....

لیکن گاڑی اب علی گڑھ پہنچ چکی تھی اور اُنہیں جی نہ چاہتے ہوئے بھی وداع ہونا پڑا۔ پلیٹ فارم پر لوگوں کی بھیڑ جمع تھی جن میں سے زیادہ تر طالب علم تھے کسی طرح لوگوں کو بھنک پڑ گئی تھی کہ پنڈت جی اُس گاڑی سے اُدھر سے گذریں گے۔ لوگ نعرے لگا رہے تھے "پنڈت جواہر لال نہرو کی جے!" انور اور سبحان کو بھیڑ کے بیچ سے نکلنے میں کافی دِقّت ہوئی لیکن جب انہوں نے مُڑ کر دیکھا تو پنڈت جی انہیں دیکھ کر ہاتھ ہلا رہے تھے۔

ایک بیٹھ کر اِکّے پر بیٹھ کر ہوسٹل واپس جاتے ہوئے انور نے سبحان سے جواہر لال کے آٹو گراف دکھانے کو کہا۔ انہوں نے اپنے دستخط کے اُوپر صرف یہ الفاظ لکھے تھے ——

"جان ہتھیلی پر لے کر چلو۔"

اِکّے کی کھڑکھڑاہٹ کے ساتھ ساتھ انور کے دماغ میں لگاتار یہی الفاظ گونج رہے تھے۔ جان ہتھیلی پر لے کر چلو! جان ہتھیلی پر لے کر چلو! جان ہتھیلی پر لے کر چلو! اُس کے دماغ میں ابھی یہ بات بالکل صاف نہیں تھی لیکن نہ جانے کیوں اُسے ایسا لگ رہا تھا کہ اُن الفاظ نے اُس کے سامنے زندگی کا وہ راستہ کھول دیا تھا جسے وہ بہت دنوں سے کھوج رہا تھا۔

(۵)

اس کے بعد کچھ دن تک انور نے جو بھی کام کیا وہ اپنے سامنے ایک خاص مقصد رکھ کر۔ اُس نے پنڈت جواہر لال نہرو کے ساتھ اپنی ملاقات کے بارے میں، ایک مضمون لکھا

اُسے پھاڑ ڈالا، پھر لکھا، کئی بار ٹھیک کیا، پھر اُسے صاف صاف نقل کیا اور اُسے بھاری بھرکم سُرخی دے کر " نہرو ہمارے مستقبل کی اُمید " دلّی میں ہندوستان ٹائمز کے پتے پر بھیج دیا، لیکن کسی کو کانوں کان اِس کی خبر لگنے نہیں دی کیونکہ وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ اگر وہ مضمون نہ چھپے تو لوگ اُس کا مذاق نہ اُڑائیں۔

اِسی دوران اُس نے ہسٹری سوسائٹی کا پچھلا حساب کتاب دیکھا تو معلوم ہوا کہ یونیورسٹی کے خزانچی کے پاس سوسائٹی کے چھ سو ستّاون رُوپے ساڑھے نو آنے پڑے ہوئے ہیں کیونکہ پچھلے سال کے سکریٹری نے کوئی کام ہی نہیں کیا تھا اِس لئے کوئی خرچ بھی نہیں ہوا تھا۔ پھر وہ ہسٹری ڈپارٹمنٹ کے چیرمین کو اِس دورے کی اجازت دے دینے کے لئے راضی کرنے کے کام میں جُٹ گیا۔ پروفیسر حبیب بہت ہی شریف آدمی تھے اِس لئے اُنھیں راضی کرنے میں کوئی دِقّت نہیں ہوئی، لیکن اسے پرو وائس چانسلر سے بھی اپنی تجویز منظور کرواتا تھا لیکن یہ کام آسان نہیں تھا۔ یہ انگریز صاحب کلاس روم اور کھیل کے میدان کے باہر طالب علموں کی ہر حرکت کو شک کی نظر سے دیکھتے تھے اور اُنہیں ایسی ہر حرکت میں حکومت کے خلاف بغاوت کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ اُنھوں نے یونیورسٹی سوشل سروس لیگ کی مثال بھی پیش کی اور بتایا کہ اِس لیگ نے آس پاس کے گاؤوں کے لوگوں کو چھوٹی موٹی ڈاکٹری مدد پہنچانے کی غرض سے لڑکوں کی کچھ ٹولیاں سائیکلوں پر وہاں بھیجی تھیں ــــ کونین کی گولیاں بانٹنے کے لئے، زخموں پر ٹنکچر آیوڈین لگانے کے لئے اور دُکھتی ہوئی آنکھیں بورک سے دھونے کے لئے ــــ لیکن یہ غیر نقصان دہ پلان بھی کس طرح کمیونسٹوں کی بھیانک سازش بن گیا تھا۔ ایک لڑکے نے یونین میں کھڑے ہو کر بتایا کہ سماج سیوا کے نام پر لگائے

گئے ان چکروں کے دوران اس نے گاؤں کی کیا حالت دیکھی تھی اور پھر زمینداروں اور سرکار کو گالیاں دیتے ہوئے ایک جوشیلی تقریر کر ڈالی تھی۔ لیکن انہوں نے کہا کہ انور اگر یقین دلائے کہ یہ تجویز تاریخ کے بارے میں لڑکوں کی معلومات بڑھانے کے لئے ہی بڑھائی گئی ہے تو وہ ....

انور نے پرووائس چانسلر صاحب کے بھی دستخط کرا لئے اور جو بیس لڑکے اس سفر کے لئے چُنے گئے تھے انہوں نے انور کے پاس خرچ بھر کے پیسے بھی جمع کر دیئے۔ ایک لاری کرائے پر لی گئی اور چھبیس مارچ کو صبح سویرے ہی یہ ٹولی روانہ ہو گئی۔

یہ سفر سچ مچ بہت ہی دلچسپ رہا۔ متھرا اور برنداون کے دیہاتوں اور آگرہ اور فتح پور سیکری کی عالیشان عمارتوں کی اپنی اپنی الگ ہی کشش تھی۔ کچھ لڑکوں نے اپنی کاپیوں میں اِن عمارتوں کی بناوٹ اور پتھر پر کُھدی ہوئی عربی کی لکھائی کی تصویریں بنالیں، لیکن کچھ لڑکوں کو صرف سیر کرنے میں دلچسپی تھی۔

دلّی میں انور ٹھہرا اپنے گھر پر ہی تھا لیکن وہ زیادہ تر وقت دِلّی گھومنے اور اپنے ساتھیوں کو تاریخی جگہیں دکھانے میں صرف کرتا تھا۔

قُطب مینار جاتے وقت لاری برن بیسٹین برج کے پاس سے مُڑی اور انور نے "ہندوستان ٹائمز" کا سائن بورڈ لگا ہوا دیکھا۔ اُس نے ڈرائیور سے فوراً لاری رکوائی اور وہ اپنے ساتھیوں سے ایک منٹ میں واپس آنے کو کہہ کر چلا گیا۔ وہ ایڈیٹر کے دفتر میں گیا اور وہاں ہندوستان ٹائمز کے ایڈیٹر مسٹر پوتھن جوزف نے اُس کا استقبال کیا۔ اُنہوں نے انور کو بتایا کہ اُس کا مضمون جلد ہی چھپے گا۔ انہوں نے انور سے یہ بھی پوچھا کہ اُس کا دِلّی کس سلسلے میں آنا ہوا، اور جب انور نے انہیں بتایا کہ

وہ اپنے کچھ ساتھیوں کو لے کر تاریخی مقامات کا چکر لگا رہا ہے تو اُنہوں نے اُس سے اپنے اِس سفر کے بارے میں کچھ لائنیں لکھ دینے کو کہا اور چلتے چلتے یہ بھی کہا کہ یہ خبر اگلے دن کے اخبار میں چھپے گی۔

(۶)

جن دنوں انور دلّی میں تھا اُس زمانے میں ایک اور اہم واقعہ ہوا۔ وہ ایک دن صبح سو رہا تھا کہ اُس کے ابّا نے آکر اُسے جگایا اور کہا کہ اُس کا دوست رام لال اُس سے ملنے آیا ہے۔

وہ ابھی تک نیند کے نشے میں تھا۔ بڑبڑا کر بولا "رام لال؟ میں کسی رام لال کو نہیں جانتا۔" لیکن یہ نام دوہراتے ہی جیسے کسی نے اُس کی یادداشت کے تار چھیڑ دیئے۔ وہ اُچھل کر کھڑا ہو گیا اور بولا "کہاں ہے وہ؟"

رتن بیٹھک میں انتظار کر رہا تھا اور ملتے ہی اُس نے پہلی بات کہی "مجھے بہت خوشی ہے کہ تمہارے ابّا نے مجھے پہچانا نہیں۔"

"رتن مجھے تمہاری طرف سے بڑی فکر تھی۔ تم جس طرح علی گڑھ سے چلے آئے اُس کا مجھے بہت افسوس ہے۔ لیکن تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ میں یہاں ہوں؟"

رتن نے صبح کا لپٹا ہوا "ہندوستان ٹائمز" اُسے کھول کر دکھایا۔ "یہ دیکھو اس میں ہسٹری سوسائٹی اور اُس کے سکریٹری دی گریٹ مسٹر انور علی کی خبر چھپی ہے۔"

"تو اچھا ہی ہوا کہ اُس میں میں نے اپنا نام لکھ دیا تھا، کہیں پولیس تو تمہارا پیچھا نہیں کر رہی ہے؟"

"نہیں، تم فکر نہ کرو، یہاں دلّی میں مجھے کوئی نہیں جانتا۔"

انور کے ابّا نے اُن دونوں کے لئے ناشتہ بھجوادیا اور دونوں دوستوں نے پیٹ بھر کر کھایا۔ پھر انور کپڑے پہن کر تیار ہو گیا اور دونوں ساتھ باہر نکلے۔ گلیوں اور بازاروں میں چہل پہل شروع ہونے لگی اور اخبار بیچنے والے لڑکے خاص خاص خبریں چلّا چلّا کر اخبار بیچ رہے تھے۔

جب وہ دریا گنج کے چوراہے پر پہنچے تو رتن نے کہا "انور یاد ہے تم نے ایک بار کہا تھا کہ تم ہماری مدد کرنے کے لئے کچھ بھی کر سکتے ہو ـــ"

"ہاں! بشرطیکہ اُس میں کسی کو مارنے کا سوال نہ ہو۔ میں نے یہ بات اُس وقت بھی صاف کر دی تھی"۔

"نہیں"۔ رتن نے بہت دھیرے دھیرے سوچ کر کہا "کوئی مارا نہیں جائیگا"۔

"تم مجھ سے کیا کام لینا چاہتے ہو؟"

"میں تمہیں اپنے ایک دوست سے ملانا چاہتا ہوں وہ وہاں اُس موٹر میں ہم لوگوں کا انتظار کر رہے ہیں"۔

(۷)

رتن کا دوست اُن دونوں سے عمر میں بڑا نہیں تھا۔ اُس کا چہرہ بہت ہنس مکھ تھا اور اُس پر بڑی ملائمت تھی لیکن اینٹھی ہوئی نوکیلی مونچھوں کی وجہ سے اُس پر ایک قسم کی سختی آگئی تھی۔ وہ فوجی ڈھنگ کی خاکی قمیص اور گہرے رنگ کی پتلون پہنے ہوئے تھا اور سر پر فیلٹ ہیٹ لگائے ہوئے تھا جس کی لگر سامنے کو کچھ جھکی ہوئی تھی جس کا سایہ اُس کی آنکھوں پر پڑ رہا تھا۔

انور نے اُس سے ہاتھ ملایا اور اُسے ایسا لگا کہ اس ہاتھ کی پکڑ میں طاقت بھی تھی اور دوستی بھی۔ لیکن اُن دونوں کا ایک دوسرے سے تعارف نہیں کرایا گیا۔ انور نے یہ سمجھ لیا

کہ وہ اُس کے بارے میں جانتا ہی ہوگا اور کیونکہ اُسے معلوم تھا کہ اِس طرح کے انقلابی کتنی ہوشیاری برتتے تھے، اِس لئے اُس نے اُس کا نام پوچھا بھی نہیں۔ تینوں موٹر کی اگلی سیٹ پر گھس پل کر بیٹھ گئے اور مونچھوں والے اُس نوجوان نے سٹارٹر دبا دیا۔ گیر بدلتے ہی وہ بڑی سی کالی موٹر ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ وہ تیزی سے نئی دلّی کی طرف بڑھ رہے تھے۔

انور اُن دونوں انقلابیوں کے بیچ میں کچھ گھبرایا اور ڈرا ہوا بیٹھا تھا۔ اُسے یقین تھا کہ پولیس اُن دونوں کی تلاش میں ہوگی۔ انور نے کنکھیوں سے موٹر چلانے والے کو دیکھا، موٹر چلانے والے کے ہاتھ بہت چکنے اور صاف تھے اُس کی انگلیاں لمبی اور نازک تھیں جیسے آرٹسٹوں کی ہوتی ہیں، لیکن جس مضبوطی کے ساتھ وہ سٹیرنگ وہیل پکڑے ہوئے تھا اُس سے اُن ہاتھوں کی طاقت کا بھی پتہ چلتا تھا۔

اُس کا ترچھا لگا ہوا ہیٹ اُس کی سادگی کے ساتھ میل نہیں کھاتا تھا اور حالانکہ اُس کی قمیص اور اُس کی مونچھوں پر فوجی پن کی چھاپ تھی پر وہ بہت ہی دھیمی آواز میں غالبؔ کی ایک غزل گنگنا رہا تھا اور جو شعر وہ گنگنا رہا تھا وہ بھی بہت معنی خیز تھا۔

آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
عُذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا؟

اِس گمنام انقلابی کو اپنے مقبول شاعر غالبؔ کا شعر گنگناتے دیکھ کر انور اُس کی طرف آپ ہی آپ کھنچ گیا۔ موٹر تیزی سے بھاگی چلی جا رہی تھی اور انور دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ کیا وہ یہ غزل صرف اِس لئے گنگنا رہا ہے کہ اُس وقت اتفاق سے وہی غزل اُس کے دماغ میں آ گئی تھی یا اِس لئے کہ اُس غزل میں انقلابی کی جان کی بازی لگا دینے اور اپنے آپ کو قربان کر دینے کا جذبہ ظاہر ہوتا تھا؟

موٹر اچانک بائیں طرف گھوم کر پُرانے قلعے کی طرف بڑھی اور انور کے خیالوں کی زنجیر بھی ٹوٹ گئی۔

"کدھر جارہے ہیں ہم لوگ؟" اُس نے گھبرا کر پوچھا۔

"فکر نہ کرو"۔ رتن نے اُسے تسلّی دیتے ہوئے کہا "تم نئی دِلّی میں جہاں بھی چاہو گے وہاں ہم تمہیں اُتار دیں گے، لیکن پہلے ہمیں تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔"

کھنڈروں کے پاس پہنچ کر موٹر رک گئی۔ موٹر چلانے والے نے دروازہ کھولا اور اُن دونوں کو آرام سے بیٹھ کر باتیں کرنے کے لئے جگہ دے کر باہر نکل گیا۔

"کل تم سب لوگ اسمبلی جارہے ہو؟" رتن کے اس سوال میں انور کو کوئی تُک نہیں دکھائی دیا۔

"ہاں جا تو رہے ہیں، لیکن تمہارا مطلب کیا ہے ....؟"

"وہ میں ابھی تمہیں بتا دوں گا، لیکن پہلے تم یہ بتاؤ کہ تمہیں اپنے ساتھیوں کے لئے اکیس پاس کہاں سے ملیں گے؟"

"ہمارے پروفیسر نے اور ابا نے اسمبلی کے کئی ممبروں کے نام خط دیئے ہیں۔ ہر ممبر دو پاس دے سکتا ہے۔ اِس طرح ہمیں کافی پاس مل جائیں گے۔"

"اچھّی بات ہے۔ اگر تمہیں اکیس پاس مل سکتے ہیں تو تیئیس بھی مل سکتے ہیں۔" رتن نے یہ بات کچھ اِس طرح کہی جیسے حکم دے رہا ہو۔

آخر کار انور کو اِس بات کا خوفناک مطلب سمجھ میں آیا اور اُس نے اُونچی آواز میں کہا "نہیں، نہیں۔ یہ مجھ سے نہیں ہو گا۔ تم لوگ کوئی ایسی ویسی حرکت کر بیٹھو گے۔ ہم سب پکڑے جائیں گے ... نہیں، نہیں..."

"چلاؤ نہیں" رتن نے سختی سے کہا "میں تم سے وعدہ کر چکا ہوں کہ کسی کو جان سے نہیں مارا جائے گا۔"

انور نے اپنے دوست کو دیکھا۔ کیا یہ وہی مست شرارتی لڑکا تھا جس سے وہ امرتسر میں ملا تھا اور جسے اس نے اپنا دوست بنایا تھا؟ اس کے چہرے پر ایک عجیب جانی پہچانی سختی تھی، اس کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی کڑواہٹ تھی اور آنکھوں میں ظالم چمک۔ اس نے یہ شکل پہلے کہاں دیکھی تھی؟ اچانک اُسے جلیانوالہ باغ کی یاد آئی۔ گولی چلنے کے بعد وہاں موت کا سا سناٹا چھا گیا تھا اور ایک لڑکا جس کی زلفیں اس کی پیلی پگڑی سے باہر نکلی ہوئی تھیں اپنے مُردہ باپ کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ یہ بھیانک لمحہ جس کا تجربہ اُن دونوں کو ایک ہی ساتھ ہوا تھا اُن دونوں کے درمیان تعلقات قائم کرنے والی کڑی تھی اور انور جانتا تھا کہ رتن اس سے جو کچھ کرنے کو کہہ رہا تھا اُس سے وہ انکار نہیں کر سکتا۔ مونچھوں والے اُس لمبے آدمی نے انور سے کہا اور جس دوستانہ لہجے میں اس نے انور کو "کامریڈ" کہا تھا اُس نے انور کے دُکھی دل کے لئے مرہم کا کام کیا — "ہم کسی دوسرے کو خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتے لیکن یہ کام ضروری ہے۔ جو لوگ بہرے ہیں ہمیں اُن کے کان کھولنے ہیں اور یہ کام کل ہی ہونا ہے۔ صرف تم ہی ہماری مدد کر سکتے ہو۔"

وہ ہندوستانی ہلکے سے پنجابی لہجے کے ساتھ بولتا تھا اور اُس کے لفظوں میں زور بھی تھا اور ترغیب دلانے والی بات بھی۔ لیکن جس چیز نے انور کی ساری مشکلوں کو ختم کر دیا تھا وہ تھا اُس کی آنکھوں کا جذبہ۔ اُس کی آنکھوں میں قوتِ ارادی کی چمک تھی، ایک عجیب کشش تھی اور اُن کی گہرائی میں بے حد اداسی کی ایک جھلک تھی۔ وہ ایک ایسا آدمی تھا جو بہت دُکھ جھیل چکا تھا اور موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ چکا تھا۔

انور نے اپنی آنکھیں اُس کی طرف سے پھیر لیں اور بولا "پاس تو ہو جائیں گے لیکن اپنا وعدہ یاد رکھئے گا، کوئی جان سے نہ مارا جائے۔"

(۸)

گیلری میں سے دیکھنے پر کمان دار اسمبلی چیمبر ایک گہرا کنواں لگتا تھا اور وہاں اتنی اونچائی سے "معزز ممبروں" کی آوازیں ایسی سنائی دیتی تھیں جیسے بہت سے مینڈک بول رہے ہوں اور اُن کے گلے بیٹھے ہوئے ہوں۔ انور کے دماغ میں فوراً یہ بات آئی کہ وہ اسمبلی کے بارے میں اپنے تجربوں پر ایک مضمون لکھے گا جس کا عنوان ہوگا "کنوئیں کے مینڈک"۔ مخالف پارٹی کے ممبر جن میں سے بہت سے سفید گاندھی ٹوپیاں لگائے ہوئے تھے، اٹھتے تھے، جھک کر صدر کا احترام کرتے تھے، اپنی بات کہتے تھے، پھر بیٹھ جاتے تھے۔ لیکن سرکاری پارٹی کے ممبر مجسّموں کی طرح چپ چاپ بیٹھے رہتے تھے اور مخالف پارٹی کی بہت محنت کے ساتھ جتائی گئی دلیلوں کی طرف کوئی توجہ ہی نہیں دیتے تھے۔ اب تک انور اخباروں میں جو کچھ پڑھتا آیا تھا، اُس کے تجربے سے وہ جانتا تھا کہ اگلے دن قوم پرست اخبار اِس خبر کو اِس عنوان سے چھاپیں گے "تجارتی جھگڑوں کے بل کی کڑی تنقید"۔ لیکن یہاں وہ اپنی آنکھوں سے جو کچھ دیکھ رہا تھا اس میں نہ غصّہ تھا نہ کڑی تنقید، صرف لفظوں کا ایک سلسلہ تھا جو ختم ہی نہیں ہوتا تھا اور اُن ہی لفظوں کو بار بار سُنتے سُنتے نیند آنے لگی تھی۔ کورے الفاظ اور کچھ نہیں! .... اِس ساری بے لطف کاروائی میں اگر کہیں تھوڑی سی جان دکھائی دی تو وہ تھی مخالف پارٹی کے لیڈر پنڈت موتی لال نہرو کی جوشیلی تقریریں۔ کھادی کی ریشمی شیروانی پہنے اور گاندھی ٹوپی لگائے وہ بہت رُعب دار لگ رہے تھے۔ اس کے بعد پھر جیسے ہر چیز

گہری نیند میں سوگئی اور انور کو یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ سرکاری پارٹی کا ایک ممبر ایک موٹا سا لال منہ والا انگریز باقاعدہ خراٹے لے رہا تھا اور اس کے پاس بیٹھا ہوا ایک دوسرا انگریز ممبر اس ورڈ پزل، حل کر رہا تھا اور اُن کے پیچھے ایک گروہ بند جتھے کی شکل میں اسمبلی کے نامزد کئے ہوئے ممبر بیٹھے ہوئے تھے۔ یہی وہ فرمانبردار لوگ تھے جو ایک کے بعد دوسرے بل پر مشین کی طرح سرکار کی طرف سے ہاتھ اُٹھا دیتے تھے۔ وہ بڑی بے چینی سے اپنی کرسیوں پر پہلو بدلتے رہتے تھے اور اس بات کا انتظار کر رہے تھے کہ کب ووٹ لینے کا وقت ہوئے اور وہ اُٹھ کر تائید کرنے والوں کے کمرے میں چلے جائیں اور اس طرح مزدور طبقہ کی تحریک کو کچلنے کے لئے ملک پر تھوپے گئے قانون کو عوام کی منظوری کا دکھاوا ظاہر کریں اور اس فریب کو جمہوریت کے نام پر ہونے والے اس ظلم کو روکنے کے لئے مخالف پارٹی کی طرف سے عوام کے نمائندے صرف باتیں ہی باتیں کرتے تھے، جن باتوں کو کوئی سنتا بھی نہیں تھا۔

اس کنویں میں جھانک کر دیکھتے وقت انور کے دماغ میں کئی بار یہ خیال آیا کہ کوئی من چلا اس کنویں میں ایک پتھر پھینک دے اور اس کے ٹھہرے ہوئے گندے پانی میں ہلچل پیدا کر دے۔ کاش ... وہ سوچ رہا تھا کہ آخر ان کے دونوں دوست کیا کرنے والے ہیں؟ ــــ ایک جس کی مونچھ اوپر کو اینٹھی ہوئی تھی اور دوسرا جو دیکھنے میں بنگالی لگتا تھا؛ اب تک وہ اپنے وعدے پر قائم تھے۔ اسمبلی کے اندر گھستے ہی انہوں نے کارڈ انور کو واپس کر دیئے تھے اور انور نے تجویز کے مطابق انہیں پھاڑ کر باتھ روم کے فلش میں بہا دیا تھا۔ اس نے ان کے ساتھ گلابی رنگ کے کچھ پرچے دیکھے تھے اور شاید وہ انہیں نیچے پھینکنے کے لئے موقع کی تاک میں تھے،

سُرخ انقلابی پرچوں کی بارش سے یہ لوگ سچ مچ جاگ اُٹھیں گے۔ ان کا سارا ڈھیلا پن دُور ہو جائے گا۔ انور نے نظر دوڑا کر دیکھا تو اُسے وہ دونوں نوجوان، جن کے نام ابھی تک وہ نہیں جانتا تھا، پبلک گیلری کے دُوسرے سرے پر دکھائی دیئے۔ وہ سرکاری ممبروں کے ٹھیک اُوپر پہلی قطار میں بیٹھے تھے۔

"دیکھو، وائسرائے کے باکس میں کون ہے؟" راز نے انور کے کان میں کہا "میرے خیال میں تو اپنے وہی دوست سرجان سائمن ہیں"۔

انور نے اُن کے سر کے چھدرے ادھ پکے بالوں اور اُن کے ڈبل بریسٹ سوٹ سے پہچانا کہ یہی رائل کمیشن کے چیئرمین سرجان سائمن تھے جو پچھلے سال سارے ملک میں سامراجی دباؤ کی نشانی بن گئے تھے۔ نہ جانے کیوں انور کی نظریں ان ہی رتن کے دوستوں کی طرف اُٹھ گئیں اور اُس نے دیکھا کہ اینٹھی ہوئی مونچھوں والا نوجوان وائسرائے کے باکس کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا ہے، جیسے دونوں گیلریوں کے بیچ کے فاصلے کا اندازہ لگا رہا ہو جو پورے چیمبر کی چوڑائی کے برابر تھا۔

انور کا دل دہل گیا۔ بار بار وہ اپنے دل کو سمجھا رہا تھا "لیکن انہوں نے وعدہ کیا ہے، انہوں نے وعدہ کیا ہے!" اُنہوں نے جلدی سے نیچے بیٹھے لوگوں پر نظر ڈالی۔ ایک آدمی بیٹھا ہوا "السٹریٹیڈ ویکلی" کے اوراق اُلٹ رہا تھا۔ وہ موٹا لال منہ والا آدمی ابھی تک خراٹے لے رہا تھا۔ سرکاری ممبروں میں سے کوئی تقریر کر رہا تھا۔ پھر جب اُس کی نظر لوٹ کر گیلری پر پڑی تو اُس نے دیکھا کہ وہ مونچھوں والا نوجوان اُٹھ کھڑا ہوا ہے جیسے باہر جا رہا ہو اور دُوسرے ہی لمحے اُس نے پھینک دیا تھا...

بم! ایک بھیانک دھماکے کے ساتھ سرکاری ممبروں کے سامنے فرش پر بم

پھٹ گیا اور اُس کے فوراً ہی بعد لال مرچوں کی بارش شروع ہو گئی۔ ممبروں میں خاص طور پر افسروں اور سرکاری ممبروں میں کھلبلی مچ گئی۔ کچھ بھاگ کر باہر پاخانوں میں جا چھپے کچھ رینگ کر میزوں کے نیچے چھپ گئے۔ ہر آدمی دروازے کی طرف بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا اور دیکھتے دیکھتے سارا چیمبر بدبودار دھوئیں سے بھر گیا۔ انور نے دیکھا کہ صرف دو آدمی ایسے تھے جو اِس گھبراہٹ کا شکار نہیں ہوئے ایک تھے وِٹھل بھائی پٹیل، لمبی داڑھی والے سپیکر اور دوسرے پنڈت موتی لال نہرو جو اپنی پارٹی کے ممبروں کو سمجھا رہے تھے "ارے بھائی، بھاگتے کیوں ہو یہ تو کوئی ہمارے ہی آدمی ہوں گے۔؟"

اِس بھاگ دوڑ اور شور وغل، عورتوں کی چیخ و پکار اور پولیس کی سیٹیوں کو دبا کر ایک للکار چیمبر میں بار بار گونج رہی تھی "انقلاب زندہ باد!" "انقلاب زندہ باد!"۔

یہ اُس مونچھوں والے نوجوان کی آواز تھی۔ انور نے اُسے دیکھا اور اُس کی وہ تصویر انور کے دل پر ہمیشہ کے لئے نقش ہو گئی۔ وہ ایک کرسی پر نڈر کھڑا تھا — ایک پورے سامراج کے خلاف ایک اکیلا آدمی اور وہ نعرہ لگا رہا تھا جو جلد ہی ایک پورے ملک کے لئے جدوجہد کی للکار بن جانے والا تھا۔

پولیس اُسے ہاتھ لگاتے ہوئے ڈر رہی تھی، اس لئے اُس نے بڑی بے پروائی سے اپنا ریوالور اُن کے سامنے پھینک دیا اور اپنے آپ کو اور اپنے ساتھی کو پولیس کے حوالے کر دیا۔

انور جب دوسرے طالب علموں کے ساتھ باہر جا رہا تھا تو اس نے پولیس کے ایک داروغہ کو اُس لمبے قد والے نوجوان سے اُس کا نام پوچھتے سُنا جس کی مونچھوں میں اب بھی بغاوت کا بانکپن تھا۔ اس نے بڑے فخر سے جواب دیا "بھگت سنگھ" اور جب وہ پاس سے ہو کر

گذرا تو انور کو بہت ڈر لگا۔ اگر اُس کے چہرے سے ذرا بھی اشارہ ملا کہ وہ انور کو پہچانتا ہے تو انور کو گرفتار کر لیا جائے گا۔ لیکن بھگت سنگھ پاس سے ہو کر گذر گیا اور اُس کے چہرے کا رنگ ذرا بھی نہیں بدلا پھر بھی اُس کی آنکھوں میں مسکراہٹ کی ایک چمک تھی جیسے وہ انور سے کہہ رہا ہو" کامریڈ، ہم اپنے وعدے پر قائم رہے نا؟"۔

وہ اسے گرفتار کر کے لے گئے مگر باہر برآمدے سے اُس کی گرجدار آواز پورے چیمبر کی دیواروں کو ہلاتی ہوئی گونجتی رہی — انقلاب زندہ باد!

اور اُس لمحہ انور نے محسوس کیا کہ ٹھہرا ہوا گندہ پانی تہہ تک، مل گیا ہے۔ بہروں کے کان کھل گئے ہیں۔ انقلاب آ گیا ہے۔ اب ہندوستان وہ پہلے والا ہندوستان نہیں رہ جائے گا — اُس ایک بم کا دھماکہ ہر ہندوستانی کی زندگی کو بدل دے گا۔

کتاب چوتھی

طوفان اور طوفان کے بعد

۱۶
کھُلی سازِش
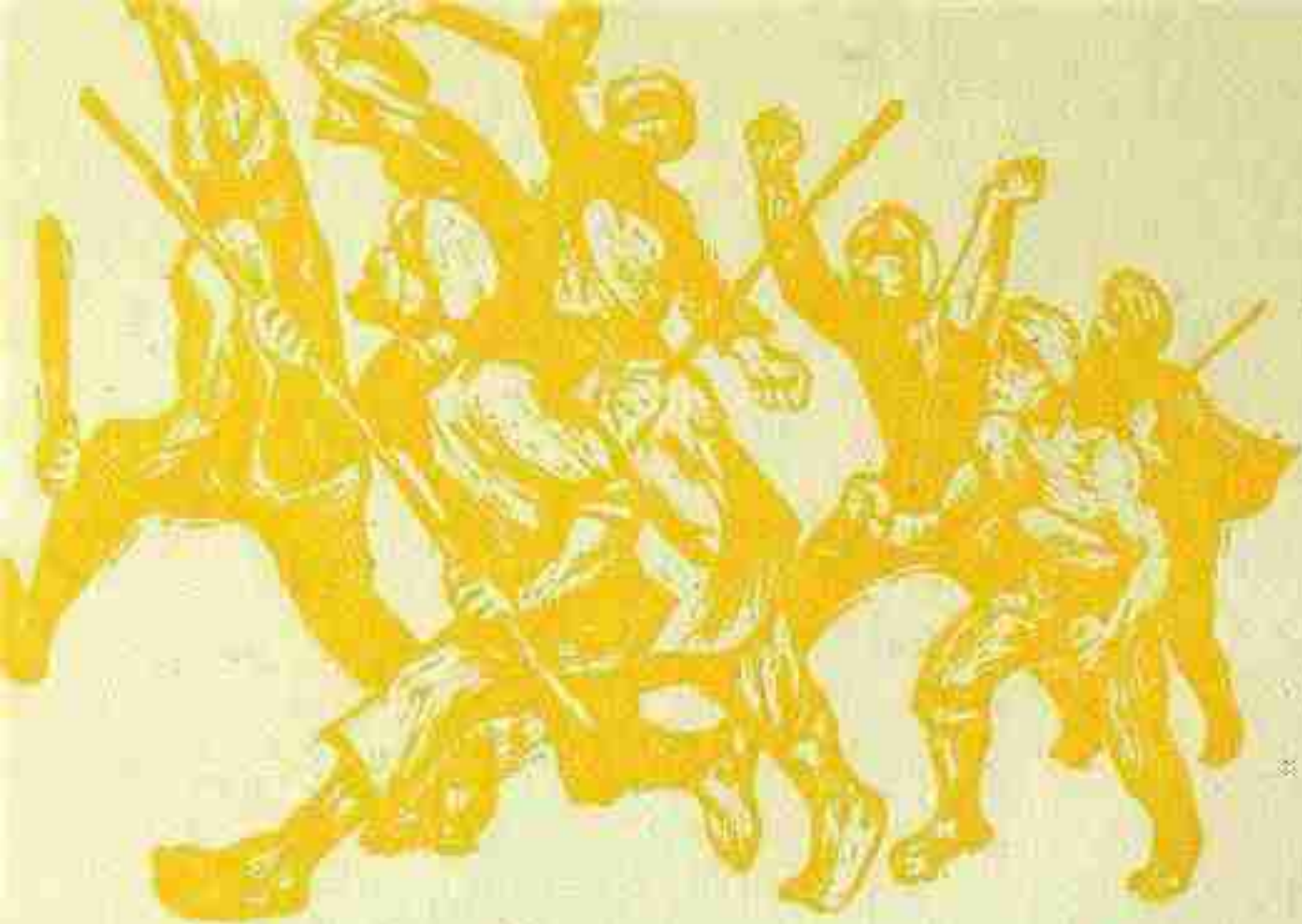
(۱)

"..... اِس لئے یہ کانگریس پچھلے سال کے کلکتہ سیشن کے ذریعے منظور کردہ تجویز کے مطابق یہ اعلان کرتی ہے کہ کانگریس کے دستور کی دفعہ نمبر ایک میں "سوراج" لفظ کے معنی مکمل آزادی ہوں گے ...."

جس وقت یہ تجویز منظور کی گئی اُس وقت صدر کی کرسی کے پیچھے لگی ہوئی گھڑی بارہ بجا رہی تھی۔ بڑے سے پنڈال میں ایک لاکھ مندوبین کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے، پنڈال اتنا بڑا ہوتے ہوئے بھی اُن کے لئے چھوٹا تھا لیکن اُنہیں اِس بات کی تسلی تھی کہ لاہور میں دسمبر کی رات کی اُس کڑاکے کی سردی میں ایک دوسرے سے چمٹ کر بیٹھنے کی وجہ سے اُن کے جسم میں کچھ گرمی آ رہی تھی۔ اور بھی اُن کے درمیان بیٹھا ہوا تالیاں بجا رہا تھا اور نعرے لگا رہا تھا۔ تالیاں بجاتے بجاتے اُس کی ہتھیلیاں سوج گئی تھیں،

اور گلا بیٹھ گیا تھا۔ اُس کے گالوں پر خوشی کے آنسو بہہ رہے تھے۔ یہی وہ موقع تھا جس کا وہ اور ملک کے سبھی نوجوان کئی سالوں سے انتظار کرتے آئے تھے۔ جس موقع کے لئے اپنے لوگوں نے مُصیبتیں جھیلی تھیں اور اپنی جان جوکھم میں ڈالی تھی، مار کھائی تھی، دُکھ سہے تھے اور اپنی جان تک دی تھی۔

لوگوں کی بھیڑ مارے خوشی کے پاگل ہو اُٹھی تھی اور لوگ "مہاتما گاندھی کی جے" اور "پنڈت جواہر لال نہرو کی جے" کے نعرے لگا رہے تھے۔ اِن نعروں کی گونج میں گھڑی کی آواز بالکل ڈوب کر رہ گئی تھی۔ سب ہی نوجوانوں کے گلوں سے "انقلاب زندہ باد" کا بہادرانہ نعرہ گونج اُٹھا جسے انور نے اسمبلی چیمبر میں بم پھٹنے کے بعد بھگت سنگھ کو لگاتے سُنا تھا۔ پھر اِس نعرے کو منتر کی طرح بار بار دُہرا رہی تھی اور اِس گونجتی ہوئی آواز میں اپنی آواز سُن کر انور کا دل بلّیوں اُچھلنے لگا۔ یہ آزادی کا نیا منتر تھا اور انور اُس نوجوان کے بارے میں سوچنے لگا جسے کالے پانی کی سزا ہوئی تھی اور جو اس وقت لاہور جیل میں تھا اور سینڈرس کا خون کرنے کے اس سے بھی بھیانک جُرم کی سزا سُنائے جانے کا انتظار کر رہا تھا۔ اِس شور و غل، جے جے کار اور نعرے بازی کے غُل غپاڑے میں اُسے یکایک بھگت سنگھ اور اس کے نوجوان بنگالی ساتھی بٹو کیشور دت کی یاد آ رہی تھی۔ نہ صرف سرکار کے پٹھو اخباروں اور اعتدال پسندوں نے بلکہ قوم پرست اخباروں اور کانگریس کے مہاتما گاندھی جیسے لیڈروں نے بھی اُن کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا تھا اور اسمبلی میں بم پھینکنے کے لئے اُن کی مذمت کی تھی۔ پھر بھی اُس دن ان دونوں نے جو بغاوت کا نعرہ لگایا تھا وہ آج سارے ملک میں کروڑوں لوگوں کی زبان پر تھا۔ اپنے چاروں طرف انور کو دُور جنوب سے آئے ہوئے کالے رنگ کے تامل واسی دبلے پتلے

پھر نیلے بنگالی، موٹے موٹے گجراتی اور گٹھے ہوئے جسم والے مراٹھے بیٹھے دکھائی دے رہے تھے اور وہ سب ہی ایک آواز سے عربی اور فارسی کے لفظ چلا رہے تھے ۔۔۔

"انقلاب زندہ باد۔ انقلاب زندہ باد!"

دیکھتے دیکھتے چاروں طرف یہ خبر پھیل گئی کہ اس تاریخی تجویز کے منظور کیے جانے کے موقع پہ کانگریس کے نئے صدر پنڈت جواہر لال نہرو آزادی کا جھنڈا لہرائیں گے اور اس خبر کے پھیلتے ہی سب لوگ باہر نکلنے کے لیے دروازوں کی طرف بھاگ پڑے۔

راوی کے مٹیالے پانی میں کانگریس کیمپ کی روشنیوں کا عکس دھندلا دھندلا دکھائی دے رہا تھا۔ مغرب کی طرف سے ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی جو تیر کی طرح چبھتی ہوئی اُن کی ہڈیوں تک پہنچ رہی تھی مگر اُن کے دلوں میں آزادی کی نئی جوت جل اُٹھی تھی اور ایک بار پھر آدھی رات کے سناٹے میں اُن کے نعروں کی گونج سنائی دی حالانکہ سردی کے مارے اُن کے دانت بج رہے تھے۔ بجلی کی روشنیوں کا رُخ پنڈت جواہر لال نہرو کی طرف موڑ دیا گیا۔ جھنڈے کے نیچے کالی شیروانی اور چوڑی دار پاجامہ پہنے ہوئے پنڈت جی اپنے قد سے زیادہ لمبے لگ رہے تھے۔ انور کو ایسا لگا کہ وہ ایک شخصیت بھی ہیں اور ایک نشانی بھی۔ اُس اُمڈتی ہوئی بھیڑ کو چیر کر وہ آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُسے شروع کے کچھ الفاظ سنائی نہیں دیئے کیونکہ جواہر لال نہرو دھواں دھار تقریر کرنے والوں میں سے نہیں تھے لیکن جب بھیڑ بالکل خاموش ہو گئی تو اُن کی نڈر آواز بالکل صاف سنائی دینے لگی اور انور کو ایسا لگا کہ وہ یہ الفاظ اسی سے کہہ رہے ہیں ۔۔۔

"اب ہم نے اپنے ملک کو برٹش حکومت سے آزاد کرنے کی کھلی

سازش کی ہے اور ساتھیو آپ کو، ہمارے ملک کے سب بھائیوں اور بہنوں کو اِس کھلی سازش میں شامل ہونے کی دعوت دی جاتی ہے لیکن اس کے بدلے میں آپ کو تکلیفیں اٹھانی پڑیں گی، جیل جانا پڑیگا اور ہو سکتا ہے آپ کو اپنی جان کی بھی قربانی دینی پڑے۔ لیکن آپ کو یہ تسلی رہے گی کہ آپ ہندوستان کی خاطر جو کچھ کر سکتے تھے وہ آپ نے کیا اور آپ نے انسانوں کو اُن کی موجودہ غلامی سے چھڑانے میں کچھ تھوڑی بہت مدد کی ....."

جھنڈا اوپر چڑھ کر لہرانے لگا۔۔ لال، سفید اور ہرے رنگ کا ترنگا جھنڈا جس پر ایک چرخہ بنا ہوا تھا اور ایک پل کے لئے پوری بھیڑ پر سناٹا چھا گیا۔ وہ اس تاریخی واقعے کی اہمیت سے اور اس بغاوت بھرے چیلنج کے سنجیدہ نتیجوں کو سوچ کر کچھ سہم سے گئے تھے۔ اتنے میں ایک طرف سے تالیوں کی آواز لہر کی طرح اٹھی اور دیکھتے دیکھتے تالیاں طوفان کی طرح گونج اٹھیں اور نعروں میں ایک نیا نعرہ جُٹ گیا۔ جھنڈا اونچا رہے ہمارا۔"

۳۱ دسمبر ۱۹۲۹ء ..... رات کے بارہ بجے۔ یہ ہمیشہ یاد رکھنے والا لمحہ تھا ایک سال ختم ہو رہا تھا اور ایک نیا سال شروع ہو رہا تھا۔ انور اپنے کیمپ میں واپس آیا تو اُسے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اب بھی جذبات کی لہر پر سوار ہے اور اُسے ایسا لگا کہ اس نے تاریخ کے رُخ کو مُڑتے دیکھا ہے اور اُسے موڑنے میں حصہ لیا ہے۔

(۲)

اُس جھونپڑے میں چھ آدمی ٹھہرے ہوئے تھے، سب کے سب نوجوان۔ انور کے علاوہ علی گڑھ سے تین اور آدمی آئے تھے۔ عثمان فضل بھائی، راؤ اور ایک بہت

چھوٹا سا سکول کا لڑکا یونس جو شمال مغربی سرحدی صوبے کا رہنے والا تھا اور لال کرتی والوں کے لیڈر خان عبدالغفار خاں کا کوئی بہت نزدیکی رشتہ دار تھا۔ باقی دو میں ایک تھا رائے، جو کسی بنگالی اخبار کا رپورٹر تھا اور دوسرا تھا سندرم۔ جو جنوبی ہندوستان میں بھواڑہ کا طالب علم کارکن اور نوجوانوں کی تنظیم کا ممبر تھا۔

ایک ایک کر کے وہ واپس لوٹے اور کپڑے اتار کر سردی میں ٹھٹھرتے ہوئے وہ اپنی اپنی رضائیوں اور کمبلوں میں گھس گئے۔ لیکن اس پٹھان لڑکے کو چھوڑ کر جو دن بھر لال کرتی والے والنٹیروں کے ساتھ پریڈ کرتے کرتے تھک کر چور ہو گیا تھا اور آتے ہی سو گیا تھا۔ ان میں سے کسی کو بھی نیند نہیں آرہی تھی۔ رائے ایک سگریٹ سے دوسری سگریٹ سلگا کر لگاتار دھواں اڑا رہا تھا اور سندرم ہر بار اسے یاد دلاتا تھا کہ وہ سگریٹ کا بچا ہوا ٹکڑا دیکھ بھال کر پھینکا کرے نہیں تو آگ لگ جائے گی۔ راز کوئی نظم گنگنا رہا تھا، ایسا لگتا تھا کہ اس دن کے جوشیلے واقعات سے متاثر ہو کر وہ کوئی نظم کہہ رہا تھا۔ عثمان نظم پوری ہونے سے پہلے ہی سن لینا چاہتا تھا لیکن راز رائے اور سندرم کے سامنے سنانا نہیں چاہتا تھا کیونکہ ان کی اردو کی واقفیت نہ ہونے کے برابر تھی لیکن ٹیپ کا مصرع بار بار گنگناتے ہوئے ایک بار انجانے ہی اس نے اسے زور سے پڑھ دیا۔ نظم کا عنوان تھا "آدھی رات کا ستارہ" اور اس میں راز نے ان تاریخی واقعات، اور اپنے دل پر ان کے تاثر کو شاعرانہ ڈھنگ سے بیان کیا تھا۔

انور تو ہمیشہ سے راز کی شاعری کا دیوانہ تھا۔ وہ ہر شعر پر 'واہ واہ' کرنے لگا۔ اس کی تعریف سن کر رائے اور سندرم نے انگریزی میں اس کا ترجمہ کرنے کی مانگ کی لیکن انگریزی میں بنگالی جرنلسٹ کو اس میں کچھ مزا نہیں آیا اور اس نے ایسے خیالات ظاہر کئے جنہیں سن کر انور دنگ رہ گیا کیونکہ ان میں اسے حب الوطنی کی کمی کا احساس ہوا۔ رائے

نے کہا کہ گاندھی نے (وہ انہیں گاندھی جی تک نہیں کہتا تھا) دائیں بازو کی مخالف پارٹی کو نیچا دکھانے کے لئے اور کانگریس پر پھر پہلے کی اپنا قبضہ جمانے کے لئے تنگ ظلم سے پنڈت جواہر لال نہرو کو کانگریس کا صدر بنا دیا تھا۔ انور یہ نہیں برداشت کر سکتا تھا کہ اُس کے مقبول لیڈر پر اس طرح تنقید کی جائے، اس لئے اُس نے زبردست مخالفت کرتے ہوئے کہا "ہر آدمی جانتا ہے کہ جواہر لال نہرو کا چناؤ ترقی پسند نوجوان لوگوں کی جیت ہے۔ تم نے ابھی پریسیڈنٹ کی حیثیت سے اُن کی تقریر سُنی ہے۔ اگر تم اب بھی انہیں رجعت پسند سمجھتے ہو تو یہ تمہاری ضد ہے اور کچھ نہیں۔"

"اور تم بالکل اناڑی قسم کے جذباتی آدمی ہو جو آدمی کو ہیرو بنا کر اُسے پوجتے ہو" رائے نے جواب دیا "اور تم نے ابھی تک آدمی کی باتوں اور اُس کے کاموں میں فرق کرنا نہیں سیکھا ہے۔"

اس پر عثمان اور سُندرم دونوں کو غصّہ آگیا۔ وہ دونوں بھی انور کی طرح ہی نہرو کے پکّے بھگت تھے، اس لئے وہ اُس کی طرف سے بولنے لگے۔ عثمان نے کہا کہ نہرو کی رہنمائی کو جو تسلیم نہیں کرتا وہ غدّار ہے۔ اور سُندرم نے، جس کی یادداشت بہت اچھّی تھی، پنڈت جی کے کانگریس کے صدر کی حیثیت سے کی گئی تقریر کے کچھ حصّے زبانی دُہرانا شروع کیا ــــ وہ حصّہ جس میں انہوں نے مکمّل آزادی اور انگریزوں سے ناطہ توڑ لینے پر زور دیا تھا، کھُلے عام یہ قبول کر لیا تھا کہ وہ سوشلسٹ ہیں اور ہندوستان میں سوشلزم قائم کرنے کے لئے کام کریں گے۔ انہوں نے دیسی رجواڑوں پر حملے کئے تھے، گاندھی جی کے ٹرسٹی شپ کے اصول کی کھُلی مخالفت ظاہر کی تھی اور نیشنل کانگریس اور مزدوروں کی ٹریڈ یونین کانگریس کے درمیان

گہرے تعاون کی پیشین گوئی کی تھی۔ اُس سال وہ اِن دونوں ہی تنظیموں کے صدر تھے۔

"سب باتیں ہی باتیں ہیں کوری باتیں۔" سنکی رائے نے دوسری سگریٹ جلاتے ہوئے کہا اور پھر ایک بار نہرو کے تینوں بھگتوں نے ایک ساتھ اُس پر جوابی حملہ شروع کر دیا۔

"اچھی بات ہے۔" انور نے اپنے دونوں تائید کرنے والوں کی بات کاٹ کر اونچی آواز میں کہا "ہم تھوڑی دیر کے لئے مان لیتے ہیں کہ گاندھی جی رجعت پسند ہیں اور جواہر لال کمزور آدمی ہیں اور اُن میں بالکل دم نہیں ہے لیکن کیا تم کسی دوسرے لیڈر کا نام بتا سکتے ہو جس سے ہم آزادی کی لڑائی کی رہنمائی کرنے کی اُمید کر سکتے ہیں؟"

اُس نے سوچا تھا کہ اِس بات سے وہ رائے کا منہ بند کر دے گا لیکن رائے کو اِس سوال کا جواب ڈھونڈنے میں ایک پل بھی نہیں لگا۔ اُس نے بڑے بھروسے کے ساتھ جواب دیا۔ "ہاں، کیوں نہیں؟ سبھاش بوس۔"

عثمان کے تو یہ سنتے ہی جیسے آگ لگ گئی۔ اس نے جل کر کہا۔ "تم بنگالی لوگ تو ہمیشہ کسی بنگالی ہی کو پسند کرتے ہو۔ اس لئے تمہاری ترقی کی ساری باتیں کھلی صوبہ پرستی کے سوا کچھ نہیں ہے۔"

اس پر بحث میں پھر گرمی پیدا ہو گئی اور سب ایک ساتھ بولنے لگے۔ رائے، جس کی زبان قینچی کی طرح چلتی تھی، اس تہرے حملے سے اپنی حفاظت کرتا رہا۔ ایک بار تو ایسا لگا کہ وہ دبلا پتلا بنگالی جو کسی سے کم غصے والا نہیں تھا، نہرو کے ان تینوں بھگتوں سے ہاتھا پائی کر بیٹھے گا۔ پر اتنے میں یونس کی آنکھ کھل گئی اور پوچھنے لگا کہ کیا

گڑبڑ ہے، اس لئے ہاتھا پائی کی نوبت نہیں آئی۔ اس کے علاوہ بغل والی جھونپڑی سے کسی نے بیچ کی دیوار کو زور سے تھپتھپاتے ہوئے گرجدار آواز میں کہا "ارے رام رام کیا گول مال مچا رکھا ہے؟ نیند حرام کر رکھی ہے، ہمیں صبح اٹھ کر ندی پر نہاتے جانا ہے اور پوجا پاٹ کرنا ہے۔"

ان لوگوں نے باتیں بند کر دیں اور جلدی جلدی اپنے اپنے کمبلوں میں دبک گئے لیکن رائے نے سونے سے پہلے اپنی سگریٹ بجھاتے ہوئے بھی ان پر فقرہ کس ہی دیا "یہ ہیں تمہارے پڑوسی، گھاس کھانے والے پوتّر گاندھی وادی۔"

(۳)

نہرو کے خلاف رائے کی باتوں سے انور کی وفاداری میں کوئی کمی نہیں آئی۔ لیکن دل ہی دل میں اس نے فیصلہ کیا کہ اگلے دن وہ اس بنگالی جرنلسٹ سے کہے گا کہ وہ اُسے سبھاش سے ملا دے۔ اس طرح ایک دن میں اُسے تین آدمیوں سے ملاقات کرنی پڑے گی کیونکہ یونس کے ذریعے اس نے لمبے چوڑے ڈیل ڈول والے پٹھان لیڈر عبدالغفار خان سے ملنے کا انتظام کیا تھا اور سُندرم نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اُسے اس لیڈر سے ملا دے گا جس نے کانگریس کے ساتھ ہی ہونے والی شراب بندی کانفرنس کی صدارت کی تھی، اُس کا نام کچھ بہت ہی ٹیڑھا سا تھا لیکن کہا جاتا تھا کہ وہ جنوبی ہندوستان کا سب سے قابل لیڈر تھا۔

باقی لوگ تو جلد ہی سو گئے لیکن انور لیٹا لیٹا اُن تمام باتوں کے بارے میں سوچ رہا تھا جو اُس نے دیکھی اور سُنی تھیں۔ رائے کے جیسے سنکی چاہے جو کہیں پر انور کو اس بات میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ لڑائی کا بگل بج چکا تھا اور جلد ہی سارا

ملک گاندھی اور نہرو کی رہنمائی میں آزادی کی آخری لڑائی چھیڑنے والا تھا۔ وہ سوچنے لگا: اس لڑائی میں وہ کیا کرے گا۔ کیا وہ الگ کھڑے رہ کر صرف تماشا دیکھے گا؟ وہ جانتا تھا کہ یہ اُس سے نہیں ہو گا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ جدّوجہد میں کودنے کا مطلب یہ ہو گا کہ اُسے جیل جانا پڑے گا، شاید یونیورسٹی سے اُسے نکال بھی دیا جائے، شاید اپنے ابّا سے بھی رشتہ توڑنا پڑے کیونکہ اب وہ کانگریس کے پکّے مخالف ہو گئے تھے۔ پھر بھی یہ سب خطرے تو اُسے مول لینے ہی ہوں گے، اگر وہ اپنے تئیں اور اپنے عہد کے تئیں سچّا رہنا چاہتا تھا تو اُسے اس کے لئے قیمت تو چکانی ہی ہوگی۔ راستہ صاف تھا۔ اُس نے دیکھا کہ ہزاروں لوگ جیل جا رہے ہیں، ہزاروں لوگ اہنسا کی لڑائی لڑنے کے لئے آگے بڑھ رہے ہیں، کوئی جوابی حملہ کئے بنا اور بھاگے بنا جواہر لال کی طرح، لاٹھیاں کھا رہے ہیں یہاں تک کہ ہنستے ہنستے پھانسی کے تختے پر بھی چڑھ رہے ہیں اور اُس نے دیکھا کہ وہ جیل میں بند ہے، وہ اپنی کھوپڑی پر لاٹھیوں کی بوچھار محسوس کرنے لگا اور کمبل کا کنارہ اُسے اپنے گلے میں پھانسی کے پھندے کی طرح معلوم ہونے لگا۔

اور پھر، جیسا کہ نیند آنے کے پہلے کے لمحوں میں ہمیشہ ہوتا تھا، سلمہ کی جادو بھری دل کو لُبھانے والی تصویر اس کی آنکھوں کے آگے گھوم گئی ۔۔۔ ملائم گھنگھروالے بالوں میں گھرا ہوا وہ لمبوترا چہرہ، بڑی بڑی معصوم آنکھیں اور لال لال ہونٹ جن سے اُس نے محبّت کے اٹوٹ بندھنوں میں انور کو باندھ لیا تھا۔ آج اس کے سامنے اس کی جو تصویر آئی اس میں اس کے چہرے کے چاروں طرف ایک سوالیہ نشان کا گھیرا تھا جیسے پورے چاند پر گرہن لگ گیا ہوا۔ ابھی اس نے اپنے

دماغ میں وطن کی خدمت کی جو تجویز تیار کی تھی اس میں وہ کس طرح کھپ سکے گی؟ اس کے ابا سرکار کے وفادار تھے اور حالانکہ وہ جانتی ایسا تھی کہ اُسے سیاست میں کوئی دلچسپی نہیں ہے لیکن وہ انور کے سیاسی دوستوں اور اُس کی سیاسی دلچسپیوں سے بہت جلتی تھی۔ وہ اس کے لاہور جانے پر بھی خوش نہیں تھی اور اسی لئے اُسے یہ بہانہ بنانا پڑا تھا کہ وہ وہاں اپنی سیاسی دلچسپی کی وجہ سے نہیں بلکہ سیر کرنے جا رہا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ وہ اس کے لئے کبھی بھی راضی نہیں ہو گی کہ وہ کسی بھی خطرناک سیاسی کام میں ہاتھ ڈالے۔ لیکن کیا یہ ایک عورت کے لئے قدرتی بات نہیں تھی؟ جب مرد لڑائی پر چلے جاتے ہیں تب بھی تو اُن کی عورتیں روتی ہیں، لیکن کیا اس وجہ سے سپاہی فوج میں بھرتی ہونا بند کر دیتے ہیں؟۔ وہ اُس سے محبت کرتی تھی اس لئے وہ اُسے جانے تو نہیں دینا چاہے گی۔ لیکن وہ اُسے بتائے گا کہ وہ اس کے لئے جانا کیوں ضروری ہے یہ صرف اس کے فرض کا ہی نہیں بلکہ اُس کی عزت کا بھی سوال ہے اور وہ سمجھ جائے گی، وہ رو رو کر اُسے وداع کرے گی اور جب جدوجہد ختم ہو گی اور آزادی مل جائے گی تب وہ لوٹ کر آئے گا اور وہ مسکرا کر اُس کا استقبال کرے گی پھر اُن کی شادی ہو جائے گی اور اُن کے دن چین سے گذریں گے......

نیند سے اُس کی آنکھیں بند ہونے لگی تھیں اور وہ اس مسرت آمیز تصوّر کو سینے سے لگا کر کروٹ بدل کر سو گیا۔

(۴)

انور نے دیکھا کہ کچھ باتوں میں سبھاش بوس کی شخصیت جواہر لال نہرو جیسی ہی دلکش تھی، لیکن کچھ باتوں میں وہ اُن سے بالکل مختلف تھے۔ دونوں ہی بہت خوبصورت تھے لیکن نہرو کے چہرے پر کافی نرمی تھی اور ناک نقشہ کافی اُبھرا ہوا تھا لیکن اُس

جوشیلے بنگالی کا چہرہ کچھ بھرا ہوا اور گول تھا۔ انور نے انہیں کانگریس میں تقریر کرتے ہوئے سُنا تھا۔ انہوں نے کانگریس کو یہ رائے دی تھی کہ آزادی کی تجویز کو روبہ عمل لانے کے لئے اور سامراجیت کو چیلنج دینے کے لئے مزدوروں، کسانوں اور نوجوانوں کی تنظیم کی بنا پر انگریز سرکار کے متوازی ایک دوسری سرکار بنائی جائے۔ پُرانے لیڈروں کی مخالفت کی وجہ سے یہ تجویز پاس نہیں کی گئی تھی لیکن سامعین میں جو نوجوان تھے وہ سبھاش بوس کے بہادرانہ منصوبے اور ان کی جوشیلی تقریر سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ دونوں کی تقریر سُننے کے بعد انور اس سوچ میں پڑ رہا تھا کہ بوس اور نہرو میں کیا فرق ہے؟ وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ حالانکہ دونوں سوشلسٹ تھے لیکن بوس آزادی اور سماجی انصاف کی طرف اپنے جوشیلے رویّے کی وجہ سے دل کے جذبات کو چھو لیتے تھے، لیکن نہرو کی بات دماغ کو چھوتی تھی اور اُنیسویں صدی کے سیاسی فلسفیوں کی طرح وہ علم سے دماغوں میں تبدیلی کے ذریعے دنیا کو بدلنا چاہتے تھے۔

سٹیج پر تقریر کرتے وقت بوس بہت جوشیلے آدمی معلوم ہوتے تھے لیکن جب انور نے انہیں اپنی جھونپڑی میں قریب سے دیکھا تو وہ بالکل ہی دوسری قسم کے آدمی نکلے ۔ بے حد شریف کافی نرمی سے بولنے والے اور کچھ آرام طلب! انہیں درمیان میں نہرو کی طرح غصہ بھی نہیں آتا تھا۔ رائے نے جو بنگالی لیڈر کو کافی اچھی طرح جانتا تھا انور کا تعارف کراتے ہوئے کہا "یہ علی گڈھ کے بہت کٹّر نوجوان نیشنلسٹ ہیں۔ لیکن پکّے نہرو وادی ہیں" اور یہ سُن کر بوس مسکرا دیئے۔ جرنلسٹ رائے نے پہلے ہی سے اپنے اخبار کے لئے اُن کا انٹرویو لینے کا پلان بنا رکھا تھا۔ لیکن اُس نے اپنے سوال اس طرح تیار کئے تھے کہ انور کے خیالات میں ایک نئی روشنی پیدا ہو اور شاید وہ اپنے

پرانے خیالات کی طرف سے کچھ مایوس ہو۔

"بوس بابو" اُس نے بنگالی کے عام خطاب کا استعمال کرتے ہوئے پوچھا "لاہور کانگریس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے ؟"

بوس بابو نے دھیرے دھیرے رُک رُک کر بہت سدھے ہوئے انداز میں جواب دیا۔ "ظاہر ہے مجھے تو اس بات کی خوشی ہے کہ کانگریس نے مکمّل آزادی کو اپنا مقصد مان لیا ہے، لیکن مجھے اِس بات کا بڑا افسوس ہے کہ ہم نے سرکار کے متوازی اپنی الگ سرکار بنانے کی جو عملی تجویز رکھی تھی اُسے منظور نہیں کیا گیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ منزل تک پہنچنے کے لئے کوئی راستہ نہیں بتایا گیا ہے اور نہ ہی آنے والے سال کے لئے کام کا کوئی پروگرام ہی بنایا گیا ہے۔" پھر کچھ دیر رُک کر، جس کے دوران اپنے موٹے سے چشمے کے پیچھے سے انور کو ایک نظر دیکھا، انھوں نے زیادہ زور دے کر اور کچھ جھنجھلا کر کہا "اس سے زیادہ مضحکہ خیز بھی کوئی بات ہو سکتی ہے یہ تو میں سوچ بھی نہیں سکتا، لیکن سیاست میں کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کو نہ صرف اصلیت کا احساس نہیں رہ جاتا بلکہ وہ اپنی معمولی عقل بھی کھو دیتا ہے۔"

رائے نے فوراً دوسرا سوال پوچھا "کیا یہ سچ ہے کہ آپ کو ورکنگ کمیٹی میں نہیں لیا گیا ہے ؟"

اِس سوال کو سُن کر وہ بہت خوش ہوئے اور جوش میں آ کر بنگالی بولنے لگے لیکن یہ سوچ کر کہ اُن کی بات انور کی سمجھ میں نہیں آئے گی، انھوں نے پھر انگریزی میں بولنا شروع کر دیا۔ "یہ کوئی چھپی ہوئی بات نہیں ہے کیونکہ کل رات ورکنگ کمیٹی کے ممبروں کے ناموں کا اعلان کر دیا گیا ہے اور صرف مجھے ہی نہیں بلکہ بائیں بازو کے

لگ بھگ سب ہی لوگوں کو جان بوجھ کر کمیٹی میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔"

انور نے ہمت کر کے بیچ میں دخل دیتے ہوئے کہا۔ "لیکن یہ تو عجیب بات ہے کیونکہ پریسیڈنٹ خود بائیں بازو کے ہیں اور سوشلسٹ بھی ہیں؟ آخر انہوں نے اپنی پسند کے لوگوں کو کمیٹی میں کیوں نہیں لیا؟"

"کیونکہ" سبھاش بوس نے جواب دیا۔ "لوگوں کو چُننے کا کام مہاتما جی کرتے ہیں اور وہ نہیں چاہتے کہ کمیٹی میں کوئی ایسا آدمی ہو جو اُن کے خلاف آواز اُٹھائے۔ جواہر لال تو پریسیڈنٹ صرف نام کے ہی ہیں۔" پھر انہوں نے جرنلسٹ کو، جو اُن کی باتیں لکھتے جارہے تھے، آگاہ کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن یہ سب کچھ ابھی اخبار میں چھاپنے کے لئے نہیں ہے۔"

(۵)

انور یونس کے ساتھ جا کر خان عبدالغفار خان سے ملا۔ اُس نے اُن سے زیادہ لمبا آدمی اب تک نہیں دیکھا تھا۔ دوسرے لوگ اُن کے آگے بالکل بونے لگتے تھے، اُن کی لمبی سی جھکی ہوئی ناک اور چٹان جیسا سخت کھردرا چہرہ جس پر داڑھی اُگی ہوئی تھی شمال مغربی صوبے کے سخت پہاڑی علاقوں کی یاد دلاتا تھا جن پر کوئی قابو نہیں پاسکا تھا۔ اپنے لمبے چوڑے ڈیل ڈول کے باوجود اُن میں بچوں جیسی معصومیت اور سنتوں جیسی نرمی تھی۔ وہ اتنی نرمی سے باتیں کرتے تھے کہ سُننے والا شرمندہ ہو جاتا تھا۔

انور کا ہمیشہ سے یہ خیال تھا کہ پٹھان بہت خوفناک لڑاکو لوگ ہوتے ہیں لیکن اُس وقت اُس کے سامنے ایک ایسا پٹھان تھا جو بھولی چڑیا کی طرح نرمی سے بولتا تھا اور یہ یقین کرتا تھا کہ گاندھی جی کی اہنسا کے راستے پر ہی چل کر پٹھانوں کو نجات

مل سکتی ہے۔ اُن کے چاروں طرف کوئی درجن بھر دوسرے پٹھان کھڑے تھے جو کھدر کی شلواریں اور گہرے بھورے لال رنگ کے کُرتے پہنے تھے (اسی وجہ سے اُن کا نام "لال کُرتی والے" پڑ گیا تھا) انہوں نے انور کو اپنے صوبے کی عجیب حالت کے بارے میں بتایا۔ جہاں انگریز باری باری سے روپے اور بندوقوں کی مدد سے حکومت کرتے تھے جہاں بھی ممکن ہوتا تھا وہ قبائلیوں کو رشوت دے کر کام نکالتے تھے اور جب ضرورت ہوتی تھی تو اُن پر بم برساتے تھے، اور اس طرح وہ فوجی اہمیت کے اس علاقے کو اپنے قابو میں رکھتے تھے۔ انور آنکھیں پھاڑے ہوئے تعجب سے اُن کی باتیں سنتا رہا۔ انہوں نے انور کو اُن انگریز سیاسی ایجنٹوں کے بارے میں بتایا جو لاکھوں کی رقم پانی کی طرح خرچ کرتے تھے اور بہت بڑے علاقے میں وہ جسے چاہتے مروا سکتے تھے، اس نے یہ بھی سُنا کہ عبدالغفار خاں اپنے اسی صوبے میں لوگوں کو تعلیم دلانے اور سماج سدھار کے کام کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ انور کو یہ سُن کر بھی تعجب ہوا کہ سرکار غفار خاں کی ان کوششوں کو ناکام کرنے کی کوشش کر رہی تھی کیونکہ سرکار چاہتی تھی کہ لوگ جاہل اور پچھڑے رہیں۔ لیکن آزادی کے دیوانے قبائلی کسی بھی قیمت پر اپنی آزادی بیچنے کو تیار نہیں تھے اور وہ بہت ہی بھونڈی قسم کی دیسی بندوقوں کی مدد سے انگریز سامراج کی "آگے بڑھنے کی پالیسی" کے خلاف جان کی بازی لگا کر ٹکر لے رہے تھے۔

"اور پھر بھی خان صاحب" انور نے ہمت کر کے پوچھا "آپ سمجھتے ہیں کہ ان نڈر قبائلیوں کو ہتھیار پھینک کر اہنسا کا راستہ اپنانا چاہیے؟"

"ہاں میں تو یہی سمجھتا ہوں" اس لمبے چوڑے پٹھان نے جواب دیا "اہنسا کا راستہ صحیح راستہ ہے ــــ وہی خدا کا بتایا ہوا راستہ ہے۔ اس مہم میں ہم گاندھی

جی کے ساتھ ہیں اور انشاء اللہ ہم یہ دکھا دیں گے کہ پٹھان آزادی کے لیے جان بھی دینا جانتا ہے۔"

انور اب تیسرے لیڈر سے ملاقات کرنے کے لئے جدا ہوا تو وہ سوچ رہا تھا کہ یہ پٹھان بھی عجیب آدمی ہے، لیکن اس پٹھان میں ایک عجیب کشش تھی۔ سندرم نے جنوبی ہندوستان کے جس لیڈر سے اس کا تعارف کرایا اُن کا نام تھا راج گوپال اچاریہ۔ انور کے لئے یہ نام اتنا ٹیڑھا تھا کہ اُس کا صحیح تلفظ کرنے کے لئے اُسے یہ نام لکھ لینا پڑا۔ عبدالغفار خاں کے مقابلے میں وہ ایک کالے بونے جیسے لگ رہے تھے اور اپنی گنجی چاند اور گہرے رنگ کے چشمے کی وجہ سے اُن کی شکل و صورت کچھ خاص دلکش نہیں تھی۔ انور اُن کی زود فہمی اور اُن کی حاضر جوابی سے بہت متاثر ہوا اور اس نے دیکھا کہ دائیں بازو کی ہر پالیسی کو وہ سب سے اچھی طرح پیش کر سکتے تھے، لیکن ایک ایسے آدمی سے باتیں کرنے میں بڑی اُلجھن ہوتی ہے جس کی آنکھیں گہرے رنگ کے چشمے کے پیچھے چھپی رہیں۔ ایسا آدمی خود تو سب کچھ دیکھتا رہتا ہے پر اُسے کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ جب بات چیت کا رُخ سیاست سے ہٹ کر مذہب کی طرف مُڑ گیا اور وہ دُبلا پتلا چھوٹا سا مدراسی آدمی گیتا کے اشلوک سنانے لگا تو انور کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کرے۔

سبھاش بوس، خاں عبدالغفار خاں، راج گوپال اچاریہ۔ ایک جوشیلا بنگالی اور ایک خاموش اور سنجیدہ پٹھان، ایک ہوشیار اور شاید چالاک مدراسی۔ انور ایک ہی دن میں ان تینوں سے ملا تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کانگریس کی سیاسی پالیسی کے ڈھانچے میں ان تینوں کو ایک ساتھ کیسے بٹھایا

جائے۔ اب تک تو وہ یہی سمجھتا آیا تھا کہ کانگریس کی سیاسی پالیسی کا فیصلہ گاندھی جی کی مہاتماؤں جیسی انسان دوستی اور جواہر لال کے سوشلسٹ آئیڈلزم کی بنیاد پر ہوتا ہے! جو تحریک جلد ہی چھڑنے والی تھی، کیا اُس میں اِن بے میل ہستیوں اور ایک دوسرے کی مخالف طاقتوں کو ایک ساتھ شامل کیا جا سکتا تھا؟ اگر اس میں کامیابی حاصل ہو گئی تو یہ گاندھی جی کی پالیسی کی سب سے بڑی کامیابی ہو گی! اُس رات یہی سوچتے سوچتے انور کو نیند آ گئی۔

(۶)

انور، راز اور یونس کے ساتھ علی گڑھ واپس جانے کی تیاری کر رہا تھا لیکن ابھی وہ بستر باندھ ہی رہا تھا کہ اتنے میں رتن ــــ بلکہ کہنا چاہیے رام لال کیونکہ اب اُس کا یہی نام تھا ــــ وہاں آ پہنچا۔ تو وہ ابھی تک پولیس کے چنگل سے بچا ہوا تھا؟ انور اسے دیکھ کر بہت خوش ہوا اور دونوں دوستوں نے لپک کر ایک دوسرے کو گلے لگا لیا۔

"ارے بھائی، کہاں جا رہے ہو؟" رتن نے اس کے سامان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "ابھی تو تم نے صرف کانگریس دیکھی ہے لاہور تو گھومے ہی نہیں۔ تمہیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے مجھے چار دن ہو گئے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ میں تمہیں اس طرح چلا جانے دوں گا؟ کم سے کم کچھ دن تو تمہیں میرے ساتھ رہنا پڑے گا۔ مجھے یقین ہے تمہارے دوستوں کو کوئی اعتراض نہیں ہو گا"

اور یہ کہہ کر وہ انور کو اپنے ساتھ گھسیٹ لے گیا اور اس کا سوٹ کیس اور بستر تانگے میں ڈال کر اس نے تانگے والے سے کرشن نگر چلنے کو کہا۔ پھر انور سے بولا۔

"میں نے کرائے پر ایک گھر لے رکھا ہے جس میں میں اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ رہتا ہوں۔" انور کو اچھی طرح اس بات کا اندازہ تھا کہ وہ کس طرح کے دوستوں کے ساتھ رہتا ہوگا اور جب وہ رتن کے گھر پہنچا اور اس نے اندر کے کمروں میں طرح طرح کی بوتلیں، شیشیاں، کانچ کی نلیاں اور تیزاب کی صراحیاں، پرانے لوہے کے ٹکڑے اور کچھ فولاد کے خول بھرے ہوئے دیکھے تو اُس کے دل میں طرح طرح کے شک پیدا ہونے لگے اور وہ سمجھ گیا کہ یہ سب چیزیں صرف بم بنانے کے ہی کام آسکتی ہیں۔

"مجھے یہاں لاکر کیا تم نے بہت بڑا خطرہ نہیں مول لیا ہے؟" انور نے بیٹھتے ہوئے کہا "کیا تمہاری پارٹی کے لوگ اِس بات پر اعتراض نہیں کریں گے کہ تم نے ایسی خفیہ جگہ ایک اجنبی آدمی کو دکھا دی؟"

"انور تم نے دِلّی میں ہم لوگوں کے لئے جو کچھ کیا اُس کے بعد تم اب پارٹی کے لئے اجنبی نہیں رہ گئے۔"

اس بات پر انور کو یاد آیا کہ اُس حادثے کو دس مہینے ہو گئے تھے لیکن ابھی انور کو اُس کے دوست سے ایک حساب چکتا کرنا تھا۔ اُس نے شکایت کرتے ہوئے کہا "اِس بار تم اپنے وعدے پر قائم نہ رہے۔ تمہیں یاد ہے میں نے کیا کہا تھا کوئی تشدّد نہ ہونے پائے؟"

رتن یہ سُن کر ہنس پڑا اور بولا "تمہیں بھی یاد ہے ہم نے کیا کہا تھا — کوئی جان سے نہیں مارا جائے گا۔" بھگت سنگھ، بٹوکیشور دت اور اپنے دوسرے ساتھیوں کی یاد آتے ہی جن پر وہاں سے کچھ ہی میل کی دوری پر لاہور سنٹرل جیل میں قتل اور بغاوت کے سنگین جرموں میں مقدمہ چلایا جا رہا تھا، رتن کا چہرہ بجھ

اُداس ہوگیا۔ اُسے شاید اس بات کا اندازہ ہوگیا ہوگا کہ انور نے اُس کے جذبات کو تاڑ لیا ہے۔ کیونکہ کسی کا نام لئے بغیر اس نے کہنا شروع کیا "تمہیں یہ تو معلوم ہی ہوا ہوگا کہ اُن کے ساتھ کیا ہورہا ہے ـــ بھوک ہڑتال کے بارے میں اور اکسٹھ دن کی بھوک ہڑتال کے بعد جیتن داس کی موت کے بارے میں تو تم نے سُنا ہوگا۔ اور ذرا سوچو، دو مہینے تک اُس نے اناج کا ایک دانہ بھی نہیں کھایا۔ تم نے اُسے دیکھا نہیں تھا۔ وہ یوں بھی اتنا دُبلا پتلا اور اتنا نرم طبیعت کا تھا کہ ہم لوگ اُس سے کہا کرتے تھے کہ 'جتین تم تو بالکل لڑکیوں جیسے ہو' اور ہماری اس بات پر وہ شرما کر ہنس دیتا تھا اور جب اُس کی ارتھی اُٹھی اُس وقت وہ سُوکھ کر بالکل کانٹا ہو چکا تھا اور اُس کا وزن بچے کے وزن سے زیادہ نہیں تھا۔"

انور نے دیکھا کہ رتن کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے تھے اور ادھر کچھ دنوں سے اُس نے سخت گیری اور سخت کلامی کا جو ایک باہری غلاف اوڑھ رکھا تھا وہ اچانک ہٹ گیا۔ اب اُس سے وہی پُرانا رتن باتیں کر رہا تھا جس سے وہ لڑکپن میں ملا تھا اور جس کی طبیعت اتنی نرم تھی۔ "اخباروں میں پورا حال چھاپا نہیں جاتا کہ پولیس ہمارے ساتھیوں کے ساتھ کیا سلوک کر رہی ہے۔ اُنہیں بُری طرح پیٹا گیا ہے اور ہفتوں اندھیری کال کوٹھریوں میں بند کر کے رکھا گیا ہے۔ اُنہیں سخت تکلیفیں دی گئی ہیں اور ننگا کر کے برف کی سلوں پر لٹایا گیا ہے۔ اب ہم انہیں زیادہ دن تک یہ تکلیفیں سہنے نہیں دے سکتے۔ جلد ہی ہمیں ......"

یکایک وہ بات کرتے کرتے رُک گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ جتنی باتیں بتانا چاہتا تھا اُس سے زیادہ اُس نے بتا دی ہیں۔ اتنی باتیں تو اُسے پورے بھروسے

والے دوست کو بھی نہیں بتانی چاہئیں۔

"تمہارا مطلب ہے کہ تم اُن لوگوں کو چھڑانے کی کوشش کرو گے؟" انور سے پوچھے بغیر نہ رہا گیا۔ اِس دلیرانہ تجویز کا تصور کر کے ہی اُس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

رتن نے سر ہلا کر دوسرے کمرے کی طرف اشارہ کیا جہاں انور پہلے ہی بم کا کارخانہ دیکھ چکا تھا۔ "ہمارے کچھ ساتھی اسی کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ اصلی ڈرل یہ نہیں ہے۔ میں تو تم سے ایک دوسری ہی چیز کے بارے میں باتیں کرنا چاہتا ہوں جو کہیں زیادہ ضروری ہے لیکن جس میں تمہارے لئے خطرہ بہت کم ہے۔"

انور یہ جاننے کے لئے بے چین تھا کہ وہ کیا چیز تھی جس کے بارے میں رتن اس سے باتیں کرنا چاہتا تھا پر رتن کو بتانے کی جلدی نہیں تھی "پھر باتیں کریں گے لیکن یہاں نہیں، اب دوسرے لڑکے واپس آتے ہوں گے اور میں یہ بات اُن کے کانوں میں بھی پڑنے دینا چاہتا ہوں۔" پھر اُس نے ایک ایسی بات کہی کہ انور چکر میں پڑ گیا۔ اُس نے کہا "تم کپڑے بدل کر اپنا سب سے اچھا سوٹ پہن لو، شاید ہم کھانا کھانے کیلئے ایک بہت ہی فیشن ایبل ہوٹل میں چلیں گے۔"

(۷)

وہ سنگیت سب سے پہلے افریقہ کے جنگلوں سے آیا تھا، جہاں کے قدیم جنگلی باشندے بھوت پریت بھگانے والے جادوگر کے مشورے کے مطابق ڈھول پیٹ کر، بھونپو بجا کر اور اپنے تنے ہوئے کالے پیٹ بجا بجا کر عجیب عجیب آوازیں نکال کر چلاتے تھے۔ جب غلاموں کی تجارت کرنے والوں نے اِن بیچارے حبشیوں کو پکڑ کر سات سمندر پار نئی دنیا میں جا کر بسنے والے سفید فام لوگوں کے ہاتھ بیچا تو یہ اپنے ساتھ اپنا

سنگیت بھی لے گئے۔ نیویارک، شکاگو اور سان فرانسسکو کے اکتائے ہوئے شوقین لوگوں کو یہ سنگیت بھا گیا اور جنوبی امریکہ کی جذبات کو اُبھارنے والی بھیگی بھیگی ہوا میں اِس سنگیت کو نئے سانچے میں ڈھالا گیا اور وہ پہلے سے بھی زیادہ شدید جذباتی ہو گیا۔ ڈالر کے دیس سے آنے والی دوسری چیزوں ــ ہالی وڈ کی فلمیں، فورڈ کی موٹر گاڑیاں، لپ سٹک، چیوئنگ گم ــ کے ساتھ جاز سنگیت بھی ہندوستان پہنچا۔ یہ سنگیت لاہور میں بڑی تیزی سے پنپنے لگا کیونکہ نودولیتے زمینداروں کے بیٹوں کو اس میں خود اپنے ملک کے جاندار لوک سنگیت کی ایک عجیب اور مسخ شدہ سی گونج سنائی دیتی تھی۔

رتن انور کو مال روڈ پہ ایک نائٹ کلب میں لے گیا اور وہاں اُسے لاہور کی زندگی کے ایک ایسے پہلو سے واقف کرایا جو کانگریس کیمپ کے رُوکھے سیاسی ماحول سے بالکل الگ تھا۔ یہ بالکل ہی دوسری دنیا تھی کپڑے کی دکانیں جن میں سیکڑوں قسم کا رنگ برنگا ولایتی کپڑا ٹھسا ٹھس بھرا ہوا تھا، جگ مگ کرتی ہوئی جوہریوں کی دکانیں، ریستوراں، شراب خانے اور نائٹ کلب، الپاکا کے ڈِنر سوٹ، کلف دار قمیص، جارجٹ اور چینی کریپ کی ساڑیاں، زری کی قمیصیں اور شلواریں، ہیرے کے بُندے اور موتیوں کے ہار، پوڈر اور سُرخی سے رنگے ہوئے چہرے، رسیلے ہونٹ اور دعوت دیتی ہوئی آنکھیں، بے جھجک قہقہے، گلاسوں کی کھنک، شراب کی جھلملاہٹ، گال سے گال ملا کر ناچتے ہوئے جوڑے اور کانگو کے جنگلی سنگیت کی دُھن پر تھرکتے ہوئے لچکدار جسم اور ان سب چیزوں پہ چھایا ہوا سگریٹ کا دُھواں اور وسکی کی بھبھک...

رتن نے اُسے بتایا کہ اُس نے یہ اصول سا بنا لیا تھا کہ وہ ساری خفیہ باتیں کسی

نائٹ کلب میں جاکر ہی کرتا تھا۔ جہاں بھیڑ میں ہو کر بھی آدمی اکیلا رہتا ہے اور اُس ہُلڑ کے بیچ کھُل کر بات چیت کر سکتا ہے۔ انور کو شروع شروع میں تو اس میں بہت خطرہ معلوم ہوا لیکن ناچ گھر کی مدھم روشنی میں کچھ منٹ تک کونے والی میز پر بیٹھنے کے بعد اُسے یقین ہوگیا کہ رتن نے یہ جگہ پسند کرنے میں کتنی سمجھداری کا ثبوت دیا تھا۔ شراب کے دیوتا کا یہ مندر آخری جگہ تھی جہاں پولیس کسی انقلابی کی تلاش میں آ سکتی تھی

تھوڑی ہی دیر میں وہ وہاں کے ماحول سے واقف ہوگیا اس لئے اب اُس کا دھیان اپنے چاروں طرف کی چیزوں سے ہٹ گیا اور اُس نے اپنے دوست کی بات غور سے سُننا شروع کیا۔

رتن نے اُسے بتایا کہ جیل کے اندر اور باہر دونوں ہی جگہ کے انقلابیوں کو اب بھی یقین نہیں تھا کہ کانگریس کوئی انقلابی قدم اُٹھائے گی۔ پھر بھی وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ آزادی والی تجویز آگے کی سمت میں ایک قدم ہے اور بہت تھوڑا ہی سہی لیکن اس بات کا امکان ہے ضرور کہ جتنے دن تک جواہر لال کانگریس کے پریسیڈنٹ ہیں تب تک کانگریس شاید کچھ بائیں بازو کی طرف جُھکے۔

انور کو یہ سُن کر بہت دلچسپی پیدا ہوئی کیونکہ اُس نے محسوس کیا کہ دہشت پسند بھی اب دھیرے دھیرے اُس کے ڈھنگ سے سوچنے لگے ہیں لیکن پھر بھی اُس نے پوچھا "تو اِس میں میں کیا کر سکتا ہوں؟"

"یہی میں بتانے جا رہا ہوں۔" رتن نے جواب دیا اور بتایا کہ انقلابی یہ محسوس کرتے ہیں کہ انہیں اب اپنا کام سیاسی حلقے میں کرنا ہوگا اور بم وغیرہ پھینکنے تک ہی محدود نہیں رہنا ہوگا۔ اس کے لئے کسی ایسے آدمی کی ضرورت ہے جو دوسرے دلوں تک ہماری

بات پہنچا سکے اور اُن کی بات ہمیں بتا سکے کیونکہ اُن کا طریقہ ہمارے اب تک کے طریقے سے الگ بھلے ہی ہو پر انقلاب کے لئے اُن کے دل میں ہم سے کم لگن نہیں ہے۔"

"تمہارا مطلب"۔ انور نے اُس کی بات کا مطلب سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "کمیونسٹوں سے ہے۔"

"ہاں کمیونسٹوں سے بھی، اوروں سے بھی۔ شاید علی گڈھ میں میں نے تمہیں بتایا تھا کہ ہماری پارٹی کی پالیسی میں سوشلزم کی طرف ایک نیا جھکاؤ آیا ہے۔ ہمارے ساتھیوں کی بھوک ہڑتال کے زمانے میں میرٹھ کے قیدیوں نے بھی ہماری ہمدردی میں بھوک ہڑتال کر کے ہمارے ساتھ اپنے بھائی چارے کا ثبوت دیا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ساتھ مل کر کام کرنے کی بنیاد موجود ہے۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ ہماری طرف سے میرٹھ ایک پیغام پہنچا دیا جائے جس میں ہمارے ٹھوس مشورے ہوں۔"

آخر کار انور کی سمجھ میں آنے لگا کہ اس میں وہ "کیا کر سکتا ہے"۔

"تو تم مجھ سے یہ چاہتے ہو کہ ......"

"ہاں، تم ہی ایک ایسے آدمی ہو جو اس کام کو کر سکتے ہو۔ ہم میں سے کوئی بھی میرٹھ کی عدالت میں جانے کی ہمّت نہیں کر سکتا کیونکہ وہاں آدھے درجن صوبوں کے سی۔ آئی۔ ڈی والے موجود ہوں گے۔"

اُن کے آپس کے تعلقات اتنے گہرے تھے کہ خیالات میں بے حد فرق ہونے کے باوجود رتن کبھی بھی انور سے یہ پوچھتا نہیں تھا کہ وہ اس کا کوئی کام کرے گا کہ نہیں۔ وہ بس سیدھے اُس سے وہ کام کرنے کو کہہ دیتا تھا۔

انور کچھ گھبرا رہا تھا لیکن رتن نے اُسے ہمّت بندھاتے ہوئے کہا۔ "میں نے سب

نقشہ تیار کر لیا ہے۔ تمہارے لئے کوئی بھی خطرہ نہیں ہے۔ کل جب ہمارے ساتھیوں کا مقدمہ پیش ہو تو تم ایک پریس رپورٹر بن کر عدالت میں جانا ـــــ میں نے تمہارے لئے پریس کا پاس بنوا لیا ہے۔ وہاں اُن میں سے کوئی ایک چپکے سے تمہارے ہاتھ میں ایک چٹھی سرکا دے گا۔ تمہیں بس میرٹھ جا کر وہاں اُن میں سے کسی کو وہ چٹھی دے دینا ہے۔ بس اتنا ہی کام ہے۔ تمہیں اور کچھ نہیں کرنا ہے، بہت ہی سیدھی سی بات ہے۔"

انور کو یہ بات اتنی سیدھی نہیں معلوم ہوئی کیونکہ اُسے پہلے اس قسم کے خفیہ کام کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ لیکن کانگریس کی تحریک کو کچھ بائیں بازو کی طرف لے جانے کے لئے کمیونسٹوں اور دہشت پسندوں کے درمیان میل ہو جانے کا خیال اُسے بَچ گیا۔ اس لئے اُس نے رضامندی میں اپنا سر ہلا دیا۔ اس کے بعد دونوں دوستوں نے ناچ کی طرف توجہ دی جہاں کئی جوڑے ایک زوردار "پھڑکتی ہوئی" دھن پر ناچ رہے تھے اور ایک لڑکی بہت کسا ہوا کالا فراک پہنے، جو ایک طرف سے اس طرح کٹا ہوا تھا کہ اُس کی پوری ننگی ٹانگ دکھائی دیتی تھی، جھوم جھوم کر دیوانوں کی طرح گا رہی تھی۔

چکی چک چک!

"اٰئی لو یو سو مچ، سو مچ، سو مچ!"

(۸)

دوسرے دن بہت صبح ہی انور نے ایک تانگہ پکڑا اور کرشن نگر سے سیدھا اسٹیشن گیا۔ وہاں اُس نے اپنا سوٹ کیس اور بستر کلوک روم میں ڈالا اور لگ بھگ ایک

گھنٹے میں ویٹنگ رُوم میں وقت کاٹنے کے بعد سنٹرل جیل کے لئے دوسرا تانگہ لیا۔ رتن نے اُسے اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ تانگہ کرتے وقت اس بات کا خیال رکھے کہ وہ پہلے والا تانگہ نہ ہو۔ جیل کا لوہے کا بھاری پھاٹک بند تھا لیکن پریس کارڈ دکھانے پر اُسے فوراً چھوٹی کھڑکی کھول کر اندر چلا جانے دیا گیا اور فوراً ہی بعد پھر کھڑکی میں تالا ٹھونک دیا گیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ خود قیدی ہو۔

عدالت کا کمرہ وکیلوں، کچہری کے کارکنوں، اخبار کے رپورٹروں اور مجرموں کے رشتے داروں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ انور جا کر رپورٹروں کی میز پر بیٹھ گیا۔ انور نے پیچھے مُڑ کر دیکھا اور اِس بات پر اُسے بہت اطمینان ہوا کہ وہ کٹہرا جس میں مجرم لا کر بٹھائے جانے والے تھے، ٹھیک اُس کے پیچھے تھا۔

اتنے میں مجرم قطار باندھ کر کمرے میں داخل ہوئے اور سارا کمرہ "انقلاب زندہ باد" اور دوسرے انقلابی نعروں سے گونج اٹھا اور انور یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ عدالت میں جتنے بھی لوگ موجود تھے سب مجرموں کے احترام میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ سارے قیدیوں کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا اور یہ ظاہر تھا کہ بھوک ہڑتال کی وجہ سے وہ ابھی تک بے حد کمزور تھے۔ بھگت سنگھ کو بھی انور اُس کی نوکیلی اینٹھی ہوئی مونچھوں کی وجہ سے ہی پہچان سکا۔ وہ بہت دُبلا ہو گیا تھا اور انور نے اُس کی آنکھوں میں پہلے جو اُداسی دیکھی تھی اُس کی جگہ پر اب اُن میں ایک نرمی اور روحانی خاموشی دکھائی دیتی تھی، ایسا لگتا تھا کہ اب اُس کے لئے سارا ٹکراؤ اور ساری کڑواہٹ کا، ساری جدوجہد اور تشدد کا خاتمہ ہو گیا تھا اور اپنا سفر ختم کرتے وقت وہ صرف اپنی پچھلی زندگی کا جائزہ لے رہا تھا اور اسے کسی بات کا افسوس نہیں تھا۔ اُس نے انور کو پہچانا اور ایک لمحے کے

لئے اس کی نظروں نے انور کے چہرے پر رُک کر جیسے چُپ چاپ ہی اُسے سلام کیا اور پھر سارے کمرے کا جائزہ لینے لگیں۔ چوکنّی سی۔ آئی۔ ڈی کو اِس بات کا شُبہ تک نہیں ہو سکا کہ وہ نظریں بیچ میں کہیں ٹھہری ہوئی تھیں۔

انگریز جج آ کر اپنی کُرسیوں پر بیٹھ گئے۔ عدالت کے کارکنوں نے وہاں پر موجود لوگوں کو کہہ کہہ کر آنریبل ججوں کے اعزاز میں کھڑا کیا۔ لوگ کھڑے تو ہو گئے پر اپنی خوشی سے نہیں بلکہ اُن کے چہروں پر ناپسندیدگی کے آثار نمایاں تھے۔

عدالت کی کارروائی شروع ہوئی اور سرکاری گواہوں سے جرح شروع ہوئی۔ انور چونکہ وہاں رپورٹ لکھنے نہیں آیا تھا اس لئے وہ غیر ضروری باتوں میں کوئی دلچسپی نہیں لے رہا تھا بلکہ اس کی بجائے مجرموں کے ردّ عمل کو دیکھ رہا تھا۔ اُس نے دیکھا کہ یہ لوگ عدالت کی کارروائی کی طرف ذرا بھی توجہ نہیں دے رہے تھے۔ ایک مقامی اخبار کے رپورٹر نے انور کو کٹہرے میں بیٹھے ہوئے خاص خاص انقلابیوں کے نام بتائے۔ بھگت سنگھ اور بٹوکیشور دت کو انور پہلے ہی سے پہچانتا تھا بہت دُبلا پتلا آدمی پونہ کا ایک مراٹھا تھا جس کا نام راج گرو تھا۔ اُس کے پاس سُکھ دیو بیٹھا تھا جس کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ وہ پوری پارٹی کا دماغ ہے۔ انور نے اخباروں میں اس مقدمے کی تفصیل پڑھی تھی اور وہ جانتا تھا کہ سرکاری وکیل اس بات کی کوشش کر رہے تھے کہ اُن میں سے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو پھانسی کی سزا ہو جائے۔ پھر بھی وہ سب، جن میں جوانی اور زندگی کی اُمنگ تھی وہاں بالکل خاموش بیٹھے تھے جیسے اُنہیں کسی بات کی فکر نہ ہو، کسی بات کا ڈر نہ ہو۔

ایک بجے عدالت لنچ کے لئے برخاست ہو گئی۔ رتن کی ہدایتوں کے مطابق

اُسے اپنا کام کرنے کا وقت آگیا تھا۔ وہ دو قدم بڑھ کر کٹہرے کے پاس آگیا اور اس طرح وہاں کھڑا ہوا کہ اس کے کوٹ کی جیب لکڑی کے جنگلے سے لگی ہوئی تھی۔ اس نے بھگت سنگھ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور کہا "میں ایک اخبار کا رپورٹر ہوں کیا آپ مجھے بتائیں گے کہ آپ لوگوں کے ساتھ جیل میں کیسا سلوک ہو رہا ہے؟"

یہ سوال پہچان کے لئے تھا۔

اُس انقلابی کی آنکھیں ایک پل کے لئے اِس طرح چمک اُٹھیں جیسے وہ اسے پہچانتا ہو اور اس نے جواب دیا "آپ ہم لوگوں کی صورتوں سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ہمارے ساتھ کس طرح کا سلوک ہوتا ہے۔" اور پھر طنز بھرے انداز میں اُس نے کہا "کیا ہماری صورت سے نہیں لگتا کہ ہمیں پیٹ بھر کھانا ملتا ہے اور ہم چین کی زندگی بسر کرتے ہیں؟ آپ دیکھتے نہیں کہ ہم سب لوگوں کا وزن کتنا بڑھ گیا ہے۔ آپ لوگ اپنے اخباروں میں لکھئے کہ ہماری سرکار کتنی رحمدل اور مہربان ہے۔"

جس وقت وہ یہ باتیں کہہ رہا تھا انور کو کاغذ کی سرسراہٹ سُنائی دی اور ایک خط چُپ چاپ اُس کی جیب میں سرک گیا۔

انور "تھینک یو، تھینک یو" کہتا ہوا جلدی سے کٹہرے کے پاس سے کھسک آیا کیونکہ اسی درمیان پولیس کے ایک داروغہ صاحب اُس کی طرف جھپٹ پڑے اور ٹھیٹ پنجابی لہجے میں اُس سے پوچھنے لگے "کیوں جی، وہاں کیا چاہیئے تمہیں؟" انور نے خاموشی کے ساتھ انہیں سمجھایا کہ وہ ایک اخبار کا رپورٹر ہے اور وہ قیدیوں سے صرف یہ جاننا چاہتا تھا کہ جیل میں اُن کے ساتھ اچھا سلوک تو ہو رہا ہے نا، حالانکہ دل ہی دل میں وہ ڈر رہا تھا کہ کہیں اُس کی تلاشی نہ لی جائے اور اُس کی جیب میں وہ کاغذ

نہ پکڑا جائے۔

"وہ سب لوگ ٹھیک ہیں تم اُن کی فکر نہ کرو" داروغہ صاحب نے غُصّے میں جھلّا کر کہا "خبردار جو تُم اب اُن کے پاس گئے، میں تمہیں یہاں سے باہر نکال دوں گا ساری رپورٹری دھری رہ جائے گی"۔

انور نے وعدہ کیا کہ وہ اب ایسا نہیں کرے گا اور پھر اُس نے اُونچی آواز میں پولیس والوں کو سُنانے کے لئے دوسرے رپورٹروں سے کہا کہ وہ باہر کھانا کھانے جا رہا ہے اور یہ کہہ کر وہ جیل سے باہر نکل گیا۔ سٹیشن پہنچ کر اُس نے پریس کارڈ پھاڑ کر پھینک دیا اور جو بند لفافہ اُسے دیا گیا تھا اُسے اپنے بٹوے میں حفاظت سے رکھ کر اُس نے میرٹھ کا ٹکٹ خریدا۔

(۹)

میرٹھ میں کمیونسٹوں پر سازش کے مقدمے سے ساری دنیا میں ہلچل پیدا ہو گئی۔ اور کمیونسٹ سازشیوں کے اس مقدمے کی خبر بھیجنے کے لئے نہ صرف دلّی اور لاہور سے، بمبئی اور کلکتے اور مدراس سے بلکہ انگلستان اور امریکہ سے بھی نامہ نگار میرٹھ آ رہے تھے۔ اِس لئے انور کو 'بمبئی کرانیکل' کے خاص نامہ نگار کی حیثیت سے اس مقدمے کی رپورٹ بھیجنے کے لئے پریس کارڈ بنوا لینے میں کوئی مشکل نہیں ہوئی۔ وہ جانتا تھا کہ اس اخبار نے اپنا کوئی نامہ نگار میرٹھ نہیں بھیجا ہے۔

جس خاص عدالت میں اس مقدمے کی پیشی ہو رہی تھی وہ ایک معمولی گھر کے بڑے سے کمرے میں قائم کی گئی تھی جسے "جرنیل صاحب کی کوٹھی" کہتے تھے۔ کسی زمانے میں جنرل گارڈن جنہوں نے برٹش سامراج کو بڑھانے میں بہت کچھ کیا تھا، یہیں

رہتے تھے اور یہ مناسب ہی تھا کہ سامراج کے دشمنوں پر اُن ہی کے گھر میں مقدمہ چلایا جائے جہاں شاید اُن کا بھوت اب بھی رہتا ہو۔

انور پولیس کے کئی سنتریوں کو پار کرتا ہوا کمرے میں گھسا۔ عدالت کی کارروائی شروع ہو چکی تھی۔ انور دیکھ رہا تھا کہ اخبار کے رپورٹر کہاں بیٹھے ہیں۔ اُس نے اُس لمبے سفیدی کئے ہوئے کمرے کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک دیکھا۔ بیچ میں ایک لکڑی کا بڑا سا چبوترا جیسا بنایا گیا تھا جس پر مجسٹریٹ صاحب کی میز لگی ہوئی تھی۔ چبوترے کے سامنے ایک اور میز تھی جس پر قانون کی موٹی موٹی کتابوں کا بڑا سا ڈھیر لگا ہوا تھا اور میز کے دونوں طرف کالے گاؤن پہنے ہوئے سرکاری اور صفائی کے وکیل بیٹھے ہوئے تھے۔ مسٹر ملز وھائٹ مجسٹریٹ، جن کے سامنے یہ مقدمہ پیش تھا، بہت ہی چھوٹے ڈیل ڈول کے نرم طبیعت کے انگریز تھے اور ایسا لگتا تھا کہ ایک ایسے خطرناک مقدمے کا فیصلہ کرنے کے لئے جس کی جڑیں میرٹھ سے ماسکو تک پھیلی ہوئی تھیں، بہت ہی غلط آدمی کو چنا گیا تھا۔ سرکاری وکیل کی دھواں دھار تقریر کو درج کرنے کے لئے ٹائپ رائٹر پر انگلیاں دوڑاتے ہوئے مجسٹریٹ صاحب انور کو قابلِ رحم لگے۔ اِس عجیب اور بے تکی تصویر کا ایک پہلو اور بھی تھا اور وہ یہ تھا کہ مجسٹریٹ صاحب کی بیوی جو اُن کے قریب ہی بیٹھی ہوئی تھی بنائی کر رہی تھیں، انہیں عدالت کی کارروائی میں ذرا بھی دلچسپی نہیں تھی۔

لیکن اس ڈرامے میں اہم پارٹ نہ تو اُن چھوٹے سے شریف صورت مجسٹریٹ صاحب کا تھا اور نہ کٹہرے میں کھڑے ہوئے اُن تیس قیدیوں کا بلکہ اس ڈرامے کا اہم اداکار وہ دُبلا پتلا لمبا سا سرکاری وکیل تھا جو اس وقت عدالت کے سامنے اپنا بیان پیش کر رہا تھا۔ وہ بولتا تھا تو ایسا لگتا تھا کہ وہ انگارے اُگل رہا ہے۔ اس کا نام کچھ

امریکنوں جیسا تھا ـــ جے ۔ لانگ فورڈ جیمس ـــ لیکن ایک آنکھ پر بنا کمانی کا چشمہ، چھدرے چھدرے کھچڑی جیسے بال، اُس کی کڑواہٹ بھری ہنسی اور طنز اُس کے ٹھیٹ انگریز ہونے کے ثبوت تھے۔ وہ کسی وقت کلکتے کی یوروپین ایسوسی ایشن کا پریسیڈنٹ رہ چکا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ 'پنچ' رسالے میں کسی برٹش سامراج کے ستون کا کوئی کارٹون زندہ ہو اٹھا ہو۔ اس مقدمے میں ایک وکیل کی حیثیت سے دلچسپی ہونے کے علاوہ اُسے کمیونسٹوں پر حملہ کرنے میں خاص خوشی ہو رہی تھی۔ وہ خود کو کمیونزم کے خلاف مجاہد تصور کرنے لگا تھا۔ روزانہ چودہ سو روپے فیس (جس میں چھٹیاں بھی شامل تھیں) اس کی کمیونسٹ دشمنی کا معمولی سا انعام تھا!

دوسرے نامہ نگاروں سے، جن میں سے کچھ شروع سے ہی مقدمے کی رپورٹ کر رہے تھے، انور کو اس مقدمے کے بارے میں چند دلچسپ باتیں معلوم ہوئیں جس سے مسٹر جیمس کے حالیہ عدالتی کارناموں کے پس منظر پر روشنی پڑتی تھی۔ مقدمہ نو مہینے سے چل رہا تھا اور تین سو سے زیادہ استغاثہ کے گواہوں کو پیش کیا گیا تھا۔ اور مقدمہ ختم ہونے تک اُس پر کُل خرچ دس لاکھ روپے یا اس سے بھی زیادہ آنے کا امکان تھا اور لانگ فورڈ جیمس استغاثہ کے گواہوں پر مزید پانچ دن لگائے گا یا کچھ اس سے بھی زیادہ ـــ اور انور کے خیال میں یہ زوردار تقریر جو کمیونزم کے نظریاتی اصولوں پر ایک حملے سے زیادہ نہ تھی (نہ کہ کسی مجرم کے خلاف فردِ جرم) اور جو لگتا تھا کبھی ختم نہ ہوگی۔

اونچے قد کا وکیل جو اپنے ہاتھ میں کارل مارکس کی کتاب "کیپٹیل" (سرمایہ) کی ضخیم جلد تھامے ہوئے تھا اور جو خوفناک کمیونسٹوں کی روس میں خبیث حرکتوں کے بارے میں زوردار بحث کر رہا تھا خود کو دیانت دار سمجھ کر بڑی ہی کے انداز میں کہہ رہا تھا۔

"یہ ــــ یہ ــــ مارکس کے خطرناک نظریات ــــ"

ڈرامائی انداز میں کچھ وقفے کے بعد اُس نے کتاب کو میز پر رکھ دیا اور لڑکھڑاتا ہوا کٹہرے تک گیا اور قیدیوں کی طرف گھور کر دیکھنے لگا جیسے وہ اُن سب کو ذاتی طور پر ذمہ دار سمجھ رہا ہو۔ "یہ ہے" اور اِن لفظوں پر زور دیتے ہوئے اُس نے مجرموں کو ایک بار پھر اس طرح گھور کر دیکھا جیسے وہ اُن سب کو اس اجتماعی شیطانیت میں شامل کر رہا ہو۔ "یہ ہے وہ سنہری جنّت جس کے لئے اِن قاتلوں کے اشارے پر روس کی خفیہ پولیس نے پچیس لاکھ مرد، عورتیں اور بچّے موت کے گھاٹ اُتار دیئے۔"

وہ ایک بار پھر رُکا تاکہ اُس کے الفاظ لوگوں کے دلوں میں بیٹھ جائیں، اور مجسٹریٹ صاحب کو اپنے چھوٹے سے ٹائپ رائٹر پر انہیں ٹائپ کرنے کا موقع مل جائے اور وہ مجرموں کو اس طرح گھور کر دیکھنے لگا جیسے اُسے اُن میں سے ہر ایک سے کوئی ذاتی شکایت ہو اور وہ اُن کی جس پر چوٹ کر کے اپنے طنز کے چاقو سے کرید کر مزا اُٹھا رہا ہو۔ لیکن اس بار تقریر کے دوران رُکنا اُس کے لئے خطرناک ثابت ہوا۔ اُس دبلے پتلے انگریز کی ایک آنکھ پر لگے ہوئے بنا کمانی کے چشمے کا سارا رُعب مٹّی میں مل گیا۔ ہوا یہ کہ جیمس صاحب کے رُکتے ہی قیدیوں نے اپنی اُکتاہٹ ظاہر کرنے کے لئے بڑے زور سے جمائی لی۔ اِس پر سب لوگ ہنس پڑے یہاں تک کہ خود جیمس صاحب کے نیچے کام کرنے والے ایک ہندوستانی وکیل صاحب بھی جن کے موٹاپے کی وجہ سے ٹھوڑی کے نیچے کھال لٹک آئی تھی، اپنی ہنسی نہیں روک سکے۔ اور تو اور مجسٹریٹ صاحب بھی اس مضحکہ خیز حالت پر اپنی ہنسی لاکھ روکنے پر بھی مسکرا ہی دیئے۔

جب جیمس صاحب نے کمیونسٹ قیدیوں کی اِس گستاخی پر جھنجھلا کر تیزی سے مُڑ کر

اُنہیں گھورا تو اُن کا چشمہ نیچے گر کر کالی ڈوری سے جھولنے لگا۔ اس پر سب لوگ پھر قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

"یور آنر، آئی پروٹسٹ۔ میں آپ کی توجہ اس بات کی طرف دلانا چاہتا ہوں کہ۔۔"

مجسٹریٹ صاحب نے اپنی ہنسی چھپانے کے لئے ایک فائل اپنے منہ کے سامنے کر لی اور جیمس صاحب کو اپنا اعتراض پورا کرنے کا موقع دیئے بغیر ہی اُنہوں نے کہا "اچھا اب عدالت لنچ کے لئے برخاست ہوتی ہے۔"

قیدیوں کو کھانا کھلانے کے لئے بنگلے کے پیچھے لے جایا گیا۔ اُن کا کھانا ایک لمبی سی میز پر لگا ہوا تھا۔ بہت سے نامہ نگار قیدیوں کو نزدیک سے دیکھنے کے لئے ٹہلتے ہوئے اسی طرف بڑھے۔ اُن میں ایک موٹا سا لال منہ والا امریکن بھی تھا جو دھوپ سے بچنے کے لئے اتنی بڑی ہیٹ لگائے تھا کہ دیکھ کر ہنسی آتی تھی۔ انور نے کچھ قیدیوں کو تو پہچان لیا کیونکہ اُنہیں دلّی کے سٹیشن پر دیکھ چکا تھا۔ باقی کا مقامی نامہ نگاروں نے تعارف کرایا۔ سپریٹ SPRATT اور بریڈلے BRADLEY کے علاوہ اب اُن میں ایک تیسرا انگریز بھی تھا۔ ہچن سن HUTCHINSON نام کا ایک نوجوان جرنلسٹ۔ قیدیوں میں سب سے بوڑھے ڈی۔آ۔ ٹھینگڈی نام کے ایک بزرگ تھے جن کی عمر اس وقت پینسٹھ سال کی تھی اور جو ٹریڈ یونین کانگریس کے پریسیڈنٹ رہ چکے تھے۔ گورکھپور کے ایک موٹے سے ہومیوپیتھ ڈاکٹر گھوش کی سج دھج نرالی ہی تھی، اُنہوں نے لینن کے ڈھنگ کی ایک چھوٹی سی کالی داڑھی رکھ چھوڑی تھی۔ پنجاب کے ایک تگڑے سکھ سردار جی کے بارے میں جو اپنی اُلجھی ہوئی داڑھی کی وجہ سے بہت خوفناک دکھائی دیتے تھے، انور کو بتایا گیا کہ وہ مشہور انقلابی سوہن سنگھ جوش تھے جو بھگت سنگھ کی

نوجوان بھارت سبھا کے پریسیڈنٹ رہ چکے تھے۔ اُس کے بعد انور نے ایک دُبلے پتلے گورے نوجوان کے بارے میں پوچھا جو سر سے پاؤں تک کالے کپڑے پہنے تھا اُس کے رپورٹر دوست نے بتایا "یہ ہیں لاہور کے کیدار ناتھ سہگل، جنہوں نے قسم کھائی ہے کہ جب تک مُلک غلام رہے گا تب تک کالے کپڑے ہی پہنیں گے"۔ اِن اکتیس قیدیوں میں ہر طرح کے لوگ تھے اور انور کو ایسا لگا کہ سچّے مارکسیوں کے ساتھ بہت سے انقلابی آدرش وادی اور سنکی لوگوں کو بھی پکڑ لیا گیا تھا، اُن میں سے کچھ ظاہر ہے طالبعلم تھے جو ابھی حال ہی میں کالج سے نکلے تھے۔ انور اُن میں سے ایک کے پاس گیا جو لگ بھگ اُسی کی عمر کا لڑکا تھا۔ بھرا ہوا گول مٹول چہرہ اور آنکھوں پر عینک لگی ہوئی۔ انور نے بات چیت شروع کرنے کے لئے کہا کہ میرٹھ میں اتنی سردی نہیں ہے جتنی لاہور میں تھی۔

"کیا تُم لاہور سے آرہے ہو؟" اُس لڑکے میں نوجوانی کا جوش اُمڈا پڑ رہا تھا اور وہ بولتے وقت کچھ ہکلاتا تھا۔

"ہاں" انور نے جواب دیا اور پیچھے مُڑ کر دیکھا کہ کوئی اُس کی بات تو سُن نہیں رہا ہے۔ "میں آپ لوگوں کے لئے دہشت پسند قیدیوں کا ایک خط لایا ہوں۔ کیا میں آپ کا نام جان سکتا ہوں؟"

"پورن چند جوشی، تُم وہ خط مجھے دے دو۔"

انور نے چھوٹا سا پتلا سا لفافہ جوشی کی طرف سرکایا ہی تھا کہ اتنے میں ایک پولیس سب انسپکٹر کو اپنی طرف جھپٹ کر آتے ہوئے دیکھ کر اُس کے ہوش اُڑ گئے۔ جوشی کھانا کھانے میں جُٹے رہے۔ "کچھ تُم بھی کھاؤ" داروغہ صاحب کے وہاں پر پہنچتے ہی جوشی نے انور کو کھانے کی دعوت دیتے ہوئے کہا۔

"میں نے تمہیں ابھی ایک چٹھی انہیں دیتے ہوئے دیکھا ہے"۔ داروغہ صاحب نے انور پر الزام لگایا اور پھر جوشی سے بولے "لاؤ، نکالو، کدھر ہے وہ خط؟"

جوشی نے چپ چاپ روٹی کا ایک بڑا سا نوالا مُنہ میں رکھا اور جواب دیا "کیسا خط؟" جس وقت جوشی کی تلاشی لی جا رہی تھی انور کے ہوش و حواس گم تھے، لیکن تلاشی میں کچھ بھی ہاتھ نہیں آیا۔ داروغہ صاحب کھسیا کر یہ کہتے ہوئے چلے گئے "خیر، لیکن میرا خیال ہے کہ انہوں نے کوئی چیز دی ضرور تھی۔"

داروغہ صاحب کافی دور پہنچ گئے تو انور نے اُس نوجوان کمیونسٹ کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ "تم فکر نہ کرو" جوشی نے ایک اور نوالہ مُنہ میں رکھتے ہوئے کہا "میں نے سب ہضم کر لیا ہے۔"

انور کی ساری محنت بے کار گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اِس بات پر خوش ہو کہ پولیس نے اُسے پکڑا نہیں تھا یا اِس بات پر مایوس ہو کہ جو خط وہ لایا تھا وہ برباد ہو گیا تھا لیکن جب وہ باقی لوگوں کے ساتھ وہاں سے چلنے لگا تو جوشی نے چپکے سے اُس سے کہا "تم فکر نہ کرو، اِس بار ہم لوگ خود اُن کے پاس خط بھیجیں گے۔"

انور کا کام پورا ہو گیا تھا پھر بھی وہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ اُس نے غازی آباد کی گاڑی پکڑی جہاں سے اُسے علی گڈھ کے لئے گاڑی بدلنی تھی۔ اُسی ڈبے میں ایک امریکن نامہ نگار بھی سفر کر رہا تھا۔ ایک گنجا سا، ادھیڑ عمر کا بہت ہی چُست آدمی جو ناک سے سُر میں بولتا تھا۔ اُس نے بغیر کسی تکلّف کے خود اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا "میں امریکن نیوز فیچرز کا نامہ نگار رابرٹ رلس ہوں۔"

"آپ صرف اس مقدمے کی رپورٹ بھیجنے کے لئے اتنی دور میرٹھ تک آئے تھے؟"

"ہاں، لیکن میں ابھی کچھ دن اور ہندوستان میں رہوں گا۔ میرا خیال ہے کہ اب چونکہ گاندھی جی نے آزادی کا عہد کر لیا ہے، تم نے آج کا اخبار پڑھا؟"

انور کو اُس دن اخبار پڑھنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا، اس لئے اس نے ملس سے اخبار لے کر موٹی موٹی خبریں پڑھ ڈالیں۔ مرکزی اور صوبہ واری قانون ساز مجلسوں کے سب ہی کانگریسی ممبروں نے استعفیٰ دے دیا تھا۔ کانگریس کی نئی ورکنگ کمیٹی نے ہر سال چھبّیس جنوری کو سارے ملک میں مکمل آزادی کا دن منانے کا فیصلہ کیا تھا اور یہ کہا تھا کہ اس دن ہر جگہ میٹنگوں میں کھُلے عام آزادی کا اعلان پڑھا جائے۔

"او لوائے، او لوائے"۔ وہ امریکی نامہ نگار کہہ رہا تھا۔ "یہاں بھی ہمارے یہاں کے جیفرسن اور ٹام پین والا قصّہ دُہرایا جانے والا ہے۔ میرا دل کہتا ہے کہ تمہارے اس قدیم ملک میں جلد ہی بہت بڑے بڑے حادثے ہونے والے ہیں، کبھی دِلّی آؤ تو مجھ سے ملنا، میں سیسل ہوٹل میں ہوں۔"

انور اُس کی بات نہیں سُن رہا تھا۔ وہ لاہور کی ایک خبر بڑے غور سے پڑھ رہا تھا۔ خبر کا عنوان تھا "کئی دہشت پسند پکڑے گئے۔ کرشن نگر میں بم فیکٹری پر پولیس کا چھاپا"۔ گرفتار کئے گئے لوگوں کے بارے میں یہ لکھا تھا کہ اُن میں "رتن سنگھ عُرف رام لال بھی شامل ہے جسے بھگت سنگھ اور اُن کے ساتھیوں کی گرفتاری کے بعد منظم کئے گئے دہشت پسندوں کے گروہ کا لیڈر بتایا جاتا ہے"۔

(۱۰)

علی گڈھ واپس پہنچ کر انور کی زندگی پھر اُسی پرانے ڈھرّے پر چلنے لگی۔ صبح کلاس میں جانا، تیسرے پہر راز، سبحان اور عثمان کے ساتھ سیاست پر کبھی نہ ختم

ہوتے والی بحثیں، لیکن شام ہوتے ہی اُس کے پاؤں اپنے آپ میرس روڈ کی طرف اُسے اِس
طرح کھینچ لے جاتے تھے جیسے سُورج ڈھلے شرابی شراب خانے کی طرف کھِنچتا ہے۔ سلمہ سے
روز ملنا اُس کے لئے ایک نشہ سا ہوگیا تھا ۔۔۔ اُس کے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔
سلمہ کی طرف اُس کا بڑھتا ہوا لگاؤ ایک "دردِ لادوا" ہو گیا تھا۔

انور ایک دُہری زندگی بسر کر رہا تھا لیکن کبھی کبھی ہی اُسے خیال آتا تھا کہ اُس میں
کتنے خطرے چھُپے ہوئے ہیں۔ اپنے کمرے میں اپنے دوستوں کے درمیان پہنچ کر وہ سیاسی
شعور رکھنے والا نوجوان بن جاتا تھا جو اُس ڈرامے میں جو جلد ہی سارے مُلک میں کھیلا
جانے والا تھا، اپنا پارٹ ادا کرنے کے لئے نہ صرف تیار تھا بلکہ بے چین تھا۔ راز اور کچھ
دوسرے لوگوں کے ساتھ وہ مقامی کانگریس کمیٹی کا ممبر بن گیا اور کھدر پہننا شروع کردیا تھا
حالانکہ جیل جانے کی تیاری میں اُس نے راز کی طرح پلنگ اور بستر چھوڑ کر فرش پر سونا
نہیں شروع کیا تھا، لیکن شام کو پروفیسر سلیم کے گھر پر وہ سیاست پر کوئی بات چیت
نہیں کرتا تھا اگر کبھی کوئی سیاست کا موضوع نکل بھی جاتا تھا تو وہ بات چیت کا رُخ دوسری
طرف موڑ دینے کی کوشش کرتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ سلمہ اور اُس کے ابّا دونوں ہی کو اُس کے
خیالات پسند نہیں آئیں گے۔ اور وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی ایسی بحث چھڑے جس سے
بدمزگی پیدا ہو۔ سلمہ سے وہ دوسری ہی طرح کی باتیں کرتا تھا یا پھر اُسے یہ بتاتا تھا، عنابی
رنگ کا سوئیٹر پہن کر وہ کتنی خوبصورت لگتی تھی یا پھر وہ کوئی بھی بات نہیں کرتا تھا۔ چُپ
چاپ اُس کے پاس بیٹھا ہوا اُس کی قُربت کا مزا لیتا رہتا تھا۔ سلمہ کی موجودگی سے سارا
ماحول مہک اُٹھتا تھا اور انور کی آنکھیں اُس کی خوبصورتی کا رس پیا کرتی تھیں۔ اُس
وقت سیاست اور انقلاب، اُسے بہت دُور کی چیزیں معلوم ہوتی تھیں جن کی کوئی

حقیقت نہیں تھی، اُس وقت تو اُن کے لئے صرف اُن کی محبت کا وجود ہوتا تھا۔

پھر بھی روز سلمہ کے گھر کے لئے روانہ ہوتے وقت وہ ارادہ کرتا تھا کہ وہ اپنے سارے خیالات اُس کے سامنے رکھ دے گا، وہ اُسے اپنی دوسری زندگی کی بھی ایک جھلک دکھلائے گا۔ وہ مستقبل کے اپنے سارے تصوّرات کے بارے میں اُسے بتائے گا۔ وہ بار بار اپنے دل میں اِس ڈائلاگ کا ریہرسل کرتا تھا "سلمہ، میں تمہارے بنا زندہ نہیں رہ سکتا لیکن میں قوم کے لئے اپنے فرض کو بھی نہیں بھول سکتا۔ میرے دل میں جو طوفانی کشمکش ہے اُسے تُم ہی ختم کر سکتی ہو۔ میں جیسا ہوں ویسا ہی قبول کر کے، یہ جانتے ہوئے کہ میں آگے چل کر باغی بننے والا ہوں۔" اُس نے کئی بار اپنے دل میں کہا تھا کہ ہو سکتا ہے کہ بے رُخی کے پردے کے پیچھے سلمہ خود بھی ایک باغی ہو اور اُسے بغاوت کی راہ پر لے آنے کیلیے شاید ایک ہلکے سے اشارے کی، محبت کے ساتھ سمجھانے بجھانے کی ضرورت ہو۔ شاید....؟ مگر ہو سکتا ہے کہ ایسا نہ بھی ہو۔ وہ یہ خطرہ مول لینے کو تیار نہیں تھا۔

(۱۱)

یومِ آزادی سے دو دن پہلے راز نے انور سے کہا کہ اگر اُن کی یونیورسٹی میں آزادی کا اعلان نہ پڑھا گیا تو یہ اُن سب کے لئے بہت ہی شرم کی بات ہوگی۔ اُس کا خیال تھا کہ یونین پر اِس بات کے لئے زور ڈالنا چاہیئے کہ اس کام کے لئے ایک میٹنگ کرے۔ لیکن یونین کا وائس پریسیڈنٹ افسروں سے ڈرتا تھا اور وہ اس بات کے لئے بھی تیار نہیں کہ افسروں کی اجازت کے بغیر یونین کی عمارت میں کوئی میٹنگ ہو، لیکن آہستہ آہستہ ہر طرف اس بات کا چرچا پھیل گیا اور طالب علموں کے مختلف گروہ جن میں [illegible] کے گروپ بھی شامل تھے اُس کے گھیرے میں آگئے اُنھیں یقین دلانے لگے کہ وہ

اِس طرح کی میٹنگ کرنے میں اُن کے ساتھ ہیں۔ نوجوان دلوں میں جوش تھا اور جب پچیس جنوری کو انہیں معلوم ہوا کہ انگریز پرووائس چانسلر نے یہ کہا تھا کہ وہ اس طرح کی کوئی میٹنگ نہیں ہونے دے گا تو اُن کا غصّہ حد پہ پہنچ گیا۔

" آزادی کی لڑائی کے سپاہی کی حیثیت سے یہ میری پہلی آزمائش ہے۔" انور ہر وقت دل ہی دل میں اپنے آپ سے یہی کہتا رہتا تھا۔ "مجھے اِس آزمائش میں پورا اُترنا ہے، مجھے قدم پیچھے نہیں ہٹانا ہے۔"

اُس دن شام کو جب سلمہ کے گھر پہنچا تو وہ کچھ گھبرایا ہوا اور پریشان تھا کیونکہ اُس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ آج وہ سلمہ کو بتا دے گا کہ کل وہ کیا کرنے جا رہا ہے۔ "کاش وہ ہمارا ساتھ دے سکے۔" یہ خیال اُس کے دماغ پر ہتھوڑے کی طرح چوٹیں مارتا رہا۔ "اگر وہ ہمارا ساتھ دے تو پھر مجھے دنیا میں کسی بات کی فکر نہیں ہے۔" وہ اُسے سب کچھ بتا دیگا اپنے سارے خیالات، اپنی ساری خواہشات، اپنے سارے پلان اور اپنے سارے خواب کیونکہ وہ اُس کی زندگی کی ساجھے دار بننے والی تھی ـــ اُس کی ساری زندگی کی، اُس کے سارے پیار کی۔ کل کچھ بھی ہو سکتا ہے۔!

اُس نے سوچا تھا کہ سلمہ گھر پہ اکیلی ہوگی کیونکہ یہ اُس کے ابّا کا کلب جانے کا وقت تھا۔ لیکن جب وہ وہاں پہنچا تو نہ صرف پروفیسر وہاں موجود تھے بلکہ اُن کے علاوہ ایک لمبا چوڑا گورا چٹا کسرتی بدن کا نوجوان بھی وہاں موجود تھا جس کا سر اتنی کم عمر ہی میں گنجا ہو چکا تھا۔ اس سے پہلے انور نے اُسے وہاں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ پھر بھی وہ بڑی بے تکلّفی سے صوفے پر آرام سے بیٹھا ہوا تھا اور سلمہ اُسے چائے بنا کر دے رہی تھی۔

انور خود کو اتنا سمجھ دار مانتا تھا کہ سلمہ کو کسی دوسرے نوجوان آدمی سے باتیں کرتے دیکھ کر

اُسے جلن نہیں ہوگی لیکن نہ جانے کیوں اُس کے دل میں ایک عجیب بے چینی پیدا ہوگئی۔

"ہیلو انور"۔ پروفیسر صاحب نے اُس کا استقبال کرتے ہوئے کہا۔ "یہ ہیں منظور، ان کے والد صاحب ہمارے بہت پرانے دوست ہیں۔"

انور جب منظور سے ہاتھ ملا رہا تھا اُسی وقت سلمہ بول اُٹھی "پاپا، صرف منظور کیوں کہتے ہیں آپ، انہیں، کہیے مسٹر منظور عالم ڈی۔ ایس۔ پی، کیونکہ یہ کسی بھی وقت کسی کو بھی پکڑ کر جیل میں بند کروا سکتے ہیں۔"

انور نے یوں ہی رسمی طور پر، "ہیلو، آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی" کہنے کے بعد اُس نے سلمہ کی چوٹ کا جواب دیتے ہوئے بڑی بے شرمی سے کہا۔ "سلمہ تمہیں گرفتار کرکے کون پولیس افسر خوش نہیں ہوگا۔"

انور کو یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ سلمہ اُس کی اِس بات کا بُرا ماننے کی بجائے اسے اپنی تعریف سمجھ کر بہت خوش ہوئی۔

اِس بے فکرے، گھمنڈی اور لمبے ڈیل ڈول والے پولیس افسر کے سامنے انور کو ایسا لگا کہ اُس کی پرانی خود اعتمادی کی کمی اور جھجک پھر اس میں واپس آگئی ہے۔ ایم۔ اے میں پڑھنے والے ایک اہم طالب علم سے جو ساری یونیورسٹیوں کے طالب علموں کی کئی ڈبیٹ میں انعام حاصل کر چکا تھا جو کیسے بڑے انقلابیوں اور سیاست دانوں سے مل چکا تھا، وہ اچانک سکول میں پڑھنے والے اُس شرمیلے اور جھینپو لڑکے جیسا ہوگیا جو بڑے لوگوں کے درمیان آکر کھویا کھویا سا رہتا ہے۔ جب اسے معلوم ہوا کہ منظور نہ صرف اُن کے ساتھ ٹھہرا ہوا ہے بلکہ کھانا کھانے کے بعد وہ اُن لوگوں کے ساتھ سینما دیکھنے بھی جانے والا ہے تو انور کے سلمہ کے ساتھ باتیں کرنے کے سارے منصوبے دھرے

کے ڈھیر رہ گئے۔

گھوم پھر کر سیاست کا چرچا چل پڑا اور اگلے دن کے لئے کانگریس نے آزادی کے جس پروگرام کا اعلان کیا تھا اس کے بارے میں پروفیسر سلیم نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا

"پروفیسر صاحب، آپ فکر نہ کیجیے" منظور ایک دم بول پڑا "ہم ان کانگریسیوں سے نبٹنے کے لئے پوری طرح تیار ہیں، آپ دیکھتے جائیے کہ ہم مسٹر گاندھی کی اس سول نافرمانی کی تحریک کو کس طرح چوبیس گھنٹے کے اندر اندر کچل کر رکھ دیں گے۔ ہر چیز کا فیصلہ کر لیا گیا ہے بلکہ ہم دو چار ریہرسل بھی کر چکے ہیں۔"

پھر وہ کسی بات کو یاد کر کے دل ہی دل میں بہت خوش ہوا اور ہنسنے لگا۔

"میں آپ کو ایک واقعہ کے بارے میں بتاتا ہوں جو خود میرے ضلع میں ہوا تھا۔ جواہر لال نے ضلع کے گاؤں کا دورہ کیا تھا اور لوگوں میں بغاوت پھیلانے والی تقریریں کی تھیں۔ میں چاہتا تو انہیں وہیں گرفتار کر لیتا لیکن ہم لوگوں کو آرڈر ملے ہوئے ہیں کہ ہم ابھی کچھ دن صبر سے کام لیں، خیر ان کے چلے جانے کے بعد زمینداروں نے شکایت کی کہ کچھ کسان جنہیں جواہر لال کانگریس کا والنٹیر بنا گئے تھے، بہت اکڑنے لگے تھے اور گستاخی سے پیش آتے تھے ... وہ بیگار کرنے سے انکار کرتے تھے، پلٹ کر جواب دینے لگے تھے وغیرہ وغیرہ۔ میں نے اپنے آدمیوں کو بھیج کر ان میں سے بارہ آدمیوں کو بدامنی پھیلانے کے جرم میں گرفتار کروا لیا۔ ان میں سے نو معمولی کسان تھے انہیں تو میں نے دس دس کوڑے لگوا کر چھوڑ دیا لیکن ان میں سے تین الہ آباد کے پڑھے ہوئے لڑکے تھے جنہیں یہاں ہنگامہ کھڑا کرنے کے لئے بھیجا گیا تھا اس لئے میں نے ان سے نبٹنے کے لئے دوسرا راستہ اختیار کیا۔"

منظور سگریٹ جلانے کے لئے اور اپنے اِس قصّے میں سننے والوں کی دلچسپی بڑھانے کے لئے بیچ میں رُکا تو انور کے گال غصّے سے تمتما اُٹھے۔ "منظور، اُن کے ساتھ تُم نے کیا کیا؟" سلمیٰ نے بے قرار ہوکر پوچھا۔ "انہیں تو شاید کوڑے نہیں لگوائے ہونگے۔"

"نہیں نہیں، اُن کے ساتھ ایسا بھونڈا طریقہ استعمال کرنے کا سوال ہی نہیں تھا۔" منظور نے سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے کہا "میں نے بہت ہی بڑھیا ترکیب استعمال کی جس سے سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ میں نے شہر کے پانچ چھ چھٹے ہوئے بدمعاش بُلوائے اور اُن کو ایک ایک بوتل ٹھرّا پلوا دیا۔ پروفیسر صاحب یہ ٹھرّا بھی بہت ہی ظالم چیز ہوتی ہے، جب وہ نشے میں چُور ہو گئے تو میں نے انہیں اُن تین کانگریسی والنٹیروں کے ساتھ ایک ہی کوٹھری میں بند کروا دیا۔ صبح تک میرے بدمعاشوں نے اُن تین نوجوان ستیہ گرہیوں کی ہڈّی پسلی ایک کر دی۔ اُن کی یہ حالت ہو گئی کہ اُن کے منہ سے بول نہیں نکلتا تھا اور لُطف تو یہ تھا کہ ہمارے کسی آدمی نے انہیں ہاتھ تک نہیں لگایا۔ اگر قیدی آپس میں لڑیں اور اُن میں سے کسی کو چوٹ آجائے تو اس میں ہمارا کیا قصور؟"

پھر وہ اپنے اس بے رحمی کے مذاق پر زور سے ہنسا اور انور کو اس سے نفرت ہونے لگی کہ کوئی آدمی اپنے بے رحم ہونے پر اتنا فخر کرے۔

"تو پروفیسر صاحب اگر آپ کو کل یونیورسٹی میں کسی ہنگامے کا خطرہ ہو تو مجھے بتائیے گا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ آپ کے یہاں اِس طرح کے سرپھرے باغی نہیں ہونگے ۔۔۔ یا ہیں؟"

اِس سے پہلے کہ پروفیسر صاحب کوئی جواب دیتے انور اپنی جگہ سے اُٹھا اور

جاکر منظور کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ ایسا کرنا اس کے لئے آسان نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اُس کے ایسا کرنے سے ایک طوفان کھڑا ہو جائے گا۔ "مسٹر منظور"۔ اُس کی آواز جوش میں کانپ رہی تھی لیکن وہ رُک رُک کر ایک ایک لفظ تول تول کر کہہ رہا تھا۔ "میں آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ کل صبح گیارہ بجے یونین ہال میں ہم لوگ انڈیپنڈنس ڈے کی جو میٹنگ کر رہے ہیں اُس میں آپ بھی تشریف لائیے۔ آپ وہاں تشریف لائیے تاکہ ہم بھی دیکھیں کہ پولیس افسر میں کتنا دم ہوتا ہے۔"

"انور!" سلمہ کے منہ سے ایک چیخ سی نکلی "تم منظور کی توہین کر رہے ہو۔"

اُس کی آواز سُن کر انور کو ایسا لگا کہ کسی نے اُس کے منہ پر ایک زور کا طمانچہ مار دیا ہے لیکن جو قدم وہ اُٹھا چکا تھا اُس سے وہ پیچھے نہیں ہٹ سکتا تھا۔ "ظاہر ہے میں توہین کر رہا ہوں۔" اُس نے کہا اور ہال سے چل دینے کے لئے مُڑا۔

"انور!" پروفیسر سلیم نے کڑک کر کہا۔

"انور!" سلمہ نے اُسے پکار کر کہا "پلیز کم ہیر"۔ لیکن وہ اُن کی آواز کو اَن سُنا کر کے باہر نکل گیا۔ وہ جانتا تھا کہ اُس نے بہت خوفناک بات کی ہے لیکن ساتھ ہی وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اُس نے بہت شاندار کام کیا ہے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ سلمہ نے اُسے پکارا تھا اور وہ کُتے کی طرح دُم ہلاتا ہوا اُس کے پاس نہیں گیا تھا!

(۱۲)

"دوستو اور ساتھیو" انجانے میں ہی اُس نے اپنی تقریر اُن ہی الفاظ سے شروع کی تھی جو اُس نے جواہر لال نہرو کو بولتے سُنا تھا "مجھے اِس بات کا بہت افسوس ہے کہ ہمیں زبردستی اِس ہال میں گھُسنا پڑا جسے استعمال کرنے کا ہمیں پورا

حق ہے لیکن ہمارا یہ حق نہیں دینے سے انکار کیا گیا تھا"....۔

انور نے سوچا آج میری آواز لڑکھڑا کیوں رہی ہے، میرا گلا رُندھا کیوں جا رہا ہے۔ وہی یونین ہال ہے جہاں میں پہلے بھی کئی بار بول چکا ہوں۔ کہیں میں اس بات سے ڈر تو نہیں رہا ہوں کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ لیکن میں نے تو یوں بھی یونیورسٹی چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا ہے، اور پھر میں اکیلا بھی تو نہیں ہوں۔ میرے ساتھ راً آ ہے، سبحان ہے، عثمان فضل بھائی ہے، اُنہیں تو ڈر نہیں لگ رہا۔ ڈٹے رہو انور، تم بھی ڈٹے رہو۔"

"میں آپ کے سامنے اس وقت پنڈت جواہر لال نہرو کی وہ بات دُہراؤں گا جو انہوں نے اس یادگار رات کو راوی کے کنارے آزادی کا پرچم لہراتے وقت کہی تھی۔ انہوں نے کہا تھا، 'اب ہم نے اپنے ملک کو بدیسی حکومت سے آزاد کرنے کی کھلی سازش کی ہے اور، ساتھیو آپ کو، ہمارے ملک کے سب بھائیوں اور بہنوں کو اس کھلی سازش میں شامل ہونے کی دعوت دی جاتی ہے، لیکن اس کے بدلے میں آپ کو تکلیفیں اٹھانی پڑیں گی، جیل جانا پڑے گا اور ہو سکتا ہے آپ کو اپنی جان کی بھی قربانی دینی پڑے....' اب میں آزادی کا عہد نامہ پڑھتا ہوں، آپ سب لوگ میرے ساتھ دُہرائیے...."

"ہم یہ یقین رکھتے ہیں کہ کسی بھی دوسری قوم کی طرح ہم ہندوستانیوں کا بھی یہ پیدائشی حق ہے کہ ہم آزاد ہوں اور اپنی محنت کے پھل کھائیں اور ہماری زندگی کی تمام ضرورتیں پوری ہوں تاکہ ہمیں بڑھنے پھلنے پھولنے کا پورا موقع مل سکے۔ ہم یہ بھی یقین رکھتے ہیں کہ اگر کوئی حکومت کسی قوم سے یہ حق چھینے اور اس پر ظلم کرے تو عوام کو اس

بات کا بھی حق ہے کہ وہ اُس حکومت کو بدل دیں یا ختم کر دیں۔

"ہندوستان میں برٹش حکومت نے ہندوستان کے عوام سے نہ صرف اُن کی آزادی چھین لی ہے بلکہ اُس نے اپنی بنیاد عوام کا خون چوسنے پر رکھی ہے اور معاشی، سیاسی، تہذیبی اور روحانی طور پر ہماری قوم کو تباہ کر دیا ہے۔ اِس لئے ہم یہ یقین رکھتے ہیں کہ ہندوستان کو انگریزوں سے اپنا ناطہ توڑ کر پُورن سوراج، یعنی مکمل آزادی حاصل کرنی چاہئے...

"... ہندوستان کو معاشی طور پر تباہ کر دیا گیا ہے۔ ہمارے عوام سے جو کچھ وصول کیا جاتا ہے وہ ہماری آمدنی سے کئی گنا زیادہ ہے ہماری اوسط آمدنی سات پیسے روز ہے اور ہم جو بھاری ٹیکس ادا کرتے ہیں اُس کا بیس فیصدی حصّہ لگان کی شکل میں لیا جاتا ہے اور تین فیصدی نمک پر ٹیکس کی شکل میں، جس کا سب سے زیادہ بوجھ غریبوں پر پڑتا ہے...."

"... دیہی صنعتیں، جیسے ہاتھ سے سُوت کاتنے کی صنعت کو تباہ کر دیا گیا ہے جس کی وجہ سے کسان سال میں کم سے کم چار مہینے خالی بیٹھے رہتے ہیں اُن کا ہُنر تباہ ہو گیا ہے اور اِس کے بدلے میں انہیں کوئی دُوسرا ہُنر بھی نہیں سکھایا گیا ہے جیسا کہ دوسرے ملکوں میں کیا گیا ہے۔ باہر سے آنے والے مال پر ٹیکس کا بندوبست اس چالاکی سے کیا گیا ہے کہ اس کی وجہ سے کسانوں پر بوجھ اور بڑھتا ہے۔ باہر سے جو مال آتا ہے اُس میں زیادہ تر مال برطانیہ کے کارخانوں کا بنایا ہوا ہوتا ہے۔ کسٹم ڈیوٹی کے معاملے میں برطانیہ کے کارخانوں کے بنے ہوئے مال کے ساتھ صاف

طرفداری کی جاتی ہے اور اُس سے جو آمدنی ہوتی ہے اُسے عوام کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے نہیں بلکہ حکومت کی فضول خرچی کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ ہندوستانی روپے اور برٹش پاؤنڈ میں جو رشتہ قائم کیا گیا ہے اُس میں اور بھی من مانی دھاندلی کی گئی ہے جس کی وجہ سے ہمارے ملک سے کروڑوں روپیہ کھنچ کر باہر چلا جاتا ہے ۔۔۔۔"

وہ ایک لمحے کے لئے رُکا۔ ہال میں لوگوں کی ہلکی ہلکی آوازوں کے درمیان اُسے پرو وائس چانسلر کی موٹر کا ہارن سُنائی دیا۔ اچھّا ہے یہ انگریز بھی چار سو ہندوستانیوں کو آزادی کی قسم کھاتے ہوئے سُن لے!

"۔۔۔۔ سیاسی اعتبار سے ہندوستان کی حالت اتنی پست کبھی نہیں رہی ہے جتنی کہ انگریزوں کی حکومت میں۔ کوئی بھی سُدھار ایسا نہیں ہوا ہے جس سے عوام کو سچّی سیاسی طاقت ملی ہو۔ ہم میں سے بڑے سے بڑے آدمی کو بھی بدیشی حکومت کے آگے جھکنا پڑتا ہے۔ اپنے خیالات ظاہر کرنے اور تنظیم بنانے کی آزادی ہم سے چھین لی گئی ہے اور ہمارے بہت سے ہم وطنوں کو مجبور ہو کر اپنے ملک سے باہر رہنا پڑ رہا ہے اور وہ اپنے ملک واپس نہیں آسکتے۔ ہمارے لوگوں میں سرکار کا کام چلانے کی جو قابلیت ہے اُسے کچل دیا جاتا ہے اور انہیں گاؤوں میں چھوٹی موٹی سرکاری نوکریوں اور دفتروں میں کلرکی پر ہی صبر کرنا پڑتا ہے ۔۔۔۔"

انور نے دیکھا کہ پروفیسر سلیم باہر برآمدے میں انتظار کر رہے تھے۔ اُس نے یہ بھی دیکھا کہ ایک اجنبی آدمی نے اُن سے آکر کچھ پوچھا ۔۔۔ وہ ضرور کوئی سی۔آئی۔ڈی کا آدمی

کے علاوہ اور کون سرکار کی مدد کر سکتا ہے ؟

" تہذیبی اعتبار سے، تعلیمی نظام نے ہمیں اپنی جڑوں سے الگ کر دیا ہے اور ہمیں جو کچھ سکھایا جاتا ہے اس کی وجہ سے ہم اُن ہی زنجیروں کو سینے سے لگائے رہتے ہیں جن میں ہم جکڑے ہوئے ہیں ......

" رُوحانی اعتبار سے، زبردستی ہم سے ہتھیار چھین لئے جانے کی وجہ سے ہم ڈرپوک ہو گئے ہیں اور ہمارے ملک پر قبضہ جمائے رکھنے والی بدیسی فوج کے موجود رہنے سے، جسے ہمارے آزادی کے جذبے کو کچلنے کے لئے بڑی بے رحمی کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے۔"

اُسے اچانک امرتسر کی سڑک پر جاتی ہوئی گھوڑسواروں کی وہ فوج یاد آگئی... اور وہ لال مُنہ والا افسر جس نے " فائر " کا حکم دیا تھا اور بیسیوں بندوقیں جو موت کی گولیاں اُگلنے لگی تھیں۔ جلیان والا باغ ... کیا ابھی اِس طرح کے اور قتلِ عام ہونگے .... ؟ وہ رُکا اور پھر ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے اس نے زور دیکر پڑھنا شروع کیا۔

"... ہم یہ سمجھنے لگے ہیں کہ ہم اپنی دیکھ بھال خود نہیں کر سکتے اور بدیسیوں کے حملے سے اپنی حفاظت نہیں کر سکتے یا چوروں، ڈاکوؤں اور بدمعاشوں سے اپنے گھروں اور اپنے خاندانوں کی حفاظت بھی نہیں کر سکتے ......

" ہم اور زیادہ دن تک ایسی حکومت کے غلام بنے رہنے کو جس نے اِن چار طریقوں سے ہمیں تباہ کر دیا ہے، انسان اور خدا کے خلاف ایک گناہ سمجھتے ہیں لیکن ہم یہ مانتے ہیں کہ اپنی آزادی حاصل کرنے کا سب سے کارگر طریقہ تشدّد کا طریقہ نہیں ہے ....

"اِس لئے ہم جہاں تک ہو سکے گا اپنی مرضی سے برٹش حکومت کے ساتھ کوئی تعلق نہ رکھ کر اپنے آپ کو تیار کریں گے، ہم سول نافرمانی کی تیاری کریں گے جس میں ٹیکس ادا نہ کرنا بھی شامل ہے۔ ہمیں پورا یقین ہے کہ اگر ہم کسی بھی طرح کا اُکساوا دیئے جانے پر بھی کسی طرح کا تشدد کیئے بغیر اپنی طرف سے کوئی تعاون نہ کریں اور ٹیکس ادا کرنا بند کر دیں تو اِس بے رحم حکومت کا خاتمہ یقینی ہے۔ اِس لئے ہم قسم کھاتے ہیں کہ مکمل آزادی حاصل کرنے کے لئے، کانگریس وقتاً فوقتاً جو بھی ہدایتیں دے گی ہم اُنہیں پورا کریں گے ...."

اور پھر اُس نے اُن سب طالب علموں کی طرف دیکھا جو ہال میں بھرے ہوئے تھے۔ اُسے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ سب کے چہروں پر آزادی کی چمک تھی۔ اُس نے دیکھا کہ راز کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔ سُبحان جیسا سخت دل آدمی بھی اِس موقع کی اہمیت سے متاثر ہو گیا تھا اور اُس کی آنکھیں نم تھیں۔ لیکن خود انور کے گالوں پہ یہ کیا بہہ رہا تھا؟ پسینہ۔ جنوری میں؟ ممکن ہے اس نے اپنے دل میں کہا، نہیں، مجھے فوراً اُسے پونچھ ڈالنا چاہیئے کیونکہ یہ لوگ آ رہے ہیں۔ پرو وائس چانسلر، پروفیسر سلیم، پروفیسر نبی بخش، پراکٹر، وارڈن، یونین کے وائس پریسیڈنٹ صاحب اور اُن سب کے پیچھے اینٹھتا ہوا پولیس افسر منظور۔ انور نے سوچا "میں مر جاؤں گا لیکن اُسے اپنی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھنے دوں گا...."

(۱۳)

لیکن اِس قصّے کا خاتمہ اچانک ہو گیا۔ انور کو جس جوش و خروش کی اُمید تھی،

وہ کہیں بھی دکھائی نہیں دیا۔ راز، سُبحان اور عثمان فضل بھائی کے ساتھ اُسے بھی یہ نوٹس دیا گیا کہ اُسے یونیورسٹی سے نکال دیا گیا ہے۔ اُن چاروں سے کہا گیا تھا کہ وہ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر ہوسٹل خالی کر دیں۔ جن چار سو لڑکوں نے وہ غیر قانونی میٹنگ کرنے میں حصّہ لیا تھا اُن میں سے مشکل سے درجن بھر ایسے رہے ہوں گے، جو کُھلے طور پر اِن چار مجرموں کا ساتھ دے کر یونیورسٹی سے نکالے جانے کا خطرہ مول لینے کو تیار ہوں۔ حُبّ الوطنی کے جوش کی لہر پیچھے ہٹ گئی تھی، ایک بار پھر نوجوانی کا جوش ڈر، دبّو پن اور بیدلی میں دب گیا۔

انور کو یونیورسٹی سے نکالے کا کوئی غم نہ تھا۔ اُس نے بی۔ اے پاس کر ہی لیا تھا اور سرکاری نوکری کرنے کا اُس کا ارادہ کبھی بھی نہیں تھا۔ لیکن اُسے اِس بات کی فکر ضرور تھی کہ سلیم صاحب پر اس کا کیا اثر ہوگا؟ کیا سلمہ عمر بھر کے لئے ایک باغی کا ساتھ دینے کو تیار ہو گی؟ کیوں نہیں ہو گی! مانا کہ اُسے سیاست میں کوئی دلچسپی نہیں ہے لیکن وہ اُس سے محبّت کرتی ہے اور جب اُسے معلوم ہو گا کہ اس نے انقلاب کے راستے پر چلنے کا فیصلہ کر لیا ہے، تو اُس کی محبّت سلمہ کے قدموں کو بھی اُسی راستے کی طرف موڑ دیگی۔ سلیم صاحب ضرور رُکاوٹ ڈالیں گے کیونکہ انہوں نے اپنے دل میں یہ طے کر لیا تھا کہ اُن کا داماد آئی۔ سی۔ یس ہو۔ اس لئے انور کے اس طرح گمراہ ہو جانے سے اُنہیں مایوسی ہوگی۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اِس بات کی بھی کوشش کریں کہ اُن کی بیٹی انور کو چھوڑ کر منظور جیسے کسی آدمی کو اپنا لے حالانکہ سلمہ سے اُسے اِس بات کا ڈر نہیں تھا کہ وہ اُسے چھوڑ کر کسی دوسرے سے محبّت کر سکتی ہے۔

پروفیسر سلیم کا نوکر سلمہ کا خط لے کر آیا۔ اُس نے بہت جلدی میں صرف اتنا لکھا

تھا" مجھے ابھی سب کچھ معلوم ہوا لیکن تم فکر نہ کرنا سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم مجھ سے ملنے کب آ رہے ہو؟ میں تمہارا انتظار کروں گی۔" سلمہ کو اُس کا کتنا خیال تھا۔ قسمت کے تھپیڑوں سے اُسے بچانے کے لئے اور اسے تسلّی دینے کے لئے وہ اُس کے پاس موجود تھی۔ اور تھوڑی ہی دیر بعد انور سائیکل تیزی سے بھگاتا ہوا میرس روڈ پر چلا جا رہا تھا

سلمہ اُس کی راہ دیکھ رہی تھی اور وہ اُسے سیدھے اپنے کمرے میں لے گئی۔ یہ دیکھ کر انور کا دل بھر آیا کہ اُس کی آنکھیں لال تھیں جس سے ظاہر تھا کہ وہ رو رہی تھی۔ جیسے ہی سلمہ نے دروازے کی چٹخنی لگائی، انور نے اُسے اپنی باہوں میں جکڑ لیا اور اُس کی گرم اور سُوجی ہوئی پلکوں کو چُومنے لگا۔ بیچاری سلمہ! اُس کی ہر بات کتنی پیاری تھی! اُس کے دل میں سلمہ کے لئے نرم و نازک جذبات کا ایک سیلاب اُمڈ آیا اور سلمہ اُس کی باہوں میں سسک سسک کر رونے لگی۔

کچھ دیر تک دونوں میں سے کوئی نہیں بولا۔ انور اپنے بوسوں سے اس کے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کرتا رہا۔ اُس نے اُس کی بھیگی ہوئی پلکوں کو، اُس کے کانپتے ہوئے ہونٹوں کو، اُس کی گردن کو اور اس کے کانوں کی ملائم لوؤں کو چُوما اور ہر بوسے کے ساتھ نرم جذبات آگ میں تپنے لگے۔ سلمہ نے اپنے جسم کو، اُس کی باہوں کی گرفت میں ڈھیلا چھوڑ دیا اور انور نے اُس کے دھڑکتے ہوئے سینے کو کس کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ اُس کے سینے میں جذبات کی لہر اُٹھ رہی تھی۔ انور سلمہ کے لئے اپنے دل کی اس پیاس سے ہمیشہ سے واقف تھا جو اندر ہی اندر ایک آگ کی طرح سُلگ رہی تھی۔ اس لمحہ انور کو احساس ہوا کہ سلمہ اُس سے کتنا پیار کرتی ہے اور وہ یہ بھی سمجھنے لگا کہ وہ اُس کی کسی بات کو، کسی بھی بات کو نہیں ٹال سکتی۔۔۔۔

انور کو ایسا لگ رہا تھا کہ اُس کے جذبات نے اُسے ڈھکیل کر ایک گہری کھائی کے کنارے پر لا کھڑا کر دیا تھا۔ "ڈارلنگ انور، تم مجھ سے پیار کرتے ہو نا؟" سلمہ نے گہری سانس لے کر کہا۔

"میری جان، تمہیں اِس میں کوئی شک ہے کیا؟" اور یہ کہہ کر اُس نے زور سے سلمہ کے ہونٹوں کو چوم لیا۔

سلمہ نے اپنی بوجھل پلکیں اُٹھائیں تو انور نے دیکھا کہ وہ جذبات کے بوجھ سے جھکی جا رہی ہیں، لیکن اتنے میں سلمہ بولی "تو تم مجھے چھوڑ کر نہیں جاؤ گے، تم معافی مانگ لوگے، مانگ لوگے نا سویٹ ہارٹ؟"

اُس کے اِن الفاظ کے اصلی معنوں کا اظہار ہوتے ہی انور کا شعور جیسے جاگ اُٹھا اور پھر اُس کے جذبات کا یہ طوفان ٹھنڈا پڑ گیا اور اُسے ایسا لگا کہ دھیرے دھیرے اُس کا سارا جسم ڈھیلا پڑتا جا رہا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا اُس نے سلمہ کی بات ٹھیک سے سُنی ہی نہ ہو؟

"سلمہ کیا کہہ رہی ہو تم؟" انور نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔ "کیا تم چاہتی ہو کہ میں غدّاری کر دوں؟"

"اِس کا مطلب یہ ہے کہ تم مجھ سے محبت نہیں کرتے ہو۔" اُس نے رُو ٹھ کر کہا اور پھر اُس کے چاروں طرف چاہت کا جال بُننے لگی "ورنہ تمہیں معافی کے کچھ لفظوں پر دستخط کر دینے میں کیا اعتراض ہے؟ پاپا نے پرو وائس چانسلر صاحب سے سب کچھ طے کر لیا ہے۔ ڈارلنگ ضد نہ کرو، تم مجھے چھوڑ کر کیسے چلے جاؤ گے؟"

انور نے محسوس کیا کہ اُسے کھو دینے کے ڈر اور اپنی محبت کی وجہ سے ہی سلمہ

ایسی ناسمجھی کی باتیں کر رہی تھی۔ اس نے کہا "لیکن میری جان، تم جانتی ہو کہ میں کہیں بھی رہوں، میں جیل میں رہوں یا پھانسی کے تختے پر کھڑا رہوں، میرا دل ہمیشہ تمہارا رہے گا۔ میں جو کچھ ہوں اور آگے چل کر جو کچھ بھی بنوں گا، میں جو کچھ بھی کروں گا، تم ہمیشہ میرے ساتھ رہو گی ——— کیونکہ تمہارے بغیر میں ہمیشہ کسی چیز کی کمی محسوس کروں گا یہ ستیہ گرہ ہمیشہ تو نہیں چلے گا۔ جب میں جیل سے واپس آؤں گا تب ہم لوگ شادی کرلیں گے ....."

"نہیں نہیں" سلمہ نے بیچ میں بات کاٹ کر کہا "میں اتنے دن تک انتظار نہیں کرسکتی۔"

"اچھی بات ہے" انور نے فیصلہ کرتے ہوئے کہا "تو پھر ہم ابھی شادی کرلیں ——— آج ہی، اِسی وقت" انور جانتا تھا کہ اس کے ابا سلمہ جیسی نئے خیالات کی لڑکی کو اپنی بہو بنانا پسند نہیں کریں گے، لیکن انہیں وہ کسی طرح سمجھا بجھا کر راضی کرلے گا۔ "میں تمہیں زیادہ کچھ تو نہیں دے سکتا، لیکن جو کچھ بھی میرا ہے، جو کچھ بھی میں اِس وقت ہوں اور آگے چل کر بنوں گا ——— وہ سب تمہارا ہے۔ سلمہ، آؤ ہم لوگ شادی کرکے دنیا کا مقابلہ کریں۔"

تھوڑی دیر تک سلمہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پھر وہ دھیرے دھیرے ہر لفظ کو تول تول کر اِس طرح بولی جو اُس کے لئے بہت ہی غیر فطری بات تھی اور اِسی لئے انور کو اُس کا اس طرح بولنا بہت بُرا لگا۔ سلمہ نے کہا "اچھی بات ہے، لیکن تم وعدہ کرو کہ تم یہ سیاست کی ساری بکواس چھوڑ دو گے، میرے ابا جو کچھ کہیں گے وہ کرو گے۔ آئی۔سی۔ایس کی تیاری کرو گے اور ......"

"نہیں۔" انور کے اس ایک تیکھے لفظ نے سلمہ کو چپ کر دیا جو اس طرح بول رہی تھی جیسے اپنے جذبات کو طاق پر رکھ کر کوئی سودا چکا رہی ہو۔ انور گہری مایوسی کی وجہ سے کانپ رہا تھا۔

"تو اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ تم مجھ سے محبت نہیں کرتے، تمہارے لئے، تمہاری سیاست اور گاندھی اور جواہر لال اور آزادی کی یہ ساری بکواس ہی سب کچھ ہے، میری محبت کچھ بھی نہیں ہے۔" اور اتنا کہہ کر وہ سسک سسک کر رونے لگی۔ "مجھے پہلے ہی یہ سمجھ لینا چاہیے تھا، سب نے مجھے یہی سمجھانے کی کوشش کی تھی مگر میں یقین نہیں کرتی تھی، میں یہی سمجھتی تھی کہ تم سچ مچ مجھ سے پیار کرتے ہو، لیکن اُن کا کہنا صحیح تھا اور میں جو کچھ سمجھتی تھی وہ غلط تھا۔"

"اُن کا!" انور کو جمع کے صیغے کا یہ استعمال کچھ کھٹکا "اُن کا کون کا؟"

سلمہ نے کچھ دھیان دیئے بغیر ہی کہہ دیا "سب ہی کا، پاپا کا، منظور کا...." اور اس کے بعد اچانک وہ رک گئی۔

انور کو ایسا لگا کہ اُس کی آنکھوں کے سامنے سے ایک پردہ ہٹ گیا ہے۔ تو یہ بات تھی، جب تک اُسے یہ اُمید تھی کہ وہ آگے چل کر آئی۔ سی۔ ایس بنے گا تب وہ اُسے ایک عاشق اور شوہر کے طور پر اپنا لینے کو تیار تھی لیکن خود اس کی اپنی کوئی قدر نہیں تھی تو کیا اُسے وہ لوگ محبت، لگاؤ اور عزت سمجھتے تھے پروفیسر سلیم، منظور اور خود سلمہ بھی؟

پھر بھی اُس نے ایک آخری کوشش کرنے کا فیصلہ کیا "سلمہ، کیا تم نے اچھی طرح سوچ سمجھ کر یہ طے کر لیا ہے کہ تمہیں میری ضرورت نہیں ہے یا صرف منظور کی خاکی وردی کے رعب میں آ کر تم ....."

"شٹ اپ!" سلمہ نے چلاّ کر کہا اور انور نے سلمہ کو ایک نئے رُوپ میں دیکھا بدمزاج اور جھگڑالو سلمہ کے رُوپ میں، جو کہہ رہی تھی "تمہیں منظور کا نام بیچ میں لانے کا کوئی حق نہیں ہے، وہ کم سے کم شریف آدمی تو ہے لیکن تُم ... تُم ... محبت کے جھُوٹے دعوے کرنے کے بعد اِس طرح ٹُھکرا دیا ہے تُم نے ... مجھے تُم سے نفرت ہے ... ہاں میں تم سے نفرت کرتی ہوں ..."

انور سمجھ گیا کہ اب اور کچھ کہنا بیکار ہے۔ ایسی چڑچڑی اور بدمزاج لڑکی سے کوئی کیسے بحث کر سکتا تھا۔

اپنے جذبات کی ساری کڑواہٹ کو دباتے ہوئے کہا "اچھا سلمہ، میں جاتا ہوں۔ جب تمہارا غصہ ٹھنڈا ہو تو میرے بارے میں زیادہ سنجیدگی سے سوچنے کی کوشش کرنا۔ جہاں تک میرا سوال ہے، میں ہمیشہ تمہارا احسانمند رہوں گا اور میرے دل میں تمہارے لئے محبت رہے گی۔" وہ کہنا تو نہیں چاہتا تھا پھر بھی اُس نے کہہ ہی دیا "ایک دن تمہیں اندازہ ہوگا کہ میں کتنے سچّے دل سے تُم سے محبت کرتا تھا۔"

انور دروازہ کھُلا چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ پر سلمہ نے نہ تو اُس کی بات کا کوئی جواب دیا نہ اُسے بُلایا ہی، لیکن جب وہ خیالوں میں اُلجھا ہوا اور اُداس اُداس بیٹھک سے باہر نکلا تو اُس نے سُنا کہ سلمہ نے بہت غصّے کے ساتھ دروازہ بند کر کے چٹخنی چڑھالی۔

(۱۴)

ریل گاڑی اُسے علی گڑھ سے دُور لئے جا رہی تھی۔ یونیورسٹی کے چھوٹے چھوٹے چوکور لان، گھنٹہ گھر، مسجد کے گنبد اور مینار یں ریل گاڑی کی کھڑکی میں سے پیچھے بھاگتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ صرف یونیورسٹی کی بستی ہی نہیں بلکہ اُس کی جوانی اُس سے

دُور بھاگ کر دُھندلے اُفق میں سمائی جا رہی تھی۔ جب گھنٹہ گھر کی چوٹی آم کے پیڑ کے پیچھے چھُپ گئی اور آنکھ سے بالکل اوجھل ہو گئی تو انور کو ایسا لگا کہ اس کے اندر ایک عجیب اور دُکھ بھرا خلا پیدا ہو گیا ہے۔

جب موسم سرما کے آسمان پر اندھیرا چھانے لگا تو اُس کی اُداسی اور گہری ہونے لگی۔ ڈیوڑھے درجے کے چھوٹے سے گھُٹے ہوئے ڈبے میں بجلی کی بتیوں سے بُجھی بُجھی سی روشنی آرہی تھی اور ایسا لگتا تھا کہ وہ بھی انور کی طرح ہی اُداس ہیں۔ ریل گاڑی کے پہیوں سے لگاتار ایک آواز آرہی تھی جو انور کے دماغ پر جیسے ہتھوڑے سے مار رہی تھی ـــــ سلمہ! سلمہ! سلمہ! اُس کے دل میں نا اُمیدی چھائی ہوئی تھی اور اُسے ایسا لگ رہا تھا کہ یہ نا اُمیدی اُس کا گلا گھونٹ دے گی۔ جنوری کی سرد ہوا سے بچنے کے لئے لوگوں نے کھڑکیاں بند کر رکھی تھیں اور انور کا دم گھُٹا جا رہا تھا۔ اُسے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ مر جائے گا۔

اُس نے گھبرا کر ایک کھڑکی کھول دی اور برف جیسی ٹھنڈی ہوا نے اُس کے منہ پر ایک تھپڑ سا مارا۔ تیز ہوا اُس کی آنکھوں میں تیر کی طرح چبھنے لگی اور اُس کے اوور کوٹ کے کالر میں سے جب یہ ہوا اندر گھُسی تو وہ سردی سے کانپ اُٹھا۔ پھر بھی نہ جانے کیوں اُسے یہ سردی اچھی لگ رہی تھی جیسے اُس میں پھر سے جان آگئی۔ اندھیرا آسمان، ٹھنڈی ہوا اور گاڑی کی گڑگڑاہٹ.... سب اُسے للکار رہے تھے جس سے اُس کے دماغ کی اُلجھن دُور ہو گئی تھی اور اُس میں ایک نیا جوش پیدا ہو گیا تھا۔ بہت دُور دہلی کی سمت میں اندھیرے اُفق پر بجلی چمک رہی تھی۔ کہیں پانی برس رہا تھا۔ موسم سرما کی بارش شروع ہو گئی تھی۔ ریل گاڑی طوفان اور بارش کو چیرتی ہوئی دلی کی طرف بھاگی چلی جا رہی تھی اور دلی کی جھپکتی ہوئی روشنیاں جیسے اشارہ کر کے اُسے اپنی طرف بُلا رہی تھیں۔

۱۷

انوکھا سفر

(۱)

وہ ایک اُڑنے والے گھوڑے کی پیٹھ پر سوار کسی بیمار کے چہرے کی طرح پیلے آسمان کی طرف اُڑتا چلا جا رہا تھا۔ وہ گھوڑا بہت عجیب تھا لیکن پھر بھی جانا پہچانا لگ رہا تھا، جیسے بچپن کی کوئی بھولی ہوئی یاد ہو۔ یہ خوشگوار خوابوں کی مسلسل اُڑان نہیں تھی بلکہ وہ بڑی محنت سے اوپر چڑھ رہا تھا اور اُسے بڑی تکلیف ہو رہی تھی۔ اُسے ایسا لگ رہا تھا کہ کسی بھی وقت وہ اپنا توازن کھو بیٹھے گا اور نیچے ایک گہری کھائی میں گر جائے گا۔ تھوڑی دیر بعد وہ گھوڑا غائب ہو گیا اور وہ ہوا میں لٹکا رہ گیا۔ اُس میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ آسمان پر اُڑ جائے اور زمین کی طرف گرتے ہوئے اُسے ڈر لگتا تھا۔ اُفق اُسے دھیرے دھیرے اپنے گھیرے میں جکڑے لے رہا تھا۔ اُفق کا رنگ گہرا پیلا تھا، بالکل سلمہ کے گئے ہوئے سوئیٹر کی طرح پیلا اور سلمہ کے سوئیٹر کی یاد آتے ہی

اُسے ایسا لگا جیسے کسی نے اُس کے دل میں خنجر اُتار دیا ہو۔ اُسے آسمان یا اُفق اپنے شکنجے
میں نہیں جکڑ رہا تھا بلکہ وہ خود سلمیٰ تھی اُس کا نازک جسم اُس کے جسم سے چپکا ہوا تھا اور
اُسے گرمی پہنچا رہا تھا اور خود اُس کا چہرہ اُس کے جسم سے اتنا قریب تھا کہ اُسے صرف
اُس کے پیلے سوئیٹر کی بُنائی دکھائی دے رہی تھی جس میں اُس کے سینے کی گولائیاں
جوں کی توں اُبھر آئی تھیں۔ وہ اُسے دکھائی تو نہیں دے رہی تھی مگر وہ اُسے محسوس
کر سکتا تھا۔ اُس کے جوان جسم کی مست خوشبو اُس کے انگ انگ میں بسی جا رہی تھی
اور وہ اُس کی گرم چاہت بھری سانس کو اپنے گالوں پر محسوس کر رہا تھا۔ یکایک سلمیٰ کو وہ
پُرانی نازک یادوں نے جاگ کر اُس کے دل کے جذبات کو جگا دیا اور اُس کی گود میں
اپنا منہ چھپا کر وہ ڈرے ہوئے بچے کی طرح سسک سسک کر رونے لگا۔

جب اُس کا خواب ٹوٹا تو بخار سے تپتے ہوئے اُس کے گالوں کو بھیگے ہوئے تکیے
کا لمس بہت خوشگوار لگا لیکن وہ ٹھیک سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ پسینہ تھا کہ آنسو
ہو سکتا ہے دونوں ہی رہے ہوں۔

اُسے وقت کا کوئی احساس نہیں رہ گیا تھا۔ شاید وہ کئی ہفتے سے بستر پر لیٹا
تھا۔ لوگ کہتے تھے کہ شاید اُسے ٹرین میں سردی لگ گئی تھی جس کی وجہ سے پہلے اُسے
انفلوئنزا ہو گیا تھا اور پھر ٹائیفائڈ لیکن وہ جانتا تھا کہ یونیورسٹی سے نکالے جانے پر
اس کے دل کو جو دھکا لگا تھا اور سلمیٰ سے بچھڑ جانے پر اُس کے دل پر جو اور بھی گہری
چوٹ لگی تھی اُس کی وجہ سے اُس کا جسم جواب دے گیا تھا۔ بڑی عجیب بات تھی
کہ علی گڑھ میں وہ اتنا خاموش تھا۔۔۔ اپنی خودداری کی وجہ سے وہ اپنے درد کا تو
کبھی اقرار کرنا نہیں چاہتا تھا دوسرے دل سے اُس درد کا چرچا کرنے کا تو سوال ہی

نہیں تھا۔ جب ریل گاڑی طوفان کو چیرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی تب اُسے ایسا لگا تھا کہ اُس میں پھر سے جان پڑ گئی ہے۔ لیکن اندرونی چوٹ کی طرح یہ اُسے اندر ہی اندر کھوکھلا کیے دے رہی تھی۔ اُسے اپنے ابّا کو یہ بتانے کا کبھی موقع نہیں ملا کہ وہ یونیورسٹی سے کیوں نکال دیا گیا تھا کہ بخار نے اُسے آ دبوچا۔

(۲)

اکبر علی یہ خبر سُن کر ذرا بھی پریشان نہیں ہوئے۔ انور جانتا تھا کہ حال ہی میں آغا خاں کی رہنمائی میں جو مسلم لیگ کانفرنس قائم ہوئی تھی اُس میں اُس کے ابّا بھی شامل تھے۔ آغا خاں بھی ایک پہیلی تھے ___ وہ خدا، پیغمبر، فیشن ایبل رئیس اور انگریزوں کے وفادار دوست سب ہی کچھ تھے اور اُن کی رہنمائی میں مسلم کانفرنس کانگریس کی، گاندھی جی کی اور ستیہ گرہ تحریک کی زبردست مخالفت کر رہی تھی۔ اکبر علی ایسے لوگوں کی صحبت میں رہ کر کچھ خوش نہیں تھے لیکن اُن کا خیال تھا کہ "چالاک ہندوؤں کا مقابلہ کرنے کے لئے مختلف الرائے مسلمانوں کو ایک ہو جانا چاہیئے۔" کیونکہ ہندو صرف مسلمانوں کو دبانے کے لئے ہی آزادی چاہتے تھے اور وہ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں میں اُن کے اور علی برادران کی طرح کے جو انگریز مخالف عنصر تھے وہ آغا خاں کی مسلم کانفرنس کو انگریزوں کے ہاتھ کی کٹھ پُتلی بنا دینے سے روک دیں گے۔

انور کچھ عرصے سے محسوس کر رہا تھا کہ اُس کے اور اُس کے ابّا کے سیاسی خیالات اور جذبات میں بہت فرق پیدا ہوتا جا رہا تھا۔ جب اُس نے اپنے یونیورسٹی سے نکالے جانے کی خبر سُنائی تو اُسے ڈر تھا کہ بہت طوفان مچے گا۔ اُسے ڈر تھا کہ اُس کے ابّا بہت ناراض ہوں گے اور اُسے گھر سے نکال دیں گے، اُسے جائداد سے بے دخل کر

دیں گے۔ وہ دل ہی دل میں خود اپنے آپ پر ترس کھانے لگا تھا اور اپنے آپ کو شہید سمجھنے لگا تھا اور اُس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ مصیبتیں اُٹھا کر اور اپنے آپ کو ہر سُکھ سے محروم کر کے اور قوم کی خدمت میں اپنی زندگی صَرف کر دے گا۔ لیکن اُس کے ابّا نے صرف اتنا کہا "اب تم بڑے ہو گئے ہو، ماشاء اللہ سمجھدار ہو، اپنا بھلا بُرا خود سمجھتے ہو۔ تُم جانتے ہو کہ میرے سیاسی خیالات تُم سے مختلف ہیں لیکن میں اپنے خیالات تمہارے اوپر تھوپنا نہیں چاہتا۔ مجھے صرف ایک بات کی خوشی ہے کہ تُم نے اپنی جان بچانے کے لئے معافی نہیں مانگی۔۔۔ شاباش!" اور یہ کہہ کر اُنہوں نے اپنے بیٹے کی پیٹھ بھی تھپکی تھی۔ ابا کے اِس پیار نے انور کے شعور کی رہی سہی طاقت کو بھی ختم کر دیا تھا۔ کاش اُس کے ابا اُس پر برس پڑے ہوتے، کاش اُنہوں نے اُسے دھمکایا ہوتا، بُرا بھلا کہا ہوتا تو اُن کا مقابلہ کرنے کے لئے اُس نے اپنی طاقت کو قائم رکھا ہوتا۔ لیکن اِس دریا دلی اور ہمدردی کے آگے وہ بالکل لاچار ہو گیا تھا وہ کمزور اور ڈھیلا ہو گیا۔ پچھلے کچھ دنوں کی ساری تھکان اُمڈ آئی اور اُس کا سر چکرانے لگا اور وہ صرف اتنا ہی کہہ پایا "ابا، ذرا میری نبض تو دیکھئے، مجھے ایسا لگتا ہے کہ مجھے بُخار ہے۔"

اکبر علی نے دل و جان سے بیٹے کی خدمت کی۔ تیز بُخار کی بے ہوشی میں بیچ بیچ میں جب اُسے ہوش آتا تو انور دیکھتا کہ اُس کے ابا اُس کے ماتھے پر گیلا کپڑا رکھ رہے ہیں، اُس کا بخار دیکھ رہے ہیں، اُسے دوا دے رہے ہیں۔ جب درد سے اس کا سر پھٹنے لگتا تو وہ اُس کا سر بھی دباتے تھے اور اپنے بیٹے کے اچھا ہونے کے لئے وہ پانچ وقت نماز پڑھ کر دُعا بھی مانگتے تھے۔ اُنہیں اپنے کاروبار کے لئے

یا اپنے دوستوں کے درمیان بیٹھنے کے لئے بہت ہی تھوڑا وقت ملتا تھا۔ حکیم بیدل جن کے سارے بال اب سفید ہو چکے تھے اور بڑھاپے سے دُہرے ہو گئے تھے بیمار انور کو قصے اور شعر سُنا کر اُس کا دل بہلاتے تھے۔ ایک دن جب انور تیز بخار کی وجہ سے بے ہوش تھا تو رامیشور کاکا بھی اس کی طبیعت پوچھنے آئے تھے۔ سب کو معلوم تھا کہ وہ شُدّھی اور سنگٹھن کے لئے پیسہ دیتے تھے جس کا مقصد نچلے طبقے کے غریب مسلمانوں کو ہندو بنانا تھا۔ یہ کام آریہ سماج کے ذریعے ہو رہا تھا جس نے ہندو مذہب کو مضبوط بنانے کا بیڑہ اٹھایا تھا اور اکبر علی کا تعلق تبلیغی تحریک سے تھا جو مسلمانوں کی طرف سے شُدّھی کا جواب تھا۔

انور نے آنکھیں کھولیں اور ابّا کے پاس بیٹھے ہوئے رامیشور کاکا کو اس نے پہچانا لیکن اُس میں بولنے کی طاقت نہیں تھی مُسکرا کر وہ سوچنے لگا "سیاست کے اِس سارے جھگڑے کے پیچھے دونوں میں اب بھی کافی دوستی ہے"۔ اس نے رامیشور کاکا کو کہتے سُنا "اکبر، تمہیں لڑکے کو اتنی ڈھیل نہیں دینی چاہیے، نہیں تو وہ اِس ستیہ گرہ کے چکّر میں پھنس جائے گا اور کسی دن اُسے پھانسی ہو جائے گی"۔ اکبر علی نے کہا "اُس کی سیاست مجھے بھی اتنی ہی ناپسند ہے جتنی تمہیں، لیکن جس چیز کو وہ صحیح سمجھتا ہے اُس کے لئے جان دینے کی اگر اُس میں ہمّت ہو، تو وہ ہمارے لئے بہت خوشی کی بات ہو گی"۔ ہمارے لئے؟ اُس کے ابّا نے بدیشی کپڑا بیچنے والے اُس بزدل بیوپاری کے ساتھ اپنا نام کیوں جوڑا تھا جس کی دُکان پر کانگریسی والنٹیر کسی دن دھرنا دینے والے تھے۔ انور کے دماغ میں یہ دُھندلا سا سوال اُٹھ رہی تھا کہ اپنے ابّا کا جواب سُن کر اُس کا شک دُور ہو گیا "نہیں رامیشور، اگر وہ گاندھی جی

کی فوج میں بھرتی ہونا چاہتا ہے تو میں اُسے روکوں گا نہیں۔ مجھے تو بس اُس کی صحت کی طرف سے بڑی فکر ہے۔"

انور اتنا جوش میں تھا کہ اُس کے سارے بدن سے پسینہ چھوٹنے لگا۔ اچانک اُسے ایسا لگا کہ اُس کا جی ہلکا ہو گیا ہے اور وہ اچھا ہو گیا ہے۔ وہ بار بار اپنے دل میں یہی ایک بات منتر کی طرح رٹنے لگا۔۔۔ میں اچھا ہو جاؤں گا! میں اچھا ہو جاؤں گا! میں اچھا ہو جاؤں گا!!!

(۳)

انور اچھا ہو گیا۔ اُس کا بخار اُتر گیا لیکن وہ کمزور بہت ہو گیا تھا، چلتا تھا تو اُس کے پیر لڑکھڑاتے تھے۔ اُس نے سوچا کہ یہ مناسب ہی ہوگا کہ وہ اپنے ابّا کو بتا دے کہ وہ جلد ہی ستیہ گرہ کے لئے کانگریس کے والنٹیروں میں اپنا نام لکھا لیگا۔ اکبر علی نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا "سو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن اگر تم جیل جانا ہی چاہتے ہو تو کیا یہ زیادہ اچھا نہیں ہوگا کہ پہلے تم بالکل اچھے ہو جاؤ اور تمہارے جسم میں کچھ طاقت آجائے؟ میری رائے میں تو تم جاکر ڈاکٹر صاحب سے مل لو۔" اُن کا مطلب ڈاکٹر انصاری سے تھا اِس لئے انھوں نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا "ظاہر ہے تمہیں اُن سے ملنے میں کوئی اعتراض نہیں ہوگا وہ تمہاری اِس بیماری کے علاوہ تمہاری اُس سیاسی بیماری کا بھی علاج بتا دیں گے۔"

انور تانگا لے کر فصیل کے پاس جمنا کے کنارے دریا گنج والی سڑک پر ڈاکٹر انصاری کے بنگلے کے لئے روانہ ہوا تو اُسے اپنے ابّا کے اِس مذاق پر ہنسی آگئی۔ انور کو ڈاکٹر صاحب کا یہ بڑا سا بنگلہ بہت اچھا لگتا تھا۔ چوڑے چوڑے ٹھنڈے برآمدے

اُن کا چمکدار ٹائلس کا فرش' ملنے آنے والوں اور مریضوں کے لیے آرام دہ کرسیاں۔ ڈاکٹر صاحب کے یہاں بیماروں کا اور ملنے کے لئے آنے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا کیونکہ وہ مشہور ڈاکٹر ہونے کے علاوہ ایک بہت بڑے قومی لیڈر بھی تھے' انور نے ڈاکٹر صاحب کے ہر کام کو بڑی دلچسپی کے ساتھ دیکھا تھا اور دو سال پہلے مدراس کانگریس میں صدر کی حیثیت سے تقریر کرتے ہوئے اُنہوں نے ہندو مسلم اتحاد کی جو زوردار اپیل کی تھی اُس سے وہ بہت متاثر ہوا تھا۔ انور اس محب الوطن ڈاکٹر سے دوبارہ ملنے کے لئے بہت بے چین تھا۔

برآمدے میں جو لوگ اُن کا انتظار کر رہے تھے اُن میں بجھے ہوئے چہروں والے گھبرائے ہوئے مریضوں کے علاوہ' جنہیں ڈاکٹر صاحب میں صرف ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے دلچسپی تھی' کچھ کھدر کے کپڑے پہنے ہوئے کانگریسی کارکن اور لمبی لمبی داڑھیوں والے مولانا بھی تھے جو شاید جمعیت العلمار کے لوگ تھے۔ یہ مسلمان مولویوں کی انگریز مخالف تنظیم تھی جو کانگریس کی طرفدار تھی لیکن انور کو وہاں نیلی آنکھوں والے ایک انگریز نوجوان کو دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کیونکہ اُس کا تعلق اِن میں سے کسی سے بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن وہ جو کپڑے پہنے تھا' ویسے کپڑے انگریز عام طور پر نہیں پہنتے تھے۔ وہ کھدّر کی قمیص' کھدّر کی نیکر اور نیلا کھدّر کا ٹینس کا بلیزر پہنے تھا جس پر کسی کالج کا نشان بھی لگا تھا۔ وہ بغیر موزوں کے پشاوری چپّل پہنے تھا اور سب سے بڑی تعجب کی بات یہ تھی کہ اس کے ہاتھ میں ایک سفید گاندھی ٹوپی تھی جو اُس نے اپنے سنہرے بالوں پر لگالی۔ کوئی پکّا صاحب کبھی بھی اِس طرح کے دیسی اور باغیانہ کپڑے نہیں پہنتا تھا۔ وہ آخر یہاں کیا کر رہا تھا؟

انور نے میز پر رکھا ہوا صبح کا ہندوستان ٹائمز دیکھا تو یہ پہیلی حل ہو گئی۔

پہلے ہی صفحے پر موٹی موٹی خبر چھپی تھی۔ " وائسرائے کے نام مہاتما کا خط ——— برطانوی حکومت کی سخت منظم طاقت کا مقابلہ کرنے کے لئے عدم تشدّد اور سول نافرمانی ——— ستیہ گرہ کے پروگرام کا اعلان ——— مہاتما کے نوجوان انگریز چیلے نے تاریخی چیلنج پہنچا دیا۔"

گاندھی جی کے خط کے ساتھ ہی نیلی آنکھوں والے اسی نوجوان کی تصویر چھپی ہوئی تھی اور تصویر کے نیچے لکھا تھا "سابرمتی آشرم کے رہنے والے مسٹر ریجنالڈ رینالڈس جنہوں نے گاندھی جی کا تاریخی خط لارڈ ارون کو دیا۔"

انور نے ایک بار پھر ریجنالڈ رینالڈس کی آنکھوں کو دیکھا اور اُسے اُن میں ایک انوکھی ملائمت دکھائی دی جو انگریزوں کی آنکھوں میں اس نے کبھی نہیں دیکھی تھی یا شاید یہ جاننے کی وجہ سے کہ اُس نے ہندوستان کے لئے کتنا بڑا کام کیا تھا، اُسے اس کی آنکھوں میں ایک خوشگوار اور رُوحانی جذبہ دکھائی دینے لگا تھا۔ وہ اس عجیب انگریز نوجوان سے باتیں کرنے کی اپنی خواہش کو دبا نہ سکا۔

" مسٹر رینالڈس"۔ انور اُس کے پاس والی کرسی پر بیٹھ کر اُس سے مخاطب ہوا۔

" یس پلیز"۔ اُس انگریز کی آواز میں بھی بڑی نرمی تھی، اُس میں وہ بڑے صاحبوں والی اکڑفوں نہیں تھی۔

" کیا آپ کے جیسے انگریز کے لئے یہ عجیب بات نہیں ہے کہ آپ خود اپنے لوگوں کے خلاف ہم لوگوں کا ساتھ دے رہے ہیں۔؟"

اُس نوجوان انگریز نے جو عمر میں انور سے کچھ ہی بڑا رہا ہو گا، اُس کی طرف

دیکھ کر کہا "ہاں میرے دوست، بدقسمتی سے یہ کچھ عجیب بات تو ہے اور اسی لئے یہ مجبوری بھی ہے، ہمارے نام پر سامراج نے جو پاپ کئے ہیں اُس کا کفارہ بھی تو ہم میں سے کچھ لوگوں کو ادا کرنا ہی ہوگا۔"

ڈاکٹر انصاری کے سیکریٹری نے آکر انور سے کہا کہ اب اس کی باری ہے اور انور نے اُٹھ کر اُس انگریز سے وداع ہوتے ہوئے کہا "میرا نام انور علی ہے، مجھے آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی" اور اُس سے ہاتھ ملاتے ہوئے انور نے پھر کہا "مسٹر رینالڈس، آپ جانتے ہیں یہ پہلا موقع ہے کہ میں کسی انگریز سے ہاتھ ملا رہا ہوں" پھر یکایک اُسے یونیورسٹی کے انگریز پروفیسروں کا خیال آیا اور اس نے اپنی بات پوری کرتے ہوئے کہا۔ "ایک دوست کی حیثیت سے"۔ رینالڈس نے مسکرا کر جواب دیا "میں اُمید کرتا ہوں کہ یہ آخری موقع نہیں ہوگا۔"

جب وہ ڈاکٹر انصاری کے کمرے میں گھس رہا تھا تو وہ اُس صبح دوسری بار متعجب ہوا کیونکہ اسی وقت ڈاکٹر انصاری کے کمرے سے رابرٹ رلس نکل رہا تھا، وہی امریکی نامہ نگار جس سے وہ میرٹھ میں ملا تھا۔

"ہائی، ڈیئر!" اُس نے ناک کی آواز میں اُس کا استقبال کرتے ہوئے کہا۔ "گریٹ مین ـــــ دی ڈاکٹر اِن ڈیڈ!"

(۴)

ڈاکٹر صاحب نے انور کو اچھی طرح دیکھا اور سارا وقت وہ اُس سے اُس کی صحت کے بارے میں بلکہ اُس کے ابا اور اُن کی سیاست کے بارے میں بھی سوال کرتے رہے، انہوں نے یہ بھی پوچھا کہ وہ یونیورسٹی سے کیوں نکال دیا گیا تھا

اور پھر اس بات پر بڑی دیر تک چرچا کرتے رہے کہ وائسرائے کے نام گاندھی جی
کے خط سے پتہ چلتا ہے کہ ستیہ گرہ جلد ہی شروع ہو جائے گا۔ جب انہوں نے انور
کے سینے پر آلہ لگا کر دیکھا تو ان کی گھنی بھوؤں کے نیچے فکر کے آثار صاف دکھائی دینے
لگے۔ انہوں نے انور کو اپنے پھیپھڑوں کا خیال رکھنے کے لئے آگاہ کرتے ہوئے کہا
"میاں مجھے یہ آواز کچھ اچھی نہیں معلوم ہوتی"۔ اور پھر انور کو فکر مند دیکھ کر بولے "گھبرانے
کی کوئی بات نہیں ہے لیکن خاص طور پر اتنی لمبی ٹائیفائڈ کی بیماری کے بعد احتیاط
برتنا ضروری ہے۔ میں تمہیں ایک ٹانک لکھے دیتا ہوں لیکن اس سے زیادہ ضروری
یہ ہے کہ تم آرام کرو، خوب تازی ہوا میں ٹہلو اور تازی سبزیاں کھاؤ۔۔۔۔"

انور نے ان کی بات بیچ میں ہی کاٹ دی" لیکن ڈاکٹر صاحب میں تو ستیہ
گرہ کرنے کے لئے اپنا نام والنٹیر دل میں لکھوانے والا ہوں، پھر جیل میں تازی
ہوا اور تازی سبزیاں کہاں ملیں گی؟"

"وہاں تو نہیں ملیں گی اسی لئے تمہیں کوئی بھی ایسا کام کرنے سے منع کیا جاتا
ہے جس میں جیل جانے کا خطرہ ہو۔ ہم تمہیں والنٹیر بنائیں گے ہی نہیں۔ کم سے کم
چھ مہینے کے لئے جیل جانے کی بات بھول جاؤ۔"

شہید بننے کے خواب دیکھنے والا یہ سن کر بہت مایوس ہوا "آپ مجھے یہ
حکم ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے دے رہے ہیں یا کانگریس کے لیڈر کی حیثیت سے؟"

"دونوں ہی حیثیت سے" ڈاکٹر صاحب نے فوراً جواب دیا اور اس پر انور
کو اپنے ابا کی بات یاد آ گئی۔ انتہائی مایوسی کے باوجود اس کے چہرے پر مسکراہٹ
دوڑ گئی۔

"کس بات پر مُسکرا رہے ہو؟" ڈاکٹر صاحب نے پوچھا۔

انور نے انہیں بتایا "چلتے وقت ابّا نے کہا تھا کہ ڈاکٹر انصاری تمہاری اِس بیماری کا بھی کوئی علاج بتائیں گے اور تمہاری سیاسی بیماری کا بھی۔" اس پر ڈاکٹر صاحب بھی خوب ہنسے۔ لیکن اُٹھتے بیٹھتے بھی انور کو یہی خیال ستا رہا تھا کہ ایسے وقت پر جب کہ سب ہی دیش بھگتوں کے قدم جیل کی طرف اُٹھ رہے ہوں گے وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہے گا۔ اُس نے کہا "ڈاکٹر صاحب میں آپ کا کہنا تو نہیں ٹال سکتا لیکن اگر میں اِس تحریک میں حِصّہ نہ لے سکا تو مجھے دُکھ ہو گا۔ آپ جانتے ہیں میں نے اسی لئے یونیورسٹی چھوڑی ہے۔" وہ اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ سکتا تھا کہ اسی کے لئے اُس نے سلمہ کو چھوڑا تھا اور اپنے محبت کے سب خوابوں کو چکنا چور کر دیا تھا۔

"تم فکر نہ کرو۔" رحمدل ڈاکٹر صاحب نے اُسے دِلاسا دیتے ہوئے کہا "میری یہ پابندی صرف کچھ مہینوں کے لئے ہی ہے تاکہ تمہاری تندرستی ٹھیک ہو جائے اور پھر ملک کی خدمت کرنے کا اکیلا یہی طریقہ تو نہیں ہے کہ آدمی جیل چلا جائے۔"

انور نے بڑی بے قراری سے پوچھا "کیا میں کسی اور طریقے سے بھی خدمت کر سکتا ہوں ڈاکٹر صاحب؟ اگر کوئی طریقہ ہو تو مجھے بتایئے۔"

"ہاں، ہے کیوں نہیں۔" ڈاکٹر صاحب نے میز پر سے ایک کارڈ اُٹھاتے ہوئے کہا اور کارڈ کو اِس طرح دیکھنے لگے جیسے انہیں کوئی بہت اچھی ترکیب سوجھ گئی ہو۔ "رابرٹ ملس کے ساتھ سارے ملک کا چکّر لگانے اور اُن کے ترجمان اور گائیڈ کی حیثیت سے کام کرنے کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟"

انور تو کسی بھی قسم کے سفر کے لئے ہمیشہ تیار رہتا تھا اور ملس کو اُس نے جتنا

دیکھا تھا اُس سے تو وہ بہت ہی ملنسار اور دوست قسم کا آدمی معلوم ہوا تھا۔ اُس کے ساتھ رہ کر شاید وہ تھوڑا بہت جرنلسٹ بھی بن جائے لیکن اس سے ملک کی کیا خدمت ہوگی ؟

ڈاکٹر صاحب نے اُس کو اطمینان کے ساتھ سمجھایا۔ انھوں نے بتایا کہ یہ بہت ضروری ہے کہ گاندھی جی کی رہنمائی میں ہندوستان کی آزادی کی جدّوجہد جلد ہی شروع ہونے والی تھی اُس کے بارے میں دنیا کو بتایا جائے۔ برطانیہ کے اخبار ظاہر ہے اُس کی طرف کوئی دھیان نہ دیں گے یا اُس کی اہمیت کو کم کر کے پیش کریں گے۔ لیکن امریکی غیر جانبدار ہیں اور اگر امریکیوں کو سچائی بتائی جائے تو وہ ہمارے دوست ہو سکتے ہیں۔ اس لئے رابرٹ ملس جیسے ایماندار امریکی نامہ نگار کی مدد کرنے سے فائدہ ہو سکتا ہے۔ جو ستیہ گرہ کی تحریک کی خبریں اپنے اخباروں کے لئے جمع کرنے ہی خاص طور پر ہندوستان آیا ہے۔ اُسے اس تحریک کے ہر پہلو کو دیکھنے اور اپنے اخباروں میں اُن کی پوری خبر دینے میں ہر طرح کی سہولت دی جانی چاہیئے۔ ملس کے ترجمان کی حیثیت سے کام کر کے ایک سمجھدار محبّ الوطن نوجوان اپنے مُلک کے لئے بہت کچھ کر سکتا ہے۔ "تُم ہندوستان اور اس کے عوام کے ارمانوں کو امریکیوں تک پہنچاؤ گے جو اپنی تاریخ اور اپنی جمہوری روایات کی وجہ سے ہمارے ساتھ ہمدردی رکھتے ہیں۔ یہ مت سمجھو کہ ستیہ گرہ سے گاندھی جی مُٹھی بھر انگریزوں کو پریشان نہیں کرنا چاہتے بلکہ وہ ساری دنیا کو انصاف کے لئے للکارنا چاہتے ہیں۔"

انور کو اور زیادہ لالچ دینے کی ضرورت نہیں تھی۔ اُس نے فوراً "ڈاکٹر صاحب

کا حکم" ملنے کا وعدہ کرلیا! اُس نے چلتے ہوئے کہا۔ "خدا حافظ ڈاکٹر صاحب، میں
اپنی طرف سے پوری کوشش کرونگا اور آپ کو یا مسٹر ملس کو شکایت کا کوئی موقع نہیں دونگا۔"

اُس کے چلے آنے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے گھنٹی بجا کر اپنے سکریٹری کو بلایا اور اُس سے کہا کہ وہ سیسل ہوٹل میں ملس صاحب کو خبر کردے کہ اُن کے لئے ترجمان کا انتظام ہوگیا ہے۔ اتنے میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجی اور انہوں نے ٹیلیفون اٹھا لیا۔

"ہیلو ... میں انصاری بول رہا ہوں ... کون، اکبر صاحب؟ ... جی ہاں، سب ٹھیک ہے۔ میں نے اُسے اچھی طرح دیکھ لیا ہے، اُسے صرف آرام اور تازہ ہوا کی ضرورت ہے ... آپ فکر نہ کیجئے وہ جیل نہیں جائے گا، کم سے کم ابھی کچھ دن تک تو نہیں۔ میں نے اُسے دوسرا علاج بتا دیا ہے۔"

(۵)

کئی مہینے تک انور اُس امریکی جرنلسٹ کے ساتھ سفر کرتا رہا۔ کہنے کو تو ایک ہی امریکی اس کے ساتھ تھا لیکن حقیقت میں دو تھے۔ ایک تو تھا ہٹا کٹا، لال چہرے والا، خبروں کا دیوانہ رابرٹ ملس، جو پچھلے پچیس برس سے خبروں کی تلاش میں لڑائیاں، خانہ جنگیاں اور انقلاب دیکھ چکا تھا اور وہ اب نئے قسم کی لڑائی کی، ایک نئے طرح کے انقلاب کی خبریں جمع کرنے آیا تھا۔ رابرٹ ملس نے جس دوسرے امریکی سے انور کا تعارف کرایا وہ کوئی جگہ گھیرے ہوئے نہیں تھا۔ وہ تو بس ایک بھوت یا ایک یاد کی طرح تھا پھر بھی وہ ہر دم اُن کے ساتھ تھا اور دلی سے احمد آباد جاتے وقت راجپوتانہ کے ریگستانوں کو پار کرتے ہوئے انور اس نیک

دل اور عقلمند بوڑھے امریکی سے اچھی طرح واقف ہو گیا۔ ہوا میں اُڑتی ہوئی لمبی سفید داڑھی، سر پہ ایک پُرانا ہیٹ اور ہاتھ میں ایک پُرانی لاٹھی لئے ہوئے وہ اُس لنکن کے ساتھ انسان کے گیت گاتا تھا جیسے خُدا کے پرستار اُس کی شان میں قصیدے گاتے ہیں۔ انور نے اُس سے پہلے کبھی ابراہم لنکن کے ہم عصر شاعر والٹ وِھٹ مین کا نام نہیں سُنا تھا کیونکہ بی۔ اے کے انگریزی ادب کے کورس میں کسی بھی امریکی شاعر کی تخلیقات شامل نہیں تھیں اور اُس کا تو خیال تھا کہ اس کے پروفیسروں نے اس امریکی شاعر کا کبھی نام بھی نہ سُنا ہوگا۔ اور انور کو یقین تھا کہ اگر انہوں نے نام سُنا بھی ہوگا تو وہ اس انقلابی کی تخلیقات کو پڑھانا کبھی منظور نہ کرتے جس کی شاعری زندگی اور ادب کے کسی بندھے ٹکے اصولوں کو نہیں اپناتی تھی اور جس میں اس باغی خیال کا پرچار کیا گیا تھا کہ سب ہی انسان بھائی بھائی ہیں۔

لمبے سفر کے لئے ہلمس سے اچھا ساتھی ملنا مشکل تھا۔ اُس نے دنیا کے کونے کونے سے علم کا کبھی نہ ختم ہونے والا ذخیرہ جمع کر رکھا تھا۔ اس نے بہت کچھ پڑھ رکھا تھا اور بہت سے تاریخی حادثات سے خود گذرا تھا۔ انقلاب کے کچھ ہی دن بعد وہ روس میں تھا اور بالشویکوں نے جو کچھ کر دکھایا تھا اُس کی وہ بہت تعریف کرتا تھا لیکن پکا کٹر Quaker ہونے کی وجہ سے وہ اُن کی دہریت اور تشدد کو ناپسند کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اُسے گاندھی جی کے اُصولوں میں اتنی دلچسپی تھی وہ کہا کرتا تھا "ہندوستان میں تم لوگ تشدد کے بغیر انقلاب لاکر لینن کے اُصولوں کی بُرائیاں دُور کر سکتے ہو اور جب یہ ہو جائے گا تو عیسیٰ کے بعد ہونے والے تمام انقلابیوں کا کام پُورا ہو جائے گا۔" پھر وہ عیسیٰ مسیح کی باتیں کرنے لگتا۔ "وہ عیسیٰ نہیں

جو مالداروں کا ولی ہے جسے گرجا گھروں میں کانچ پر بنی ہوئی تصویروں میں ریشمی کپڑے پہنے ہوئے دکھایا جاتا ہے بلکہ اصلی عیسیٰ مسیح جو محنت کرنے والا بڑھئی تھا، جس نے حرام کے پیسے بنانے والوں کو اُسی طرح مقدر سے مار بھگایا تھا جیسے لینن نے تجوریاں بھرنے والے سرمایہ داروں کو رُوس سے بھگایا تھا۔" اور پھر وہ بتاتا کہ عیسیٰ مسیح کی انقلابی تعلیمات کو کس طرح بگاڑا گیا تھا۔ وہ گاندھی جی کا ماخذ عیسیٰ کی تعلیمات اور اُس سے بھی پہلے مہاتما بدھ کی تعلیمات میں بتاتا تھا" لیکن یہ مت بھولو کہ تمہارے گاندھی کے خیالات کو ڈھالنے میں ہم امریکیوں کا بھی کچھ ہاتھ رہا ہے، انھوں نے خود ایمرسن کا اتنا ہی احسان مانا ہے جتنا ٹالسٹائی کا۔" لیکن وہ گاندھی کو ہمیشہ 'گینڈی' کہتا تھا۔

لیکن سب سے زیادہ مزہ اُسے انور کو والٹ وِھٹ مین کی نظمیں پڑھ کر سُنانے میں آتا تھا۔ وہ اپنے ساتھ ہمیشہ بائبل کی ایک کاپی کے علاوہ اس کی نظموں کا "Leaves of the grass" ("گھاس کی پتیاں") نامی مجموعہ بھی رکھتا تھا۔ جب وہ اِن بے قافیہ نظموں کو پڑھتے پڑھتے تھک جاتا تو وہ اُسے شاعر کی زندگی کی بارے میں بتانے لگتا۔ انور کے لئے یہ ایک نیا ادبی تجربہ تھا لیکن ان بے قافیہ نظموں کو سُن کر اُس میں ایک عجیب جوش پیدا ہو جاتا تھا۔ اُس نے انور کو بتایا کہ یہ شاعر اپنی زندگی میں باری باری سے بڑھئی، کلرک، ملّاح اور سپاہی سب ہی کچھ رہ چکا تھا اور سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ وہ اپنی زندگی بھر ایک آوارہ گرد رہا اور اُس زمانے میں جبکہ غلامی کا خاتمہ نہیں ہوا تھا اور عورتوں نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ انہیں ووٹ دینے کا حق حاصل ہوگا، وہ کھُلے عام عورتوں اور

مردوں کی برابری اور ہر ذات اور نسل کے لوگوں کی برابری کی باتیں کرتا تھا۔

وِھٹ مین کی "پیسیج ٹو انڈیا" (ہندوستان میری منزل) نام کی نظم پڑھ کر سُنانے میں اُسے سب سے زیادہ خوشی ہوتی تھی۔ اس نظم میں اُس نے سوئز نہر کے کھُلنے پر خوشی ظاہر کرتے ہوئے کہا تھا کہ "یہ براعظموں، سمندروں اور مختلف آب و ہواؤں کا اتحاد ہے" اور اسی موقع پر اُس نے ہندوستان کی پُرانی تہذیبوں اور فلسفوں کو خراجِ عقیدت پیش کیا تھا۔

"آتما کی دُور تک جاتی ہوئی کرنیں،
سپنے جو ابھی کھُلے نہیں،
گہرائی میں اُترنے والے صحیفے اور داستانیں،
شاعروں کی بلند خیالی،
اور بزرگ مذاہب۔"

اور جب وہ "جے پور کے گلابی شہر" سے ہو کر گزرے اور اُنہوں نے وہاں کے محلوں اور مندروں کو سورج کی روشنی میں چمکتے ہوئے دیکھا تب اُسے فوراً وھٹ مین کی یہ سطریں یاد آگئیں۔

"اے مندرو جو چمپا کے پھُولوں کی طرح سفید ہیں،
جن پر سُورج کی کرنیں برس رہی ہوں،
اے اُونچے چمکتے ہوئے کلسو،
گلاب کی طرح سُرخ سُورج کی طرح دمکتے ہوئے۔"

"اور تمہارا تاج محل۔ چاندنی میں تاج محل جتنا خوبصورت لگتا ہے اُتنی

خوبصورت چیز نہیں اس دنیا میں کہیں نہیں دیکھی۔ وہٹ مین نے اس کا بیان بہت ہی خوبصورت الفاظ میں اس طرح کیا ہے کہ "فانی خوابوں سے ڈھالی گئی لافانی داستانوں کی میناریں" کیا اُس کا اس سے خوبصورت کوئی بیان ممکن ہے ؟"

چاندنی میں تاج محل اپنا دروں کے پنکھوں کے سہارے انور کا اپنا فانی خواب، پھر اسے دیکھی کرنے کے لئے لوٹ آیا اور اُس دن رات کو جب وہ ہوٹل کے کمرے میں سونے کے لئے بستر پہ لیٹا تو اُسے نیند نہیں آئی۔ چھت پر ٹنگا ہوا بجلی کا پنکھا ساری رات ایک ہی لفظ دُہراتا رہا ـــ سلمہ! سلمہ!! سلمہ!!!

(۶)

وہ گیارہ مارچ کو صبح احمد آباد پہنچے۔ احمد آباد بے ڈھنگے طریقے سے دُور تک پھیلا ہوا ایک پرانا شہر تھا جس میں جگہ جگہ ملوں کی چمنیاں آسمان کی طرف چلی گئی تھیں "یہ ایک طرف جاگیرداریت کے زوال اور دوسری طرف کارخانہ داریت کا انوکھا میل ہے"۔ باب ملس نے شہر کو دیکھ کر کہا "روس کے انقلاب سے پہلے پیٹروگراڈ بھی کچھ ایسا ہی شہر تھا۔"

ڈاک خانے جا کر انہوں نے اپنی ڈاک لی۔ ملس کے اخباروں نے اُسے تار بھیجا تھا کہ وہ "گاندھی جی کی ڈانڈی یاترا" کے بارے میں مفصّل اور بھرپور رپورٹیں بھیجے، ایسا لگتا تھا کہ امریکہ میں لوگوں کو اس خبر میں بہت دلچسپی تھی انور کے نام اُس کے ابا نے ایک موٹا سا لفافہ بھیجا تھا جس میں انہوں نے اُس کے پیچھے اُس کے نام آئے ہوئے سارے خط بھیجے تھے۔ ایک خط سبحان کا تھا جو کانپور کی کسی ٹریڈ یونین میں کام کر رہا تھا۔ اُس نے لکھا تھا "محنت کش لوگ

نئے ہندوستان کی اِن ملوں اور فیکٹریوں میں انقلاب لائیں گے، انقلاب اُس آشرم میں نہیں ہوگا جہاں ایک سنت بیٹھا ہوا برٹش سامراج کے شیر کی دُم پر ایک چٹکی گھر کا بنا ہوا نمک رکھ کر اُسے ڈرانے کی کوشش کر رہا ہے"۔ "سجاتو سکی" بالکل نہیں بدلا تھا۔ انور اپنے دوست کی اس انوکھی مثال پر مسکرا دیا۔ پھر اس نے اُس پوسٹ کارڈ پر نظر ڈالی جس پر لکھنؤ کی مُہر لگی ہوئی تھی۔ اس پر شاعری کی بہت خوبصورت زنانی لکھائی میں غالب کا صرف ایک شعر لکھا ہوا تھا لیکن اُس سے اُس کا یہ مطلب بالکل صاف تھا کہ اُس نے ستیہ گرہ میں شامل ہونے اور جیل جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ پوسٹ کارڈ پر لکھا تھا ——

خانہ زادِ زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں؟

ہیں گرفتارِ وفا زنداں سے گھبرائیں گے کیا؟

وہ لوگ وہاں ٹھیک وقت سے پہنچے تھے کیونکہ گاندھی جی اُسی دن رات کو اپنی یاترا شروع کرنے والے تھے اور سارے شہر میں ایک ہلچل تھی۔ پروگرام پہلے ہی سے ظاہر کر کے "دشمن" کو اُس کی اطلاع دے دی گئی تھی۔ پولیس کو یہ معلوم تھا کہ گاندھی سینا میں کتنے ستیہ گرہی ہوں گے، اُن کے نام کیا ہیں، وہ کس راستے سے ہو کر دو سو میل کے سفر کے بعد سمندر کے کنارے ڈانڈی نام کے مقام پر پہنچیں گے اور راستے میں کن کن گاؤں میں ٹھہریں گے۔ یہ ایک نئے ڈھنگ کی فوج تھی جو ایک نئے ڈھنگ کی لڑائی لڑ رہی تھی اور فوجی تاریخ میں اس لڑائی کی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی تھی۔ اس لئے اس کو ایک نیا نام دیا گیا تھا —— ستیہ گرہ! سچ مچ یہ "حق کی لڑائی" تھی۔

اُنھوں نے ہوٹل سے ایک ٹیکسی لی اور سابر متی ندی کا پتلا سا پُل پار کر کے ایک دھول بھری سڑک سے ہو کر آشرم کی طرف چلے۔ آشرم نیم کے پیڑوں کے بیچ چھوٹی چھوٹی سفید جھونپڑیوں کا ایک مجموعہ تھا۔ آشرم کے خاموش ماحول میں ایک ہلچل چھپی ہوئی تھی۔ جن پچھتر لوگوں کو اس یاترا کے لئے چُنا گیا تھا وہ آخری تیاریاں کر رہے تھے۔ مہاتما گاندھی اپنے اصول کے مطابق تیسرے پہر سو رہے تھے لیکن اُن کے ایک سکریٹری سے اُن لوگوں نے ساری باتیں معلوم کر لیں۔ گاندھی جی نے خود بہت غور کر کے ایسے لوگوں کو اپنے ساتھ لے چلنے کے لئے چُنا تھا جو اہنسا میں پورا یقین رکھتے تھے۔ ان میں مسلمان اور ہریجن بھی شامل تھے اور اُن کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ اپنے ساتھ بالکل ہی ضروری چیزوں کے علاوہ کچھ بھی نہ لے جائیں۔

سکریٹری کی بات بیچ میں ہی کاٹ کر ملس نے کہا "وہ اپنے ساتھ ایک لاٹھی کے علاوہ اور کچھ نہ لیں، نہ کوئی ہتھیار نہ روٹی اور نہ پیسہ ــــــ اُن کے پیروں میں صرف ایک جوڑا جوتا اور جسم پر صرف ایک کپڑا ہو۔"

"جی ہاں، جی ہاں۔" سکریٹری کو بڑا تعجب ہوا "آپ کو یہ سب کیسے معلوم ہوا؟"

"یہ تو بہت پُرانی کہانی ہے ــــــ اب سے کوئی انیس سو تیس برس پُرانی!"

امریکی اخبار نویس نے گاندھی جی کے سکریٹری کے چہرے پر حیرت کا اظہار دیکھ کر کہا "میں تو آپ کو بائبل میں لکھی ہوئی بات سُنا رہا تھا۔ عیسیٰ نے اپنے بارہ چیلوں کو یہی ہدایت دی تھی۔"

"میرا خیال ہے کہ گاندھی جی کو اس مقدس مثال کا پتہ نہیں ہے لیکن اُنہیں یہ سُن کر بہت خوشی ہوگی، جب وہ سو کر اُٹھیں گے تو میں اُنہیں آپ کی یہ بات بتاؤنگا۔"

"ضرور ضرور، اور اُن سے میرا سلام کہہ دیجئے گا۔ میں آج انہیں پریشان نہیں کرنا چاہتا، آج اُنہیں بہت سی باتوں کے بارے میں سوچنا ہوگا لیکن راستے میں کہیں پر میں اُن سے ملاقات کرنا چاہوں گا۔"

شہر واپس پہنچ کر ملس نے ڈانڈی یاترا کا ذکر کرتے ہوئے ایک تار بھیجا اُس ہوٹل میں دوسرے انگریز اور امریکی نامہ نگار بھی ٹھہرے ہوئے تھے اِس لئے ملس اُن سے پیچھے رہ جانے کے لئے کسی بھی حالت میں تیار نہیں تھا۔ وہ اپنی "کہانی" ٹائپ کرتا جارہا تھا اور جب ایک صفحہ پورا ہو جاتا تھا تو وہ انور کو اُسے تار سے بھیج دینے کے لئے ٹیکسی سے ڈاک خانے بھیج دیتا تھا۔ یہ طوفان کی رفتار سے کام کرنے والی امریکی اخبار نویسی تھی، اس میں خرچ کی کوئی فکر نہیں کی جاتی تھی۔

کھانا کھا کر وہ پھر ٹیکسی سے آشرم جا پہنچے۔ اُنہوں نے دیکھا کہ ہزاروں لوگوں نے اُن کا راستہ روک رکھا تھا۔ وہ اپنے چہیتے مہاتما کو وداع کرنے آئے تھے۔ آس پاس دُور تک پھیلے ہوئے میدان پر اندھیرا چھاتا جارہا تھا اور تقریباً بالکل ہی سُوکھی ہوئی ندی کے اُس پار اَن گنت مشعلوں کی روشنی ہو رہی تھی جیسے اندھیری رات میں جگنو چمک رہے ہوں۔ یہ لوگ شہر اور آس پاس کے گاؤوں سے سابرمتی کے کنارے پر بسے ہوئے آشرم کی طرف آرہے تھے۔ جب اُن کی موٹر بھیڑ کو چیرتی ہوئی آشرم کے قریب پہنچی اُس وقت آدھی رات ہو چکی تھی اور آس پاس کی کھلی جگہ میں لوگ کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ بڑی مشکل سے وہ لوگ گاندھی جی کے سکریٹری کے پاس پہنچے اور اُس نے اُنہیں بتایا کہ بائبل میں ایسے ہی واقعے کے ذکر کی بات سُن کر گاندھی جی بہت متاثر ہوئے تھے لیکن اُنہوں نے امریکی اخبار نویس سے

التجا کی تھی کہ وہ اس بات کا کہیں ذکر نہ کرے کیونکہ گاندھی جی نے کہا تھا کہ عیسٰی جیسے پیغمبر کے ساتھ اپنا مقابلہ کرنا بہت بڑی گستاخی اور عیسائی مذہب کی بے ادبی ہوگی۔

"جو آدمی خود ولی اور پیغمبر ہو اُسی میں اتنی انکساری ہو سکتی ہے۔" امریکی اخبار نویس نے کہا۔

صبح ہو رہی تھی۔ گاندھی جی ایک لنگوٹی پہنے اپنی جھونپڑی میں سے نکلے اور انہیں دیکھتے ہی دس ہزار آدمیوں نے ایک ساتھ نعرہ لگایا "مہاتما گاندھی کی جے!" برآمدے میں کھڑے ہو کر گاندھی جی نے اپنے خاص ڈھنگ سے پوپلے منہ مسکرا کر اس نعرے کا جواب دیا اور ہاتھ اُٹھا کر لوگوں سے خاموش ہو جانے کو کہا۔ والنٹیروں نے جلدی سے اُن کے چاروں طرف ایک گھیرا بنا لیا اور اُنہیں ندی کے کنارے کی طرف لے چلے جہاں یاترا شروع کرنے سے پہلے پرارتھنا ہونے والی تھی۔ ایک دبلا پتلا آدھ ننگا چھوٹے قد کا آدمی چبوترے پر آنکھیں بند کئے ہوئے دھیان میں مصروف بیٹھا تھا۔ پیچھے سے آتی ہوئی مشعلوں کی روشنی میں اُس کے دُبلے پتلے اور جھریوں سے بھرے جسم کا صرف ایک کالا سا خاکہ ہی دکھائی دے رہا تھا۔ گیتا کے اشلوک پڑھے جا رہے تھے۔ اس کے بعد سفید داڑھی والے ایک مولوی صاحب نے آئمہ بھاری گونجتی ہوئی آواز میں قرآن کی آیتیں پڑھیں، پھر پارسیوں کی مذہبی کتاب سے ایک حصہ پڑھا گیا اور آخر میں عیسائیوں کی دُعا "Lead Kindly light" پڑھی گئی۔ ہال بھی انجانے ہی اس کورس میں شامل ہو گیا اور ناک کے سُر سے گاتے ہوئے اُس امریکی اخبار نویس کی بھاری آواز سُریلی ہندوستانی آوازوں پر چھا گئی۔ انور نے دیکھا کہ گاندھی جی نے اس انجانی آواز پر کچھ تعجب کے ساتھ ایک پل کو اپنی

آنکھیں کھولیں، اور اُس لمبے چوڑے امریکی کو وہی دُعا پڑھتے دیکھ کر اُنہوں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اُن کے پچکے ہوئے گالوں پر اور عینک کے پیچھے اُن کی آنکھوں میں ایک مسکراہٹ دوڑ گئی۔

پرارتھنا ختم ہونے پر گاندھی جی نے اپنی لاٹھی اُٹھائی اور اندھیرے کو چیرتے ہوئے یاترا پر چل پڑے۔ اُن کے پیچھے پیچھے سچائی کی اِس لڑائی میں لڑنے والے اُن کے پچھتر سپاہی دو قطاروں میں چلے جا رہے تھے۔ لوگوں کے ہجوم نے ایک بار پھر نعرہ لگایا "مہاتما گاندھی کی جے!" مہاتما گاندھی نے اپنی پد یاترا شروع کر دی تھی۔!

مِلس بھاگ کر اپنے ہوٹل پہنچا اور ٹائپ رائٹر پر جلدی سے ایک چھوٹی سی خبر ٹائپ کر لی، اُس کے بعد اس خبر کو تفصیلی ٹائپ کرنے سے پہلے اُس نے انور کو اُس مختصر خبر کے ساتھ ڈاک خانے دوڑا دیا تاکہ وہ تیسرے پہر نکلنے والے اخباروں میں چھپنے کے لئے ٹھیک وقت پر نیویارک پہنچ جائے۔ کھڑکی پر تار دیتے وقت انور نے اُن الفاظ کو پڑھا اور اُس کے سارے بدن میں جوش کی ایک لہر دوڑ گئی۔ خبر کچھ اِس طرح تھی ———

ورلڈ نیوز۔ نیویارک

ہندوستان کے دیہاتوں میں ایک نئے عیسٰی کی پد یاترا۔ اس ناقابلِ فتح رُوحانی طاقت کے آگے نئی دلّی کے محلوں میں ظالم حکمراں گھبرا اُٹھے۔ آج صبح سویرے دھیمی رفتار سے بہنے والی سابرمتی کے کنارے سے مہاتما گاندھی نے اپنے پچھتّر پیروؤں کے ساتھ عیسائیوں کی دُعا "Lead kindly light!" پڑھتے ہوئے اپنی تاریخی پد یاترا شروع کی۔

اپنے کروڑوں ہم وطنوں کے لئے یہ دُبلا پتلا آدمی گھپ اندھیرے میں اُمید کی کرن کے مانند ہے۔ نمک بنا کر انگریزوں کا قانون توڑنے کیلئے گاندھی نے سمندر کے کنارے کی طرف اپنی یاترا شروع کر دی۔ یہی اُن کے ہم وطنوں کا آزادی کا سفر ہے۔ تفصیلی خبر بعد میں بھیج رہا ہوں۔۔۔

(۷)

کچھ دن تک تو گاندھی جی جدھر جاتے تھے اُدھر ہی وہ بھی موٹر سے پہنچ جاتے۔ انور نے ایسا محسوس کیا کہ شروع شروع میں اُسے جتنا جوش تھا وہ گاندھی جی کے ستیہ گرہ کے مذہبی پہلو کو دیکھ کر کافی ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ یہ آزادی کی فوج میدانِ جنگ کے لئے کوچ نہیں کر رہی تھی بلکہ ایسا لگ رہا تھا کہ ایک مقدس روح کے ساتھ کچھ یاتری کسی تیرتھ یاترا پر جا رہے ہیں۔ جہاں بھی وہ جاتے ہزاروں کی تعداد میں گاؤں والے وہاں آکر جمع ہو جاتے اور مہاتما کے پیر چھونے کے لئے، یا جہاں پر اُنہوں نے قدم رکھا تھا کم سے کم وہاں کی دھول ہی لے جانے کے لئے دھینگا مشتی کرنے لگتے۔ انور جانتا تھا کہ مہاتما گاندھی اس بات کو پسند نہیں کرتے تھے لیکن وہ اس طرح کی اندھی بُت پرستی کو کیوں برداشت کرتے تھے؟ وہ ایسا ماحول ہی کیوں پیدا کرتے تھے جو لوگوں کو جس سرکار سے نفرت ہے، اُس کے خلاف لڑنے کی بجائے اُن کی اپنی پاکیزگی کی طرف کھینچتا تھا؟ جن گاؤں سے ہو کر وہ گزرے وہاں کے کسان بہت غریب تھے۔ آخر مہاتما جی اُن کسانوں کو نہ صرف بدیسی سرکار کے خلاف بلکہ اُن کا خون چوسنے والے زمینداروں اور مہاجنوں کے خلاف بغاوت کرنے کے لئے کیوں نہیں اُکساتے تھے؟... آخر کیوں نہیں... ؟ کیوں نہیں؟

انور نے ایک بار جب گاندھی جی کو کسانوں کی ایک بھیڑ کے سامنے تقریر کرتے سنا تو اس کے کچھ شک دور ہو گئے اور اُسے اپنے کچھ سوالوں کا جواب بھی مل گیا۔ وہ گجراتی بول رہے تھے اور ایک والنیٹر اُن کی تقریر کا ترجمہ ہندوستانی میں کرتا جاتا تھا، جس کا ترجمہ انور کو مِلس کے لئے انگریزی میں کرنا پڑتا تھا۔ یہ بہت ہی لمبا سلسلہ تھا اور اس دُہرے ترجمے میں درمیان میں کچھ لفظ رہ بھی جاتے تھے لیکن انور کو اس بات کی خوشی تھی کہ وہ سنتوں کی طرح ہمت رکھنے کی نصیحت نہیں کر رہے تھے بلکہ اُن کی تقریر ظلم کی مخالفت کرنے کے لئے ایک انقلابی پیغام تھا۔

انہوں نے کہا "ہندوستان میں انگریز حکومت نے اس عظیم ملک کو اخلاقی مادی، تہذیبی اور رُوحانی طور سے تباہ کر دیا ہے۔ میں ایسی حکومت کو ایک لعنت سمجھتا ہوں، میں نے اِس حکومت کے انتظام کو ختم کر دینے کا بیڑہ اٹھایا ہے۔ میں نے ایک زمانے میں "God save the king" کا گیت گایا ہے اور دوسروں کو یہ گیت گانا سکھایا بھی ہے۔ میں درخواستوں، وفد اور دوستانہ بات چیت کے ماحول میں بھروسہ رکھتا تھا۔ لیکن یہ سب طریقے بیکار ثابت ہو چکے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ سرکار اِن طریقوں سے صحیح راستے پر نہیں آئے گی۔ اب بغاوت میرا مذہب ہے۔ ہماری لڑائی اہنسا کی لڑائی ہے۔ ہم کسی کو جان سے مارنے کے لئے نہیں نکلے ہیں لیکن یہ ہمارا فرض ہے کہ اس سرکار کے ظلم کا نام و نشان مٹا دیں۔"

انور سوچنے لگا کہ اگر مہاتما جی جیسا نرم طبیعت کا آدمی اس طرح کی باتیں کر سکتا ہے تو وہ انقلاب، جس کا نعرہ بھگت سنگھ نے اسمبلی میں بم پھینکنے کے بعد لگایا تھا سچ مچ ہی آ گیا ہے۔ کسانوں کا جوش بھی نعرے لگانے تک ہی محدود

نہیں تھا۔ اِس جلسے میں گاندھی جی کی تقریر ختم ہوتے ہی بڑی بڑی پگڑیاں باندھے ہوئے آدھے درجن آدمی کود کر سٹیج پر پہنچ گئے۔ وہ سرکار کے ذریعے مقرر کئے ہوئے گاؤوں کے پٹیل تھے اور اسٹیج پر کھڑے ہو کر انہوں نے اپنے استعفوں کا اعلان کیا۔ اُن میں سے ایک نے چلّا کر کہا "ہمیں مہاتما کا حکم مل گیا ہے، اب ہم اِس ظالم سرکار کی سیوا نہیں کریں گے۔" تالیوں کی آواز سے آسمان گونج اُٹھا اور پتہ لگانے پر اُن اخبار نویسوں کو یہ معلوم ہوا کہ اِن چھ پٹیلوں کو لیکر گجرات میں استعفٰے دینے والے پٹیلوں کی تعداد دو سو تک پہنچ چکی ہے۔ سرکار کو دھیرے دھیرے عوام کے عدم تعاون کا اندازہ ہوتا جا رہا تھا۔

آخرکار ملس کو مہاتما گاندھی سے انٹرویو کا وہ موقع مل ہی گیا جس کی تاک میں وہ کئی دنوں سے تھا۔ لیکن جب تک غیر ملکی اخبار نویس ستیہ گرہیوں کی اس ٹولی کے ساتھ لگے ہوئے تھے تب تک وہ اِس انٹرویو کو ٹالتے ہوئے تھا۔ لیکن کچھ دن بعد انگریز اور امریکی اخبار نویس روز تیز دھوپ اور گرد میں پندرہ پندرہ میل چلتے چلتے اُکتا گئے اور اس لئے وہ احمد آباد لوٹ گئے۔ اُسی دن شام کو جمبوسار نام کے گاؤں میں انور اور ملس گاندھی جی سے ملے۔ گاندھی جی آم کے ایک پیڑ کی چھاؤں میں بیٹھے چرخہ کات رہے تھے۔ انور نے اُنہیں یاد دلایا کہ وہ ایک بار پہلے بھی اُن سے مل چکا تھا اور گاندھی جی نے کہا "ارے ہاں، مجھے یاد ہے، لیکن اُس وقت سے تم بہت بڑے ہو گئے ہو۔" اس کے بعد انور نے انہیں اربرٹ ملس کے بارے میں اور ہندوستان کی آزادی کے مقصد کے لئے اُس کی ہمدردی کے بارے میں بتایا کہ ڈاکٹر انصاری نے اُسے اس امریکی اخبار نویس کے ساتھ ایک ترجمان کی حیثیت سے سارے ملک کا چکر لگانے کے لئے

متعین کیا تھا۔ انور نے دیکھا کہ مہاتما جی اس بات سے بہت خوش ہوئے کیوں کہ انہوں نے مسکرا کر کہا "اچھا! اچھا!" گاندھی جی کے سکریٹری نے بتایا کہ جلس ہندوستان کی طرف دوستی کا جذبہ رکھنے والا وہی امریکی نامہ نگار تھا جس نے عیسیٰ مسیح کی زندگی کے ایک واقعہ کے ساتھ ستیہ گرہیوں کا مقابلہ کیا تھا۔ یہ سن کر گاندھی جی عیسیٰ مسیح کی باتیں کرنے لگے جن کے لئے اُن کے دل میں بہت عقیدت تھی۔ اس کے بعد وہ ٹالسٹائی اور ایمرسن کی باتیں کرتے رہے جن کے وہ دونوں ہی بہت مدّاح تھے۔ باتوں کے دوران جلس نے والٹ وھٹ مین کا ذکر کیا مگر گاندھی جی نے اس شاعر کی کسی تخلیق کو نہیں پڑھا تھا۔ پھر بھی جب انہیں بتایا گیا کہ لنکن کے اعلان سے بہت پہلے ہی اس شاعر نے غلامی کو اُکھاڑ پھینکنے کے بارے میں بہت کچھ کہا تھا اور اس کے لئے بہت کام کیا تھا تو گاندھی جی کو اس شاعر میں بڑی دلچسپی پیدا ہوئی جلس نے جب دیکھا کہ اُسے انٹرویو کے لئے جو ایک گھنٹے کا وقت دیا گیا تھا اُس کا زیادہ تر حصہ تو سیاست سے کوئی تعلق نہ رکھنے والی اِدھر اُدھر کی باتوں میں نکل گیا تو اس نے آخری کچھ منٹوں میں جلدی جلدی مسائل حاضرہ کے متعلق سوال پوچھنے شروع کئے۔

"مہاتما گینڈی" وہ گاندھی کو اب بھی گینڈی کہتا تھا لیکن دوسرے اخبار نویسوں کی طرح وہ اُس کے پہلے 'مسٹر' کا لفظ نہیں لگاتا تھا "انگریزوں سے آپ کو کیا شکایت ہے؟"

گاندھی جی نے چرخہ چلاتے ہوئے جواب دیا "ایک لفظ میں میری شکایت کی بنیاد اُن کا استحصال ہے۔ وہ ہندوستان کا خون چوس رہے ہیں۔ وہ اُسے لوٹ رہے

کی تنخواہ ہی کو لے لیجیے جس کا ذکر میں نے لارڈ اروِن کے نام اپنے خط میں کیا تھا۔ اُسے ہر مہینے اکیس ہزار رُوپے سے زیادہ ملتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اُسے روزانہ سات سو رُوپے سے زیادہ ملتے ہیں جب کہ اوسط ہندوستانی کی آمدنی دو آنے روز سے بھی کم ہے ۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اسے اوسط ہندوستانی کے مقابلے میں پانچ ہزار گنا سے بھی زیادہ تنخواہ ملتی ہے، لیکن اوسط انگریز کی آمدنی دو رُوپے روز ہے، پھر بھی وہاں کے وزیرِ اعظم کو صرف ایک سو اسّی رُوپے روز ملتے ہیں۔ کیا یہ استحصال نہیں ہے ؟ یہ تو صرف ایک مثال ہے۔ نظام کا پورا طریقہ غلط اور جابرانہ ہے۔"

"انگریزوں کی حکومت کا مقابلہ کرنے کے لیے آپ نے نمک قانون جیسے چھوٹے قانون کو توڑنے کے لیے کیوں چنا ؟"

"کیونکہ غریبوں کی نظر سے دیکھا جائے تو اس قانون کو میں سب سے زیادہ ناجائز قانون سمجھتا ہوں۔ چونکہ آزادی کی تحریک بنیادی طور پر سب سے غریب لوگوں کے لیے ہے، اس لیے میں نے سب سے پہلے اُس بُرائی کو ہی دُور کرنے کا بیڑہ اُٹھایا ہے۔"

"اگر آپ گرفتار ہو گئے تو کیا ہو گا ؟"

"میں گرفتار بھی کیا جا سکتا ہوں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں جان سے مار دیا جاؤں لیکن مجھے اِس بات کی پوری اُمید ہے کہ میرے بعد اِس کام کو تربیت یافتہ ڈھنگ سے پورا کرنے کے لیے ہزاروں لوگ تیار ہوں گے۔"

"تھیوڈور پارکر نے بھی بالکل ایسی ہی بات کہی تھی۔"

"میں ایک لاعلم آدمی ہوں" گاندھی جی نے کہا "تھیوڈور پارکر کون تھے ؟"

ہلس نے انہیں تھیوڈور پارکر کا قصہ سنایا۔ وہ لنکن اور وھٹ مین کے زمانے میں ایک بہت بڑا ناصح گذرا تھا اور غلامی کے خاتمے کا پرچار کرنے والے شروع کے کچھ لوگوں میں سے تھا۔ اُس کا کہنا تھا کہ یہ غلامی کا رواج عیسائی مذہب کے خلاف ہے۔ جو اخلاقیات کے ماہر اس ناانصافی کی حالت کا جوں کا توں قائم رکھنا چاہتے تھے انہوں نے اُسے کھلے عام بحث کرنے کے لئے للکارا۔ اُس کے دوستوں نے اُسے صلاح دی کہ وہ اس میٹنگ میں نہ جائے کیونکہ یہ اُسے مار ڈالنے کی سازش تھی، لیکن وہ جانے پر تُلا ہوا تھا۔ اس لئے اُنہوں نے اُسے اُس کے گھر میں بند کر دیا۔ میٹنگ میں اس کے دشمنوں نے اُسے بزدل ٹھہرایا۔ یکایک پارکر وہاں آ پہنچا اور کُود کر سٹیج پر جا کھڑا ہوا اور زور زور سے چلّا کر کہنے لگا "اگر چاہو تو مجھے جان سے مار ڈالو! لیکن تم میرا جو خون بہاؤ گے اُس کی ایک ایک بُوند سے ہزاروں پارکر پیدا ہوں گے اور غلامی کا خاتمہ کر دیں گے۔" اس کے دشمن شرمندہ ہو کر چُپ ہو گئے۔

ظاہر تھا کہ گاندھی جی پارکر کی مثال سے بہت متاثر ہوئے اور کچھ دیر تک چُپ رہنے کے بعد بولے "یہ اہنسا کی طاقت کی ایک روشن مثال ہے۔" مگر ہلس پھر تازہ سیاسی مسائل پر باتیں کرنے لگا۔

"لارڈ اِروِن نے آپ کے خط کا جو جواب دیا ہے اُس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

"گھٹنے ٹیک کر میں نے روٹی مانگی تھی اور جواب میں مجھے پتھر ملا۔ پھر بھی مجھے اس پر کوئی تعجب نہیں ہے۔ انگریز قوم صرف طاقت کے آگے سر جھکاتی ہے۔"

گاندھی جی کے سکریٹری خطوں کا ایک بڑا سا ڈھیر لئے ہوئے چلے آ رہے تھے۔

اس لئے مِلس نے جلدی سے ایک سوال اور پوچھا" انگریزوں کی اس دلیل کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے کہ اُن کی حکومت سے ہندوستان کو فائدہ ہی پہنچا ہے کیونکہ انہوں نے اس ملک میں امن قائم کیا ہے؟"

" انگریزوں کی حکومت میں ہمارے ملک کو جو امن نصیب ہوا ہے وہ جیل خانے یا قبرستان کا ہی امن ہے۔ انہوں نے پورے ہندوستان کو ایک بہت بڑا جیل خانہ بنا رکھا ہے۔"

اتنے میں گاندھی جی جو سُوت کات رہے تھے وہ ٹوٹ گیا اور ایسا ظاہر ہوا کہ سُوت کا ٹوٹنا بات چیت کا سلسلہ ختم ہونے کا اعلان تھا۔ گاندھی جی نے اپنی کمر میں ایک زنجیر سے لٹکتی ہوئی گول جیبی گھڑی ہاتھ میں لے کر امریکی اخبار نویس کو دکھلاتے ہوئے کہا" آپ پانچ منٹ زیادہ وقت لے چکے ہیں" اور یہ کہہ کر وہ بچوں کی طرح کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

وہاں سے باہر نکلتے وقت انور نے مِلس سے پوچھا" ہمارے مہاتما کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"۔

" میں چاہتا تھا کہ میں اور کچھ دیر اُن سے باتیں کر سکتا تھا۔ ابھی بھی بہت سی ایسی باتیں ہیں جو میری سمجھ میں نہیں آئیں، مثلاً یہ بات کہ وہ چرخے پر اتنا زور کیوں دیتے ہیں، مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ یہ ترقی کے سلسلے کو پیچھے موڑ دینے کے برابر ہے۔ لیکن اِس بات چیت کے بعد مجھے ایک بات کا پہلے سے بھی زیادہ یقین ہو گیا ہے وہ ہے اُن کی ایمانداری اور نیکی۔ اتنی نیکی خطرناک ہو سکتی ہے۔"

" کس کے لئے خطرناک ہو سکتی ہے؟"

"یہ تو میں نہیں کہہ سکتا، لیکن ہو سکتا ہے خود اُن کے لیے۔"

انور اس بات کا پورا مطلب نہیں سمجھ سکا، اس لئے اُس نے پوچھا "آپ کا مطلب میں سمجھ نہیں پایا؟"

"یہ تو میں بھی نہیں بتا سکتا" اُس امریکی اخبار نویس نے سوچتے ہوئے کہا "میں پھر عیسیٰ مسیح کی زندگی اور موت کے بارے میں سوچ رہا تھا۔"

(۸)

جب وہ احمد آباد واپس پہنچے اُس وقت، کُل ہند کانگریس کمیٹی کے سینکڑوں ممبر — جسے قوم پرست اخبار "قومی پارلیمنٹ" کہنے لگے تھے — سول نافرمانی کی تحریک شروع کرنے کے بارے میں ورکنگ کمیٹی کے فیصلے کی تائید کرنے کے بعد واپس جانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ انہوں نے کانگریس کے صدر پنڈت جواہر لال نہرو کی ایک جھلک دیکھی۔ وہ اپنے ساتھیوں سے رخصت ہو رہے تھے۔ یہ ممکن تھا کہ اُن تھوڑے سے لوگوں کو چھوڑ کر جو جیل میں اُن کے ساتھ ہی رکھے جائیں، باقی لوگوں سے کئی برس تک اُن کا ملنا نہ ہو سکے۔ جب وہ لوگ ایک دوسرے سے گلے مل کر وداع ہو رہے تھے اُس وقت اُن کے چہرے پر ایک اُداسی کی جھلک تھی ساتھ ہی انہیں اس بات کا بھی احساس تھا کہ وہ آخری قدم اُٹھانے جا رہے ہیں، لڑائی کے لئے دونوں طرف کے مورچے جم چکے ہیں لیکن ساتھ ہی اُن کی آنکھوں میں ایک چمک بھی تھی، دشمن کو اپنا کس بل دکھانے کا عزم مصمم بھی تھا۔ فضا میں فکر کا جو جذبہ سمایا ہوا تھا اُسے جیسے دُور کرنے کے لئے بیچ بیچ میں لوگ ہنسی مذاق بھی کر رہے تھے۔ سروجنی نائیڈو خوش خوش تھیں اور ریاست والی بھی، جو بات بات میں لوگوں کو ہنساتی تھیں اور کئی بار بہادری کے ساتھ جیل جا چکی

تھیں، جن میں اپنے بھاری بھرکم جسم اور ادھیڑ عمر کے باوجود لڑکیوں جیسی چُستی تھی۔
وہ اپنی خاص آواز میں کہہ رہی تھیں "اچھّا جواہر، رخصت۔ میرا خیال ہے کہ اب ہم سب
لوگوں کو جبل کی تیرتھ یاترا کی تیاریاں کر لینی چاہئیں۔"

اب سیاسی واقعات کا رُخ احمد آباد سے ہٹ کر کہیں اور مُڑ رہا تھا، اس
لئے رات کی گاڑی سے انور اور مِلس بمبئی کے لئے روانہ ہو گئے۔

(۹)

بمبئی! انور کے لئے تو اس نام میں ہی ایک جادو سا تھا۔ شہر کی فضا ایک
نشیلی اور طاقت ور دوا کی طرح تھی۔ بڑی بڑی عمارتیں، سڑکوں کی بھیڑ بھاڑ، ٹرامیں
بسیں اور بجلی کی ریل گاڑیاں، ہوٹلوں اور چائے خانوں میں طرح طرح کے لوگوں کی
چہل پہل، جگمگاتی ہوئی دکانیں ہر چیز جدیدیت کے سانچے میں ڈھلی ہوئی معلوم
ہوتی تھی۔ ہر چیز اسے لُبھا رہی تھی اور ساتھ ہی اُس کی پہنچ سے باہر بھی معلوم ہوتی تھی۔
اُسے ایسا لگتا تھا کہ اس شہر میں تابناک مستقبل کے امکانات بھی ہیں اور ایک للکار بھی۔
اُس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اِس شہر کو فتح کر کے ہی دم لے گا۔

وہ لوگ تاج محل ہوٹل میں ٹھہرے۔ اپنے سیدھے سادے طالب علموں والے
لباس میں انور کو ایسا لگا کہ وہ اِس جگہ کے لائق نہیں ہے اور اس کے علاوہ وہ اس کی
بھی کوئی وجہ نہیں سمجھتا تھا کہ جب وہ آسانی سے اپنے ایک دوست کے ساتھ ٹھہر
سکتا ہے تو پھر مِلس اُس کے لئے اتنا پیسہ کیوں خرچ کرے۔ اس لئے اُس نے عثمان
فضل بھائی کو اُس کے ابّا کے عطر کے کارخانے میں ٹیلیفون کیا اور اُسے فوراً ٹیلیفون
پر ہی اس بات کا احساس ہو گیا کہ عثمان کو اُس کی آواز سُن کر کتنا تعجب ہوا تھا اور

ساتھ ہی کتنی خوشی ہوئی تھی۔ گھنٹے بھر کے اندر ہی عثمان انور کو اپنے گھر لے جانے کے لئے ہوٹل آ پہنچا۔ انور کے ساتھ ہی عثمان کو بھی کالج سے نکال دیا گیا تھا۔ ملس نہیں چاہتا تھا کہ انور اُسے چھوڑ کر چلا جائے۔ وہ اپنے ترجمان کو سچ مچ بہت چاہنے لگا تھا اور وہ محسوس کرتا تھا کہ اُس کی پوری ذمہ داری اس کے اوپر ہے۔ لیکن جب عثمان نے بہت زور دیا تو وہ راضی ہو گیا۔ اس کے علاوہ انور نے ملس کو یہ بھی بتایا کہ تاج محل ہوٹل میں رہ کر بمبئی کے عوام کی زندگی سے اس کا تعلق نہیں رہ پائے گا اور چونکہ عثمان مقامی کانگریس کی سرگرمیوں میں آگے بڑھ کر حصّہ لے رہا تھا اس لئے اس کے ذریعے وہ اپنے دوست کے لئے خبریں حاصل کر سکے گا۔

چھ اپریل کو خبر آئی کہ گاندھی جی ڈانڈی پہنچ گئے اور انہوں نے سمندر کے کنارے سے نمک اُٹھا کر نمک قانون توڑ کر سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دی۔ یہ سارے ملک میں قانون توڑنے کی تحریک شروع کرنے کا اشارہ تھا۔ ہر جگہ جلسے ہوئے، جلوس نکالے گئے، بدیسی کپڑوں کی دکانوں پر دھرنا دیا گیا اور کھلے عام نمک بنایا گیا۔ سرکار نے اس بغاوت کو بھڑکانے والے اہم لیڈروں کو تو ہاتھ نہیں لگایا مگر اُس کے ساتھیوں کے ساتھ بے انتہا تشدّد کا سلوک کیا۔

عثمان کا ایک دوست "بمبئی کرانیکل" میں سب ایڈیٹر تھا اور انور اپنا بہت سارا وقت وہیں گذارتا تھا اور دیکھتا رہتا تھا کہ اخبار کے دفتر میں خبریں کس طرح لگاتار آتی رہتی تھیں۔ کراچی میں ایک عدالت کے سامنے جہاں کچھ ستیہ گرہیوں پر مقدمہ چل رہا تھا، ایک نہتّی بھیڑ پر گولی چلائی گئی۔ دو نوجوان مارے گئے اور بہت کو گہری چوٹ آئی جن میں گٹھے ہوئے جسم والے سندھی لیڈر جے رام داس دولت رام

بھی تھے جنہیں انور نے ابھی کچھ ہی دن پہلے احمد آباد میں دیکھا تھا۔ پٹنہ، کلکتہ، مدراس، رتناگیری اور لاہور سے بھی گولی چلنے کی خبریں آئی تھیں۔ پشاور میں کئی لوگ فوج اور پولیس کی گولیوں سے مارے گئے تھے جن میں ایک عورت، اور اس کا بچہ بھی تھا جسے ماں کی چھاتی سے دودھ پیتے ہوئے ہی گولی کا نشانہ بنا دیا گیا تھا۔ ایک سب ایڈیٹر نے انور کو بتایا "شروع شروع میں تو جب کہیں بھی پولیس گولی چلاتی تھی تو وہ خبر اتنی سنسنی خیز سمجھی جاتی تھی کہ اُسے پہلے صفحے پر سات کالم کی نمایاں سُرخی لگا کر چھاپا جاتا تھا لیکن اب تو روز اتنی جگہوں سے گولی چلنے کی خبریں آتی ہیں کہ ہم انہیں ایک کالم سے زیادہ کی سُرخی نہیں دے سکتے۔ لاٹھی چارج کی خبریں تو یوں ہی کسی کونے میں چھاپ کر ٹال دی جاتی ہیں۔"

سارے ملک میں بغاوت کی آگ دہک رہی تھی۔ بمبئی میں بھی یہی حال تھا۔ انور کو ایسا لگتا تھا کہ کسی بھی دن یہ آگ بھڑک اُٹھے گی۔ اس شہر میں کانگریس کی تنظیم دوسرے شہروں کے مقابلے میں زیادہ اچھی تھی اور اس لئے یہاں وہ زیادہ طاقتور بھی تھی۔ عثمان نے اُسے بتایا کہ بمبئی میں انگریز سرکار سے الگ ایک دوسری سرکار کی بنیاد پڑ رہی ہے۔ کانگریس کے ہزاروں والنٹیر تھے جن کی اپنی الگ وردی تھی ان میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی، زخمیوں کو لیجانے کے لئے ایمبولنس گاڑیوں، طبی امداد اور ہسپتال کا پورا انتظام تھا۔ کانگریس ہاؤس کے حکم پر کروڑوں روپے کے بدیسی کپڑے سے بھرے ہوئے گوداموں میں تالا لگا دیا گیا تھا اور کانگریس کے والنٹیر دن رات ان پر پہرہ دیتے تھے۔ شراب کی دکانوں پر دھرنا دیا جا رہا تھا اور شراب کا کاروبار لگ بھگ بالکل ٹھپ پڑ گیا تھا۔ چونکہ اخباروں پر روک لگانے کے لئے

اُن کے ایڈیٹروں کے خلاف کئی سرکاری حکم جاری کر دیے گئے تھے اس لیے سائکلو سٹائل کر کے غیر قانونی کانگریس بُلیٹن صبح اور شام کو نکالے جاتے تھے اور کھُلے عام سڑکوں پر بیچے جاتے تھے۔ سب سے تعجب کی بات تو یہ تھی کہ پولیس کی نظروں سے چھُپا کر کانگریس کا ایک ریڈیو سٹیشن بھی کام کر رہا تھا جو بغاوت کا پیغام براڈکاسٹ کرتا تھا اور چائے کی دُکانوں میں ہزاروں لوگ کھُلے عام پولیس کے سامنے اس ریڈیو کا پروگرام سُنتے تھے۔

ایک رات جب انور ملس کے ساتھ تاج میں کھانا کھا رہا تھا تو اُس نے بغاوت کے اِس جذبے کا ایک عجیب اظہار دیکھا۔ کھانا کھانے والے زیادہ تر لوگ انگریز یا امریکی تھے۔ مرد کالے رنگ کے ڈِنر سوٹ اور عورتیں ایوننگ گاؤن پہنے تھیں ان میں کچھ پارسی، اینگلو انڈین اور اِکّا دُکّا ایسے ہندوستانی بھی تھے جو اپنے رہن سہن میں بالکل انگریزوں جیسے تھے۔ اتنے میں اُن کے درمیان سے ایک لمبا تڑنگا، خوبصورت سا نوجوان سفید کھدّر کی دھوتی، کُرتہ اور گاندھی ٹوپی پہنے ہوئے گُذرا۔ وہ چُپ چاپ ایک میز پر جا کر بیٹھ گیا اور کھانے کا آرڈر دینے لگا۔ ہیڈ ویٹر اس کھدّر پوش نوجوان کو دیکھ کر دنگ رہ گیا اور سینکڑوں آنکھیں اس نوجوان پر آ کر جم گئیں جس کے کھدّر کے کپڑے کالے کوٹوں کے سمندر میں ایک سفید جزیرے کی طرح چمک رہے تھے۔ انور اپنی کھٹیچر کالی شیروانی کی وجہ سے یوں ہی کچھ گھبرایا ہوا بیٹھا تھا، جب اُس نے مینجر کو غُصّے سے اُس نوجوان کی میز کی طرف بڑھتے دیکھا تو انور نے سمجھا کہ اب وہ کھدّر پوش بہت بے عزّتی کے ساتھ وہاں سے نکال دیا جائے گا۔ لیکن مینجر میز کے پاس پہنچا تو اُس کا پورا رویّہ ہی بدل گیا۔ وہ بہت

جھک کر اور مسکرا کر کہنے لگا۔ "ڈِ تمہ سر، یس سر، انڈیڈ سر"۔ بولتے ہوئے اُس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی اور وہ مُڑے بغیر ہی قدم اُٹھاتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ پاس کی میز پر بیٹھے ہوئے ایک نوجوان نے بتایا "آپ جانتے ہیں یہ نوجوان آدمی موہن شاہ ہے۔ اس کے باپ کوئی ایک درجن ملوں کے مالک ہوں گے اور اگر وہ چاہے تو اس ہوٹل کو خرید سکتے ہیں"۔

کھانا کھا کر اُس کھدّر پوش نوجوان نے بل پر دستخط کیے، ویٹر کو ٹپ دیا، اور ایک سونے کے سگریٹ کیس کا کھٹکا دبا کر اُس میں سے بیڑی نکالی اور پلاٹینم کے لائٹر سے اُسے جلا کر چل دینے کو اُٹھ کھڑا ہوا۔ انور نے دیکھا کہ وہ اپنی بغل میں کاغذوں کا ایک بنڈل لئے ہوئے تھا اور اُن کی میز کے پاس سے گذرتے وقت اس نے ایک کاغذ اس طرح گرا دیا جیسے اپنے آپ گر گیا ہو۔ انور نے جلدی سے وہ کاغذ اُٹھا لیا۔ وہ سائکلو سٹائل کیا ہوا کانگریس بُلیٹن تھا اور اُس کے سامنے والے صفحے پر موٹے موٹے حرفوں میں لکھا ہوا تھا۔

پنڈت جواہر لال گرفتار

کل شہر میں زبردست احتجاج اور جلوس

(۱۰)

انور کو یاد نہیں تھا کہ پہلے اُس نے اُس لڑکی کو دیکھا یا اُس جھنڈے کو جو وہ اُٹھائے ہوئے تھی لیکن جلوس میں وہ ہی دونوں سب سے زیادہ اُبھر کر سامنے آ رہے تھے یا شاید وہ دونوں ایک ہی تھے کیونکہ دونوں ایک ہی خیال، ایک ہی جذبے کا اظہار کرتے تھے۔ وہ بالکل جھنڈے کی مانند تھی۔ بہادر اور سیدھی تنی ہوئی۔ ہرے رنگ کا

بلاؤز اور گیروے رنگ کے کنارے کی سفید ساڑی پہنے ہوئے وہ خود ایک ترنگا جھنڈا لگ رہی تھی اور وہ اتنی نازک تھی کہ ہوا کے جھونکے سے اُس کا بدن ہلتا ہوا معلوم ہوتا تھا اور جھنڈا بالکل اُس کے جیسا تھا۔ رنگین، لہریئے دار، جاندار چیز، سربلند اور چنچل۔

جھنڈا جلوس کے آگے آگے چل رہا تھا۔ دو والنیٹر اُسے مضبوطی سے اپنے ہاتھوں میں تھامے ہوئے تھے۔ اُن میں سے ایک داڑھی والا سکھ نوجوان تھا جو سر پر کالیوں والی پگڑی باندھے تھا (اُسے دیکھتے ہی انور کو رتن کی یاد آ گئی جو اس وقت کسی جیل میں پڑا سڑ رہا تھا اور سزائے موت کا انتظار کر رہا تھا) اور دوسرا ایک نوجوان پٹھان تھا جو سلیٹی رنگ کی کھدر کی شلوار اور لال کھدر کی قمیص پہنے تھا۔ اُس کے ٹھیک پیچھے جھنڈے کے پیچھے خاتون والنیٹرز کی ایک پلٹن چل رہی تھی اور اس پلٹن کی سب سے اگلی قطار میں "وہ" تھی۔ اُن کے بعد ہزاروں دوسرے والنیٹرز کی قطاریں تھیں جنہیں فوج کے ڈھنگ سے الگ الگ جتھوں میں بانٹ دیا گیا تھا، اِن میں پنجاب کے اکالی اور سرحدی علاقے کے پٹھان "لال کُرتی والے" سب سے زیادہ چمک رہے تھے۔

ہر چیز خاموش تھی۔ سڑکوں پر آمد و رفت بند تھی اور صرف دو لاکھ پیروں کی آواز سنائی دے رہی تھی جو ایک لے پر فوجی انداز سے چل رہے تھے۔ انور کو ایسا لگا کہ اُس نے اپنی ساری زندگی میں اس سے زیادہ خوبصورت اور پُر اثر نظارہ نہیں دیکھا تھا۔ یہ سامراج کی طاقت کو جس نے اُن کے مقبول لیڈر جواہر لال پر ہاتھ ڈالا تھا، ہندوستانیوں کا جواب تھا۔ یہ بغاوت کے راستے پر بڑھتا ہوا ہندوستان تھا۔ اور اس جلوس کا سارا مقصد جلوس کی اگلی قطار میں چلنے والی اُس لڑکی کے چہرے پر جھلکنے والے بغاوت کے پاک جذبے میں سمٹ آیا تھا۔

جلوس کی سب سے پچھلی قطاروں سے طوفان کی گھن گرج کی طرح ایک آواز گونج اٹھی ــــ انقلاب زندہ باد! جلوس کے بیچ میں کسی نے اس نعرے کو اٹھا لیا اور پھر اسے واپس پیچھے لوٹا دیا۔ ایسا لگتا تھا کہ کھیل میں گیند ادھر سے ادھر پھینکی جا رہی ہو۔ یہ آواز کرافورڈ مارکٹ کی دیواروں سے ٹکراتی ہوئی اوپر کو اٹھی اور ٹرام کے بجلی کے تاروں کو پار کرتی ہوئی بادلوں سے گھرے آسمان پر چھا گئی۔

اِن۔قی۔لاب زندہ باد! سرحدی صوبے کے پٹھان لڑکے 'ق' کی آواز گلے کی گہرائی میں سے اتنی صاف نکالتے تھے کہ ایسا لگتا تھا کہ قرآن کی آیتیں پڑھ رہے ہوں۔

اِن۔کی۔ی۔لاب جِندہ باد! گجراتی عورتوں نے جن کے بالوں میں چاندی کی شکل کے پھولوں کے گجرے لگے ہوئے تھے باریک آواز میں ایک ساتھ نعرہ لگایا۔

"اِن ان۔قلاب . . ." والنٹیروں کی ایک ٹولی کے کپتان نے نعرہ لگایا اور ہزاروں نوجوان آوازوں نے ایک ساتھ جواب دیا "زندہ باد!"

درجنوں طرح کے الگ الگ تلفظ میں موٹی اور پتلی، تیز اور دھیمی آوازوں میں منتر کی طرح پڑھے ہوئے یا میدانِ جنگ میں لگائے ہوئے نعرے کی طرح اِن دو لفظوں نے اِس وسیع ہجوم کو جکڑ رکھا تھا ــــ جس میں ہندو اور مسلمان، سکھ اور پارسی سب ہی تھے، اُن میں گجراتی سیٹھ بھی تھے اور ملوں کے مراٹھے مزدور بھی، سرحدی علاقے کے گورے پٹھان بھی اور جنوب کے کالے مدراسی بھی۔ انور سوچ رہا تھا کہ یہ بھی کیسی عجیب بات ہے کہ "انقلاب" عربی کا تلفظ تھا اور "زندہ باد" فارسی کا۔ لیکن ان دونوں لفظوں نے مل کر ہندوستانیوں کو وہ نعرہ دیا تھا جو ساری دنیا کے

مزدوروں کی جدّوجہد کا نعرہ تھا۔ انقلاب زندہ باد! اُسے اداس آنکھوں والے نرم دل انقلابی بھگت سنگھ کی یاد آگئی جس نے ملک کو یہ نعرہ دیا تھا اور جو جلد ہی ملک کی خاطر اپنی جان کی قربانی دینے والا تھا۔ اُسے میرٹھ کے اُن تیّس قیدیوں کا خیال آیا جن پر اسی "انقلاب" کو لانے کی سازش کا الزام لگایا گیا تھا جس کا اعلان اُن کے لاکھوں ہم وطن کھُلے عام کسی بھی سرکاری سزا کی پرواہ نہ کرتے ہوئے کر رہے تھے۔ اُس کی آنکھوں کے آگے گاندھی جی کا دُبلا پتلا جسم اُبھر آیا جنہوں نے سمندر کے کنارے سے نمک اُٹھا کر جو دیکھنے میں بہت ہی چھوٹی بات معلوم ہوتی تھی، سارے ملک میں بغاوت کی لہر پیدا کر دی تھی۔ اُسے وہ بات یاد آئی جو جواہر لال نہرو نے سُبحان کی آٹو گراف بک میں لکھی تھی اور اُسے اب ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ سارا ملک ہی "جان ہتھیلی پر رکھ کر" نکل پڑا تھا۔ ہر آدمی "انقلاب" کو اپنے ڈھنگ سے سمجھتا تھا۔ گاندھی جی چاہتے تھے کہ ہر آدمی چرخا چلائے، کمیونسٹ چاہتے تھے کہ اجتماعی کھیت قائم کیے جائیں اور ہزاروں فیکٹریاں کھولی جائیں تاکہ ملک کو صنعتی بنایا جا سکے۔ لیکن انقلاب تک پہنچنے کے لیے پہلے قدم کے بارے میں سب کی رائے ایک ہی تھی کہ بدیسی سرکار کو نکال باہر کیا جائے۔

(۱۱)

جب جلوس وکٹوریا ٹرمینس کے پاس پہنچا تو کم سے کم ایک ہزار پولیس والوں نے اُسے آگے بڑھنے سے روک دیا۔ پولیس والے نیلی وردیاں پہنے ہوئے تھے اور اُن کے سروں پر چھوٹی چھوٹی پگڑیوں کی شکل کی ٹوپیاں تھیں جیسے کان میلیوں کی ہوتی ہیں۔ کچھ کے ہاتھوں میں لاٹھیاں تھیں اور کچھ کے رائفلیں، افسروں کے پاس

ریوالور تھے۔ بلبس نے انور کے کان میں بھاری آواز میں کہا "اب تماشا دیکھنا۔" انور کا دل دھک سے ہو گیا۔ وہ سوچنے لگا کہ اگر کہیں کچھ ہو گیا تو "وہ" تو آگے سب سے پہلی قطار میں ہے، پہلا وار اسی پر پڑے گا۔

ایک پولیس افسر سیدھا عورتوں کے پاس گیا اور اس نے ان سے کہا کہ جلوس غیر قانونی ہے اس لئے سب لوگ فوراً وہاں سے چلے جائیں۔ عورتوں نے اسے جواب دیا کہ وہ چوراہے کے اس پار آزاد میدان میں میٹنگ کرنے جا رہی ہیں اور کوئی بھی طاقت انہیں واپس نہیں لوٹا سکتی۔ افسر نے اپنی گھڑی دیکھ کر کہا کہ وہ انہیں پانچ منٹ کا وقت دے سکتا ہے اس کے جواب میں عورتیں سڑک پر دھرنا دے کر بیٹھ گئیں۔ کانگریس کے افسر اور جلوس کی رہنمائی کرنے والی عورتوں کے درمیان جن میں "وہ" بھی شامل تھی، کچھ صلاح مشورہ ہوا اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ صرف عورتیں ستیہ گرہ کریں گی اور باقی لوگ خاموشی کے ساتھ واپس چلے جائیں گے۔ صرف وہ دو لوگ جو جھنڈا لئے ہوئے تھے اور اکالی اور پٹھان والنٹیر باقی رہ گئے اور انہوں نے زمین پر بیٹھی ہوئی عورتوں کی حفاظت کرنے کے لئے ان کے چاروں طرف ایک گھیرا بنا لیا۔

یہ کوئی شام کے چار بجے کی بات ہو گی اور جب سورج ڈوبا اور سڑک کی بتیاں جلیں اس وقت بھی عورتیں وہیں بیٹھی تھیں۔ آس پاس کی چائے کی دکانوں کے مالک ستیہ گرہیوں کے لئے کیتلیوں میں بھر بھر کر چائے اور مٹھائی کے ڈبے بھیج رہے تھے انور کو یہ دیکھ کر ہنسی آ گئی کہ کچھ عورتوں نے گھر سے اپنے بچوں کو منگوا لیا اور وہ انہیں وہیں سڑک پر بیٹھ کر دودھ پلا رہی تھیں۔ لیکن پولیس افسروں کو اس میں خوش ہونے کی کوئی بات دکھائی نہیں دی کیونکہ انہیں ابھی تک کھانا نصیب نہیں ہوا تھا۔

جب وکٹوریا ٹرمینس کے ریلوے سٹیشن کے گھنٹہ گھر نے رات کے بارہ بجائے اُس وقت عورتیں بہت جوش کے ساتھ گانے گا رہی تھیں۔ "یہ لوگ آٹھ گھنٹے سے یہاں بیٹھے ہیں"۔ رابرٹ ملس نے کہا "میں سوچتا ہوں دنیا کو اس کی خبر کر دینی چاہیئے" اور وہ سڑک کی بتی کے نیچے بیٹھ کر پریس کا تار لکھنے لگا۔ انور نے اُس کے کندھے پر سے جھانک کر تار پڑھا اور اس کے پہلے ہی الفاظ پڑھ کر اس کے جذبات میں ایک طوفان سا اُٹھ کھڑا ہوا

"رات کے بارہ بجے بمبئی کی پانچ ہزار عورتیں پچھلے آٹھ گھنٹوں سے سڑک پر دھرنا دیئے بیٹھی ہیں۔ وہ نہ صرف ایک ہزار پولیس والوں کا مقابلہ کر رہی ہیں بلکہ ہندوستانی عوام کی طرف سے برٹش سامراج کی عدم تشدد مخالفت کی نشانی ہیں۔۔۔۔"

بمبئی میں صبح ہو رہی تھی لیکن وہ عورتیں اب بھی وہیں موجود تھیں۔ چودہ گھنٹے تک وہاں بیٹھے رہنے کے بعد بھی اُن کے چہروں پر نہ تھکاوٹ تھی اور نہ مایوسی۔ پولیس کے افسروں کی آنکھیں رات بھر نہ سونے کی وجہ سے لال ہو رہی تھیں اور وہ جھنجھلا رہے تھے۔ اُن میں سے ایک افسر نے ایک بار پھر اُن عورتوں کے پاس جا کر انہیں تاکید کی کہ وہاں سے ہٹ جائیں نہیں تو۔۔۔ عورتوں نے اس کے جواب میں ایک بغاوت بھرا گیت گانا شروع کر دیا

نہیں رکھنی، نہیں رکھنی

سرکار ظالم نہیں رکھنی!

صبح آٹھ بجے جب انور دوسرا تار دینے تار گھر گیا تو وہاں سے ایک تار بابا کی۔

جو پہلے تار کے جواب میں آیا تھا۔ اُس تار میں لکھا تھا۔

"مُبارک ہو! بمبئی کی عورتوں والی خبر نے سنسنی پیدا کردی ہے۔
سب اخباروں میں پہلے صفحے پر چھپی۔ اگر مظاہرہ جاری رہے تو دو دو
گھنٹے بعد تار بھیجنا۔"

ایک اینگلو انڈین سارجنٹ جو دیکھنے سے ہی جھنجھلایا ہوا معلوم ہوتا تھا، اُن کے پاس آکر زور سے بولا "تم لوگ یہاں کیا کر رہے ہو؟" جواب میں ملس نے اُسے نیویارک سے آیا ہوا وہ تار تھما دیا جسے دیکھ کر سارجنٹ کا مُنہ فوراً اُتر گیا۔ وہ اُن کے پاس سے چلا گیا اور جاکر سڑک پر جمع ہوتی ہوئی بھیڑ پر چلّانے لگا۔ وہ اُن پر چلّاتا، انہیں گالیاں دیتا اور ڈنڈے سے انہیں دھمکاتا، پر بھیڑ اُس کی اِن حرکتوں پر ہنس دیتی جس سے اُسے اور غصّہ آتا لیکن وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ملس نے تار پر لکھا "ڈیلیو، دنیا کی نظریں آپ پر لگی ہوئی ہیں"۔ اور ایک والنٹیر کے ہاتھ وہ تار سڑک پر بیٹھی ہوئی عورتوں کے پاس بھیج دیا۔ اُن دونوں نے دیکھا کہ آن کی آن میں خبر ساری عورتوں کے پاس پہنچ گئی اور اُن کے چہرے خوشی اور قوتِ ارادی سے چمک اُٹھے۔ انور نے کہا "اب اس کے سہارے وہ کم سے کم کچھ گھنٹے اور جمی رہیں گی"۔

لیکن اتنے میں پانی برسنا شروع ہو گیا ـــ مانسون کا پہلا چھینٹا اور ایسا لگا کہ پانی کا چھینٹا پڑتے ہی پولیس والوں کی پست ہمتی اور جھنجھلاہٹ دُور ہو گئی اور اُن میں نیا جوش آگیا۔ اپنی برساتیاں پہنے یا چھتریاں لگائے وہ عورتوں کو موسلا دھار بارش میں بھیگتا ہوا دیکھتے رہے۔ وہ اُمید لگائے ہوئے تھے کہ کسی بھی وقت عورتیں گھبرا کر وہاں سے بھاگ کھڑی ہوں گی۔ تھوڑی ہی دیر میں سڑک پر کئی کئی انچ پانی بھر گیا لیکن عورتیں

اُسی پانی میں بیٹھی رہیں۔ ساری عورتیں سر سے پاؤں تک بھیگ چکی تھیں اور اُن کی گیلی ساڑیاں بدن سے چپکی جارہی تھیں مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئیں۔ انور اِس بات پر بہت شرمندہ ہوا کہ ایسے وقت میں وہ اگلی قطار والی اُس لڑکی کے سڈول جسم کو اپنی ہوس بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

پانی پھوٹ پھوٹ کر برستا رہا یہاں تک کہ بادلوں کا سارا پانی ختم ہوگیا۔ اتنے عرصے میں پولیس والوں کی ہمت بھی ٹوٹ چکی تھی۔ موسلا دھار بارش کم ہوتی گئی۔ اب صرف پھوار پڑ رہی تھی اور جب شام کے چار بجے اور آسمان پر سے بادل چھٹ گئے اُس وقت بھی عورتیں سڑک پر بیٹھی تھیں۔ "چوبیس گھنٹے!" مِلس نے کہا "اِن لوگوں نے تو ریکارڈ توڑ دیا۔ میں جا کر ایک اور تار دے دوں' انور تم یہیں ٹھہرنا اور دیکھتے رہنا کہ کیا ہوتا ہے میں ایک گھنٹے میں واپس آتا ہوں۔"

جب ساڑھے چار بجے تو پولیس کے افسر قابو سے باہر ہو گئے۔ انھوں نے آخری بار وارننگ دی کہ اگر عورتیں پانچ منٹ کے اندر وہاں سے نہیں ہٹیں تو اُنہیں مجبور ہو کر لاٹھی چارج کرنا پڑے گا۔ سیٹیاں بجیں اور پولیس والے اپنی اپنی جگہوں پر لاٹھیاں سنبھال کر کھڑے ہو گئے۔ وہ سڑک پر لاٹھیاں پٹک پٹک کر دیکھ رہے تھے کہ وہ کتنی مضبوط ہیں۔ اکالی اور پٹھان والنٹیروں نے عورتوں کے چاروں طرف گھیرا بنا لیا۔ جھنڈا پکڑنے والوں نے پھر آگے بڑھ کر جھنڈا لہرا دیا جو بارش سے بچانے کے لئے لپیٹ لیا گیا تھا۔ پانچ منٹ گذرتے ہی "مہاتما گاندھی کی جے" کے گونجتے ہوئے نعرے نے خاموشی کو کانچ کی طرح توڑ دیا۔

اور پھر لاٹھیاں برسنے لگیں۔

انور نے لاٹھی چارجوں کے بارے میں سُنا اور پڑھا تھا لیکن اس کے لئے وہ دوسرے حادثوں کی طرح ہی ایک حادثہ تھے ـــــ انہیں وہ بُرا ضرور سمجھتا تھا لیکن اُن کے ساتھ اس کا کبھی کوئی براہ راست تعلق نہیں رہا تھا۔ لیکن اس وقت اس نے جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا اس کے بارے میں وہ یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اُس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ لاٹھی کا ہر وار کسی سر پر یا سینے پر یا پیٹھ پر یا ٹانگ پر پڑتا تھا اور یہ کوئی انسان ہوتا تھا۔ گوشت پوشت کے بدن والا انسان جس کی ہڈیاں ٹوٹ سکتی تھیں، جس کا خون بہہ سکتا تھا۔ اُن میں سے ہر ایک کسی کا بیٹا یا بھائی، کسی کا دوست یا ساتھی کسی کا شوہر یا عاشق تھا۔ لاٹھی کے ہر وار کے پیچھے ایک کہانی تھی ـــــ مصیبتیں جھیلنے اور بہادری کے ساتھ لڑنے کی کہانی۔ یہ والنٹیر ـــــ یہ اکالی اور پٹھان، گجراتی اور مراٹھے ـــــ آخر کس چیز کے بنے تھے کہ وہ بے رحمی سے چلائی جانے والی لاٹھیوں کی مار کھاتے رہتے تھے پر اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوتے تھے، وہ ذرا بھی نہیں ہچکتے تھے، وہ اپنا منہ بھی نہیں پھیرتے تھے؟ وہ سیدھے سادے معمولی لوگ تھے ـــــ کلرک، طالب علم، دکاندار اور مل مزدور ـــــ لیکن وہ ثابت کر رہے تھے کہ وہ بھی ہیرو بن سکتے ہیں۔ ....

بیسیوں زخمی اور بے ہوش ہو کر گر رہے تھے اور انہیں فوراً سٹریچروں پر اُٹھا کر پاس ہی کھڑی ایمبولنسوں پر پہنچا دیا جاتا تھا۔ یہ سچ مچ کی لڑائی تھی ـــــ لیکن عجیب لڑائی تھی جس میں مارنے کا سارا کام ایک طرف والے کرتے تھے اور دوسری طرف کے لوگ صبر کے ساتھ سب کچھ برداشت کرتے جاتے تھے۔ انور نے دیکھا کہ ایک تگڑے پٹھان

کے سینے پر لگاتار لاٹھیاں پڑ رہی تھیں اور ہر وار پڑتے ہی وہ زور سے نعرہ لگاتا تھا، یہاں تک کہ پولیس والے نے جھنجھلا کر اُس کی کھوپڑی پر وار کیا۔ پٹھان چکر کھا کر گر پڑا۔ اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا مگر اُس کے گرتے ہی اس کی جگہ ایک سکھ نے لے لی اور اس بار پولیس والے نے چھوٹتے ہی اس کے سر پر وار کیا۔ ایک گجراتی والنٹیر سٹریچر لیکر اُس کی طرف لپکا لیکن پولیس والے کے سر پر تو خون سوار تھا، اُس نے ایک لاٹھی اُس کے بھی رسید کر دی۔ کچھ دیر بعد جب دوسرے سٹریچر پر انہیں وہاں سے لے جایا گیا تو انور نے دیکھا کہ جہاں وہ تینوں گرے تھے وہاں خون کا ایک بہت بڑا دھبہ تھا...

والنٹیروں کی تعداد کم ہوتی گئی اور جو تھوڑے بہت بچ گئے تھے انہیں کبھی بھی مار گرایا جا سکتا تھا۔ ایسی حالت میں عورتوں نے آگے بڑھ کر اُن نوجوان لڑکوں کی حفاظت کرنے کے لئے اُن کے چاروں طرف گھیرا ڈال دیا۔ ادھیڑ عمر کی ایک گجراتی عورت خون دیکھ کر بالکل پاگل ہو اٹھی تھی اور وہ لگاتار چیخ چیخ کر یہی کہہ رہی تھی "مارو، اور مارو، مجھے مار ڈالو۔" ایک پل کے لئے تو پولیس والوں نے شرمندہ ہو کر اپنے ہاتھ روک لئے لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ عورتیں پکے ارادے کے ساتھ میدان کی طرف بڑھ رہی ہیں تو وہ اُن پر بے رحمی سے ٹوٹ پڑے۔ وہ عورت جو پہلے چلا رہی تھی اُس کی ٹانگ پر ایک لاٹھی پڑی اور وہ ٹرام کی پٹری پر گر پڑی لیکن وہ اب بھی یہی چلا رہی تھی "مارو، مار ڈالو مجھے"۔ اتنے میں کچھ زیادہ جوشیلی لڑکیاں اور وہ دونوں والنٹیر جو جھنڈا اٹھائے ہوئے تھا، پولیس کا گھیرا توڑ کر میدان میں جا پہنچے تھے۔ انور لپک کر وہاں پہنچا اور اس نے دیکھا کہ عورتیں جھنڈے کے چاروں طرف زمین پر بیٹھی تھیں اور وہ دبلی پتلی لڑکی اُن کے سامنے تقریر کر رہی تھی۔ اس وقت وہ پہلے سے بھی زیادہ بغاوت کے جذبے سے

بھرپور معلوم ہوتی تھی۔ تو انہوں نے آخر کار پولیس کو نیچا دکھا کر اپنی میٹنگ کر ہی لی تھی۔

یہ دیکھ کر پولیس پاگل ہو اُٹھی اور بھاگ کر وہاں جا پہنچی اور اُن دونوں والنٹیروں پر ٹوٹ پڑی جو جھنڈا لئے ہوئے تھے۔ وہ پٹھان اور اکالی بہادری سے اپنی جگہ پر ڈٹے رہے اور مضبوطی سے جھنڈا اونچا کئے رہے لیکن پولیس نے بھی بڑی چالاکی سے پہلے تو اُن کی ٹانگوں پر لاٹھیاں ماریں اور جب انہوں نے گر پڑنے کے بعد بھی جھنڈے کو نیچا نہ ہونے دیا تو پولیس والوں نے اُن کے ہاتھوں پر لاٹھیاں مارنی شروع کیں۔ اتنے میں ہڈی چٹخنے کی آواز آئی۔ لاٹھی نے کسی کی کلائی توڑ دی تھی۔ جھنڈا ڈگمگا کر زمین پر گرنے لگا۔ گورے سارجنٹ کے چہرے پر شیطانی مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

لیکن جھنڈے کو گرنے نہیں دیا گیا۔ جو لڑکی تقریر کر رہی تھی اُس نے لپک کر جھنڈے کو تھام لیا اور اُسے اتنی مضبوطی سے کس کر پکڑ لیا کہ اس کے چھوٹے چھوٹے نازک ہاتھوں کی اُنگلیوں کے جوڑ سفید پڑ گئے۔ وہ پولیس والوں کے سامنے سینہ تانے کھڑی تھی۔ یہ سب کچھ پلک مارتے میں ہو گیا۔ ایک سپاہی نے اپنی لاٹھی اٹھا کر ہوا میں ہی روک لی۔ ایک لڑکی پر وار کرنے کی اُسے ہمت نہیں ہوئی۔ ایک گورے سارجنٹ نے گرج کر کہا "جھنڈا چھوڑ دو" لیکن جب اُس کے جواب میں لڑکی نے "مہاتما گاندھی کی جے" کا نعرہ لگایا تو وہ سارجنٹ آپے سے باہر ہو گیا اور پولیس والے کی لاٹھی چھین کر اُس کی طرف جھپٹا۔ اس کا چہرہ غصّے کے مارے مسخ ہو گیا تھا۔ اُس پل میں انور کو کچھ ہو گیا۔ اُس نے اپنی فطری بزدلی، احساس میں اپنا عقیدہ اور اپنے آپ پر قابو سب کو اس طرح چھوڑ دیا جیسے سانپ اپنی کینچلی اُتار دیتا ہے۔ اُس کے دماغ پر بس ایک ہی خیال چھایا ہوا تھا ـــــ اُس لڑکی کو کوئی ہاتھ نہ لگانے پائے، کیوں کہ

اُس وقت اُسکی نظروں میں وہ صرف ایک لڑکی نہیں تھی بلکہ جھنڈے کی عزت تھی، ہندوستان کی روح تھی۔ اسکی آنکھوں کے آگے لال پیلے دھبے ناچنے لگے اور دیوانوں کی طرح وہ سارجنٹ پر ٹوٹ پڑا۔

اُس کی پیٹھ پر لاٹھی کا جو پہلا وار پڑا وہ سب سے خطرناک تھا۔ اُس کے سارے جسم میں درد کی لہریں دوڑ گئیں اور جب اُس کے کندھے پر دوسرا وار پڑا تو اُس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔ لیکن اُس نے اپنے دانت بھینچ کر آنسو روک لیئے "نہیں، ہرگز نہیں، میں اِن لوگوں کے سامنے اور اُس کے سامنے بزدلی کا ثبوت نہیں دوں گا۔ میں ان سارجنٹوں اور پولیس والوں کو اپنا مذاق نہیں اُڑانے دوں گا۔" اُس نے اپنے دانت ہونٹوں میں گڑ لیئے اور جب اُس کی پیٹھ پر ٹانگوں پر اور بانہوں پر لگاتار لاٹھیاں پڑنے لگیں تو اُسے خود اپنے خون کا مزا معلوم ہوا لیکن اُسے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ اُسے اب اتنا درد محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ یہ لوگ اگر مجھے مارتے مارتے اپنی لاٹھیاں بھی توڑ دیں تو میں پیچھے نہیں ہٹوں گا۔ مارنے دو، مارنے دو۔ اتنے میں اُس نے دیکھا کہ وہی سارجنٹ اُس کی طرف وہی لاٹھی لیئے ہوئے جھپٹا چلا آرہا ہے جس سے اُس نے اُس لڑکی کو مارنے کی کوشش کی تھی اور جیسے ہی لاٹھی ہوا میں گھومی اُسے ایک لڑکی کے چیخنے کی آواز سُنائی دی اور اُس نے جلدی سے سر گھما کر دیکھا تو اُسے لڑکی کی آنکھوں میں ایک خوف دکھائی دیا لیکن وہ ابھی ٹھیک سے دیکھ بھی نہ پایا تھا کہ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے زمین اُٹھ کر اُس کے ماتھے سے ٹکرائی اور اُس کی آنکھوں کے آگے ستارے ناچنے لگے اور پھر اُس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔

۱۸

جب شیر بھوکا ہوتا ہے

(۱)

ہلکے ہلکے درد کی بے ہوشی میں انور نے ادھ کھلی آنکھوں سے اُسے دیکھا۔ چار دن تک ہسپتال کے نظارے دیکھنے ہسپتال کی آوازیں سننے اور ہسپتال کی بدبوئیں سونگھنے کے بعد — وہی سفید دیواریں کبھی نہ ختم ہونے والی پلنگوں کی دوہری قطاریں، زخمی لوگوں کی آہیں اور کراہیں اور ہر طرف فینائل کی تیز بو — ان تمام چیزوں کے درمیان اُسے بس ایک نظر دیکھ لینا ہی انور کے لئے "ٹانک" ثابت ہوا۔

انور کو بے ہوشی کی حالت میں لوگوں نے سٹریچر پر کانگریس ہسپتال پہنچا دیا تھا۔ لاٹھی چارج کے بعد اُسے اسی میدان میں اسی حالت میں پڑا پایا گیا تھا۔ جب اُس کی بے ہوشی ٹوٹی اُس وقت تک اُس کے سر کے زخم میں ٹانکے لگ چکے تھے اور پٹی باندھی جا چکی تھی اور یہ سمجھنے میں اُسے کچھ دیر لگی کہ اُس کے سر میں جو سخت درد ہو رہا تھا اُس کا

پچھلی شام کے واقعات کے ساتھ بھی کچھ تعلق تھا۔ پھر بھی اُس کی سمجھ میں یہ نہیں آرہا تھا
کہ ہر بار جب وہ گہری سانس لیتا تھا تو اُس کے سینے میں درد کیوں ہوتا تھا۔ اُس نے
نوجوان کھدر پوش ڈاکٹر سے جب یہ بات کہی تو اُس نے یہ بتایا کہ شاید بے ہوش ہونے
کے بعد اُسے ایک لاٹھی اور جڑ دی گئی ہو۔ لیکن اس وقت اُسے آتا دیکھ کر اُس کا سارا
درد دُور ہو گیا۔

چوٹ کے درد سے زیادہ وہ اکیلے پن کا درد محسوس کر رہا تھا۔ کھچا کھچ بھرے
ہوئے ہسپتال کا وہ عجیب اکیلا پن تھا جہاں زیادہ تر بیمار یا تو بے ہوش تھے یا انہیں اتنی
سخت تکلیف تھی کہ وہ ایک دوسرے سے باتیں بھی نہیں کر سکتے تھے۔ جیسے ہی وہ چلنے
پھرنے اور باتیں کرنے کے لائق ہوتے تھے وہ "مورچے" پر سے زخمی ہو کر آنے والے دوسرے
لوگوں کے لئے جگہ خالی کر کے ہسپتال سے چلے جاتے تھے۔ لڑائی اب بھی پورے زور پر
جاری تھی۔ انور کے داہنی طرف والے پلنگ پر ایک بہت دُبلا پتلا گجراتی لڑکا تھا جس کا
رنگ بالکل پیلا پڑ چکا تھا۔ جب والنٹیر اُسے اٹھا کر لائے تھے اُس وقت تک اُس کے سر کی
چوٹ سے اتنا خون بہہ چکا تھا کہ ڈاکٹروں نے اس کے بچنے کی اُمید چھوڑ دی تھی۔ لیکن
قوتِ ارادی کا معجزہ سمجھئے کہ وہ بچ گیا حالانکہ اس کا چہرہ بالکل مُردوں جیسا ہو گیا تھا۔
اور ہسپتال آنے کے بعد سے اس نے ابھی تک آنکھ بھی نہیں کھولی تھی۔ انور کے
پلنگ کی دوسری طرف ایک لمبا تگڑا کالی داڑھی والا سکھ تھا اور اسے دیکھ کر انور کو ترجن
کی پھر یاد آئی جس پر لاہور میں مقدمہ چل رہا تھا۔ انور کا جی چاہتا تھا کہ وہ اس سے
باتیں کرے لیکن اُس سکھ کے جسم کے ہر حصے پر چوٹ لگی تھی اور اسے بہت تیز بخار تھا
اور وہ لگاتار بے ہوشی میں بڑبڑاتا رہتا تھا۔ وہ گالیاں دیتا تھا' نعرے لگاتا اور کبھی کبھی

پنجابی میں چلّانے لگتا اور انور اُس کی باتوں کا کچھ بھی مطلب سمجھ نہیں پاتا۔ "مارو' اور مارو' سُوّر دے پُتّر نوں"۔ وہ کبھی کبھی بڑبڑاتا اور کبھی کبھی چلّا پڑتا "سُوّرو' میں تمہارے سر توڑ دیتا لیکن میں مہاتما جی کو وچن دے چکا ہوں' میں وچن دے چکا ہوں کہ میں پلٹ کر نہیں ماروں گا' میں وچن دے چکا ہوں ۔۔۔" اُس کی آواز دھیرے دھیرے بالکل ڈوب جاتی اور انور اپنا درد بھول کر یہ سوچنے لگتا کہ سکھوں اور پٹھانوں جیسے جوشیلے اور لڑاکو لوگوں کے لئے یہ کتنا مشکل ہوتا ہوگا کہ مارتے مارتے اُن کی ہڈّی پسلی ایک کر دی جائے پھر بھی وہ اہنسا پر ڈٹے رہیں جب کہ خود اُس کے جیسا فطرتاً ڈرپوک آدمی بھی پلٹ کر مارنے سے باز نہیں رہ سکا تھا۔

ملاقات کے گھنٹوں میں رابرٹ ملس اُسے دیکھنے آیا تھا۔ بے چارہ انور کی وجہ سے بہت پریشان نظر آتا تھا۔ وہ یہ محسوس کرتا تھا کہ پولیس والوں نے انور کو جو چوٹ پہنچائی تھی اس کے لئے ذاتی طور پر وہ خود ذمہ دار ہے۔ وہ خبر لایا تھا کہ ولایتی کپڑے کے گودام پر دھرنا دینے کے لئے والنٹیروں کی ایک ٹولی کو لے جاتے ہوئے عثمان کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ اکیلے رہ جانے کی وجہ سے اب ملس کو اِس انوکھی لڑائی کے مختلف "مورچوں" کی خبریں جمع کرنے کے لئے زیادہ بھاگ دوڑ کرنی پڑتی تھی اور یہ لڑائی بھی روزانہ زور پکڑتی جا رہی تھی۔ انور ملس کے کام کی اہمیت سمجھتا تھا اور اِس لئے اُس نے منع کر دیا کہ وہ بار بار ہسپتال آنے کی فکر نہ کیا کرے۔

انور اسی طرح ہسپتال میں لیٹا لیٹا چھت کے ٹائل گنتا رہتا تھا یا کھڑکی میں سے سورج اور بادلوں کی آنکھ مچولی دیکھتا رہتا تھا۔ وہ بالکل اکیلا تھا اور رات کے وقت چوروں کی طرح سلمیٰ کی یاد اُس کے دل میں آتی تھی' اُسے تسلّی دینے کے لئے

نہیں بلکہ اُسے ستانے کے لئے۔ کبھی کبھی تو اُسے لگتا تھا کہ اُس کے دل کا خالی پن اُس کو سر کے زخم یا اس کے سینے کی چھپی ہوئی چوٹ سے بھی زیادہ تکلیف دہ تھا۔

اتنے میں وہ آئی۔ گہرے رنگ کی گوٹ لگی ہوئی کھدر کی سفید ساڑی اور ہرا بلاؤز پہنے ہوئے وہ پھول کی طرح کھِلی ہوئی تھی۔ انور کو دل ہی دل میں اُس آدمی سے حسد ہو رہا تھا جس سے ملنے وہ آئی تھی لیکن اُسے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ وہ اُسے ہی کھوج رہی تھی۔ انور کو یقین نہیں آیا۔

"ہیلو" اُس نے کھِلی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ انور کا استقبال کیا، جیسے وہ برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ "میں آپ کا شکریہ ادا کرنے آئی ہوں۔ آپ نہ ہوتے تو شاید میری جان نہ بچتی۔"

انور خوشی کے مارے بالکل دیوانہ ہو گیا۔ اُس نے دبی زبان میں کچھ اس طرح کی بات کہی کہ یہ تو اس کا فرض تھا۔

"اچھا، اب آپ کیسے ہیں؟ چوٹ تو بہت بُری آئی تھی لیکن اب تو آپ ٹھیک ہیں۔" اور یہ کہہ کر اُس نے اُس کے سر پر بندھی ہوئی پٹی پر اتنی نرمی سے پیار کے ساتھ ہاتھ پھیرا کہ انور کو نہ جانے کیوں درد کم معلوم ہونے لگا۔ وہ اُس کے پلنگ کی پٹی پر بیٹھ گئی، اور اس کے بالوں کی خوشبو انور کو مدہوش کرنے لگی۔

"کس بات پر مسکرا رہے ہیں آپ؟"

"کچھ نہیں، بس یوں ہی غالبؔ کا ایک شعر یاد آ گیا تھا۔" وہ اس کے سامنے وہ شعر پڑھنے میں ہچکچاہٹ محسوس کر رہا تھا۔

"غالبؔ؟"

"ہاں، ایک شاعر تھے جو مجھے بہت پسند ہیں۔"

"کیا کہا ہے انہوں نے؟"

اُس کے اِس بے باک دوستانہ رویّے کو دیکھ کر انور کی ساری ہچکچاہٹ دُور ہو گئی اور اس نے شعر پڑھ کر سُنایا۔

"اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے مُنہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھّا ہے"

اور پھر اس کا مطلب سمجھاتے ہوئے کہا "اس کا مطلب ہے کہ تمہیں دیکھ کر کوئی بھی بیمار اپنے آپ کو بھلا چنگا محسوس کرے گا۔"

انور کا خیال تھا کہ اِس طرح کھُلی تعریف پر وہ جھینپ جائے گی لیکن وہ ہنس دی۔

"مجھے اِس بات کی بڑی خوشی ہے کہ آپ ایسا سمجھتے ہیں۔" اُس نے کہا۔ "میں آپ کو اپنے گھر لے جانے کے لئے آئی تھی۔"

(۲)

انور اُس بڑی سی پیلی موٹر میں اس اجنبی لڑکی کی بغل میں بیٹھا اُسے دیکھ رہا تھا جس نے بنا کسی تکلّف کے اس سے دوستی کر لی تھی۔ لڑکی خود موٹر چلا رہی تھی جلوس میں تو وہ جھنڈے کی طرح ہی ایک نشانی تھی۔ اب جا کر انور نے پہلی بار اُسے ایک شخصیت کی حیثیت سے دیکھا تھا۔ اس کا قد چھوٹا اور جسم دُبلا پتلا تھا۔ اُس نے اپنے کالے چمکدار بالوں کو بیچ سے مانگ نکال کر پیچھے کس کر ایک جُوڑا باندھ رکھا تھا جس میں اس نے چنبیلی کے پھولوں کا گجرا لگا رکھا تھا۔ اُس کی ناک پر بچوّں کی طرح چتّیاں پڑی ہوئی تھیں اور جب بھی وہ مسکراتی تھی تو اس کے دونوں گالوں میں گڈھے بن جاتے تھے۔

بمبئی میں ہر آدمی کی طرح اُس کا رنگ بھی پیلا اور پھیکا تھا اور انور کو یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ وہ پوڈر، سُرخی یا لپ سٹک نہیں استعمال کرتی تھی۔ وہ کسی بھی اعتبار سے بہت خوبصورت نہیں تھی اور نہ ہی اس میں جنسی کشش تھی جیسے کہ سلمیٰ کا سارا جسم جنسی کشش رکھتا تھا۔ پھر بھی اس کے صاف ستھرے، دُبلے پتلے جوان جسم میں، اُس کی اُوپر کو اُٹھی ہوئی ناک میں، اُس کے بات کرنے کے خوش مزاج، بے جھجک اور سیدھے سادے ڈھنگ میں، اور جس خود اعتمادی کے ساتھ وہ موٹر چلا رہی تھی اُس میں کوئی بات ایسی ضرور تھی جس کی وجہ سے اس کی شخصیت دل کو ایک دم اپنی طرف کھینچ لیتی تھی۔

"آپ جانتی ہیں میں تو آپ کا نام بھی نہیں جانتا؟" انور نے کہا جب کہ وہ ایک ماہر ڈرائیور کی طرح اپنی کار کو کرافورڈ مارکیٹ کی بھیڑ میں سے نکال لے جا رہی تھی۔

"ہاں، میں جانتی ہوں" اُس نے جواب دیا اور اس کے گالوں میں گڑھے پڑ گئے۔ اُس کے چہرے پر شرارت بھری مسکراہٹ دوڑ گئی۔ "نام تو میں بھی نہیں جانتی آپ کا۔ چلئے دونوں برابر ہو گئے۔"

پھر مضبوطی سے سٹیرنگ وہیل سنبھال کر اُس نے مُڑ کر انور کی طرف دیکھا۔ موتیوں کی طرح چمکتے ہوئے چھوٹے چھوٹے دانتوں کی جھلک دکھاتے ہوئے بولی۔

"میرا نام آشا ہے، آشا شاہ، اور آپ کا؟"

"انور علی۔"

اس کا ہاتھ سٹیرنگ وہیل پر ذرا سا سرک گیا اور انور کو اس کی آواز میں تعجب کے ساتھ ہی کچھ مایوسی کا بھی احساس ہوا، جب اُس نے کہا "تو آپ مسلمان ہیں!"

اِس میں بُرا ماننے کی تو کوئی بات نہیں تھی پھر بھی انور نے کچھ چڑ کر کہا "جی ہاں،

میں مسلمان ہوں آپ کو کوئی اعتراض ہے؟"

ایک پل کے لئے وہ جھینپی پھر سنبھل کر موٹر چلانے لگی اور چہرا ہے پر بڑے اطمینان کے ساتھ موٹر گھماتے ہوئے اُس نے ہنس کر کہا "جی نہیں، مجھے کیوں اعتراض ہوگا؟ میرے کچھ بہت اچھے دوست مسلمان ہیں۔ مجھے کچھ تعجب ضرور ہوا کیونکہ دیکھنے میں آپ مسلمان لگتے نہیں۔"

انور کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کوئی تعریف کی بات ہے یا نہیں، اس لئے اُس نے بات چیت کا رُخ بدلتے ہوئے پوچھا "ہم لوگ کہاں جا رہے ہیں؟" کیوں کہ موٹر فورٹ کے علاقے میں بازار کی طرف جا رہی تھی۔

"پہلے تو میں آپ کو ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں گی۔" اس نے سیدھا سادہ جواب دیا۔ "کانگریس ہسپتال کے ڈاکٹر ابھی نئے نئے ہیں اور انہیں زیادہ تجربہ بھی نہیں ہے۔ پھر انہیں اتنے بہت سے لوگوں کی دیکھ بھال کرنی پڑتی ہے کہ وہ کسی کا خاص خیال نہیں رکھ سکتے۔ اُن لوگوں نے آپ کے زخم کو تو ٹھیک ٹھاک کر دیا ہے لیکن ہاؤس سرجن نے مجھے بتایا کہ اُسے آپ کے سینے کی چوٹ کے بارے میں اطمینان نہیں ہے، اس لیے اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں کسی سپیشلسٹ کو دکھاؤں۔"

وہ سپیشلسٹ ایک بہت ہی خوش مزاج بوڑھا پارسی ڈاکٹر تھا۔ انور نے دیکھا کہ وہ بھی کھدّر کے کپڑے پہنے تھا۔ ڈاکٹر نے انور کا سینہ اچھی طرح ٹھونک بجا کر دیکھا۔ پسلیوں پر آلہ رکھ کر بڑے غور سے اُس کے دل کی دھڑکن سُنی اور یکایک اس کے چہرے پر فکر کے آثار نمایاں ہوئے۔

"خاصی بُری طرح پٹائی ہوئی ہے تمہاری۔" ڈاکٹر نے جانچ کرنے کے بعد کہا "لیکن

پھر بھی تمہارے سینے کی جو بُری حالت ہے وہ پٹائی کی وجہ سے نہیں ہو سکتی۔" اور پھر اچانک اُس نے پوچھا "تمہارے باپ کو تو سینے یا پھیپھڑوں کی کوئی بیماری نہیں تھی۔ برانکائٹس، دمہ، نمونیہ، ٹی۔ بی وغیرہ؟"

جہاں تک انور کو یاد تھا اُس نے اپنی زندگی میں کبھی اپنے ابا کی کسی بیماری کا ذکر نہیں سُنا تھا۔ ساٹھ برس کی عمر میں بھی وہ سیدھے تن کر چلتے تھے اور اُن کے گالوں پر ابھی بھی لالی تھی جو اچھی تندرستی کی نشانی تھی اور اُن کا کہنا تھا کہ بچپن میں اچھا گھی کھانے اور خالص دُودھ پینے سے ہی اُن کی اتنی اچھی صحت تھی۔ انور نے ڈاکٹر صاحب کو اپنے ابا کی تندرستی کے بارے میں بتایا اور بوڑھے ڈاکٹر صاحب کو اِس بات پر سچ مچ بہت تعجب ہوا۔ پھر انہوں نے انور سے اُس کی ماں کے بارے میں پوچھا اور انور کو یہ بتانا پڑا کہ اُسے اپنی ماں کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں تھا کیونکہ وہ تو اُس کے پیدا ہوتے ہی مر گئی تھیں۔

"ممکن ہے اُن ہی کے خون کا اثر ہو" ڈاکٹر صاحب نے سوچتے ہوئے کہا۔ "حالانکہ عام طور پر یہ باپ کے ہی خون کا اثر ہوتا ہے۔۔۔" یہ کہہ کر وہ میز پر بیٹھ گئے اور انور کے لئے طاقت کی کچھ دوائیاں لکھنے لگے۔ "اِن سے تم ہفتے بھر میں ٹھیک ہو جاؤ گے۔ لیکن تمہیں بہت خیال رکھنا چاہیئے، تمہارا دِل اور سینہ بہت کمزور ہیں، سردی سے بچو اور اچھا اور طاقت دینے والا کھانا کھاؤ انڈے، دُودھ اور ہری سبزیاں۔ اور صبح اُٹھ کر روز کھلی ہوا میں گہری سانس لیا کرو۔ اچھا یہ تو بتاؤ کہ عام طور پر تمہارا علاج کون ڈاکٹر کرتا ہے؟ کیا تمہارے گھر کا کوئی بندھا ہوا ڈاکٹر ہے؟"

انور نے ڈاکٹر انصاری کا نام بتایا۔

"اوہ، انصاری! بہت ہی عمدہ ڈاکٹر ہیں اور آدمی بھی بہت اچھے ہیں، میرے

ساتھ ایڈنبرا میں پڑھتے تھے، اُن سے اچھا ڈاکٹر ملنا مشکل ہے لیکن جب تک وہ جیل میں ہیں تب تک اپنی صحت کا خیال رکھنا۔"

انور نے ہمّت کر کے یہ بھی بتایا کہ وہ خود بھی جیل جانا چاہتا ہے مگر ڈاکٹر اُسے اِس بات کی اجازت دینے کو بالکل تیار نہیں تھے۔ "بیکار کی باتیں نہ کرو۔" اُنھوں نے بگڑ کر کہا۔ "انصاری بھی تمھیں کبھی اِس بات کی اجازت نہیں دیتے۔" پھر وہ آشا سے مخاطب ہو کر بولے۔ "آشا، اپنے دوست کا خیال رکھنا اور اُسے کسی ہنگامے میں نہ پھنسنے دینا۔ اچھّا اب تم لوگ جاؤ۔ باہر بہت سے مریض انتظار کر رہے ہیں۔ اور اپنے پاپا اور ممّی سے میرا سلام کہنا نہ بھولنا، آشا۔"

"ڈاکٹر جمشید جی بہت ہی پیارے آدمی ہیں، ہے نا؟" آشا نے موٹر میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ہاں، ٹھیک ہی ہیں۔" انور نے کچھ چڑ کر کہا۔ "لیکن میں اِسے پسند نہیں کرتا کہ مجھے بیمار سمجھا جائے۔" پھر یکایک اُسے احساس ہوا کہ آشا نے اُسے اتنے بڑے ڈاکٹر کے پاس لے جا کر اُس پر جو احسان کیا تھا اس کا وہ شکریہ ادا نہیں کر رہا ہے۔ اِس لئے اُس نے کہا "میری بات کا بُرا نہ ماننا۔ جب سے ڈاکٹر انصاری نے مجھے جیل جانے سے منع کیا ہے تب سے مجھے ڈاکٹروں سے چڑ ہو گئی ہے۔"

(۳)

"میں اپنی ماں کو لے لوں، تمھیں کوئی جلدی تو نہیں ہے؟" آشا نے موٹر کو پیچھے کرتے ہوئے کہا۔ "جب سے اُنھوں نے سُنا ہے کہ تم نے کس طرح پولیس کی لاٹھیوں سے مجھے بچایا ہے اُس دن سے وہ تم سے ملنے کو بہت بے چین ہے۔ اصل میں اُس نے ہی مجھ سے کہا تھا کہ میں تمھیں گھر لے آؤں۔ تمھیں میری ماں بہت اچھی لگے گی۔"

انور نے حامی بھری۔

"ہاں، تمہیں میری ماں تو اچھی لگے گی لیکن شاید پاپا اچھے نہ لگیں۔" آشا کی آواز میں کچھ کھسیانا پن تھا۔

انور نے پوچھا کہ اُس کے پاپا میں ایسی کیا بات ہے کہ وہ اچھے نہ لگیں۔

"معلوم نہیں۔" آشا نے بھیڑ میں سے موٹر نکالتے ہوئے جواب دیا "کہہ نہیں سکتی۔ ایک بات تو یہ کہ وہ کانگریسی نہیں ہیں اور اِس تحریک سے خوش نہیں ہیں۔ دوسری بات یہ کہ وہ پونجی پتی ہیں اور میرا خیال ہے کہ تُم سرمایہ داری کو پسند نہیں کرتے، میں بھی نہیں کرتی۔ خیر چھوڑو، کچھ اور باتیں کریں۔ مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔"

انور نے کہا کہ وہ اپنے بارے میں زیادہ تو کیا بتا سکتا ہے، علاوہ اس کے کہ وہ علی گڈھ یونیورسٹی میں پڑھتا تھا اور اُسے ایک میٹنگ میں آزادی کی قسم پڑھ کر سُنانے کے جُرم میں یونیورسٹی سے نکال دیا گیا تھا۔ اور پھر کچھ دن بیمار رہنے کے بعد وہ امریکی جرنلسٹ رابرٹ ملس کے ترجمان کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ پھر انور نے آشا سے اُس کے بارے میں پوچھا۔ اُس نے بتایا کہ وہ بی۔اے۔ کے پہلے سال میں پڑھتی تھی۔ جب گاندھی جی نے آزادی کی تحریک کے لیئے سارے ملک کو للکارا تو وہ بھی پڑھائی چھوڑ کر والنٹیر بن گئی۔ "ہزاروں لڑکیاں والنٹیروں میں بھرتی ہوئی ہیں لیکن اُن میں سب سے بہادر صفیہ سوم جی ہے، جو آج کل جیل میں ہے۔ جیسا کہ تمہیں اس کے نام ہی سے پتہ چلتا ہوگا وہ مسلمان ہے۔ وہ میری بہت گہری دوست ہے۔" انور نے دیکھا کہ آشا نے آخری بات بہت زور دے کر کہی تھی۔

موٹر پھنڈی بازار کی مسلم بستی سے ہو کر بائیکلہ برج پار کر کے لال باغ کی طرف چلی

جا رہی تھی۔ اُن کے سامنے ملوں کی اُونچی اُونچی چمنیاں سر اُٹھائے کھڑی تھیں اور اُن سے دُھواں نکل کر آسمان پر پھیل رہا تھا۔ سڑک پہلے سے بہت خراب تھی۔ فٹ پاتھ بھی بہت میلے اور گندے تھے اور لوگ بھی میلے کچیلے دکھائی پڑتے تھے۔ وہ چھ سات منزلہ عمارتوں کے بیچ سے ہو کر گذر رہے تھے جن میں لوگ شہد کی مکھیوں کے چھتوں کی طرح چھوٹی چھوٹی کھولیوں میں رہتے تھے۔ ہوا میں پٹرول، چمنیوں کے دھوئیں، ناریل کے تیل، سڑتی ہوئی کھلی نالیوں اور پسینے کی ملی جلی بُو بسی ہوئی تھی۔ آشا نے اپنا سینٹ سے مہکتا ہوا رومال نکال کر ناک پر رکھ لیا۔ پھر موٹر بائیں طرف مُڑی اور ریل کا پُل پار کر کے ایک پتلی سی گلی میں گھُسی اور راستے کے بیچوں بیچ پڑے ہوئے کچرے کے ڈھیر کے پاس جا کر رک گئی۔ فٹ پاتھ پر جوہان کی پیک اور کیلے کے چھلکوں سے بے حد گندا تھا بہت سے بے گھر لوگ سو رہے تھے۔ یہاں کی عمارتیں تو بڑی سڑک پر بنی ہوئی چالوں کی طرح اُونچی بھی نہیں تھیں جن کے بیچ سے ہو کر وہ ابھی آئے تھے۔ دو منزلہ مکان جو پُرانے ہو کر بالکل گرنے ہی والے تھے اور جن پر بننے کے بعد سے کبھی رنگ و روغن نہیں ہوا تھا اس طرح ایک دوسرے سے لگے ہوئے تھے جیسے شرابی ایک دوسرے کا سہارا لئے کھڑے ہوں۔ اور ان مکانوں کے چاروں طرف غریبوں کے زیادہ غریب رشتہ داروں کی طرح ٹین کی چھتوں والی ٹوٹی پھوٹی جھونپڑیوں کا ایک جھرمٹ تھا جو لکڑی کے پُرانے صندوقوں کی لکڑی، ٹوٹے پھوٹے ٹین کے ٹکڑوں اور ٹاٹ کے چیتھڑوں سے بنائی گئی تھیں اُن میں ایک جھونپڑی ایسی بھی تھی جو ایک چھوٹے سے تنبو کی شکل کی تھی اور جس کی چھت کسی سنیما کے پُرانے بورڈ کے پُرانے کپڑے سے بنائی گئی تھی۔ کپڑے پر تصویر کے رنگ بہت کچھ دھوپ سے اُڑ گئے تھے۔ مگر اُس میں "مشہور دل کی رانی" کی شکل اب بھی صاف پہچانی جاتی تھی۔ بہت سے دُبلے پتلے، سوکھی ٹانگوں والے

ننگے بچے سڑک پر اور نالیوں میں کھیل رہے تھے اور سڑک کے نل کے پاس عورتوں کی بھیڑ جمع تھی کیونکہ اس پورے علاقے میں یہی ایک نل تھا اور اس میں بھی پانی بہت پتلی دھار سے آتا تھا۔

"یہ ہیں وہ گندی بستیاں جن پر ہمارے شہر کو اتنا ناز ہے۔" آشا نے انور کو چاروں طرف نظر ڈالتے ہوئے دیکھ کر بڑے طنز اور کڑواہٹ بھرے لہجے میں کہا۔

"ہاں لیکن ہم لوگ تو تمہاری ماں کو لینے جا رہے تھے؟"

"چلیں گے، لیکن میں نے تمہیں یہ دکھانے کے لئے ہی موٹر روکی تھی۔" یہ کہہ کر اس نے موٹر پھر اسٹارٹ کر دی اور انور کو یہ دیکھ کر بہت تعجب ہوا کہ اب موٹر پہلے سے بھی پتلی اور گندی گلی میں گھس رہی تھی جو ریل کی پٹری کے کنارے تاڑ کے پیڑوں کے جھرمٹ میں جا کر ختم ہو گئی تھی۔ اتنے میں اچانک بارش شروع ہو گئی اور انہیں موٹر کی کھڑکیوں کے شیشے چڑھا لینے پڑے۔ انور کی سمجھ میں اب بھی یہ نہیں آ رہا تھا کہ وہ آشا کی ماں کو لینے ایسی گندی جگہ کیوں آئے تھے اور اس نے یہ بات آشا سے کہہ بھی دی۔ جواب میں آشا نے صرف ایک جھونپڑی کی طرف اشارہ کیا جو پھوس کے چھپر والی دوسری جھونپڑیوں جیسی ہی لگتی تھی۔ انور کو بھیگے ہوئے شیشوں میں سے دھندلا دھندلا دکھائی دیا کہ اس جھونپڑی کے سامنے ایک بھیڑ جمع ہے۔ آشا نے بٹن دبایا اور سامنے کا شیشہ صاف کرنے والا وائپر چلنے لگا۔ اور انور نے دیکھا کہ وہ جھونپڑی اصل میں تاڑی کی دکان تھی اور اس کے سامنے موسلا دھار بارش میں ایک چھوٹے سے قد کی دبلی پتلی عورت سفید ساڑی پہنے کھڑی بھیگ رہی تھی اور وہ ہاتھ جوڑ کر اندر جانے والے گاہکوں سے جو دیکھنے میں ہٹے کٹے پہلوان لگتے تھے، منتیں کر رہی تھی کہ وہ دکان میں نہ جائیں۔

"تو یہ تمہاری ماں ہیں؟" انور یہ تو جانتا تھا کہ بڑے بڑے ہوٹلوں اور ولایتی شراب کی دکانوں کے سامنے عورتیں دھرنا دیتی تھیں لیکن اُس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ آشا کی ماں جیسی امیر گھرانے کی بوڑھی عورت شراب بندی کے بارے میں گاندھی جی کے پیغام کا پرچار کرنے کے لئے اتنی گندی بستی میں آنے کی ہمت کرے گی۔

نوجوان لڑکیاں شہر کے ایسے حصّوں میں آنے سے گھبراتی تھیں اِس لئے اِن گندی بستیوں میں دھرنا دینے کا کام میری ماں اور دوسری بوڑھی عورتوں نے سنبھال لیا۔ میری ماں ...."

باقی جملہ پاس سے گذرتی ہوئی بجلی کی ریل گاڑی کے شور میں ڈوب گیا۔

"کیا کہہ رہی تھیں تم؟" انور نے اونچی آواز میں پوچھا۔

ریل گاڑی کا شور ختم ہوگیا۔ "میں یہ کہہ رہی تھی کہ میری ماں ایک خاص وجہ سے شراب کی دکانوں پر ہی دھرنا دیتی ہیں۔ اب تم میرے پاپا سے ملو گے تو تمہیں اس کی وجہ سمجھ میں آجائے گی۔"

انور اپنے دماغ میں ایک تصویر بنانے لگا جس میں ایک باوفا بیوی اور اس کے شرابی شوہر کے درمیان ہر دم جھگڑا رہتا تھا اور اِس لئے وہ چپ ہوگیا۔ اتنے میں بارش اور تیز ہو گئی اور انور نے دیکھا کہ آشا کی بوڑھی ماں کی کھدّر کی ساڑی بالکل بھیگ چکی تھی۔ لیکن انہوں نے زیادہ تر گاہکوں کو شرمندہ کرکے اُن کے گھر واپس بھیج دیا تھا۔ صرف ایک تگڑا سا آدمی جو پہلے سے ہی نشے میں معلوم ہوتا تھا اور جس کے پیر لڑکھڑا رہے تھے، بڑی بے شرمی کے ساتھ اب تک وہاں ڈٹا رہا تھا۔

"تمہارے خیال میں کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ اب ہم لوگ انہیں وہاں سے لے آئیں؟"

بالکل بھیگ گئی ہیں۔ میرا تو خیال ہے کہ وہ آج کے لئے کافی لوگوں کو اس پاپ کے گڈھے میں گرنے سے بچا چکی ہیں۔"

آشا نے اپنی گھڑی دیکھی "پانچ منٹ بعد دکان بند ہو جائے گی۔ بارش تو کیا اگر برف بھی گرنے لگے تو بھی وہ دکان بند ہونے سے پہلے وہاں سے نہیں ہٹیں گی۔ میں نے تو ان سے اس معاملے میں بحث کرنا ہی چھوڑ دیا ہے۔"

آخرکار تاڑی کی دکان بند ہونے کا وقت آگیا اور انور نے یہ انہونی بات دیکھی کہ تاڑی بیچنے والے نے اس عورت کو ہاتھ جوڑ کر نمسکار کیا جو اس کے دھندے کے خلاف لوگوں میں پرچار کر رہی تھی اور اس کے گاہکوں کو دکان میں آنے سے روک رہی تھی۔

"ماننا پڑتا ہے کہ یہ انوکھی شرافت ہے"۔ انور نے کہا۔

"نہیں، یہ ایک انوکھا ملک ہے"۔ آشا نے انور کی بات کو ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔

وہ بوڑھی عورت چل کر موٹر تک آئی اور جب انور اس کا استقبال کرنے کے لئے گھبرا کر موٹر سے نیچے اترا تو اس نے انور سے متعارف ہونے کا انتظار کئے بغیر ہی اسے بڑے پیار سے ڈانٹتے ہوئے کہا "تو کیوں بھیگتا ہے بیٹا؟ بیٹھ اندر"۔ وہ گجراتی لہجے میں ہندوستانی بولتی تھی مگر اس کی آواز میں نرمی اور مٹھاس تھی۔

انور اس بوڑھی عورت کے ساتھ پیچھے کی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ وہ ایک سوکھے تولئے سے اپنے بھیگے ہوئے ہاتھ اور منہ پونچھنے لگی اور انور اسے غور سے دیکھنے لگا۔ اس نے سوچا پچاس سے اوپر ہوگی لیکن اس کے چہرے پر جھرّیوں کا کہیں نام بھی نہیں تھا۔ بالوں میں ایک بیتی چاندی کی طرح چمکتے ہوئے سفید بالوں کی تھی اور چھوٹی چھوٹی چمکدار آنکھوں کے چاروں طرف گہرے گڈھے پڑ گئے تھے لیکن اس کی ناک بھی مینٹ کی طرح ہی ذرا سی اوپر کو اٹھی ہوئی

تھی اور یہ بھی صاف ظاہر تھا کہ ہنستے وقت آشا کے گالوں میں جو گڈھے پڑتے تھے وہ بھی اُسے اپنی ماں سے ہی ملے تھے۔

جب اُس نے "میری بیٹی کی جان بچانے" کے لئے انور کا بار بار شکریہ ادا کیا تو انور کچھ کھسیا سا گیا کیونکہ وہ بڑی تفصیل کے ساتھ اِس بات کا ذکر کر رہی تھی کہ بغیر سوچے سمجھے پولیس سارجنٹ پر ٹوٹ پڑنے میں اُس نے غیر معمولی بہادری کا ثبوت دیا تھا۔ اِس لئے جب اُس نے بات چیت کا رُخ بدلتے ہوئے پوچھا "بیٹا، تمہارا نام کیا ہے؟" تو انور کو بہت خوشی ہوئی۔

انور نے اپنا نام بتایا اور اُسے یہ دیکھ کر بہت اطمینان ہوا کہ یہ جان کر کہ وہ مسلمان ہے اُس نے کوئی حیرت کا اظہار نہیں کیا۔

"جگ جگ جیو بیٹا" اُس نے دعائیں دیتے ہوئے کہا۔

بیٹا! انور کو اس رحمدل بوڑھی عورت کے مُنہ سے یہ لفظ بہت ہی میٹھا لگا، اور اپنی عمر میں پہلی بار انور کو اپنے دل میں چھپی ہوئی ایک پیاس کا احساس ہوا — اپنی ماں کی ممتا جسے اُس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

(۴)

کوئی ہفتے بھر بعد ایک دن صبح جب انور کی آنکھ کھلی تو اُس نے دیکھا کہ اُس کے کمرے کی کھڑکی کے باہر چڑیوں کا ایک جھنڈ شور مچا رہا ہے، انور کو ایسا لگا جیسے وہ بہت لمبا سہانا سپنا دیکھ کر اٹھا ہو۔ اُس نے محسوس کیا کہ سپرنگ دار پلنگ اس کے جسم کے بوجھ سے لچک رہا تھا۔ اُس نے دیوار کے پاس رکھی ہوئی بیش قیمت سنگھار میز دیکھی۔ باغ کے پھولوں کی مست خوشبو آرہی تھی۔ اُسے یہ سمجھنے میں کچھ دیر لگی کہ وہ سیٹھ مانک لال جی کی مالا بار ہِل کی کوٹھی میں مہمان ہے۔ وہ کم گو سیٹھ جی سے ایک بار ملا تھا جن کا گنجا سر بالکل

ابلے ہوئے انڈے کی طرح چکنا تھا اور اُس نے دیکھا تھا کہ اُن کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں
چالاکی اور دولت کے لالچ کی چمک تھی لیکن اُن کے چاروں طرف گہرے رنگ کے گھیرے
بھی پڑے ہوئے تھے۔ سارا دن وہ دلال اسٹریٹ کے اپنے دفتر میں، سٹہ بازار میں شیئر خریدنے
اور بیچنے میں یا بریلی میں اپنی کسی مِل کا معائنہ کرنے میں گزار دیتے تھے۔ اور رات کو تاج میں یا
جُوہو کے اپنے اُس بنگلے میں شراب پیتے رہتے تھے جو خاص طور پر اسی کام کے لئے رکھا گیا تھا۔
لوگ دبی زبان میں یہ بھی کہتے تھے کہ سیٹھ جی نے وہاں کوئی رکھیل رکھ چھوڑی تھی، جو جُوہو
کے بنگلے میں جوئے اور شراب کی محفل جمتی تھی اور سیٹھ جی کی تفریح کے لئے کرائے پر ناچنے
والیاں لائی جاتی تھیں۔ سیٹھ جی شاید ہی کبھی دو بجے رات سے پہلے گھر لوٹتے تھے اور اُن
کی بیوی بیمار ہونے پر بھی کبھی اُن کے لوٹنے سے پہلے سوتی نہیں تھی۔ پھر بھی سیٹھ جی نہ جانے کیوں
اپنی دُبلی پتلی چھوٹی سی بیوی سے ڈرتے تھے۔ انور نے کبھی بھی انہیں گھر پر اونچی آواز
میں بولتے یا اپنی بیوی کی بات کو کاٹتے ہوئے نہیں سُنا تھا۔

اُن سے انور کی صرف ایک بار ملاقات ہوئی تھی اور وہ انور کے ساتھ بہت ہی شرافت
کے ساتھ پیش آئے تھے۔ لیکن جس ڈھنگ سے انہوں نے بات کی تھی اُس سے انور کو ایسا
لگا تھا کہ وہ اپنے آپ کو اُونچا اور انور کو نیچا سمجھتے ہیں۔ خاص طور پر جس دریا دلی کے ساتھ
انہوں نے انور کو "جب تک جی چاہے" رہنے کی دعوت دی تھی اُس میں زور اس بات پر
تھا کہ وہ اپنی بیوی اور بیٹی کی اس طرح کی ہر سنک کو پورا کرنے کا خرچ برداشت کر سکتے ہیں
آشا نے اُسے پہلے ہی سے اپنے پاپا کے بارے میں بتا دیا تھا پھر بھی انور کا دل کسی طرح اِس
بات کو ماننے کو تیار نہیں ہوتا تھا کہ ایسا آدمی آشا جیسی لڑکی کا باپ اور مالتی جی جیسی
عورت کا شوہر ہو سکتا ہے۔

اُس خاندان میں بس ایک آدمی اور تھا، آشا کا بڑا بھائی موہن۔ موہن وہی کھدّر پوش نوجوان نکلا جسے انور نے آج میں کھانا کھانے کے بعد کانگریس کا غیر قانونی بلیٹن بانٹتے دیکھا تھا۔ انور یہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ موہن اُسے اچھا لگتا ہے یا نہیں۔ موہن کچھ تھا ہی ایسا۔ وہ ابھی کچھ سال تک پیرس میں رہنے کے بعد واپس لوٹا تھا۔ وہاں اُس نے لمبے لمبے بال بڑھا لئے تھے اور آرٹ سیکھنے کے بہانے وہ بالکل لاابالی پن کی بوہیمین زندگی گذار رہا تھا۔ ہندوستان لوٹنے کے بعد سے اُس نے کھدّر پہننا شروع کر دیا تھا۔ اور اُس کا یہ انقلابی چولا بھی اُتنا ہی بناوٹی تھا جتنا کہ اُس کا پہلے والا فن کاروں کا بھیس۔ اُس میں بھولے پن اور دکھاوے کی اکڑ کی ایک عجیب آمیزش تھی۔ اُس میں دکھاوا ضرور تھا، لیکن ایسا بھی نہیں تھا کہ اُس کے دل میں بالکل ہی لگن نہ رہی ہو۔ وہ ایک کھدّر پوش شوقین نوجوان تھا، وہ ایسا وطن پرست تھا جو خوشی خوشی پھانسی پر چڑھ جاتا لیکن اِس شرط پر کہ شہید ہوتے وقت اُس کی تصویریں کھینچنے کے لئے اخباروں کے فوٹوگرافر وہاں موجود ہوں۔ وہ انور پر بہت رُعب جھاڑتا تھا، لیکن اُسے نیچا دکھانے کے لئے نہیں بلکہ ایک بڑے بھائی کی طرح۔ وہ انور کو ہمیشہ "مائی بوائے" کہتا تھا۔ جب بھی دونوں اکیلے ہوتے وہ انور سے کہتا "مائی ڈیئر بوائے! تُم نے زندگی نہیں دیکھی ہے۔ جب تک آدمی کم سے کم سال بھر تک پیرس کی رنگینی نہ دیکھے تب تک اُس نے زندگی میں کچھ نہیں دیکھا۔" لیکن دوسرے ہی لمحے وہ غیر قانونی پرچے چھاپنے اور بانٹنے کے بارے میں اپنی کسی انوکھی تجویز پر بحث کرنے لگتا تھا۔

بستر پر لیٹے لیٹے انور اُن عجیب حالات پر غور کر رہا تھا جنہوں نے اُسے اِس گھر میں پہنچا دیا تھا۔ اتنے میں اُسے ماں جی کی آواز سُنائی دی۔ "اٹھ گئے بیٹا؟ چائے بھیج دوں نا؟"

"ہاں ماں جی، میں بالکل تیار ہوں۔" انور نے چادر اتار پھینکی اور پھرتی سے اُٹھ کر کھڑکی کے پاس جاکر بوڑھے ڈاکٹر جمشید جی کی نصیحت کے مطابق کھلی ہوا میں گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ اُس کے سینے کا درد تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ ماتھے کا زخم بھی بھر گیا تھا صرف ایک نشان باقی رہ گیا تھا۔ انور کے جسم میں نئی پھرتی آگئی تھی، اُس کے دل میں نئی اُمنگ تھی۔

چائے آئی تو اُس کے ساتھ آشا اور سوہن بھی آئے۔ آشا لڑکوں جیسا پاجامہ پہنے تھی اور اُس کے کھلے بال اُس کے کندھوں پر بکھرے تھے اُسے دیکھ کر انور کو ہنسی آرہی تھی مگر ساتھ ہی وہ اچھی بھی بہت لگ رہی تھی۔ سوہن کا لباس اُس کی فطرت کی طرح ہی آدھا تیتر اور آدھا بٹیر تھا۔ وہ کھادی کے سلیپنگ سوٹ پر چینی سلک کا ڈریسنگ گاؤن پہنے تھا اور منہ کے ایک کونے میں وہ لمبا سا سگریٹ ہولڈر دبائے تھا۔

"انور، ہم لوگ تم سے ایک کام کروانا چاہتے ہیں، کیا تمہاری طبیعت اب اتنی ٹھیک ہے کہ تم باہر جا سکو؟" آشا نے بڑی بے چینی سے پوچھا۔

"جائے گا کیوں نہیں اب یہ بالکل بھلا چنگا ہو گیا ہے۔" سوہن نے آشا کو ڈانٹتے ہوئے کہا "تم نے بھی اسے بالکل بچہ بنا رکھا ہے۔"

"بچہ تو نہیں ہے، لیکن بیمار تو تھا۔ جانتے ہو ڈاکٹر جمشید جی نے ....."

"چھوڑو اُس بڈھے اناڑی ڈاکٹر کی باتیں۔ اُس کی باتوں کی چکر میں جو پڑ جائے اُسے عمر بھر بیساکھیوں کا سہارا لے کر ہی چلنا پڑے۔"

انور بھائی بہن کے ہر وقت کے اِن جھگڑوں کا عادی ہو چکا تھا لیکن چونکہ یہ جھگڑا اُس کے بارے میں ہو رہا تھا اِس لئے اُسے بیچ میں بولنا پڑا "اچھا، تم دونوں اپنا جھگڑا بند کر کے کچھ یہ بھی بتاؤ گے کہ آخر کام کیا ہے؟"

"انور، بائی لوائے ....." موہن موقع کی اہمیت کو دیکھ کر کچھ سوچنے لگا۔

"ذرا ٹھہرو" آشا نے گھبرا کر اونچی آواز میں کہا۔ "پہلے میں دروازہ بند کر لوں، کہیں کوئی ہماری باتیں سُن نہ لے۔"

انور اِس ساری کارروائی کے جاسوسی ماحول کو دیکھ کر بہت حیران رہ گیا۔

"بات یہ ہے کہ کام بہت ہی ضروری ہے" موہن نے دوبارہ کہنا شروع کیا لیکن اُس کی بے قرار بہن نے اُسے پھر روک دیا۔

"بھیّا، تُم سارا کھیل بگاڑ دوگے، میں بتاؤں گی۔"

آخر کار انور کو ساری بات کا پتہ چل گیا اور اُسے یہ جان کر کچھ تعجب ہوا کہ بات سچ مچ کچھ سنجیدہ تھی۔ اُن لوگوں کو کسی خفیہ ذریعے سے پتہ چلا تھا کہ گاندھی جی اُسی رات کو دھرسانا میں گرفتار کر کے پونا کے پاس یروداجیل میں لیجائے جانے والے تھے۔

"ہم لوگ چاہتے یہ ہیں کہ تُم جا کر گاندھی جی سے ملو" موہن نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا "ہم سب لوگوں پر پولیس کی نظر ہے اِس لئے اگر ہم میں سے کوئی بمبئی سے باہر جائے گا تو پولیس کو شک ہوگا۔ لیکن تُم آسانی سے جا سکتے ہو کیونکہ یہاں کی سی۔ آئی۔ ڈی ابھی تمہیں جانتی نہیں ہے۔"

"انور" آشا نے بڑی عاجزی سے کہا "تُم مہاتما گاندھی کا پیغام لے آؤ، پھر ہم اُسے اپنے بلیٹنوں میں چھاپیں گے اور اپنے کانگریس ریڈیو پر پڑھ کر سنائیں گے۔ سنسنی پھیل جائے گی، بہت بڑا "سکوپ" (Scoop) رہے گا۔"

انور نے انہیں یقین دلایا کہ وہ یہ کام بڑی خوشی سے کرے گا لیکن سوال یہ تھا کہ رات سے پہلے وہ دھرسانا پہنچے گا کیسے؟

"وہ سب انتظام ہم لوگ کر دیں گے ماں جو! لیکن گاندھی جی کا انٹرویو تم اُن کے گرفتار ہونے کے بعد ہی لینا، یہ اصلی بات ہے" انور، "بس تُم ہمارا اتنا کام کر دو پھر تم جو کہو گے وہ میں کروں گا۔"

"کرو گے؟" انور نے پوچھا۔

"ہاں ضرور کروں گا۔" موہن نے اُسے یقین دلایا۔

"اچھّا تو مجھے مائی لوا ئے نہ کہا کرو۔"

"مان لیا مائی لوائے۔"

اِس پر سب لوگ ہنس پڑے اور موہن داڑھی بنانے چلا گیا اور آشا انہیں دروازے پر سے پیچھے مُڑ کر دیکھا اور بولی "میں تو کانگریس ہاؤس جا رہی ہوں اور شاید تمہارے جانے سے پہلے پھر تُم سے ملاقات نہ ہو سکے، کام پُورا کر کے آنا۔"

تو آخر کار سرکار نے گاندھی جی کو گرفتار کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا، انور نے اُٹھتے ہوئے سوچا۔ اس کا مطلب تھا کہ اب کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔ جب سرکار عوام کے عظیم لیڈر کو گرفتار کر لے گی تو عوام اور بھی مضبوط ارادے کے ساتھ اپنے مقصد کی طرف، اپنے نعروں اور اپنے خوابوں کے انقلاب کی طرف بڑھیں گے۔

وہ بہت ہی تاریخی دن ہونے والا تھا، اس لئے انور نے کیلنڈر پر نظر ڈالی۔ چار ستمبر انیس سو اکتیس، ہفتے کا دن تھا۔

(۵)

انور کا کام اُس سے کہیں مشکل ثابت ہوا جتنا کہ اُس نے سمجھا تھا۔ اُس نے موہن اور آشا سے یہ بات منوالی تھی کہ وہ رابرٹ ملس کو بھی اس تجویز میں شامل کرے گا کیونکہ

بہرحال وہ اب بھی ملس ہی کے ساتھ کام کر رہا تھا۔ ملس یہ خبر سُن کر بے حد خوش ہوا اور اس نے انور کو اس 'سکوپ' کے لئے پہلے ہی سے مبارکباد دی جس کے لئے وہ ابھی پروگرام ہی بنا رہے تھے۔ اُسے اپنی کامیابی پر اتنا بھروسہ تھا کہ اس نے اپنے نیو یارک کے دفتر کو ایک اہم 'سٹوری' کا انتظار کرنے کے لئے تار بھی بھیج دیا۔ شام کے وقت وہ سیٹھ مانک لال کی موٹر میں بیٹھ کر سورت کے لئے روانہ ہوئے۔ راستے میں کھانے کے لئے انہوں نے اپنے ساتھ کچھ سینڈوچ رکھ لئے تھے۔ تقریباً دو ہفتے تک پلنگ پر پڑے رہنے کے بعد انور کے لئے یہ بہت ہی خوشگوار تجربہ تھا اور اُسے کچھ کچھ اِس بات کا بھی احساس تھا کہ وہ تاریخ کی تعمیر میں حصہ لے رہا ہے۔

گاڑی آدھی رات کے بعد آئی لیکن اُسے وقت سے زیادہ دیر تک روک رکھا گیا۔ ایک بجے تک تمام خوانچے والوں کو اور اُن تمام لوگوں کو جن کے پاس اُس گاڑی کے ٹکٹ نہیں تھے، پلیٹ فارم سے ہٹا دیا گیا۔ اتنے میں گارڈ نے سیٹی بجائی اور لوگ بھاگ کر اپنے اپنے ڈبوں میں پہنچ گئے۔ لیکن ایک پل تک ہچکچانے کے بعد جیسے ہی انور اور ملس لپک کر ایک ڈبے میں چڑھے ویسے ہی گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ رُکی اور ساتھ ہی سفید کپڑوں میں گاندھی جی کا خاکہ نظر آیا۔ اُن کے ساتھ پولیس افسروں کی ایک ٹولی تھی۔ دوسرے ہی پل گاڑی پھر سے چل دی.....

اِس طرح انور کو معلوم ہو گیا کہ وہ اُس گاڑی پر سفر کر رہا ہے جس پر گاندھی جی کو جیل لے جایا جا رہا ہے۔ اب سوال یہ تھا کہ اُن سے ملاقات کیسے کی جائے۔ جب گاڑی اگلے اسٹیشن پر رُکی تو وہ دونوں یہ پتہ لگانے کے لئے اترے کہ قیدی کو کس ڈبے میں بٹھایا گیا تھا۔ پلیٹ فارم پر مٹی کے تیل کے کچھ لیمپوں سے جو دُھندلی دُھندلی روشنی

ہو رہی تھی اُس میں اُنہوں نے کچھ ہتھیار بند پولیس والوں کو ڈائننگ کار کے سامنے ٹہلتے دیکھا۔ "یہی ہے!" ملس نے چپکے سے کہا۔ "اسی ڈبے میں ہیں اور کہیں ہو ہی نہیں سکتے۔" اب سوال اُن تک پہنچنے کا تھا۔ گاڑی بہت سویرے ہی بمبئی پہنچ جانے والی تھی اور یہ یقین تھا کہ بمبئی سے پہلے ہی اُنہیں کسی جگہ اُتار لیا جائے گا۔ ملس نے آنکھ میں دھول جھونک کر ڈبے میں گھس جانے کا فیصلہ کیا اور ڈبے کے سامنے ٹہلتے ہوئے پولیس والوں کی ذرا بھی پروا کئے بغیر وہ ڈائننگ کار کے دروازے کے پاس گیا اور بالکل پکے صاحبوں کی طرح "بوائے! بوائے!" پکارنے لگا۔

"کیا چاہیئے صاب؟" ایک پولیس والے نے اس کا راستہ روک کر کافی جھڑک کر پوچھا۔

انور وہاں سے کچھ دُور پر کھڑا ملس کی حاضر جوابی پر من ہی من میں مُسکرا رہا تھا۔ "وِسکی سوڈا مانگتا۔۔۔ جلدی، سمجھا؟" اور یہ کہہ کر ملس نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی لیکن وہ اندر سے بند تھا۔

"نہیں صاحب، ڈائننگ کار بند ہو چکا ہے اب وِسکی سوڈا کا ٹائم نہیں ہے۔" پولیس والے نے بھی صاف صاف بتا دیا کہ ملس کی تکڑم نہیں چلے گی اور اس لئے امریکی اخبار نویس کو اُلٹے پاؤں واپس آنا پڑا۔

گارڈ نے سیٹی دی اور اُنہیں بھاگ کر اپنا ڈبہ پکڑنا پڑا لیکن جب گاڑی چل پڑی تو انور نے اتنا ضرور دیکھ لیا کہ ڈائننگ کار کا دروازہ کھلا اور پولیس والے چلتی گاڑی میں لپک کر چڑھ گئے۔

اگلے سٹیشن پر ہی اُن کے لئے آخری موقع تھا کیونکہ اس کے بعد گاڑی دادر پر ہی

کھڑی ہونے والی تھی اور نہیں پورا یقین تھا کہ گاڑی اس سے کچھ میل پہلے ہی روک دی جائیگی اور گاندھی جی کو چپ چاپ وہاں سے موٹر میں بٹھا کر لے جایا جائے گا۔ اس لئے انور نے ملس کو منع کر دیا کہ اگلے سٹیشن پر نہ اُترے نہیں تو پولیس والوں کو شک ہو جائے گا۔ اس بار اُس نے خود قسمت آزمانے کا فیصلہ کیا تھا۔

جب گاڑی چھوٹے سے سنسان سٹیشن پر رُکی تو انور ایک تھرماس لے کر نیچے اُترا اور پینے کا پانی ڈھونڈنے لگا۔ اس نے سٹیشن پر پانی کا کوئی انتظام نہ ہونے کے بارے میں قلی، ٹکٹ کلکٹر اور سٹیشن ماسٹر سب سے بحث کی۔ وہ پولیس والے کی طرف توجہ دیئے بغیر ڈائننگ کار سے آگے نکل گیا لیکن جاتے جاتے اُس نے کھڑکی کے کانچ پر گاندھی جی کے جانے پہچانے چہرے کا عکس دیکھا۔ مشرق کی طرف آسمان پر پو پھوٹ رہی تھی۔ جب گارڈ نے سیٹی دی اور گاڑی چلنے لگی اُس وقت وہ انجن کے پاس تھا۔ وہ گھبرایا ہوا پیچھے اپنے ڈبے کی طرف بھاگا لیکن گاڑی کی رفتار کافی تیز ہو چکی تھی اور اگر اس گڑبڑ میں اس نے پولیس والوں کے گھس جانے کے بعد ڈائننگ کار کا ہینڈل پکڑ لیا تو اس میں اُس کا کیا قصور تھا؟ اس سے پہلے کہ پولیس والے سمجھ پاتے کہ کیا ہو رہا ہے وہ اندر پہنچ چکا تھا اور اُس عظیم قیدی کے سامنے کھڑا تھا۔

گاندھی جی نے اُسے پہچان کر مسکرا دیا۔ "چلتی گاڑی میں چڑھ کر اپنی جان خطرے میں ڈالنا اچھی بات نہیں ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔" انور نے اپنی نوٹ بک اور پنسل نکالتے ہوئے جواب دیا۔ "لیکن آپ سے ملنا ضروری تھا۔ آپ اپنی گرفتاری کے بعد عوام سے کیا کرنے کی اُمید رکھتے ہیں؟"

"ظاہر ہے میں یہی اُمید کرتا ہوں کہ وہ تحریک چلاتے رہیں۔" وہ دھیرے دھیرے

بول رہے تھے جیسے ہر لفظ کو کہنے سے پہلے تول رہے ہوں۔ "قربانی کے بغیر جو سوراج ملتا ہے وہ کبھی قائم نہیں رہتا۔ اِس لئے لوگوں کو بڑی قربانی دینی ہوگی۔ اصلی قربانی میں ساری تکلیفیں ایک طرف والوں کو برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ دوسرے کی جان لئے بغیر خود اپنی جان دینی پڑتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ہندوستان اِس اصول پر چل سکے۔ اِس وقت ہندوستان کی عزت اور ہر چیز "مٹھی بھر نمک" میں چھپی ہوئی ہے۔ یہ مٹھی توڑ کھلے ہی دی جائے لیکن کھلنے نہ پائے۔"

گاڑی دھیمی ہو چلی تھی اور وہ بمبئی کے پاس پہنچ چکے تھے۔ انور گاندھی جی سے کوئی قطعی اور ٹھوس پیغام چاہتا تھا۔ اِس لئے اُس نے پوچھا۔ "کیا ستیہ گرہ کی حد نمک قانون توڑنے تک ہی رہنی چاہیے یا لوگوں کو اس کے علاوہ بھی کوئی قدم اٹھانا چاہیے؟"

انور کو اپنے سوال کا جو جواب ملا اُس سے اُس کے دل میں جذبات کی ایک لہر سی اٹھی۔ وہ اہنسا کی سینا کے لیڈر سے باتیں کر رہا تھا جو لڑائی جاری رکھنے کے بارے میں حکم دے رہے تھے۔ "سمندر کے کنارے سے نمک بٹورنے یا نمک بنانے میں پورے گاؤوں کو حصہ لینا چاہیے۔ عورتوں کو شراب کی دکانوں، افیون کے ٹھیکوں اور ولایتی کپڑے کی دکانوں پر دھرنا دینا چاہیے، ولایتی کپڑے کی ہولیاں جلائی جانی چاہئیں ہندوؤں کو کسی کے ساتھ چھوت چھات کا برتاؤ نہیں کرنا چاہیے، ہندوؤں، مسلمانوں، پارسیوں اور عیسائیوں سب ہی کو ایک دوسرے کو بھائیوں کی طرح گلے لگانا چاہیے، لڑکوں کو سرکاری سکول چھوڑ دینا چاہیے اور سرکاری نوکروں کو سرکاری نوکریاں چھوڑ کر عوام کی خدمت کرنا چاہیے جیسا کہ گجرات کے پٹیلوں اور تلاٹیوں نے کیا ہے۔"

انور نے دیکھا کہ جب وہ گاندھی جی کا پیغام لکھ رہا تھا اُس وقت پولیس کے افسر

غصّے کے مارے تلملا رہے تھے مگر وہ کچھ کر نہیں سکتے تھے۔ وہ شاید یہ فیصلہ کر ہی رہے تھے کہ اُسے وہیں گرفتار کرلیں کہ اتنے میں گاڑی کے بریک لگے اور وہ ایک جھٹکے کے ساتھ رُک گئی۔ اکسپریس رُک گئی اور ڈائننگ کار ریل کی پٹڑی کو پار کرنے والی سڑک کے پھاٹک کے سامنے آ لگی۔ اب پولیس والے اپنے قیدی کو اُتارنے میں اتنے مشغول تھے کہ انہیں کسی اور بات کا خیال ہی نہیں تھا۔

انور نے ہاتھ جوڑ کر چپ چاپ نمستے کیا اور گاندھی جی نے مسکرا کر اُسے آشیرواد دیا اور اپنی کھدّر کی شال اپنے کندھوں پر ڈال کر گاڑی سے نیچے اتر گئے۔

پھاٹک کے پاس کھڑے ہوئے دو بدیسی اخبار نویسوں کو انور نے پہچانا اور وہ دل ہی دل میں اس بات پر مسکرانے لگا کہ جب انہیں یہ معلوم ہوگا کہ کوئی اُن سے پہلے ہی گاندھی جی سے انٹرویو لے چکا ہے تو وہ کتنا افسوس کریں گے۔

"مسٹر گاندھی آپ کو کچھ کہنا ہے؟" اس نے ایک اخبار نویس کو سوال کرتے سنا اور گاندھی جی نے جواب دیا "انگلینڈ اور امریکہ کے لوگوں سے کہیئے کہ آج صبح جو کچھ آپ دیکھ رہے ہیں اُس کا اصلی مطلب سمجھیں۔۔۔ کیا یہی آزادی ہے؟۔۔۔"

وہ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں پوچھ سکے کیونکہ پولیس جلدی جلدی سے گاندھی جی کو موٹر میں بٹھا کر فوراً وہاں سے لے گئی۔ جب اونگھتے ہوئے مسافروں کو اس تاریخی ڈرامے کا پتہ چلا تو ہر ڈبّے سے باہر جھانک جھانک کر دیکھنے لگے۔ لیکن پولیس والوں کو اور اخبار نویسوں کو یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ جس ڈبے میں گاندھی جی سفر کر رہے تھے اُس کی ایک کھڑکی میں سے انور باہر سر نکالے جھانک رہا تھا۔

"بھلا یہ کون ہے؟" اُن میں سے ایک نے پوچھا۔ اُسے کچھ کچھ اصل بات کا شک

ہو گیا تھا کہ کسی نے اس سے بھی زیادہ پھرتی دکھا کر معرکے کی خبر پہلے ہی اُڑا لی تھی۔

لیکن گاڑی چل پڑی تھی اور انور اپنا خالی تھرماس ہلا ہلا کر چلّا کر کہہ رہا تھا "جانتے نہیں ہو، میں کون ہوں؟ پانی کی تلاش میں بھٹکنے والا کالا آدمی؟"

(۶)

گاندھی جی کا پیغام لانے میں انور کی کامیابی پر آشا اتنی خوش تھی کہ اُس نے انور کو دعوت دی کہ وہ بھی اُس کے ساتھ کانگریس کے خفیہ ریڈیو سٹیشن پر چلے جہاں سے وہ پیغام اسی دن شام کو براڈ کاسٹ کیا جانے والا تھا۔

"تمہیں یقین ہے کہ مجھے اپنا اتنا بڑا راز بتا کر تم کوئی خطرہ نہیں مول لے رہی ہو؟ مان لو اگر میں سی۔ آئی۔ ڈی کا بھیجا ہوا آدمی ہوا تو؟"

وہ آشا کو چھیڑ رہا تھا اور یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ وہ اس پر کتنا بھروسہ کرتی ہے۔

"بکواس نہ کرو، ہم تمہیں اپنا ہی آدمی سمجھتے ہیں۔" جس طرح سے اُس نے یہ بات کہی اُس میں دوستوں جیسے بھروسے کے علاوہ بھی کچھ تھا۔ "اور پھر سی۔ آئی۔ ڈی کا کوئی آدمی ایک والنٹیر کی جان بچانے کے لئے پولیس سے اپنی کھوپڑی نہ تڑواتا۔"

"پہلی بات، تو یہ کہ تم کوئی معمولی والنٹیر نہیں ہو اور پھر غداروں کے سینے میں بھی تو دل ہوتا ہے۔" وہ اپنی یہ تعریف سُن کر کچھ شرما گئی مگر وہ سیدھی سادی طبیعت کی تھی اُسے نخرے دکھانا بالکل نہیں آتا تھا۔ "دوسری بات یہ کہ کبھی کبھی دوسروں کا اعتبار حاصل کرنے کے لئے سی۔ آئی۔ ڈی والوں کو اپنا سر بھی تڑوانا پڑتا ہے جیسا کہ میں نے کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ مجھے جو چوٹ لگی ہے اُس کی وجہ سے مجھے ترقی مل گئی ہے۔"

وہ بہت ہی دوستانہ ڈھنگ سے لڑکوں کی طرح ہنسی۔ انور کو اُس کی یہی بات

اچھی لگتی تھی۔ آپ اُس کے ساتھ بالکل برابری سے باتیں کر سکتے تھے، ہنسی مذاق کر سکتے تھے اور آپ کو یہ احساس کبھی نہیں ہوتا تھا کہ آپ کسی لڑکی سے باتیں کر رہے ہیں۔

دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد وہ آشا کی موٹر میں بیٹھ کر اپولو بندر گئے اور وہاں سے آشا نے موٹر ڈرائیور کے ساتھ واپس بھیج دی۔ اُس وقت سمندر کے کنارے پر بالکل سناٹا تھا۔ صرف گیٹ وے آف انڈیا کے ٹھنڈے فرش پر کچھ بے گھر لوگ چین سے سو رہے تھے۔ اُن دونوں نے تاج ہاربر بار میں جا کر کچھ سینڈوچ اور کیک خریدے۔ پھر وہ کنارے پر جا کر ایک موٹر بوٹ میں بیٹھ گئے۔ انور نے دیکھا کہ بوٹ والا آشا کو جانتا تھا۔ کیونکہ اس نے نہ تو پیسوں کے لئے کوئی سوال کیا اور نہ ہی یہ پوچھا کہ وہ کہاں جانا چاہتے ہیں۔

جب موٹر بوٹ پھٹ پھٹ کرتی ہوئی بندرگاہ سے باہر نکلی تو انور نے پوچھا۔

"کسی کو شک تو نہیں ہوگا؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی ہمارا پیچھا کرے؟"

"زیادہ سے زیادہ کوئی یہی تو شک کرے گا کہ میں تمہارے ساتھ رومانس کرنے کے لئے باہر جا رہی ہوں اور لوگ ہمارے بارے میں طرح طرح کی باتیں کریں گے۔"

"اور تمہیں اس کی کوئی پروا نہیں ہے؟"

"نہیں، بالکل نہیں اگر اس سے کانگریس ریڈیو کا راز چھپائے رکھنے میں مدد ملتی ہو۔"

اب وہ کھلے سمندر میں پہنچ چکے تھے اور انور سوچ رہا تھا کہ شاید وہ کسی دلکش جزیرے کی طرف جا رہے ہیں۔ اس نے دیکھا کہ بوٹ والا اُسے کچھ شک کی نظر سے دیکھ رہا تھا اور انور اسے کوئی بُری بات بھی نہیں سمجھتا تھا۔ جو لوگ خفیہ انقلابی کام کرتے تھے انہیں ہر طرح سے چوکنا رہنا ہی پڑتا تھا، خاص طور پر نئے لوگوں کے معاملے میں۔ بوٹ والا اپنی دلچسپی کو نہ دبا سکا اور اس نے انور کی طرف اشارہ کر کے مراٹھی میں آشا سے کچھ

کہا۔ انور کی سمجھ میں یہ تو نہیں آیا کہ اُس نے کیا کہا لیکن وہ اتنا ضرور سمجھ گیا کہ وہ اُس کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ لیکن آشا نے اس کی بات کا جواب ہندوستانی میں دیتے ہوئے اس سے انور کا تعارف کرایا اور بتایا کہ "یہ شمالی ہندوستان کے ایک ساتھی ہیں جو تحریک کی بڑی خدمت کر رہے ہیں۔" اُس نے بوٹ والے کو یہ بھی بتایا کہ انور نے کس طرح صبح گاندھی جی سے ملاقات کی تھی۔ اس پر اٹھا بوٹ والا خوش ہو کر مسکرا دیا۔ یہ سب کچھ جان لینے کے بعد ہی اُس نے موٹر بوٹ کو ایک دوسری کشتی کی طرف موڑ دیا جو سمندر میں اکیلی تیر رہی تھی اور جس کے سفید بادبان ہوا میں تنے ہوئے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ مچھلیاں پکڑنے والی کوئی کشتی تھی۔

اس کشتی پر کانگریس کا خفیہ ریڈیو سٹیشن تھا۔ اس کے اونچے اونچے مستول بڑی آسانی سے ایریل کا کام دیتے تھے اور بیٹریاں، مائکروفون اور دوسری مشینیں کشتی میں بنے ہوئے ایک صندوق میں چھپا دی گئی تھیں۔ انور نے جب اپنے ہی لائے ہوئے گاندھی جی کے پیغام کو ریڈیو پر سُنا تو اُس کے دل میں ایک نیا طوفان پیدا ہو گیا "ہم کانگریس ریڈیو سے بول رہے ہیں! یہ کانگریس ریڈیو ہے!! ہم اب آپ کو اپنے مقبول لیڈر مہاتما گاندھی کا وہ پیغام پورا سناتے ہیں جو انہوں نے آج صبح ہمارے خاص نامہ نگار کو اپنی گرفتاری کے بعد دیا تھا..."

انور کو شک تھا کہ شاید گاندھی جی اس طرح کی خفیہ کارروائیوں کو پسند نہ کریں۔ کانگریس ریڈیو کا انتظام پوری طرح کچھ نڈر اور سوجھ بوجھ والے نوجوانوں کے ہاتھوں میں تھا۔ اُنھوں نے اپنے ٹرانسمیٹر کی جگہ جلدی جلدی بدل کر پولیس کے جاسوسوں اور سرکار کے ریڈیو کے ماہروں کو چکر میں ڈال رکھا تھا۔ کبھی وہ شہر کے باہر کسی سنسان بنگلے میں

اپنا ریڈیو سٹیشن چلاتے تھے، تو کبھی کسی سنسان سڑک پر چلتی ہوئی موٹر پر۔ ایک بار تو ایلیفنٹا کے غاروں میں بھی اپنا ریڈیو سٹیشن قائم کرنے کا انتظام سب سے آسان اور محفوظ ثابت ہوا تھا۔

جب وہ دونوں وہاں سے چلے گئے تو اُس وقت بھی ٹرانسمیٹر پوری آواز سے کہہ رہا تھا۔

"یہ کانگریس ریڈیو ہے! ہم کانگریس ریڈیو سے بول رہے ہیں!! آپ آزادی کی آواز سُن رہے ہیں"۔

(۷)

جب وہ دونوں اپولو بندر واپس پہنچے تو موٹر ان کا انتظار کر رہی تھی۔ اِس بار آشا نے ڈرائیور کو چھٹی دے دی اور خود موٹر چلانے لگی۔

"شہر کے باہر گھومنے چلتے ہو؟" اُس نے پوچھا اور اس سے پہلے کہ انور کوئی جواب دیتا آشا نے کہا "میرا ایک دوست کھار میں رہتا ہے اور میں چاہتی ہوں کہ تم اُس سے ضرور ملو"۔

یہ فیصلہ ہوتے ہی موٹر ہارنبی روڈ پر دفتر سے لوٹتے ہوئے لوگوں کی بھیڑ میں سے ہوتی ہوئی بوری بندر سٹیشن اور کرافورڈ مارکیٹ کو پار کرتی ہوئی بھنڈی بازار، لال باغ اور پریل کی گندی بستیوں سے گذر کر دادر پہنچی، پھر بائیں طرف مڑ کر تلک برج پار کر کے ماہم پہنچی اور پھر وہاں سمندر پر بنا ہوا چھوٹا سا پل پار کر کے بمبئی کے مضافات کی طرف بڑھی۔ سارا وقت انور یہی سوچتا رہا کہ آشا کا یہ دوست کس قسم کا آدمی ہوگا۔ آشا نے جس ڈھنگ سے اُسکے بارے میں بتایا تھا اُس سے یہ ظاہر تھا کہ وہ اُس کا کوئی 'معمولی دوست' نہیں تھا بلکہ کوئی ایسا آدمی تھا جس کے لئے اُس کے دل میں خاص عزت تھی۔ شاید وہ اُس سے پیار کرتی تھی! یہ خیال آتے ہی اس کا دل بے چین کیوں ہو اُٹھا، اُسے کچھ کچھ حسد کیوں ہونے لگا؟ کہیں، ایسا تو نہیں ہے کہ وہ خود آشا سے تھوڑا تھوڑا پیار کرنے لگا تھا؟

یہ خیال دل میں پیدا ہوتے ہی اُس نے اپنے آپ کو سمجھایا "انور، بے وقوفی کی باتیں نہیں

کرتے۔" اتنے میں موٹر ایک چھوٹے سے بنگلے کے احاطے میں رک گئی۔ "وہ یہیں رہتا ہے" آشا نے موٹر کا انجن بند کرتے ہوئے کہا "اور ہاں اُس کا نام لیشونت دیسائی ہے۔"

یہ کہہ کر وہ انور کو بنگلے میں نہیں بلکہ گیراج میں لے گئی جو اُس احاطے میں بنگلے کے پیچھے کی طرف بنا ہوا تھا۔ انور کے چہرے پر تعجب کے آثار دیکھ کر آشا نے کہا "بڑی عجیب بات لگتی ہے نا؟ لیکن وہ ہے ہی عجیب آدمی اور پھر آجکل گھر ملنا بھی مشکل ہے۔" دروازہ کھٹکھٹانے کے بعد وہ اندر چلے گئے اور وہاں انور نے ایک عجیب ماحول میں ایک عجیب آدمی کو دیکھا۔

لیشونت بہت دنوں سے بیمار تھا اور چارپائی پر ہی پڑا رہتا تھا۔ اُس کا جسم گھل کر بالکل ڈھانچہ رہ گیا تھا اور اُس کی داڑھی بہت بڑھ گئی تھی۔ اس کے بدن میں صرف آنکھیں ہی ایسی تھیں جن میں جان معلوم ہوتی تھی — بڑی بڑی ڈراونی آنکھیں تھیں اس کی لیکن ساتھ ہی اُن آنکھوں میں بھی کوئی ڈر چھپا ہوا تھا۔ مگر ان میں ایک عجیب کشش بھی تھی۔ آشا نے اِن دونوں کا تعارف کرایا۔ لیشونت کوشش کر کے مسکرایا اور اُس نے کمبل کے نیچے سے اپنا سوکھا ہوا ہاتھ نکال کر اپنے مہمان کی طرف بڑھا دیا۔ اُس ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں پکڑ کر انور کو عجیب سا لگا جیسے وہ خود موت سے ہاتھ ملا رہا ہو۔

"کہیئے میرا محل آپ کو کیسا لگا؟" اُس کا مذاق بھی مایوسی کے رنگ میں ڈوبا ہوا تھا اور اُس کی آواز بچوں کی طرح پتلی اور بے جھجک تھی۔

انور نے کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑا کر دیکھا۔ دیوار پر کارل مارکس، ٹالسٹائی اور سٹالن کی تصویریں لگی تھیں۔ ایک ہنسیا اور ہتھوڑے والا لال جھنڈا لگا ہوا تھا، کچھ کاٹھیاواڑ کے پردے دیوار پر ٹنگے ہوئے تھے اور ایک کیل پر بخار کا چارٹ لٹک رہا تھا۔ ہر طرف کتابوں کے ڈھیر تھے — الماریوں میں، میز پر، پلنگ کے پاس لگی ہوئی ایک لمبی بنچ پر اور خود پلنگ

پر بھی۔ یہ صاف ظاہر تھا کہ وہ بار کس وادی تھا اور اُسے پڑھنے لکھنے کا شوق تھا اور وہ جس نرمی کے ساتھ آشا سے کوئی کام کرنے کو کہتا تھا اُس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اُس سے بے حد پیار کرتا ہے۔

انور نے یشونت سے کہا کہ اُس کا کمرہ اُسے بے حد پسند آیا تھا اور اُس نے کتابوں کا اتنا اچھا ذخیرہ لائبریریوں کے علاوہ اور کہیں نہیں دیکھا۔ یہ سُن کر بیمار خوش ہوا۔

آشا فوراً کمرہ ٹھیک کرنے میں لگ گئی۔ اُس نے کتابیں جھاڑ کر پھر الماریوں میں رکھیں، تصویریں سیدھی کیں اور پلنگ پر بستر ٹھیک سے بچھایا۔ بڑے پیار سے سہارا دے کر اُس نے یشونت کو بٹھا دیا اور اُس کی پیٹھ کے پیچھے تکیے ٹھیک سے لگا دیئے پھر وہ بنچ پر پڑی ہوئی چھوٹی پلیٹیں اور گلاس اُٹھا کر انہیں دھونے کے لئے نل پر چلی گئی۔ انور دیکھ رہا تھا کہ یشونت آشا کے ہر کام کو ایسی نظروں سے دیکھتا تھا جیسے وہ اپنی کسی چیز پر ناز کر رہا ہو۔ اگر اُس کی وہ حالت نہ ہوتی جو اُس وقت تھی تو اُس کا یہ برتاؤ مضحکہ خیز لگتا۔ اب اُس کی حرکتوں پر صرف ترس آتا تھا۔

آشا کے جاتے ہی بیمار نے انور سے ایک ایسا سوال پوچھا جسے سُن کر وہ دنگ رہ گیا۔ یشونت نے پوچھا "کیا تم اُس سے پیار کرتے ہو؟" یہ سوال اس طرح اچانک پوچھا گیا تھا، اور اتنا غیر موزوں تھا کہ ایک پل کے لئے تو انور کی سمجھ ہی میں نہیں آیا کہ اس کا کیا جواب دے۔ پھر اُس نے لڑکھڑاتی زبان سے کچھ سٹپٹا کر ضرورت سے زیادہ زور دے کر کہا "نہیں، بالکل نہیں... تمہیں یہ خیال ہی کیوں پیدا ہوا؟... ہمیں ابھی ملے ہوئے مشکل سے دو ہفتے ہوئے ہیں۔"

یشونت خود یہ سوال پوچھ کر پچھتا رہا تھا اور اُس نے معافی مانگتے ہوئے کہا "میں جانتا ہوں کہ مجھے ایسا سوال نہیں پوچھنا چاہیئے تھا۔ لیکن تُم میری بات کا بُرا نہ ماننا۔ اس وقت

میری جو حالت ہے اُس میں میرے لئے اُس کی محبت اتنی ضروری ہے کہ کبھی کبھی مجھے بلاوجہ دوسروں سے جلن ہونے لگتی ہے۔ بات یہ ہے کہ میں بیمار آدمی ہوں اور مارکس کی کتابیں پڑھنے کے بعد بھی میری ہر بات سمجھداری کی نہیں ہوتی۔" یہ کہہ کر وہ نڈھال ہو کر لیٹ گیا۔

اب انور کے پچھتانے کی باری تھی کہ اس نے اُس کی بات کا اتنا کیوں بُرا مانا تھا۔

آشا پلیٹیں دھو کر واپس لوٹی اور اس نے ہمیشہ کی طرح کھلی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا "تم دونوں کیا باتیں کر رہے تھے؟" اس نے ہاں میں سر ہلا دیا اور جب آشا نے کہا "تو پھر مجھے پڑھ کر سناؤ" تو اُس کا چہرہ کھل اُٹھا۔

جتنی دیر میں لیشونت نے اپنے تکیے کے نیچے سے لکھے ہوئے کاغذوں کا پلندہ نکال کر انہیں سنبھالا اتنی دیر میں آشا نے انور کو بتایا کہ لیشونت سال بھر سے مارکس کی عظیم کتاب "سرمایہ" کا گجراتی میں ترجمہ کر رہا تھا اور اب یہ کام لگ بھگ پورا ہو گیا تھا۔ مترجم نے خود اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا "مجھے تو کرنا ہی تھا۔ اگر میں اچھا ہوتا تو میں کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہو جاتا یا کسی ٹریڈ یونین میں کام کرتا۔ اب میں یہاں لیٹے لیٹے صرف پڑھتا رہتا ہوں یا کبھی کبھار کچھ لکھ لیتا ہوں۔ موجودہ سماج بالکل بیمار اور سڑا ہوا ہے   میری طرح، اُسے مرنا ہوگا جتنی جلدی وہ مر جائے اُتنا ہی اچھا ہے۔"

اس کے بعد وہ دھیمی کمزور آواز میں اپنا ترجمہ پڑھنے لگا اور آشا اُس پر اپنی نظریں جمائے مشتاق رہی۔ بیچ بیچ میں وہ کہیں پر تعریف میں کوئی لفظ کہہ دیتی یا اپنی طرف سے کوئی مشورہ دیتی۔ انور گجراتی نہیں سمجھ پا رہا تھا لیکن اتنا وہ ضرور جانتا تھا کہ یہ ترجمہ اُن دونوں کے درمیان تعلقات قائم کرنے والی کڑی تھی۔ ایک کا ترجمہ پڑھ کر سنانا اور دوسرے کا اُسے سننا عملی طور پر اُن کے آپس کے پیار کا اونچا روپ تھا۔

یشونت کے بدن میں بہت دیر تک پڑھنے کی طاقت نہیں تھی اس لئے جلد ہی اُس کی آواز میں تھکان پیدا ہوگئی، اُس کی پلکیں کمزوری اور نیند سے بوجھل ہوگئیں۔ "آج بس کرو، یشونت، بہت اچھا ترجمہ ہو لئے، باقی میں کل سُنوں گی۔" اور یہ کہہ کر آشا نے یشونت کے ڈھیلے ہاتھوں سے گرے ہوئے اوراق اُٹھا لئے اور اُنہیں سنبھال کر تکیے کے نیچے رکھ دیا۔ پھر اُس نے چپکے سے اس کے پیچھے سے گدیاں ہٹا دیں اور اُس کا سر تکیے پر ٹکا دیا۔ یشونت نے آنکھیں کھولے بغیر گجراتی میں کچھ کہا اور آشا اُس کا ماتھا تھپک کر اُس سے الگ ہوگئی۔ اس نے انور کو اشارہ کیا اور دونوں دبے پاؤں کمرے سے باہر نکل آئے۔

(۸)

جس وقت وہ دونوں اُس گیراج میں سے نکلے اُس وقت سورج ڈوب چکا تھا اور سڑک کی بتیاں ایک ایک کر کے جلتی جا رہی تھیں۔ آشا یکایک کسی سوچ میں ڈوب کر بالکل چُپ ہوگئی تھی اور سڑک پر پہنچ کر وہ بولی "چلو جوہو چلتے ہیں، آج چاندنی رات ہے۔"

وہ شہر کے باہر چھوٹے چھوٹے بنگلوں کی قطاروں کے درمیان سے ہوتے ہوئے چُپ چاپ چلے جا رہے تھے۔ آخر کار آشا نے کہا "یشونت بھی کمال کا آدمی ہے، کیوں تمہارا کیا خیال ہے؟ اُس کا جسم بیماری کی وجہ سے بالکل تباہ ہوگیا ہے لیکن اس کا دماغ بہت تیز ہے۔ سچّے ہیرے کی طرح۔"

"کیا بیماری ہے اُسے؟"

"ٹی۔بی۔"

"اچھا؟ مگر میں نے تو اُسے ایک بار بھی کھانستے نہیں دیکھا۔"

"نہیں، ویسی ٹی۔بی نہیں ہے۔ اُس سے بھی بُری بیماری ہے۔ اُسے ریڑھ کی ہڈّی کی

ٹی۔ بی ہے، کوئی علاج ہی نہیں ہے اس کا۔"

"ڈاکٹر کیا کہتے ہیں؟"

"کہتے ہیں کچھ مہینے اور چل جائے گا، لیکن جب تک یہ ترجمہ پورا نہیں ہو جاتا تب تک وہ مرنے والا نہیں۔ اسی کے سہارے وہ زندہ ہے۔۔۔۔۔!"

"اور تم! تم یہ تو جانتی ہی ہو کہ وہ تمہیں بے حد پیار کرتا ہے؟"

آشا نے اُداس ہو کر سر ہلا دیا۔

"اور تم؟ کیا تم بھی اُسے پیار کرتی ہو؟"

آشا چُپ چاپ موٹر چلاتی رہی۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے جواب دیا "میں ہمیشہ سے اُس کی ذہنیت اور ایمانداری کی وجہ سے اُس کی عزّت کرتی رہی ہوں۔ وہ ہمارے کالج میں سب سے تیز لڑکا تھا۔ اپنے اصولوں کا بہت پکّا۔ اُس نے اپنا گھر بار اِس لئے چھوڑ دیا کہ اُس کے گھر والے بہت بڑا جہیز لیکر اُس کا بیاہ کرنا چاہتے تھے۔ کچھ دن تک وہ ایک اسکول میں پڑھاتا رہا اور وہیں اُسے یہ بھیانک بیماری لگ گئی۔ پچھلے سال بھر سے تو وہ چارپائی سے ہی لگا ہے۔"

"تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔"

"تمہارے سوال کا جواب دینا مشکل ہے۔ میں اُسے بہت پسند کرتی ہوں، اُس کی بڑی عزّت کرتی ہوں اور مجھے اُس کی حالت دیکھ کر دکھ ہوتا ہے۔ کیا یہ سب چیزیں مل کر محبت بن جاتی ہیں؟ نہیں، میرا خیال ہے محبت کے لئے کسی اور چیز کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اور پھر جس آدمی کی کوئی ضرورت سے زیادہ عزّت کرتا ہو اُسے وہ پیار نہیں کر سکتا۔ آدمی اپنے برابر والے سے پیار کر سکتا ہے۔ میرے اُوپر تو ہمیشہ اُس کی ذہانت اور دانشوری کا رعب رہا ہے۔"

"لیکن وہ تو سمجھتا ہے کہ تم اُسے پیار کرتی ہو، تمہیں یہ بات تو معلوم ہے نا؟"

"ہاں، میں جانتی ہوں اور اگر اُس سے اُس کی اُمید بندھتی ہے اور اُس میں زندہ رہنے کی طاقت آتی ہے، تو میں اُس میں کوئی بُرائی بھی نہیں سمجھتی۔"

آشا نے موٹر ناریل کے پیڑوں کے ایک جھرمٹ میں کھڑی کر دی اور دونوں چاندنی میں ایک ریت کے ٹیلے پر بیٹھ گئے۔ سمندر میں جوار آ رہا تھا اور لہروں میں پگھلی ہوئی چاندی کی چمک تھی۔ انور کو اس خاموش فضا میں درد کا احساس ہوا۔ شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ وہ ابھی یشونت سے مل کر آیا تھا اور اُس کے قابلِ رحم اور موہوم پیار پر اُسے دُکھ ہو رہا تھا لیکن انور کے دل میں بھی مایوسی چھائی ہوئی تھی، وہ سلمہ کے لئے بے چین تھا۔ اُس نے سوچا تھا کہ آشا کا ساتھ پا کر وہ اُسے بھول جائے گا۔ پر نہ جانے کیوں اُس کا اثر بالکل اُلٹا ہی ہوا تھا۔ آشا جو کچھ بھی کرتی تھی یا کہتی تھی اُس سے انور کے دل میں سلمہ کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔

آشا نے اُس سے کہا۔ "انور، مجھے اپنے بارے میں، اپنے گھر والوں اور دوستوں کے بارے میں، اپنے بچپن اور کالج کے دنوں کے بارے میں بتاؤ۔ تم اپنی زندگی میں کیا کرنا چاہتے ہو؟"

انور نے اُسے بتانا شروع کیا اور ایک ایک کر کے اُس کی زندگی کے سارے واقعات اُس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گئے ــــ انجم کے ساتھ بچپن کے ہنسی خوشی کے دن، امرتسر کے بھیانک حادثے کی گہری چھاپ، انجم کی موت اور خدا پر سے اُس کا بھروسہ اُٹھ جانا، فرقہ وارانہ فسادات اور گاندھی جی سے اُس کی ملاقات، یونیورسٹی کی زندگی اور آخر میں وہاں سے نکالا جانا۔ اُس نے آشا کو اپنے ابا کے بارے میں، رتن کے بارے میں، عثمان کے بارے میں اور "سُجالوسکی" کے بارے میں بتایا ــــ آشا یہ نام سن کر مسکرا دی۔ اور آخر میں اُس نے یہ بھی بتایا کہ وہ خود بھی نہیں جانتا کہ وہ زندگی میں کیا کرنا چاہتا ہے۔ شاید وہ اخبار نویس بننا چاہتا ہے لیکن اُسے اپنے آپ پر اور اپنی قابلیت پر اتنا بھروسہ نہیں ہے کہ وہ کچھ بھی کر سکے۔

"انور۔" آشا کی آواز میں اتنی نرمی تھی کہ انور کو ایسا لگا جیسے کوئی اپنے نازک ہاتھوں سے بڑے پیار سے اُسے سہلا رہا ہو۔ "تمہارے اندر اتنی ہمّت اور اتنی قابلیت ہے کہ تم اپنے ملک کے لئے بہت کچھ کر سکتے ہو۔ یہ اور بات ہے کہ تم ابھی یہ نہیں بتا سکتے ہو کہ تم کیا کر سکتے ہو۔ اس لئے تم مجھ سے وعدہ کرو کہ تم اپنے آپ پر بھروسہ رکھنا نہیں چھوڑو گے۔"

انور نے سر اُوپر اُٹھا کر دیکھا اور اُس کی نظریں آشا کی نظروں سے چار ہوئیں۔ وہ ریت کے ملائم ٹھنڈے تکیے میں اپنی کہنیاں ٹکائے بیٹھی تھی اور ہوا نے اس کے بال بکھیر دیئے تھے۔ چاندنی اور سمندر کی لہریں اور ناریل کے پیڑوں کے پتّوں کے جھلملاتے ہوئے سائے — یہ سب اُس پل آشا کی شخصیت میں سمٹ آئے تھے۔ وہ بہت اچھّی لگ رہی تھی، اور بے اختیار اُس کی طرف کھنچا جا رہا تھا۔ اُس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ اس کی گردن کو، اُس کے گالوں پر پڑنے والے گڈھوں کو، اُس کی لجائی ہوئی پلکوں کو چوم لے۔ لیکن اُس کی نظروں کے سامنے آشا نہیں تھی، وہ آشا کو نہیں چومنا چاہتا تھا، بلکہ وہ سلمہ تھی — سلمہ جیسی کہ وہ تھی، اور سلمہ جیسی کہ وہ اُسے بنانا چاہتا تھا۔ اور اگر اس وقت وہ آشا کو چوم لیتا تو یہ اُس کے لئے اپنے آپ کو دھوکہ دینے کے برابر ہوتا۔ وہ آشا کی اتنی زیادہ عزّت کرتا تھا کہ وہ اُسے سلمہ کی جگہ نہیں رکھ سکتا تھا۔

اِس لئے اُس نے ہاتھ میں کچھ ریت اُٹھائی اور اُنگلیوں کے بیچ سے اُسے گرانے لگا۔ اُس کے ہاتھوں کو ریت ٹھنڈی لگ رہی تھی اور اِس طرح اُسے اپنے مچلتے ہوئے دل کو قابو میں کرنے میں بہت مدد ملی۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے کہا۔ "آشا، جانتی ہو، یشونت مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ کیا میں تم سے پیار کرتا ہوں؟"

"پھر تم نے کیا کہا؟" آشا نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اُس سے پلٹ کر کہا۔

"میں نے کہا... میں نے کہا...." وہ آشا کو وہ بات نہیں بتانا چاہتا تھا جو اُس نے کہی تھی بلکہ جو اُسے کہنی چاہیئے تھی۔" میں نے کہا کہ تم اتنی اچھی ہو کہ میں تمہارے لائق نہیں، کہ میں تمہاری اتنی عزت کرتا ہوں کہ تمہیں پیار نہیں کر سکتا۔ اس کے علاوہ مجھے ایک دوسری لڑکی سے محبت ہے جو تم سے آدھی بھی اچھی یا سمجھدار نہیں ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ وہ مجھ سے پیار بھی نہیں کرتی۔ لیکن پھر بھی میں اُسے پیار کرتا ہوں کیا اس میں کوئی عجیب بات یا بُرائی ہے؟"

"نہیں، میں تو نہیں سمجھتی۔ انسان کا دل اتنا پیچیدہ ہے کہ وہ کسی قانون کا پابند نہیں ہو سکتا۔" اُس کے ہونٹوں سے ایک ہلکی سی آہ نکل کر سمندر کی لہروں اور ناریل کے پتوں میں سے ہو کر بہتی ہوئی ہوا کے شور میں کھو گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ اُٹھی اور بولی۔ "چلو چلیں، بہت دیر ہو گئی۔"

(۹)

گاندھی جی کی گرفتاری کی خبر سارے ملک میں آگ کی طرح پھیل گئی اور جگہ جگہ بغاوت ہونے لگی۔ لوگوں نے اپنا غصہ ظاہر کرنے کے لئے ہڑتالیں کیں، جلوس نکالے، نمک ستیہ گرہ نے پھر زور پکڑا، بدیسی کپڑے کا بائیکاٹ شروع ہوا اور سڑکوں پر ولایتی کپڑے کی ہولیاں جلائی جانے لگیں، شراب کی دکانوں پر دھرنے دیے گئے، گرفتاریاں ہوئیں لاٹھیاں اور گولیاں چلیں۔

جب انور دوسرے دن صبح ملس سے ملا تو وہ بوڑھا امریکی اخبار نویس غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔ اُس سے پہلے دن شام کو اُس نے اپنی آنکھوں سے میدان میں احتجاجی میٹنگ کرنے کے لئے اکٹھے ہوئے ستیہ گرہیوں پر ایک وحشیانہ لاٹھی چارج دیکھا تھا۔ سینکڑوں لوگ بے ہوش ہو گئے تھے۔

"مائی گاڈ، انور" اس نے قسم کھا کر کہا۔ "میں نے اپنی ساری زندگی میں ایسا بھیانک منظر نہیں دیکھا ہے۔ میں نے ایک آدمی کو مار کھاتے دیکھا۔ مشکل سے بیس برس کا لڑکا رہا ہوگا۔ وہ بار بار چوٹ کھا کر گرتا تھا، اُس کا چہرہ خون سے لت پت تھا لیکن وہ ہر بار اُٹھ کھڑا ہوتا تھا اور کہتا تھا اور مارو۔ یہاں تک کہ انگریز پولیس سارجنٹ بھی جو اُسے پیٹ رہا تھا شرمندہ ہو گیا اور اُس نے اپنا ڈنڈا پھینک دیا۔"

مِلس نے اپنی رپورٹ میں اس لڑکے کی پٹائی کا ذکر کیا تھا۔ اُس نے ہمیشہ سے زیادہ سخت لفظوں کا استعمال کیا تھا اور اِس لئے مقامی سنسر نے اُس کی رپورٹ روک لی تھی۔ اس پر بوڑھے کو غصّہ آگیا تھا اور وہ سب کو ٹیلیفون کر کے دھمکی دے رہا تھا کہ اگر اس کی رپورٹ روکی گئی تو انگلینڈ اور امریکہ کے سفارتی تعلّقات ٹوٹ جائیں گے۔ انور نے اُس سے پوچھا کہ اُسے یہ کیسے معلوم ہوا کہ اُس کا تار روک لیا گیا ہے۔ مِلس نے اُسے بتایا کہ بہت سویرے ایک گمنام پرچی ملی تھی جس پر لکھا تھا "آپ کی رپورٹ سنسر نے روک لی ہے، ہوم سکریٹری سے بات کر لیجیے۔" جب اُس نے ہوم سکریٹری کو ٹیلیفون کیا تو سامراج کے اِس بھاری بھرکم ستون نے نہ صرف یہ مان لیا کہ اُس کا تار روک لیا گیا ہے بلکہ مِلس سے یہ کہنے کی ہمّت بھی کی کہ اُس کی رپورٹ میں سچّائی کو توڑ مروڑ کر اور بہت بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا تھا۔

"اُس کی یہ مجال کہ مجھ سے یہ کہے۔" بوڑھے نے گرج کر کہا۔ "مجھ سے ــــ رابرٹ مِلس سے ــــ میں جو کہ پانچ براعظموں میں خبروں کو سچ سچ بلکہ کچھ کم کر کے ہی بیان کرنے کے لئے مشہور رہوں۔"

انور کو اس بپھرے ہوئے امریکی اخبار نویس کا غُصّہ ٹھنڈا کرنے میں کافی وقت

لگا اور اس بیچ میں اُسے کئی گلاس شربت بھی پلانا پڑا۔ تھوڑی دیر بعد انور نے اُس سے کہا۔
"رابرٹ! تم اسے ڈاک سے کیوں نہیں بھیج دیتے؟ اگر ڈاک ہوائی جہاز سے بھیجنے کا انتظام ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا...."

"میری سمجھ میں آگیا" یکایک ملس اُچھل پڑا۔ "بس اب کچھ نہ کہنا۔ تُم نے مجھے ایسی ترکیب سُجھا دی ہے کہ میں اِن اندھے صاحب لوگوں کے دماغ ٹھکانے لگا دوں گا۔ ذرا مجھے ٹیلیفون تو دینا۔"

اُس نے پھر ہوم سکریٹری کا نمبر ملایا۔ "میں پھر رابرٹ ملس بول رہا ہوں .... یس .... جی ہاں، اپنی اسی رپورٹ کے بارے میں جسے سنسر نے روک لیا ہے ... جی ہاں ... لیکن اگر میں ایک پرائیویٹ ہوائی جہاز چارٹر کر کے ایران چلا جاؤں اور وہاں سے اپنا تار بھیجوں تو آپ کو کوئی اعتراض تو نہ ہوگا اور اُس کے بعد میں یہ بھی جوڑ دوں کہ ہندوستان میں اسے سنسر نے روک لیا تھا ... جی نہیں، میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ دراصل میں ایروڈروم ہی جا رہا تھا لیکن میں نے سوچا کہ آپ کو بتا دوں شاید آپ نے اپنا ارادہ بدل دیا ہو ... کیا کہا؟ ... رپورٹ؟ ... جی ہاں، میں اپنی عزت کی قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ اُس کا ایک ایک لفظ سچ ہے اور میں نے جو کچھ اپنی آنکھ سے دیکھا ہے وہی لکھا ہے۔ اگر آپ سچ پوچھیں تو میں نے سچائی کو کچھ گھٹا کر ہی پیش کیا ہے ... تو آپ اُسے جانے دیں گے؟ ... آپ کا بہت بہت شکریہ ...."

"تار بھیج دیا جائے گا" ملس نے بتایا۔ لیکن اُس کے بعد ہوم سکریٹری بہت دیر تک ٹیلیفون پر کچھ کہتا رہا جسے سُن کر ملس کے چہرے پر فکر کے آثار نمودار ہو گئے۔

دوسرے دن انور کو اُس کے ابّا کا ایک خط ملا جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ اُس کی چچازاد بہن بلقیس کی شادی سلام پور کے نواب صاحب کے بیٹے کے ساتھ ہو گئی ہے۔ اور چونکہ وہ چھوٹے نواب کی عیاشی سے اچھی طرح واقف تھا اِس لئے اُسے یہ خبر سُن کر کوئی خوشی نہیں ہوئی۔ وہ سوچنے لگا بیچاری بلقیس سونے کے پنجرے میں بند ہو گئی۔ پشاور سے یونس کا خط آیا تھا جس میں اُس نے خان عبد الغفار خاں کے بارے میں لکھا تھا، جن کا نام پٹھانوں نے بڑے پیار سے بادشاہ خاں رکھ دیا تھا۔ اُس نے لکھا تھا "بادشاہ خاں نے ہم پٹھانوں میں ایک نئی ہمّت پھونک دی ہے یہ ہمّت کہ ہم اپنی جان دے دیں لیکن نہ تو دشمن کو پلٹ کر ماریں نہ اس سے ڈریں۔ کاش تم دیکھ پاتے کہ انہوں نے پٹھانوں کو کتنا بدل دیا ہے۔" یرّوادہ جیل سے سُندرم کا خط آیا تھا۔ اُس نے لکھا تھا کہ اُسے لوگوں کو سرکار کے خلاف بھڑکانے کے جرم میں دو سال کی سزا ہو گئی تھی۔

اُس نے دوسرا خط اُٹھایا اور جب اُس نے اُس پر لکھائی دیکھی تو اُس کا دل بلّیوں اُچھلنے لگا۔ سلمیٰ کا خط تھا جو دِلّی کے پتے پر گیا تھا اور اُس کے ابّا نے اُسے بمبئی بھیج دیا تھا۔ آخر کار اُس نے خط لکھا۔ اُس نے اِس بات کی معافی مانگی ہوگی کہ وہ اُسے ٹھیک سے پہچان نہ سکی اور شاید اُس نے پھر اپنی محبّت کا یقین دلایا ہوگا۔ لفافہ کھولتے وقت اُس کے ہاتھ کانپ رہے تھے...

"انور۔" رلس نے ایک موٹے کاغذ کے لیٹر ہیڈ پر چھپے ہوئے خط پر سے نظر اُٹھا کر اُس سے کہا۔ "سارے مُلک کا چکّر لگانے کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟"

میرے اخبار والوں نے لکھا ہے کہ میں تمہاری اِس انوکھی لڑائی کے ہر مورچے پر جاکر وہاں کی خبریں بھیجوں۔"

انور نے کوئی جواب نہیں دیا۔ شاید اُس نے ملس کی بات سُنی ہی نہیں۔ وہ آنکھیں پھاڑے اپنے ہاتھ کے خط دیکھ رہا تھا۔ وہ خط نہیں تھا۔ خوبصورت کاغذ پر سُنہرے حرفوں میں چھپا دعوت نامہ تھا۔ پروفیسر محمد سلیم نے اُسے ڈپٹی سُپرنٹنڈنٹ آف پولیس مسٹر منظور احمد کے ساتھ اپنی سلمہ کی شادی کے مبارک موقع پر ۱۰ مئی ۱۹۳۱ء کو اپنی کوٹھی سلیم منزل، میریس روڈ علی گڈھ پر دعوت میں شریک ہونے کے لئے بُلایا تھا۔

۱۹
دُنیا کا خاتمہ ؟

(۱)

انور کئی مہینوں کے لئے دورے پر جانے والا تھا اِس لئے وہ ماں جی اور موہن سے ملنے گیا لیکن وہ دونوں کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ شاید کانگریس کے کسی کام سے گئے ہوں گے مایوس ہو کر وہ وہاں سے واپس آ رہا تھا کہ اتنے میں ایک نوکر نے آ کر اُس سے کہا کہ سیٹھ جی اس سے ملنا چاہتے ہیں۔ انور کو تعجب ہوا۔ پہلی بار سیٹھ مانک لال نے اُس میں دلچسپی دکھائی تھی۔ آخر وہ اُس سے کیا باتیں کرنا چاہتے تھے ؟ وہ ڈر رہا تھا کہ سیٹھ جی اُس پر اپنا رُعب جھاڑیں گے اور اُس سے اس طرح سے باتیں کریں گے جیسے وہ اُن کے سامنے بہت ہی گھٹیا آدمی ہو۔ انور کو اُن کے بات کرنے کے اِس ڈھنگ سے بڑی جُھنجھلاہٹ ہوتی تھی مگر جانے سے انکار کرنا بھی تو بہت بدتمیزی ہوتی۔ آخر وہ اُن کے گھر میں ہفتہ بھر تک مہمان رہ چکا تھا اور اُن کا "نمک کھا چکا تھا۔" پھر اُسے یہ جاننے کی بھی خواہش تھی کہ اُسے کیوں بُلایا

گیا ہے۔ انہوں نے صرف خوش اخلاقی سے اُسے بلا لیا تھا یا انہیں اُس سے کوئی ضروری بات کہنی ہے؟

وہ اُس کمرے میں گیا جو اُن کا "پڑھنے کا کمرہ" کہلاتا تھا۔ حالانکہ وہاں جو بہت سی کتابیں رکھی ہوئی تھیں وہ صرف سجاوٹ کے لئے منگائی گئی تھیں اور شاید ہی کبھی الماری میں سے نکالی جاتی ہوں، اور سیٹھ جی تو خیر کبھی کوئی کتاب چھوتے ہی نہیں تھے کیونکہ اُن کی ادبی دلچسپی "ٹائمز آف انڈیا" کے مالی اور تجارتی صفحوں تک ہی محدود تھی۔ سیٹھ مانک لال نے جو بڑھیا چینی سلک کا کرتا اور ململ کی دھوتی پہنے تھے اور جن کی تین ہیرے کی انگوٹھیاں اور دو سونے کے دانت چمک رہے تھے، کرسی سے اُٹھ کر بڑے تپاک سے انور کا استقبال کیا۔ پہلے تو انہوں نے انور سے اُس کی صحت کے بارے میں پوچھا اور پھر یہ پوچھا کہ وہ مانک مینشن چھوڑ کر تاج میں کیوں رہنے لگا تھا، وہاں تو اس کا پیسہ بیکار ہی خرچ ہوتا ہوگا۔ انور نے انہیں بتایا کہ مسٹر ہلس کو جن کے ساتھ وہ کام کرتا تھا، وہاں ہر وقت اُس کی ضرورت رہتی ہے اور رہی خرچ کی بات تو وہ امریکن نیوز ایجنسی دیتی ہے۔ اس بات کا سیٹھ جی پر کافی رُعب پڑا۔ کروڑپتی سیٹھ جی کی نظروں میں انور کی عزت بڑھ گئی کیونکہ وہ ہر آدمی کو پیسوں کے معیار سے جانچتے تھے۔

"میرا خیال ہے کہ اس امریکن جرنلسٹ کے ساتھ کام کرنے کے دوران تم بہت سے کانگریسی لوگوں سے بھی ملتے ہو گے۔ میں نے سنا ہے کہ تم گاندھی جی سے، میرا مطلب ہے مہاتما جی سے بھی مل چکے ہو اور اُن سے بات کر چکے ہو۔"

انور نے اقرار کر لیا کہ ہاں اُسے یہ خوش قسمتی حاصل ہو چکی ہے۔

"اور تمہیں بہت سی ایسی سیاسی باتوں کا بھی پتہ ہو گا جن کی خبر ہم تک نہیں ہوتی؟"

اِس پر اُس آدھے اخبار نویس نے (انور اپنے آپ کو اب آدھا اخبار نویس کہنے

لگا تھا) جواب دیا کہ جو کچھ وہ دیکھتا یا سنتا تھا وہ سب اخباروں میں بھی چھپ جاتا تھا۔

سیٹھ جی نے سوچا کہ انور اپنی انکساری کی وجہ سے ہی ایسا کہہ رہا ہے اور انہوں نے ایک بار پھر زور دے کر کہا کہ اخبار نویسوں کو ہمیشہ اس سے زیادہ باتیں معلوم ہوتی ہیں جتنی کہ وہ اخباروں میں چھاپتے ہیں۔ "بات یہ ہے" انہوں نے اپنا مقصد سمجھاتے ہوئے کہا۔ "میں کانگریس کے بارے میں اور اس تحریک کے بارے میں جاننا چاہتا تھا جو کہ ــــ میرا مطلب ہے ــــ مہاتما جی نے شروع کر رکھی ہے۔"

انور سوچنے لگا کہ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ سیٹھ جی کے دل میں کوئی تبدیلی آگئی ہو اور وہ دیش بھگت بنتے جا رہے ہوں۔ اس نے کہا "آپ کے اپنے گھر میں تین پکے کانگریسی ہیں جو شاید آپ کو ان باتوں کے بارے میں مجھ سے زیادہ بتا سکتے ہیں۔"

"ارے وہ لوگ!" سیٹھ جی نے کافی حقارت آمیز لہجے میں کہا "میری بیوی تو ہر بات کو مذہبی کام سمجھ کر کرتی ہے اور اس لئے وہ گاندھی جی کو دیوتا کی طرح پوجتی ہے۔ آشا بالکل بچّی ہے اور اسے سیاست کا کچھ بھی پتہ نہیں ہے حالانکہ وہ جیل بھی چلی گئی ہے اور موہن ــ موہن کے لئے یہ سب ایک تماشہ ہے ایک نیا فیشن ہے۔" حالانکہ سیٹھ جی نے اپنے خاندان کے سب ہی آدمیوں کے بارے میں بہت سخت باتیں کہی تھیں لیکن ان کی سیاست کے بارے میں انہوں نے کافی سوچ سمجھ کر اپنی رائے قائم کی تھی۔

"آپ کیا بات جاننا چاہتے ہیں؟" انور نے آخر کار پوچھا۔

"پہلی بات تو یہ کہ تمہاری رائے میں کیا یہ تحریک چلے گی یا سیاسی آتش بازی کی طرح کچھ دن بعد ٹھنڈی پڑ جائے گی؟ یا یوں سمجھ لو کہ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کیا کانگریس کے پیچھے اتنی طاقت ہے کہ وہ سرکار پر کافی دن تک دباؤ ڈال سکے؟ "ٹائمز آف انڈیا" کا تو

کہنا ہے کہ کانگریس کے ساتھ کچھ مٹھی بھر سر پھرے، کچھ ایسے لوگ جن کے پاس سیاست کے علاوہ اور کوئی کام ہی نہیں ہے اور کچھ غیر ذمّہ دار نوجوان ہی ہیں۔"

انور نے انہیں بتایا کہ ٹائمز آف انڈیا جیسے اخبار سے جس کے مالک انگریز ہیں اور جو سرکار کا پٹھو ہے، یہ اُمید ہی کرنا بیکار ہے کہ وہ کبھی بھی اس بات کو مانے گا کہ زیادہ تر لوگ کانگریس کے ساتھ ہیں ـــ لیکن یہ حقیقت ہے۔ چونکہ انور جانتا تھا کہ سیٹھ مانک لال جیسے لوگ غیر ملکی لوگوں کی رائے کو کتنی اہمیت دیتے ہیں اِس لئے اُس نے کہا "اور صرف یہ میری یا مسٹر ملس کی ہی رائے نہیں ہے بلکہ اس وقت ہندوستان میں بدیسی اخباروں کے جتنے نامہ نگار ہیں۔ کیا انگریز کیا امریکن ـــ اُن میں سے تقریباً سب ہی کی یہ رائے ہے۔"

"اچھا!" سیٹھ جی کو سچ مچ تعجب ہوا اور ساتھ ہی اُن پر اس بات کا رُعب بھی پڑا۔

"اُن میں سے ایک انگریز نامہ نگار نے تو، جو کئی مہینے سے ہندوستان میں ہے، اپنے اخبار میں یہاں تک لکھا ہے کہ 'جیل میں بند مہاتما گاندھی اب ہندوستان کی اصل آتما ہے' اور ایک دُوسرے نامہ نگار نے امریکی اخباروں میں لکھا ہے کہ آج ہندوستان میں سرکار کے مقابلے میں کانگریس کی بات زیادہ مانی جاتی ہے۔"

یہ بات سُن کر تو "ٹائمز آف انڈیا" پڑھنے والے سیٹھ جی کا رہا سہا شک بھی دُور ہو گیا۔ انہوں نے اپنے کاغذوں میں سے ایک چھپا ہوا فارم نکال کر پوچھا "تو پھر تمہاری کیا رائے ہے، میں اِس اقرار نامے پر دستخط کر دوں؟"

انور نے فارم لے کر دیکھا۔ اُس نے اُس فارم کے بارے میں سُن تو رکھا تھا پر دیکھنے کا موقع پہلی بار ملا تھا۔ یہ ایک اعلان تھا جس پر کانگریس ہندوستانی کپڑا ملوں

کے مالکوں سے دستخط کرانا چاہتی تھی۔ یہ اعلان ان الفاظ سے شروع ہوتا تھا "ہمیں عوام کی قومی توقعات سے پوری ہمدردی ہے"۔ اس اعلان کا اصل مقصد تو یہ تھا کہ اس بات کا پورا انتظام کر لیا جائے کہ ملیں پوری طرح ہندوستانی کاروباروں کی شکل میں چلائی جائیں گی؛ ان میں صرف ہندوستانیوں کو نوکر رکھا جائے گا اور وہ صرف ہندوستانی بیمہ کمپنیوں ہندوستانی بینکوں اور ہندوستانی جہازوں کی کمپنیوں کے ساتھ تجارتی لین دین رکھیں گی؛ لیکن ساتھ ہی اُس میں ایک دفعہ یہ بھی تھی جس میں مل مالکوں سے یہ اعلان کرنے کو کہا گیا تھا کہ وہ سودیشی کے پرچار میں مدد دیں گے جس کے لئے سب سے پہلے تو مل کے بنے ہوئے کپڑے اور کھادی کی آپس کی مقابلہ بازی کو ختم کریں گے اور دوسرے کپڑے کی قیمتیں بڑھا کر یا اُس کی "کوالٹی" گرا کر اس تحریک سے پیدا ہونے والی حالت کا فائدہ خود اپنے حق میں نہیں اٹھائیں گے۔

"بولو تمہارا کیا خیال ہے؟ کیا ہم اپنے موت کے پروانے پر خود دستخط کر دیں؟"

"میرے خیال میں تو آپ کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارہ ہی نہیں ہے۔ جن ملوں کے مالک اس پر دستخط نہیں کریں گے اُن کی فہرست تیار کی جا رہی ہے اور بدیسی کپڑے کی طرح ہی اُن کے مال کا بھی بائیکاٹ کر دیا جائے گا۔"

"میں جانتا ہوں۔ اسی لئے زیادہ تر لوگوں نے دستخط کر دیے ہیں۔ میں صرف یہ سوچ رہا تھا کہ کیا اس طرح اپنے آپ کو کسی سیاسی پارٹی کے ہاتھوں بیچ دینا مناسب ہوگا؟"

انور نے سیٹھ جی کی ہمت افزائی کے لئے کہا "میرا خیال ہے کہ آپ کو اس پر دستخط کر دینے سے کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ بہرحال، گاندھی جی کچھ بھی کہیں ہاتھ کے بُنے ہوئے کپڑے سے تو ملک کی کپڑے کی آدھی ضرورت بھی پوری نہیں ہو گی۔ اور جب

بائیکاٹ ہوگا تو ہندوستانی ملوں کا کاروبار چمک اُٹھے گا۔ رہا کسی پارٹی کے ہاتھ اپنے آپ کو بیچ دینے کا سوال، تو میرے کچھ کمیونسٹ ساتھیوں کا تو یہ خیال ہے کہ مِل مالک کانگریس کو خریدے لے رہے ہیں۔ آپ کے لئے یہ سودا بُرا نہیں رہے گا۔"

"دیکھنا یہ ہے کہ کانگریس کتنے دن تک اس طرح اپنی تحریک چلا سکتی ہے۔" سیٹھ مانک لال نے آہ بھر کر شک بھرے لہجے میں کہا "کاش مجھے کسی طرح یہ یقین ہو جاتا کہ یہ گھوڑا جیتے گا۔"

"آپ میری بات مانیئے، اِس گھوڑے پر داؤ لگائیے، آج کی سب سے اچھی بیٹ یہی ہے۔" انور نے بھی بمبئی آنے کے بعد سے گھوڑ دوڑ کے کچھ لفظ سیکھ لئے تھے۔ "اچھا، اب میں چلوں گا۔ ماں جی سے میرا سلام کہیئے گا۔"

اپنی بیوی کے ذکر سے مانک لال سیٹھ کچھ خوش نہیں ہوئے اور انھوں نے کچھ اداس ہو کر دھیمی آواز میں کہا "اچھا کہہ دوں گا جب ملاقات ہوگی۔" انور جانتا تھا کہ ماں جی سے اُن کی ملاقات تو اب اگلے دن ناشتے پر ہی ہوگی۔

(۲)

دوپہر کو جب انور تاج محل ہوٹل پہنچا تو کھانے کا وقت ہو چکا تھا اور مِلس ڈائننگ رُوم میں جا چکا تھا۔ انور نے دیکھا کہ وہ وہاں سنہری بالوں والے کسی اجنبی کے ساتھ کھانا کھا رہا ہے جس کے ماتھے کی چوڑائی دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ وہ بہت عالم فاضل ہے، اُس کے داڑھی تھی جس کے بال کچھ کچھ لال تھے۔ انور اُسے کوئی پروفیسر سمجھ رہا تھا لیکن تعارف ہوتے پر معلوم ہوا کہ وہ لندن کے اخبار "ڈیلی ہیرلڈ" کا خاص نامہ نگار جارج سلو کومب تھا۔ رابرٹ اور سلو کومب پرانے دوست تھے اور وہ دنیا کے کئی

گڑبڑ والے علاقوں میں ساتھ رہ چکے تھے اور اس وقت وہ پیرس کی امن کانفرنس، لینن، ٹراٹسکی، لائیڈ جارج اور بریاں کے بارے میں اپنی یادداشتوں کو دہرا رہے تھے۔ انور جانتا تھا کہ سلوکومب کا اخبار ایک طرح سے لیبر پارٹی کا سرکاری اخبار مانا جاتا تھا۔ ایک زمانے میں یہی لیبر پارٹی ہندوستان کے قوم پرستوں کی خواہشات سے گہری ہمدردی رکھتی تھی۔ لیکن جب سے کچھ ووٹوں کی اکثریت سے اُس نے اپنی سرکار بنائی تھی تب سے اُس نے بھی ہندوستان اور نوآبادیات کی طرف وہی پرانی "ٹوری" پالیسی اپنائی تھی اور ہندوستان کے قوم پرست اخبار "دغاباز" لیبر پارٹی والوں کی سخت تنقید کرتے تھے جو ایک زمانے میں سماج واد اور سبھی ملکوں کی برابری کا دم بھرتے تھے لیکن اب اُسی پرانے سامراج کے راستے پر چل رہے تھے۔ کانگریس کے ایک روزنامہ اخبار نے اپنے اداریے میں لکھا تھا "ہندوستان کو آزادی دینے سے انکار کرکے لیبر پارٹی نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ انگریز بھی جو سماج وادی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، دل میں سامراج وادی ہیں۔"

انور بھی جلا بیٹھا تھا۔ اُس کا بہت جی چاہتا تھا کہ اب جبکہ اُس کی میز پر برطانیہ کی حکمران پارٹی کا ایک نمائندہ بیٹھا ہے وہ کھل کر اپنے خیالات کا اظہار کرے۔ لیکن سلوکومب بہت دنیا دیکھے ہوئے تھا اور اس کے خیالات بند ڈھولوں میں جکڑے ہوئے نہیں تھے۔ اُس کا رویہ بھی سامراج وادیوں جیسا نہیں تھا۔ وہ اپنے ہندوستان کے عجیب سفر کا ذکر جس شاندار طریقے سے کر رہا تھا اُسے سیاسی بحث کے رُخ میں موڑنا بہت مشکل تھا۔ وہ انہیں بتا رہا تھا کہ کچھ ہی گھنٹوں کی کوشش پر وہ پیرس سے، جہاں وہ نامہ نگار کی حیثیت سے مقیم تھا، بھاگ کر لندن پہنچا تھا اور وہاں سے ڈاک لے جانے والے ہوائی جہاز پر سوار ہوا تھا۔ جہاز ایک بھیانک طوفان میں پھنس گیا تھا اس لیے انہیں

رات جرمنی، نورمبرگ میں بتانی پڑی تھی۔ اُس نے لگے ہاتھوں یہ بھی بتایا کہ" دوسرے دن ناشتے کے وقت ہم ویانا پہنچے' دوپہر کے کھانے کے وقت بڈاپسٹ اور رات کا کھانا بلگریڈ میں۔" ہوائی جہاز پر یونان سے ہوتا ہوا وہ قاہرہ پہنچا تھا اور وہاں سے موٹر پر پورٹ سعید جاکر اُس نے ہندوستان جانے والا پانی کا جہاز پکڑا تھا۔ اُس منجھے ہوئے نامہ نگار نے جس آسانی کے ساتھ اِن تمام انوکھی جگہوں کے نام گنائے تھے اُس سے انور میں بہت ہیجان پیدا ہوا تھا کیونکہ دِل ہی دِل میں وہ بھی اسی طرح صحافت کے سلسلے میں ایسے انوکھے کارنامے انجام دینا چاہتا تھا۔

اتنے میں کافی آگئی اور کافی پیتے ہوئے سلوکومب انہیں بتانے لگا کہ اُسے اِس بات کا تو پورا یقین تھا کہ ہندوستان کے کروڑوں لوگ گاندھی جی کے اشارے پر چلتے ہیں لیکن — یہ کہہ کر اُس نے کافی کا ایک گھونٹ لیا — وہ پھر بھی اُن سے کچھ سوال پوچھنا چاہے گا۔

اُس نے پوچھا" کیا گاندھی جی نے اِس امکان کو بالکل ٹھکرا دیا ہے کہ مکمل آزادی کے اُس مقصد کی بجائے جو صرف ایک دُور کا تصوّر ہے' ہندوستان کو کافی حد تک حکومت خود اختیاری دے دی جائے؟ مطلب یہ کہ وہ کس قیمت پر سِول نافرمانی کی تحریک واپس لے سکتے ہیں؟ ستیہ گرہ کی تحریک واپس لینے کے لئے اور آتے والے موسم خزاں میں لندن میں ہونے والی گول میز کانفرنس میں شریک ہونے کے لئے وہ کیا شرطیں رکھنا چاہتے ہیں؟"

سلوکومب کے اس اشارے پر کہ گاندھی جی کانگریس کی آزادی کی بنیادی مانگ سے کم پر بھی سمجھوتہ کرنے کو راضی ہو سکتے ہیں' انور کو کچھ غصّہ آگیا اور اُس نے

جھنجھلا کر کہا" گاندھی جی نے اور کانگریس نے ہندوستان کے عوام کی طرف سے اپنی مانگیں رکھدی ہیں۔ اب انگریز سرکار کو، بلکہ برٹش عوام کو ہماری مانگوں کا جواب دینا ہے۔ اگر اُن کے پاس پولیس کے ڈنڈوں کے علاوہ کوئی دوسرا جواب ہو"۔

سلوکومب نے انور کی اس جھنجھلاہٹ کا بُرا نہیں مانا۔ اُس نے کہا کہ اُس نے پولیس کو ڈنڈے برساتے دیکھا تھا اور ایک انگریز ہونے کے ناطے وہ اِس پر بہت شرمندہ تھا اس کے علاوہ برطانیہ میں بہت سے اور لوگ بھی چاہتے ہیں کہ موجودہ حالت ختم ہو اور اسی لئے وہ اپنے سوالوں کے جواب جاننا چاہتا ہے۔

" اُن کے جواب تو گاندھی جی ہی دے سکتے ہیں اور وہ جیل میں بند ہیں اور مجھے یقین ہے کہ سرکار اُن سے یہ سوال پوچھنے کا موقع نہیں دے گی"۔

اِس بات کا سلوکومب نے جو جواب دیا اس پر دوپہر کے کھانے کے وقت کی یہ گفتگو ختم ہو گئی۔ اُس نے کہا " مجھے اِس بات کا یقین نہیں ہے"۔

(۳)

کچھ دن بعد ملس نے کہا" انور، ہم لوگ ابھی اپنا سارے ملک کا دَورہ کچھ دنوں کے لئے ٹال دیں۔ جلد ہی سمجھوتے کی بات چیت شروع ہو گی اور اِس سلسلے میں کچھ قدم اُٹھائے جائیں گے۔ ایسی حالت میں ہمارے لئے بمبئی ہی میں رہنا بہتر ہو گا۔ اپنا دوست بجارج جیل میں گاندھی جی سے انٹرویو کرنے جا رہا ہے"۔

" رابرٹ، یہ ہو ہی نہیں سکتا"۔ انور اس بات پر یقین کر ہی نہیں سکتا تھا کہ سرکار ایک ایسے قیدی کو جس پر حکومت کے ساتھ بغاوت کرنے کا الزام لگایا گیا تھا جیل میں انٹرویو دینے کی اجازت دے گی جو اخباروں میں چھاپا جائے۔

"انور کسی بات کا اتنا زیادہ یقین نہ کرو، عورتوں کی طرح سرکاروں کی بھی رائے ذرا سی دیر میں بدل جاتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ سلوکومب کو اجازت مل گئی ہے اور وہ پونہ چلا گیا ہے۔"

"اگر مسٹر سلوکومب گاندھی جی سے جیل میں مل سکتے ہیں تو آپ بھی انٹرویو کے لئے عرضی کیوں نہیں دیتے؟ ایک انگریز کے مقابلے میں ایک امریکی نامہ نگار سے زیادہ کھل کر اپنی بات کہہ سکیں گے۔"

"اسی وجہ سے تو شاید سرکار میری عرضی کو اتنی آسانی سے منظور نہ کرے۔ مجھے تو یہ یقین نہیں ہے کہ سلوکومب صرف ایک اخبار نویس کی حیثیت سے اُن سے ملنے گیا ہے اس میں شاید کوئی سیاسی چال بھی ہے۔ اس کا تعلق ایک ایسے اخبار سے ہے جو برطانیہ کے حکمرانوں کا سرکاری اخبار ہے اور اگر وہ اپنی مرضی سے بھی آیا ہے تب بھی یہ ممکن ہے کہ بمبئی کی سرکار اُسے برٹش سرکار کا کسی قسم کا سفیر یا نمائندہ سمجھے گی۔"

"مجھے یہ بات کچھ اچھی نہیں لگی" - انور نے اقرار کیا۔ "وہ شاید گاندھی جی کو اس بات کے لئے راضی کرنے کی کوشش کریں گے کہ وہ اپنی آزادی کی مانگ کو کچھ کم کر دیں اور ڈومینین سٹیٹس یا اسی قسم کی کسی چیز کے لئے راضی ہو جائیں۔"

"وہ اِس بات کی کوشش تو کر سکتا ہے۔" ملس نے اپنی رائے ظاہر کی۔ "لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ گاندھی جی بھی اس کی بات مان ہی لیں۔"

"کہہ نہیں سکتا، گاندھی جی بہت سیدھے آدمی ہیں، سیاست کے یہ داؤ پیچ اُن کے بس کے نہیں ہیں اور انگریز بہت چالاک ہیں۔"

"ابھی سے ہمت ہارنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" ملس نے صلاح دی۔ "دیکھیں

آگے کیا ہوتا ہے۔"

اگلے دن سلوکومب پونہ سے واپس آگیا اور چونکہ اخباروں میں گاندھی جی سے اُس کے انٹرویو کے بارے میں کچھ نہیں چھپا اس لئے انور نے یہ مان لیا کہ وہ گاندھی جی کو سمجھوتے کے لئے راضی کرنے میں ناکامیاب رہا تھا، اور یہ سوچ کر اُس کے دل کو راحت ہوئی۔ اُس نے ملس سے کہنا شروع کیا کہ اب وہ اپنا دورہ شروع کردیں۔ وہ ایک اور وجہ سے بھی گھومتے رہنا چاہتا تھا۔ سلمہ کی شادی کی خبر سے اُس کے دل کو بہت صدمہ پہنچا تھا اور اُس کا خیال تھا کہ سفر کرتے رہنے سے نئی نئی جگہیں دیکھنے اور نئے نئے لوگوں سے ملنے سے شاید اُس کی یہ بے چینی کچھ کم ہو۔

ملس بمبئی سے چل دینے پر کچھ کچھ راضی ہو گیا تھا۔ لیکن اتنے میں ایک دن غیر یقینی واقعہ ہوا۔ ایک دن "انڈین ڈیلی میل" نامی اخبار نے گاندھی جی کے ساتھ سلوکومب کے دوسرے انٹرویو کی رپورٹ چھاپ دی۔ اُس سے اندازہ ہوتا تھا کہ گاندھی جی نے اپنی مانگیں کافی کم کردی تھیں، جس کا کہ انور کو ڈر تھا۔ سلوکومب کے مطابق چار شرطوں پر "گاندھی جی کانگریس کو سول نافرمانی کی تحریک کو واپس لے لینے اور گول میز کانفرنس میں حصہ لینے کی صلاح دینے کو تیار ہیں۔" اور ان میں سے سب سے اہم شرط میں یہ کہا گیا تھا کہ "گول میز کانفرنس میں جن مسائل پر غور کیا جائے اُن میں ایک ایسا دستور بنانے کا سوال بھی شامل کیا جائے جس کے ذریعے ہندوستان کو آزادی کا بنیادی حق مل جائے۔"

"دیکھا آپ کے دوست نے کیا کیا؟" انور نے ملس کو اخبار دکھاتے ہوئے کہا جو ابھی تک بستر سے اُٹھا نہیں تھا۔ "لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر گاندھی جی

ان سب باتوں کے لئے راضی کیسے ہو گئے؟"

"بڈھے نے بھی کچھ سوچ سمجھ کر ہی یہ کیا ہوگا" ملس نے انور کو تسلی دینے کی کوشش کی۔ "وہ بھی کوئی نادان تو ہیں نہیں۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ مہاتما جی اپنی انکساری سے جیت لینے کے لئے ہی جھک رہے ہیں"

لیکن انور نے اپنے دل کو ہمت بندھانے کا دوسرا ہی طریقہ نکال لیا تھا۔ "اگر مہاتما جی سمجھوتہ کرنے کو تیار بھی ہیں تب بھی انگریزوں کو ہمارے جواہر سے نپٹنا پڑیگا۔ یہ نہ بھولو کہ وہ کانگریس کے صدر ہیں۔ اور مجھے پورا یقین ہے کہ وہ مکمل آزادی اور انگریزوں سے بالکل ناطہ توڑ لینے سے کم کسی چیز پر راضی ہی نہیں ہوں گے۔"

ملس نے انور کے اس بھولے پن پر مسکرا کر صرف اتنا کہا۔ "انور، سیاست میں کسی بات پر اتنا یقین نہیں رکھنا چاہیئے۔"

(۴)

موہن نے ٹیلیفون کر کے انور کو کچھ باتیں کرنے کے لئے بلایا۔ انور نے دیکھا کہ موہن کے دماغ میں طرح طرح کے غلط خیالات تھے اور ایک ایک کر کے اس کے جو دوسرے دوست آتے گئے وہ بھی سمجھوتے کے اس پلان کی کڑی تنقید کر رہے تھے جس کا ذکر سلو کومب کے انٹرویو میں کیا گیا تھا۔ عجیب بات تو یہ تھی کہ بیٹھے بیٹھے کرسی توڑنے والے ان انقلابیوں کے سامنے، جن میں سے زیادہ تر کافی رئیس گھرانوں کے بگڑے ہوئے لڑکے تھے جو کبھی ایک دن بھی جیل میں نہیں رہے تھے اور جنہوں نے ایک بھی لاٹھی نہیں کھائی تھی، انور گاندھی جی کے خلاف ان کے جملوں کا جواب دے رہا تھا۔ "آخر بڈھا کوئی نادان تو ہے نہیں۔" انجانے میں انور ملس کی ہی دلیل دہرا رہا تھا۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ مہاتما جی جیت حاصل کرنے کے لئے ہی جھک رہے ہوں اور یہ ظاہر کر کے کہ وہ سمجھوتے کے لئے تیار رہیں، وہ ساری دنیا کے سامنے انگریز سرکار کو مجرم ٹھہرا رہے ہوں۔"

جب سب لوگ چلے گئے تو وہ گھر کی باتیں کرنے لگے۔ آشا کو چھ مہینے کی سزا ہوئی تھی اور اس نے ماں جی کو لکھا تھا کہ وہ اچھی طرح ہے اور شمالی ہندوستان کی ایک دوسری والنٹیر سے ہندی پڑھنا سیکھ رہی تھی۔ اس کے بعد انور نے پوچھا "تم نے سب سے زیادہ دلچسپ خبر سُنی؟ پاپا نے اُس اقرار نامے پر دستخط کر دیے جس پر دستخط کرنے کے لئے کانگریس سب ہی مل مالکوں پر زور ڈال رہی ہے۔"

انور نے موہن کو بتایا کہ اُس کی اس بارے میں اس کے پاپا سے بات ہوئی تھی۔ "میں اسی وقت سمجھ گیا تھا کہ اُن کا دل بدلنے والا ہے۔"

"دِل وِل کچھ نہیں بدلا ہے۔" بیٹے نے اپنے باپ کے بارے میں بے ادبی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ "یہ سب کچھ ماں جی کی وجہ سے ہوا ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"تمہیں معلوم نہیں؟ ماں نے دھمکی دی تھی کہ اگر انہوں نے دستخط نہیں کئے تو وہ اُن کی مل کے سامنے بھوک ہڑتال کر دیں گی۔ جب ان کے شوہر خود غداری کر رہے ہوں تو وہ دوسروں کی ملوں کے آگے دھرنا کیسے دے سکتی تھیں۔"

انور کو اس بات کا یقین نہیں تھا کہ صرف اپنی بیوی کی بھوک ہڑتال سے ڈر کر سیٹھ مانک لال جیسے کائیاں آدمی نے اپنی رائے بدل دی ہوگی۔ جب موہن نے اسے بتایا کہ انہوں نے نہ صرف دستخط کر دیے تھے بلکہ وہ کانگریس کے ممبر بھی بن گئے

ہیں اور انہوں نے کھدر پہننا بھی شروع کر دیا ہے تو اُسے یقین ہو گیا کہ سیٹھ مانک لال نے اپنا مطلب دیکھ کر ہی دستخط کیے ہوں گے حالانکہ یہ بات اُس نے موہن سے کہی نہیں۔

انور نے بس اتنا کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ یہ سودا اُن کے لئے بُرا نہیں رہے گا۔" جب موہن نے اُس کی اِس بات کا مطلب پوچھا تو اُس نے اُسے یہ نہیں بتایا کہ اس کا اشارہ اس بات چیت کی طرف تھا جو سیاسی پارٹیوں کو "خریدنے" کے امکانات کے بارے میں اس نے سیٹھ مانک لال سے کی تھی۔

(۵)

انور اور اُس کے جیسے ہزاروں دوسرے نوجوانوں کو جس بات کا ڈر تھا، وہ ہوا نہیں، کیونکہ گاندھی جی نے جو تجویز رکھی تھی اُس کا انگریز سرکار کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا۔ کچھ دن تک تو یہ لوگ انتظار کرتے رہے کہ دیکھیں اب کیا ہوتا ہے اور جگہ جگہ ستیہ گرہ کی تحریک بھی کچھ دیر کے لئے ٹھنڈی پڑ گئی لیکن جب کچھ بھی نہیں ہوا تو تحریک پھر شروع ہو گئی۔ دھرسانا کے سمندر کے ساحل پر جہاں سے ستیہ گرہی نمک بٹورتے تھے، ایک میدانِ جنگ بن گیا جہاں نہتے ستیہ گرہیوں اور ہتھیار بند پولیس والوں کے درمیان روز ٹکر ہوتی تھی۔ غیر ملکی نامہ نگاروں کی اب بمبئی میں کوئی کمی نہیں تھی، اِن ہی کے گروپ کے ساتھ انور اور ملس دھرسانا گئے۔ موٹر کا یہ لمبا اور تکلیف دہ سفر بیکار نہیں گیا کیونکہ وہاں پہنچ کر اُن کی ملاقات شریمتی سروجنی نائیڈو کے ساتھ ہوئی جو سیاست داں ہونے کے ساتھ ہی شاعرہ بھی تھیں، اور فصیح البیان مقرر بھی۔ ستیہ گرہ کے دوسرے لیڈروں کے ساتھ گرفتار ہونے کے آدھے گھنٹے پہلے تک وہ اپنی دلچسپ باتوں سے سب لوگوں کو ہنسا رہی تھیں۔ اُس

کے بعد والنٹیروں پر بڑی بے رحمی سے لاٹھیاں برسائی جانے لگیں۔ اس خوفناک منظر کو دیکھ کر کچھ نامہ نگار تو سناٹے میں آ گئے کیونکہ پولیس کے ظلم کے بارے میں جو باتیں انہوں نے اب تک سنی تھیں اُن پر وہ یقین نہیں کرتے تھے انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ گھوڑ سوار گورے افسر ستیہ گرہیوں کے بیچ سے سرپٹ گھوڑے دوڑاتے ہوئے گذر گئے اور بہت سی عورتوں اور بچوں کو انہوں نے روند ڈالا۔ انور نے دیکھا کہ بارحس امریکی اخبار نویس ویب ملر اس منظر کو دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ بعد میں بمبئی واپس پہنچ کر انور نے ملر کو تاج کے لاؤنج میں کسی سے کہتے سنا کہ وہ اٹھارہ برس سے نامہ نگار کا کام کر رہا تھا اور اس سلسلے میں وہ دو درجن ملکوں میں ہو آیا تھا لیکن اس نے دھرسانا جیسا خوفناک منظر آج تک نہیں دیکھا تھا۔

ایک انگریز بھی اس کی بات سن رہا تھا۔ اس نے بہت فکرمند ہو کر پوچھا "لیکن ظاہر ہے کہ یہ ساری باتیں تم اخبار میں لکھو گے نہیں"۔ اور یہ سن کر ہمیشہ نرمی سے بولنے والا ملر گرج پڑا "لکھوں گا کیوں نہیں۔ اور میں یہاں آیا کس لئے ہوں؟"

کچھ دن بعد پنڈت موتی لال نہرو بمبئی آئے۔ اُن دنوں وہ جیل میں بند اپنے بیٹے کی جگہ پر کانگریس کے صدر تھے۔ بمبئی میں پنڈت موتی لال کا جیسا شاندار استقبال ہوا ویسا کبھی بڑے بڑے راجوں مہاراجوں کو بھی نصیب نہ ہوا تھا۔ دوسرے نامہ نگاروں کے ساتھ انور بھی موتی لال جی سے ملنے گیا۔ انہوں نے بونڈ سٹریٹ کے سلے ہوئے سوٹ چھوڑ کر اب کھدر کے کپڑے پہننا شروع کر دیا تھا۔ لیکن کھدر کے کپڑوں میں بھی وہ خاندانی رئیس معلوم ہوتے تھے۔ وہ بہت ہی ہنس مکھ اور مست قسم کے آدمی تھے۔ بدیسی نامہ نگار اُن سے گھل مل گئے۔ گاندھی جی کے بزرگانہ اور مقدس رویّے کے مقابلے میں انہیں موتی لال جی کا

رئیسانہ ٹھاٹ باٹ زیادہ آسانی سے سمجھ میں آتا تھا۔ اِس موقع پر ضعیف وِٹھل بھائی پٹیل بھی موجود تھے۔ ہوا میں اُڑتی ہوئی اُن کی وہ سفید نُورانی داڑھی انور کو ابھی تک یاد تھی۔ اُس نے انہیں اُس دن، جب بھگت سنگھ نے بم پھینکا تھا، لیجسلیٹو اسمبلی میں صدارت کرتے ہوئے دیکھا تھا، انہیں دیکھ کر انور کو اُس انقلابی کی یاد آگئی جس کی آنکھوں میں شاعروں جیسی ملائمت تھی اور جس کے سر پہ موت کا بھیانک سایہ منڈلا رہا تھا۔ اُس پر سازش کا جو مقدمہ اتنے دن سے چل رہا تھا وہ اب ختم ہونے والا تھا اور یہ تقریباً طے تھا کہ اُسے پھانسی کی سزا دی جائے گی۔

اِن لیڈروں سے مل کر اخبار نویس جب باہر نکل رہے تھے اُسی وقت باہر ایک موٹر آکر رُکی اور ریشمی سُوٹ پہنے ہوئے ایک شخص، جو دیکھنے میں کوئی بڑا آدمی معلوم ہوتا تھا اُس میں سے اُترا۔ ایک مقامی اخبار نویس نے انور کو بتایا کہ اعتدال پسندوں کے لیڈر ایم۔ آر۔ جیکر تھے جو سمجھوتے کا کوئی راستہ ڈھونڈ رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جارج سلوکومب بھی اس کام میں اُن کے ساتھ تھا کیونکہ اور اخبار نویسوں کے چلے آنے کے بعد بھی وہ جیکر صاحب سے کچھ باتیں کرتا رہا اور اُن کے ساتھ پھر موتی لال جی سے ملنے گیا۔

دو دن بعد پتہ چلا کہ موتی لال جی اِس بات پر راضی ہو گئے تھے کہ کوئی "تیسرا آدمی" سمجھوتے کی کوشش کرے اور اسی تجویز کے مطابق جیکر صاحب وائسرائے سے ملنے شملہ جا رہے ہیں۔ انور کو ایک بار پھر ایسا لگا کہ سمجھوتہ ہونے والا ہے اور اُسے اس بات پر تعجب بھی ہوا۔ سرکار اب بھی کسی قسم کا سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں معلوم ہوتی تھی اور جس وقت بیچارے جیکر صاحب شملہ کا لمبا سفر کر رہے تھے اُسی وقت یو۔ پی سرکار کے وارنٹ پر موتی لال گرفتار کر لئے گئے۔

"اب کوئی سمجھوتہ نہیں ہونے کا۔" انور نے فاتحانہ لہجے میں اعلان کیا۔

"تو پھر ہم لوگ اپنا بوریا بستر باندھیں۔" ملس نے فیصلہ کیا۔ "لڑائی لمبی چلے گی اور ہمیں کئی مورچوں کی خبریں لانا ہے۔"

(۹)

خبر ملی تھی کہ گجرات کے گاؤں میں الگان ادا نہ کرنے کی زبردست تحریک چل رہی تھی اس لئے وہ پہلی ٹرین پکڑ کر سورت پہنچے اور ایک ٹوٹی ہوئی موٹر پر، جو کچھ میل چلنے کے بعد بار بار بند پڑ جاتی تھی۔ انہوں نے دیہاتوں کا چکر لگایا۔ یہاں کی زمین بہت زرخیز تھی کپاس، گنا اور تمباکو کی فصل کے لئے مٹی بہت اچھی تھی۔ اب تک انور نے یو۔پی کے جو گاؤں دیکھے تھے اُن کے مقابلے میں یہاں کے گاؤں زیادہ خوشحال دکھائی دیتے تھے۔ یہاں کے گاؤوں میں بہت سے مکان پکے بنے ہوئے تھے۔ کچھ مکان دو منزلہ بھی تھے دروازوں کے چوکھٹے نقش دار لکڑی کے تھے اور دیواروں پر رنگ برنگی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ ان میں سے زیادہ تر مذہبی تصویریں تھیں — کرشن اور گوپیاں، رام اور سیتا اور ہنومان جی کی تصویریں۔ کچھ ماڈرن تصویریں بھی تھیں، جیسے ریل گاڑی اور ہوائی جہاز کی تصویریں ایک گھر کی دیوار پر انہوں نے ایک بہت ہی اہم تصویر بنی ہوئی دیکھی جس میں گاندھی جی کو بیچ میں بیٹھا ہوا دکھایا گیا تھا۔ (اُن کے سر کے چاروں طرف ایک گولا کھینچ کر اُن کے چہرے کے نور کا ہالا دکھایا گیا تھا) اور وہ ہندوؤں، مسلمانوں، پارسیوں، عیسائیوں کے ایک گروہ کو دعائیں دے رہے تھے۔ مجمع میں کندھے پر ہل رکھے ہوئے ایک کسان اور کالے رنگ کا ایک اچھوت بھی دکھایا گیا تھا۔ یہ مجمع ہندوستان کے سارے عوام کی نمائندگی کر رہا تھا۔ یہ سچ مچ گاندھی جی کا ملک تھا۔ وہ کئی سال تک اس علاقے میں رہے تھے۔ یہاں کے

لوگ اُن کی گجراتی زبان بولتے تھے۔ یہاں کے زیادہ تر لوگوں نے اُنہیں دیکھا تھا اور اُن کی باتیں سُنی تھیں اور اُن کے ایک شاگرد ولبھ بھائی پٹیل نے کئی برسوں کی محنت کے بعد یہاں کے کسانوں کو متحّد کیا تھا۔ کھیتی کی پیداوار کی قیمتیں گر جانے کی وجہ سے اُن کی خوشحالی میں بے حد کمی آگئی تھی اور اُن کی مالی حالت بگڑتی گئی تھی۔ دو سال پہلے باردولی ضلع کے کاشتکاروں نے ہندوستان کی تاریخ میں پہلی بار لگان دینے سے انکار کیا تھا کیونکہ اُن کا کہنا تھا کہ اُن کا لگان بہت زیادہ لگایا گیا تھا۔ جبر و تشدّد کے باوجود انہوں نے قابلِ تعریف اتحاد کا مظاہرہ کیا تھا اور سرکار کو مجبور ہو کر اُن کا لگان کم کرنا پڑا تھا۔

اب پورے گجرات نے قابلِ نفرت بدیسی سرکار کو لگان دینے سے انکار کر دیا تھا۔ سرکار نے بھی ناراض ہو کر بہت ظُلم کیے تھے۔ ان گاؤں میں جن کسانوں کا اثر تھا اُنہیں گرفتار کر لیا گیا تھا۔ باقی لوگوں کو پولیس لگاتار ستا رہی تھی۔ اُن کی زمین، جائداد، یہاں تک کہ اُن کے مویشی بھی ضبط کر کے مٹّی کے مول نیلام کئے جا رہے تھے اور اس طرح اُن کا لگان وصول کیا جا رہا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہزاروں کسان اپنے گھر بار اور زمین جائداد چھوڑ کر برطانوی ہند کی سرحد پار کر کے پاس کی بڑودہ ریاست میں جا کر بسنے لگے۔ کچھ گاؤں بالکل خالی ہو گئے تھے اور اُن کی سنسان گلیوں میں گھومتے ہوئے انور کو بڑا عجیب لگا جیسے فتح پور سیکری دیکھتے وقت لگا تھا جہاں کی شاندار پُرانی عمارتوں کا سُونا پن کسی کا انتظار کرتا ہوا معلوم ہوتا تھا — یہ گاؤں اپنے کاشتکاروں کا انتظار کر رہے تھے کہ وہ نہ جانے کس وقت واپس لوٹ آئیں۔

وہ بڑودہ ریاست کی حد تک گئے اور انہوں نے دیکھا کہ سرحد کے اُس پار چٹائی اور تاڑ کے بنے ہوئے چھپّروں میں برطانوی ہند سے آئے ہوئے ان گنت کسانوں نے

سورج کی تپتی ہوئی دھوپ سے بچنے کے لئے پناہ لے رکھی ہے۔ ایک بوڑھے کسان سے جس کے سر پہ بہت بڑی پگڑی بندھی ہوئی تھی اور جس کے چہرے پر بڑی بڑی مونچھیں تھیں انور نے پوچھا کہ وہ کب تک اپنے گھر لوٹنے کی امید رکھتے ہیں۔ جس کے جواب میں اس بوڑھے کسان نے فوراً بڑے بھروسے کے ساتھ جواب دیا۔ "جب ہمارے مہاتما جی کی سرکار بن جائے گی۔"

اس درمیان انہیں خبر ملی کہ ولبھ بھائی پٹیل چھوڑ دیے گئے ہیں اور اس لئے وہ دونوں ان کی تقریر سننے اپنی موٹر پر وہاں سے پچاس میل دور ایک چھوٹے سے قصبے میں پہنچے۔ انور نے "باردولی کے ہیرو" کو پہلی بار دیکھا تھا اور وہ ان کے سخت چہرے کی گہری لکیروں میں طاقت اور استقلال دیکھ کر بہت متاثر ہوا۔ ایسا لگتا تھا جیسے پتھر کی چٹان کو کاٹ کر ان کا چہرہ تراشا گیا ہے۔ ان کے الفاظ میں بڑی کڑواہٹ بھری تھی اور مجمع کے سامنے ہندوستانی میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے وائسرائے کی اس تقریر کا منہ توڑ جواب دیا جس میں انہوں نے دھمکی دی تھی کہ اگر ستیہ گرہ کی تحریک واپس نہ لی گئی تو کانگریس کو اس کا مزا چکھا دیا جائے گا۔ پٹیل سیاست دانوں کی طرح گھما پھرا کر بات نہیں کہتے تھے، وہ تو بالکل کسانوں کی طرح دو ٹوک بات کہتے تھے۔ یہ صاف تھا کہ اپنے صوبے کے کسانوں پر اس وجہ سے ان کا اتنا زیادہ اثر تھا۔

میٹنگ کے بعد ملس نے کہا۔ "انہوں نے کیا کہا یہ تو میری سمجھ میں نہیں آیا، لیکن یہ بات مجھے کچھ عجیب ضرور معلوم ہوئی کہ یہ مہاتما گاندھی کے معتقد کیسے ہیں؟"

"کیوں؟" انور نے تعجب سے پوچھا۔

"اس لئے کہ مہاتما گاندھی تو بہت نرم طبیعت کے آدمی ہیں اور پٹیل اتنے

ہی سخت اور مُنہ پھٹ۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ کسی چیز پر کبھی بھروسہ نہیں کرتے، ہر چیز کو ختم کر دینا چاہتے ہیں۔"

"شاید یہ اچھا ہی ہے۔ اُن کی سختی گاندھی جی کی حد سے زیادہ نرمی کے ساتھ مل کر حالت کو سنبھالے رہتی ہے اور اِس لئے یہ ہندوستان کے لئے اچھا ہے۔"

"ہاں، شاید ایسا ہی ہو!"

(۷)

گجرات کے دورے کا رابرٹ ملس پر بہت گہرا اثر پڑا اور اُس نے گجرات کے بہادر کسانوں کے بارے میں کئی بہت ہی جوشیلے مضامین لکھے۔ دِلّی جاتے ہوئے راستے میں اس نے کہا، "انور، میں سوچتا ہوں کہ شملہ جاکر میں وائسرائے سے ملوں۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ اس ملک میں جو کچھ ہو رہا ہے اُس کا اُنہیں پتہ ہی نہیں ہے۔ کسی کو اُنہیں سچائی بتانی چاہیئے اور چونکہ کوئی اور نہیں بتائے گا اس لئے میں ہی جاکر بتاؤں گا۔"

انور کو یقین نہیں تھا کہ اس سے کوئی فائدہ ہوگا اور اُس نے ملس کو اس معاملے میں اپنی رائے بھی بتا دی۔

"میں تو نہیں سمجھتا کہ میرا جانا بالکل بیکار رہے گا اور بہر حال کوشش کر لینے میں کیا حرج ہے۔ میں نے سُنا ہے کہ لارڈ اِروِن بہت ہی مذہبی آدمی ہیں اور میں تو اس بات کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا کہ جانتے بوجھتے وہ پولیس کے اِن ظُلموں کی اجازت دیں گے جو اِس وقت ملک میں ہو رہے ہیں۔"

انور ملس کے عیسائیوں والے اِس جوش سے اتفاق نہیں رکھتا تھا اور اُس نے یہ بات اُس سے کہی بھی کہ اُس نے جہاں تک تاریخ پڑھی ہے اُس سے اُسے بھی

اندازہ ہوتا ہے کہ مشرق میں اور مغربی ملکوں میں بھی جو سب سے ظالم بادشاہ ہوئے ہیں وہ اپنے مذہب کے بہت پکے تھے۔" "ارے، تم ناستکوں سے تو بحث کرنا بڑا مشکل ہے۔" ملس نے کچھ جھنجھلا کر کہا۔ "کم سے کم مجھے ایک اخبار نویس کی حیثیت سے تو ملاقات کر لینے دو اور ملاقات ہونے پر اگر میں انہیں دو چار سچی باتیں بتا دوں تو تمہیں کیا اعتراض ہے؟"

ملس سیدھے شملہ چلا گیا اور انور کچھ دن بعد شملہ آنے کا وعدہ کر کے راستے میں دلّی میں اتر پڑا۔ وہ کئی مہینوں سے اپنے ابّا سے نہیں ملا تھا اور اس کے ابّا نے لکھا تھا کہ وہ کم سے کم کچھ دن کے لئے گھر ضرور ہو جائے۔

اس بڑے سے خالی گھر میں اکیلے رہنے کی وجہ سے اکبر علی بہت بوڑھے لگنے لگے تھے اور پہلے سے بھی زیادہ اداس رہتے تھے۔ ان کے اس اکیلے پن پر انور کو ترس آتا تھا۔

دوپہر کو کھانا کھا کر جب باپ بیٹے اندر والے ٹھنڈے کمرے میں سونے کے لئے لیٹے تو انور نے شکایت کے لہجے میں کہا۔ "ابّا، آپ اپنی تندرستی کا خیال نہیں رکھتے۔ آپ بہت کمزور اور بیمار لگتے ہیں۔"

"بیٹا، میں بیمار نہیں ہوں۔ بڑھاپے کا اثر ہے۔ اب دن بہ دن کوئی میں جوان تھوڑے ہی ہوتا جاؤں گا۔ ہاں، مجھے رامیشور کی ضرور فکر ہے۔"

"کیوں، رامیشور کاکا کو کیا ہوا؟"

"تم تو جانتے ہی ہو کہ ان کی صحت ویسے بھی کبھی ٹھیک نہیں رہی، کھانسی اور دمہ کی شکایت تو تھی ہی اور میان میں بخار بھی آ جاتا تھا۔ لیکن ادھر کچھ مہینوں سے ان

کی طبیعت کچھ زیادہ ہی خراب رہنے لگی ہے اور دن بھر ہلکا ہلکا بخار رہنے لگا ہے۔ بلغم کے ساتھ اب خون بھی آنے لگا ہے۔ ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ انہیں کئی برس سے ٹی۔ بی ہے ایک پھیپھڑا تو بالکل بے کار ہو چکا ہے۔"

انور کو بچپن سے ہی رامیشور کاکا سے بہت لگاؤ تھا اور اسی لیے اب یہ جان کر اُسے بہت دُکھ ہوا کہ وہ اتنے سخت بیمار ہیں۔

"ابا! چل کر انہیں دیکھ آنا چاہیے۔"

"ضرور، بیٹا، میں تو ابھی کل ہی گیا تھا، تم کل جا کر مل آنا۔ وہ تمہارے بارے میں اکثر پوچھتے رہتے ہیں۔"

رامیشور کاکا کے پھیپھڑے کی بات سُن کر انور بہت دُکھی تھا۔ اتنے دن سے ٹی بی کا شکار رہنے کی وجہ سے انہوں نے کتنی تکلیف اٹھائی ہوگی۔ یہ خیال آتے ہی انور ڈر گیا۔ ڈاکٹر جمشید جی نے اُس سے بھی تو کہا تھا کہ اس کے پھیپھڑے کمزور ہیں اور اگر اس نے اپنی تندرستی کا بہت خیال نہ رکھا تو آگے چل کر ۔۔۔۔۔

"ابا!" اُس نے اچانک چونک کر کہا۔ اُسے ڈاکٹر صاحب کی ایک دوسری بات یاد آگئی تھی "ابا، مجھے اماں کے بارے میں کچھ بتائیے۔"

اس طرح اچانک اُن سے یہ سوال پوچھ لینا غیر مناسب تھا۔ انور نے جب اپنے ابا کی کھوئی کھوئی نظروں میں اداسی دیکھی تب اُسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ بہت دُور خلا میں دیکھتے ہوئے انہوں نے جواب دیا "کیوں، انور، اُن کے بارے میں کیا جاننا چاہتے ہو؟ بہت نیک عورت تھیں وہ۔"

"نہیں، میں تو اُن کی صحت کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ کیا انہیں دق کی

بیماری تھی؟ کیا اُن کے پھیپھڑے کمزور تھے؟ کیا وہ ٹی۔بی میں مری تھیں؟"

"نہیں نہیں۔" بوڑھے اکبر علی نے بہت زور دے کر انکار کیا، جیسے اپنی مرحوم بیوی کے بارے میں اُنہیں اس طرح کی بات بہت بُری لگی ہو۔ "نہیں اُن کی صحت تو ہمیشہ بہت اچھی رہی۔ تمہاری پیدائش کے وقت دائی کی غلطی سے اُن کے خون میں زہر پھیل گیا تھا اور اسی میں وہ مر گئی تھیں۔ لیکن یہ خیال تمہارے دماغ میں کیسے آیا؟"

"کچھ نہیں ابا، بس یوں ہی۔ میں بس یہ جاننا چاہتا تھا۔"

(۸)

جس وقت انور رامیشور دیال کو دیکھنے کے لئے کمرے میں گیا اُس وقت اُن کے چہرے پر موت کا پیلا پن چھایا ہوا تھا۔ وہ پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے اور چاروں طرف دوا کی نہ جانے کتنی شیشیاں رکھی تھیں۔ رامیشور دیال کی بیوی لاج وتی نے انور کو کمرے میں جانے سے پہلے بتایا تھا کہ اچھے سے اچھے ڈاکٹر کا علاج کرایا گیا تھا اور ڈاکٹروں کا ہی نہیں بلکہ حکیموں، ویدوں اور ہومیوپیتھک ڈاکٹروں کا بھی لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا۔ لاج وتی پہلے کے مقابلے میں بہت دُبلی ہو گئی تھیں اور ایسا لگتا تھا کہ وہ کئی ہفتوں سے سوئی نہیں تھیں۔ اُن کی سُوجی ہوئی لال آنکھوں میں آنسو تھے اور انہوں نے سسکیاں لے کر روتے ہوئے کہا۔ "اب تو بس بھگوان کا نام ہی باقی ہے۔"

"کاکا!" انور نے دھیرے سے پُکارا۔ "میں ہوں انور۔" بیمار کی دھنسی ہوئی آنکھوں میں خوشی کی چمک آگئی۔

"بیٹھ جاؤ بیٹا۔" اُن کی آواز اتنی دھیمی تھی کہ ایسا لگتا تھا جیسے کسی دوسری دنیا سے لوٹ کر آرہی ہو۔

بمبئی سے کب آئے؟"

انور نے انہیں بتایا اور اُسے یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ اپنی بیماری میں بھی رامیشور کاکا یہ معلوم کرتے رہے تھے کہ وہ کہاں ہے۔

"آپ کی طبیعت کیسی ہے کاکا؟" یہ سوال بیکار تھا لیکن رسماً اسے پوچھنا ضروری تھا۔

رامیشور دیال کے سوکھے ہوئے چہرے پر ایک عجیب مُرجھائی ہوئی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ جیسے وہ اس بات کو سمجھ گئے ہوں کہ یہ سوال صرف رسماً پوچھا گیا ہے۔ جواب میں لالہ جی نے جنہوں نے سکول میں اکبر علی کے ساتھ اُردو اور فارسی پڑھی تھی، صرف اقبال کا یہ مصرع پڑھا "چراغِ سحر ہوں بجھا چاہتا ہوں۔"

نہ جانے کیوں انور کو ایسا لگا کہ یہ اصلی رامیشور کاکا تھے جو موت کے بستر پر لیٹے ہوئے بھی اقبال کے شعر پڑھ رہے تھے، رامیشور کاکا وہ نہیں تھے جو گھنٹوں بیٹھے روپے آنے پائی کا حساب جوڑتے رہتے تھے۔

"اکبر کا کیا حال ہے؟" رامیشور دیال نے پوچھا اور انور نے انہیں بتایا کہ اُن کو کچھ کام پڑ گیا اس لئے وہ کل آئیں گے۔

"سچا دوست ہو تو اکبر جیسا ہو۔ اس نے میرے لئے بہت کچھ کیا ہے۔ اگلے جنم میں بھی میں اس کا احسان نہیں چکا پاؤں گا۔" اتنا کہہ کر وہ سانس لینے کے لئے رُکے، جیسے اپنے کمزور جسم کی ساری طاقت بٹور رہے ہوں۔ پھر انہوں نے ایک ایسی بات کہی جو انور کو کچھ عجیب لگی۔ بیمار کا دل رکھنے کے لئے انور نے کہا۔ "کاکا، آپ فکر نہ کیجئے۔ میں ابا کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔"

بیمار رامیشور دیال بالکل تھک گئے تھے اور اُن کی بیوی نے اُن سے آرام کرنے کو کہا۔ اُن کو اب تک یہ اُمید بندھی ہوئی تھی کہ وہ اپنی خدمت سے اُنہیں پھر اچھا کر دیں گی۔ اُن کی اِس فضول کی اُمید پر انور کو ترس آتا تھا۔

"کاکا، میں آپ سے پھر مِلوں گا۔" اتنا کہہ کر انور چلا آیا لیکن وہ جانتا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ اُسے معلوم تھا کہ یہ آخری ملاقات ہے۔"

دوسرے دن رامیشور کاکا کا انتقال ہو گیا اور جب وہ لوگ اُن کا کریا کرم کر کے لوٹے تو انور کو ایسا لگا کہ اُس کے ابّا ایک دن میں دس برس اور بوڑھے ہو گئے ہیں۔

(۹)

انور ایسے وقت اپنے ابّا کو چھوڑ کر جانا نہیں چاہتا تھا جبکہ اُن کے دل پر اپنے سب سے پیارے دوست کی موت کا صدمہ تھا۔ اِس لیے اُس نے مِلس کو شملہ خط لکھ دیا تھا کہ وہ ابھی دلّی میں دو ہفتے اور رُکے گا اور اُس کے بعد وہ شملہ میں یا کسی بھی دُوسری جگہ اُس سے مل سکتا ہے۔

انور کے لیے دلّی میں ٹھہرنا کچھ اچھّا ثابت نہیں ہوا۔ اُس نے دیکھا کہ اُس کے ابّا کی بیٹھک میں بہت سے کٹّر مذہبی لوگ جمع ہونے لگے ہیں۔ اپنے بچپن میں اُس نے وہاں دلّی کے ملے جُلے تمدّن اور معاشرت کا جو ماحول دیکھا تھا وہ اب باقی نہیں رہ گیا تھا۔ جب حکیم بیدل اپنے شعر سُناتے تھے، رامیشور کاکا اپنی ران پر ہاتھ مار کر 'واہ، واہ' کر کے داد دیتے تھے اور کوئی اخبار سے خبریں پڑھ کر سُناتا تھا اور چائے یا شربت کے دَور چلتے تھے۔ اُن کے ساتھ ہنسی خوشی اور رواداری کے ماحول میں سب ہی سماجی اور ادبی مسئلوں پر بات چیت ہوتی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ رامیشور کاکا کے

مرتے ہی ایک دور ختم ہو گیا تھا، زندگی کا ایک ڈھنگ مٹ گیا تھا۔ پُرانے دوستوں میں بس چودھری محمد عمر باقی رہ گئے تھے۔ اور یہ پنجابی بیوپاری بھی اب خان بہادر ہو گئے تھے، سرکاری ٹھیکیدار تھے اور میونسپل کونسلر بھی۔ اُن کا کاروبار چمک گیا تھا اور اُن کے بیٹے موٹروں میں گھومتے تھے۔ وہ بڑی بے شرمی سے سرکار کی طرفداری کرتے تھے اور کانگریس کو بُرا بھلا کہتے تھے اور گاندھی جی کو ستیہ گرہ شروع کرنے کی وجہ سے بہت گالیاں دیتے تھے کیونکہ ستیہ گرہ کا مطلب تھا آئے دن کی ہڑتالیں اور ہڑتال میں اُن کے کاروبار کا بہت نقصان ہوتا تھا۔ لیکن چونکہ وہ اس بات کو جانتے تھے کہ اکبر علی خود پہلے ستیہ گرہی رہ چکے تھے اور سرکار سے کچھ زیادہ خوش نہیں تھے، اس لئے چودھری محمد عمر صاحب کانگریس کے خلاف جو بھی بات کہتے اُسے فرقہ واریت کی آڑ میں چھپا کر کہتے۔ انور نے انہیں ایک بار یہ بھی کہتے سُنا تھا کہ "اگر میں ہندو ہوتا تو شاید میں بھی گاندھی کے ساتھ ہوتا، لیکن چونکہ میں مسلمان ہوں اس لئے اِس بنیئے کے ساتھ نہیں چل سکتا کیونکہ اُس کی ساری تحریک کا مقصد مسلمانوں کو ختم کر دینا ہے۔" اور جب بھی وہ اِس طرح کی کوئی بات کہتے تھے تو اُن کے ساتھ کے پانچ چھ حالی موالی ہمیشہ اُن کی ہاں میں ہاں ملانے کو تیار رہتے تھے۔

یہ سب باتیں تو تھیں ہی، اس پر بھی ایک دن تایا امجد علی ریاست کے کسی کام سے دلّی آ دھمکے۔ اس کے بعد تو انور کے لئے وہاں رہنا بالکل ناقابلِ برداشت ہو گیا۔ اب وہ صرف ریاست کے دیوان ہی نہیں تھے بلکہ چھوٹے نواب صاحب کے سُسر بھی تھے۔ اِس لئے ان کی اکڑ کی کوئی حد ہی نہیں رہ گئی تھی اور انور کے لئے انہیں ایک منٹ کے لئے بھی برداشت کرنا ناممکن تھا۔ یہ جانتے ہوئے کہ انور کانگریسی خیالات کا ہے،

وہ جان بوجھ کر اُس کے سامنے گاندھی جی کے بارے میں اور کانگریس کے دوسرے لیڈروں کے بارے میں بُری بُری باتیں کہتے تھے تاکہ اُسے غصّہ آئے اور وہ اُسے ڈانٹ پھٹکار سکیں۔ اکبر علی کو اس طرح کی باتیں اچھی نہیں لگتی تھیں لیکن اپنے بڑے بھائی کی زبان پر قابو پانا اُن کے بس کے باہر تھا۔ اِس لیے جب اُنہوں نے دیکھا کہ انور کے لیئے وہاں رہنا بہت مشکل ہو رہا ہے تو ایک دن اُنہوں نے خود ہی کہا "میرا خیال ہے کہ مسٹر ملس بہت دن سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ اب میں بھی بالکل اچھا ہو گیا ہوں اور بھائی صاحب بھی یہاں ہیں۔ تم اب شملہ کیوں نہیں چلے جاتے؟ وہاں کی آب و ہوا سے بھی تمہیں بہت فائدہ ہوگا۔"

اُسی دن، رات کو انور شملہ چلا گیا۔

(۱۰)

اتنے مہینوں سے ساتھ ساتھ کام کرتے ہوئے ملس اپنے ترجمان مددگار کو بہت پسند کرنے لگا تھا اس لیئے انور کے واپس آجانے پر وہ بہت خوش ہوا۔ اس کی پیٹھ پر زور کی دھپ جماتے ہوئے ملس نے کہا۔ "ہیلو انور بوائے! بہت اچھا ہوا کہ تم آگئے۔ سرکاری افسروں کے اس منحوس شہر میں تمہارے جیسا انسان دیکھنے کو آنکھیں ترس گئیں۔"

خبروں کی دنیا میں واپس پہنچ کر انور بھی بہت خوش تھا۔ سیسل ہوٹل میں جہاں ملس ٹھہرا ہوا تھا سیاست دانوں کی بھرمار تھی ۔ ظاہر ہے یہ سارے لیڈر اعتدال پسند تھے۔ اُن کے علاوہ بڑے بڑے سرکاری افسر اور ودیشی مہمان اور اخباروں کے خاص نامہ نگار بھی بے شمار تھے۔

"تو رابرٹ، بھلا وائسرائے سے کبھی ملاقات ہوئی؟" انور بڑی دیر سے یہ سوال پوچھنے کا انتظار کر رہا تھا۔ کھانا کھاتے وقت بھی وہ بڑی مشکل سے چپ رہا۔ لیکن ہلس کے کمرے میں پہنچتے ہی اُسے اکیلا پا کر اُس نے یہ سوال پوچھ ہی لیا۔

"ہاں ہاں، بھلا کیوں نہیں۔" پھر ہلس نے وائسرائے کے ایک اے۔ ڈی۔ سی کی نقل اتارتے ہوئے کہا۔ "ہز ایکسلنسی دی گورنر جنرل۔ ان کونسل اینڈ وائسرائے آف انڈیا وِل بی گریشسلی پلیزڈ ٹو گیو دی آنر آف ہیونگ یور کمپنی اَٹ لنچ ایٹ دی وائسریگل لاج، ڈائننگ رُوم نمبر تھری۔ ٹراوزرس کمپلسری، پن سٹرائپس اینڈ سٹیٹیس آپشنل۔"

انور کے لئے اپنی ہنسی روکنا مشکل ہو رہا تھا۔ اُس نے کہا "مطلب یہ کہ انہوں نے لنچ کے لئے بلایا تھا۔ اور کون کون تھا؟"

"ایک مہاراجہ صاحب تھے جنہیں تین پٹاخوں کی سلامی دی جاتی ہے۔ ایک پادری صاحب تھے جنہیں یہ شکایت تھی کہ لوگ عیسائی نہیں بن رہے ہیں۔ ایک آسام کے چائے کے باغوں کے انگریز مالک تھے جو بہت بڑے شکاری کی طرح یہ بتا رہے تھے کہ ہندوستان آ کر پہلے پہل شیر کیسے مارنا چاہیئے۔ اور ایک بوڑھی میم صاحب تھیں مسز ببل۔ بی۔ وی۔ بونیٹ جو لنگڑی لولی بلیوں کی مدد کے لئے پیسے لے کر بہت سے بوڑھے سنکی لوگوں کی دعوت کرنے کے انتظام میں تن من سے لگی ہوئی تھیں۔" ہلس سچ مچ اُس دن سب کا مذاق اُڑانے پہ تُلا ہوا تھا۔

"جب آپ کے بائیں طرف مسز ببل۔ بی بیٹھی ہوں اور دائیں طرف پادری صاحب بیٹھے ہوں تو آپ اُن کی بات کاٹ کر یہ تو نہیں کہہ سکتے تھے کہ 'یور ایکسلنسی،

لولی لنگڑی بلّیوں کی بات پر مجھے یاد آیا کہ ملک میں جو ستیہ گرہ کی تحریک چل رہی ہے ....."

"یہی بات تھی. بات چیت کے دوران سیاست کا کوئی سوال اُٹھانا ناممکن تھا. حالانکہ ایک بار چائے کے باغوں کے مالک نے ایک موقع دیا تھا. شکار کی باتیں کرتے کرتے جوش میں آکر انہوں نے کہا کہ اگر ان کا بس چلتا تو وہ اِس بُوڑھے گاندھی کو گولی سے اُڑا دیتے. لیکن کھانا ختم ہو جانے کے بعد وائسرائے صاحب جا کر ایک صوفے پر بیٹھ گئے. ایک اے ۔ ڈی ۔ سی مہمانوں کو ایک ایک کر کے اُن کے پاس لے جاتا تھا اور ہر آدمی کو صرف پانچ منٹ کا وقت دیا جاتا تھا. میں پندرہ منٹ تک باتیں کرتا رہا اور وائسرائے صاحب کا سارا پروگرام گڑبڑ ہو گیا. دس منٹ زیادہ لگ گئے. اس پر اے ۔ ڈی ۔ سی نے مجھے اتنا گھور کر دیکھا جیسے انگریز سامراج کی بنیاد ہل گئی ہو."

"کیا کیا باتیں ہوئیں؟"

"وائسرائے صاحب نے پہلی ہی غلطی تو یہ کی کہ وہ مجھ سے پوچھ بیٹھے کہ میں نے ہندوستان میں کیا دیکھا."

"اور آپ نے انہیں جو کچھ دیکھا تھا بتا دیا؟"

"ایک ایک بات کھول کر اُن کے سامنے رکھ دی. لاٹھی چارج، بمبئی میں عورتوں کا جلوس، گجرات کے کسانوں کی بغاوت ــ میں نے سارا کچا چٹھا اُن کے سامنے کھول کر رکھ دیا. میں نے ہز اکسلنسی کو یہ بھی وارننگ دی کہ شملہ میں وہ ایک آتش فشاں کے دہانے پر بیٹھے ہیں. جو پہلے ہی پھٹ چکا ہے."

"یہ بات تو انہیں اچھی نہیں لگی ہو گی؟"

"میرے خیال سے تو اچھی نہیں لگی ہوگی۔ لیکن انور سچ کہتا ہوں مجھے اُس بیچارے پر ترس آتا ہے جس ملک پر وہ حکومت کرتا ہے اُس کے بارے میں اُسے بہت ہی تھوڑی واقفیت ہے تمہیں اندازہ نہیں کہ شملہ کے لوگ کتنے جاہل ہیں۔"

"اِس میں کس کا قصور ہے؟"

"ظاہر ہے کہ حکومت کے اس طریقے کا جو انہیں گرمی اور دھول اور ملک کی حقیقتوں سے بچا کر انہیں یہاں اتنی دور بٹھا کر رکھتا ہے۔ یہاں کوئی اخبار پڑھتا ہی نہیں ہے کیونکہ یہاں اخبار دو تین دن دیر میں پہنچتے ہیں۔ ہر آدمی یہاں تک کہ وائسرائے بھی، دائرکٹی کی بھیجی ہوئی رپورٹ پڑھتا ہے جس میں خبروں کو بہت کاٹ چھانٹ کر یک طرفہ ڈھنگ سے اور بہت ہی اختصار سے پیش کیا جاتا ہے۔ ہوم ڈیپارٹمنٹ صوبوں کی راجدھانیوں سے آنے والی رپورٹیں وائسرائے کے پاس بھیجتا ہے لیکن جو کچھ ہوتا ہے اُس کے موٹے موٹے خاکے کے پتہ چلنے میں بھی ایک ایک ہفتہ لگ جاتا ہے۔"

لیکن انور تو یہ جاننے کے لئے بے چین تھا کہ وائسرائے نے کیا کہا۔

"میں نے اُن سے پوچھا کہ گاندھی جی کے بارے میں اُن کی کیا رائے ہے۔ اور انہوں نے اپنی رائے بتائی لیکن اس شرط پر کہ میں کسی سے کہوں گا نہیں۔ ہر اخبار نویس کو وائسرائے سے اسی شرط پر ملنے دیا جاتا ہے کہ لاٹ صاحب جو کچھ بھی کہیں گے اُسے وہ کسی سے کہے گا نہیں۔ لیکن تمہیں میں بتا سکتا ہوں۔ مجھے ان کی بات اچھی طرح یاد ہے کیونکہ مجھے ایک وائسرائے کے لئے ایسی بات کہنا کچھ عجیب لگا تھا۔ انہوں نے بڑی چالاکی سے گول مول بات کہی تھی لیکن اُن کی رائے کچھ اچھی نہیں تھی۔ انہوں

نے کہا، جب میں پہلی بار گاندھی سے ملا تو میں ان کے تقدس سے بہت متاثر ہوا۔ میں اُن سے دوبارہ ملا تو مجھ پر قانونی معاملوں میں ان کی چالاکی کا بہت اثر پڑا۔ تیسری بار ملنے پر مجھے اس بات کا یقین ہو گیا، جب میں نے پوچھا 'لورڈ اکسلسی' آپ کو ان دونوں میں کس بات کا یقین ہو گیا؟' تو انہوں نے مسکرا کر صرف اتنا کہا 'اس کا فیصلہ آپ خود کر لیں'۔

وائسرائے کے اس مذاق پر انور کو کچھ خاص خوشی نہیں ہوئی۔ 'تو اس کا مطلب یہ ہے کہ سرکار سمجھوتہ کرنے پر تیار نہیں ہے اور ایک طرح سے مجھے اس بات کی خوشی ہی ہے۔'

" وائسرائے کی باتوں سے تو مجھے ایسا نہیں لگا۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ لاکھ معلومات نہ ہوتے ہوئے بھی انہیں اب اس بات پر الجھن ہونے لگی ہے کہ گاندھی جی کی اہنسا کو کچلنے کے لئے انہیں پولیس کے ڈنڈوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ اس بات کو نہ بھولو کہ وہ بھی اپنی اس شہرت کو قائم رکھنا چاہتے ہیں کہ وہ 'عیسائی وائسرائے' ہیں جب وقت آئے گا اور ولایت میں سرکار اہنسا کی طاقت محسوس کرنے لگے گی تب وہ بھی گاندھی جی سے سمجھوتے کی بات چیت کرنے پر فوراً راضی ہو جائیں گے۔"

" اہنسا کی طاقت یا ولایتی مال کے بائیکاٹ کا اثر؟"

" انگریز کے لئے دونوں ایک ہی چیز ہیں۔"

ملس کے ساتھ کام کرنے میں سب سے بڑا فائدہ یہی تھا کہ اس میں خیالات کے لین دین کا اور ذہنی داؤ پیچ دکھانے کا بہت موقع ملتا تھا۔ اس سے انور کا دماغ بھی تیز رہتا تھا اور زندگی اور کام کے بارے میں اُس کا جوش برقرار رہتا تھا۔

شملہ میں، گرمیوں میں سرکار کی راجدھانی ضرور رہتی تھی لیکن وہاں خبریں کوئی نہیں ملتی تھیں۔ اِس لئے وہاں کے ٹھنڈے موسم کا کافی دن تک لُطف اٹھانے کے بعد انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ پہاڑ سے نیچے اُتر کر اپنا دورہ پھر شروع کریں گے اور الگ الگ صوبوں میں ستیہ گرہ کی تحریک کا حال دیکھیں گے۔ ایک دن رات، کو سیسل ہوٹل میں کھانا کھاتے ہوئے انور نے رابرٹ کے کان میں کہا: "وہ سر تیج بہادر سپرو بیٹھے ہیں۔ اُن کے یہاں ہونے میں بھی کوئی سیاسی چال ضرور ہوگی۔" انور نے بتایا کہ سپرو اور جیکر کو "سیاست کے میدان کے جُڑواں بھائی" کہا جاتا تھا اور چونکہ یہ بات سب کو معلوم تھی کہ جیکر صاحب سرکار اور کانگریس کے درمیان سمجھوتہ کرانے کی کوشش کر رہے تھے اس لئے سپرو کا بھی اس میں شامل ہونا ضروری تھا۔

کمرے میں واپس پہنچ کر انور نے "سٹیٹسمین" اُٹھا کر دیکھا۔ اس میں لکھا تھا کہ اُس سے پچھلی رات کو سپرو نے وائسرائے کے ساتھ کھانا کھایا تھا۔ دوسرے دن انور نے ہوٹل کے دفتر میں پُوچھا تو معلوم ہوا کہ سر تیج اُس دن الٰہ آباد واپس جا رہے تھے۔

"وہ الٰہ آباد میں ہی رہتے ہیں نا؟" ملس نے پوچھا۔

"ہاں۔" انور نے جواب دیا "لیکن ساتھ ہی یہ بات بھی ہے کہ وہیں نینی جیل میں جواہر لال بھی بند ہیں۔ اگر سپرو صاحب کو اپنے گھر ہی واپس جانا ہوتا تو وہ صرف دو دن کے لئے شملہ نہ آتے۔"

(۱۱)

اتفاق کچھ ایسا ہوا کہ کچھ دن بعد جب الٰہ آباد کے پاس نینی کے چھوٹے سے سٹیشن پر ایک دن کافی رات گئے جیل کی گاڑی میں پنڈت موتی لال نہرو، جواہر لال

اور ڈاکٹر محمود کو لایا گیا تو وہاں صرف دو ہی اخبار نویس موجود تھے۔ ملس اور انور جیل کی گاڑی سے اُتر کر انہیں سیدھے ایک سنسان پلیٹ فارم پر لے جایا گیا۔ وہاں ایک سپیشل ٹرین ان کے لئے کھڑی تھی۔ انجن سے دُھواں نکل رہا تھا اور گاڑی پونا جانے کے لئے تیار تھی۔ انور نے دیکھا کہ موتی لال جی بیمار لگ رہے تھے اور اُن کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔ اُس نے موقع پا کر جواہر لال سے پوچھ ہی تو لیا۔ "آپ کی رائے میں کیا سمجھوتہ ہونے کی کوئی گنجائش ہے؟" اتنے میں گاڑی چل پڑی اور انور کے سوال کے جواب میں جواہر لال نے اپنے پاس سیٹ پر رکھا ہوا اُس دن کا اخبار اٹھا کر اُس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بڑی کڑواہٹ کے ساتھ پوچھا۔ "کیا یہ سمجھوتے کی نشانی ہے؟" اخبار کے پہلے ہی صفحے پر ایک خوفناک لاٹھی چارج اور کانگریس کے قائم مقام صدر ولبھ بھائی پٹیل، پنڈت مدن موہن مالویہ، تصدق شیروانی اور ورکنگ کمیٹی کے دوسرے ممبروں کی گرفتاری کی خبر چھپی ہوئی تھی۔ انور کو اُن کے پیچھے "بائیکلہ ہاؤس آف کرکشن" کا بڑا سا سائن بورڈ لگا دیکھ کر بہت ہنسی آئی۔ یہاں بگڑے ہوئے آوارہ بچوں کو سُدھارنے کے لئے رکھا جاتا تھا۔

جب ٹرین چلی گئی تو ملس نے کہا۔ "ان لوگوں کو اس طرح جاتے دیکھ کر مجھے اُس بند گاڑی کی یاد آ گئی جس میں لینن کو انقلاب شروع کرنے کے لئے جرمنی سے روس لے جایا گیا تھا۔

"ہمیں تو ہندوستان میں جو انقلاب آ رہا ہے اُس کی خبریں جمع کرنی ہیں چلئے ہم لوگ اپنا کام کریں۔ جواہر لال کی صورت دیکھ کر تو مجھے اس بات کا یقین ہو گیا کہ کوئی سمجھوتہ نہیں ہو گا۔"

اور ایک بار پھر اُس پرانے اخبار نویس نے انور کو وارننگ دی: "انور کسی بات کا اتنا زیادہ یقین نہیں رکھنا چاہیے۔"

(۱۲)

انہوں نے یو۔پی میں اپنا دورہ شروع کیا۔ کانگریس نے یہاں کے کسانوں کو منظّم کر کے لگان ادا نہ کرنے کی تحریک چلائی تھی۔ کانگریس نے زمینداروں سے بھی کہا تھا کہ وہ سرکار کو مالگذاری نہ دیں لیکن وہ تو سرکار کی مہربانی پر پلتے تھے، اس لئے اُن میں سے تقریباً سب ہی نے مالگذاری ادا کر دی تھی۔ یہاں تک کہ اُن زمینداروں نے بھی جو کانگریس کی تحریک کے ساتھ ہمدردی رکھنے کا دم بھرتے تھے چُپکے سے سرکار کی مالگذاری بھر دی تھی، لیکن اَن پڑھ اور غریب کسان اپنی جگہ پر ڈٹے رہے اور اُنہوں نے لگان نہیں دیا۔ اُن کی غریبی نے انہیں اپنی جان کی بازی لگا دینے کی ہمّت دی تھی اُن کے پاس کھونے کو تھا ہی کیا!

"کانگریس نے ہندوستان کے گاؤں میں سماج واد کا پیغام پہنچا دیا ہے اور کسانوں کی آنکھیں کھول دی ہیں"، ہلس نے اپنی ایک رپورٹ میں لکھا "لیکن ایک دن کانگریس خود پچھتائے گی جب وہ دیکھے گی کہ سماج واد کی تحریک کے بڑھنے سے اس کے لئے خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔" انور نے یہ پڑھ کر کہا۔ "رابرٹ، تم بھی بلا کے بدگمان ہو۔"

گاؤں کا دورہ کرتے ہوئے بیچ بیچ میں وہ گنگا کے کنارے کے مشہور تاریخی شہروں کا دورہ بھی کرتے تھے — الٰہ آباد جسے پرانے زمانے میں پریاگ کہا جاتا تھا اور جو گنگا اور جمنا کے پوتر سنگم پر بسا ہوا تھا، گومتی کے کنارے بسا ہوا لکھنؤ

جہاں اودھ کے نوابوں کے خاندان والے ابھی تک وظیفہ پاتے تھے اور اپنے بیتے ہوئے عیش کے دنوں پر آنسو بہاتے تھے، کانپور کا تیزی سے بڑھتا ہوا صنعتی شہر جہاں مزدوروں میں بے چینی پیدا ہونے لگی تھی اور جہاں اب سے سات سال پہلے ہندوستانی کمیونسٹوں نے اپنی پہلی کانفرنس کی تھی۔ دن رات ایک جگہ سے دوسری جگہ گھومتے ہوئے اور سیاسی ہلچل کی خبریں جمع کرتے ہوئے انور نے اپنے دل کے درد کو دبا لیا تھا۔ لیکن ایک دن کانپور کے سٹیشن پر ویٹنگ روم میں بیٹھے بیٹھے اُس نے وقت کاٹنے کے لیے "السٹریٹیڈ ویکلی" کا پرانا شمارہ اُٹھا لیا۔ اچانک ایک صفحے پر جس پر نئے شادی شدہ جوڑوں کی تصویریں چھپی تھیں، اُسے سلمہ اور منظور کی تصویر دکھائی دی۔ سلمہ کا چہرہ خوشی کے مارے پھول کی طرح کھلا ہوا چہرہ دیکھ کر انور کو ایسا لگا جیسے کوئی اُسے کوڑے مار رہا ہو۔ تصویر کے نیچے لکھا ہوا تھا

"علی گڑھ یونیورسٹی کے پروفیسر ایم۔ سلیم کی بیٹی سلمہ خاتون جس کی شادی ابھی کچھ دن پہلے یو۔ پی پولیس سروس کے مسٹر منظور احمد کے ساتھ ہوئی جو آج کل کانپور میں متعین ہیں۔"

اُسی دن بعد میں ایک پھٹیچر تانگے پر سول لائنز سے گذرتے ہوئے انور نے ایک بنگلہ دیکھا جس کے چاروں طرف مہندی کی جھاڑیاں لگی ہوئی تھیں جنہیں بہت صفائی سے کاٹ رکھا گیا تھا اور گیٹ پر ایک تختی لگی تھی جس پر لکھا تھا منظور احمد ڈی۔ ایس۔ پی ۔ تو یہاں رہتی تھی اس کی سلمہ ــــ ان جھاڑیوں کے پیچھے۔ اگر وہ اُس کا نام لے کر پکارتا تو وہ سُن لیتی۔ اگر وہ پھاٹک کے اندر چلا جاتا تو اس سے مل سکتا تھا۔ وہ سلمہ کے کتنا قریب تھا ــــ پھر بھی کتنا دور!

"کیا ہوا تمہیں؟" ملس نے پوچھا۔ تانگہ ہچکولے کھاتا ہوا چل رہا تھا۔ "ایسا لگتا ہے جیسے تم نے کوئی بھوت دیکھا ہو۔"

انور کے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ "شاید بھوت ہی دیکھا ہے۔"

انور بہت خوش ہوا کہ اُسی رات وہ کلکتہ کے لئے روانہ ہو گئے۔ وہ کانپور سے دُور چلا جانا چاہتا تھا ــــ بہت دُور۔

(۱۳)

اِس کے بعد چھ مہینے تک اُن کی زندگی ریل گاڑی کے پہیوں کی گڑگڑاہٹ کی دُھن پر ہی چلتی رہی۔ وہ سارے ملک کا دورہ کرتے رہے۔ کسی پبلشر نے ملس سے ایک کتاب لکھنے کو کہا تھا اس لئے اب وہ جہاں بھی جاتا تھا وہاں زیادہ دن تک ٹھہرتا تھا اور موجودہ سیاست کی سطح کے نیچے ہندوستانی زندگی کو زیادہ گہرائی سے دیکھتا تھا۔ کلکتہ میں انور نے رائے کا پتہ لگانے کی کوشش کی لیکن وہ جیل میں تھا۔ اُن کی ملاقات جوشیلے نوجوانوں سے ہوئی، جنہوں نے کھلے طور پر انہیں بتایا کہ وہ مہاتما گاندھی کو صرف یہ ثابت کرنے کا موقع دے رہے ہیں کہ اُن کی اہنسا کارگر ہو سکتی ہے اور اگر وہ کامیاب نہ ہوئے تو وہ بم اور ریوالور کا اپنا طریقہ استعمال کریں گے۔ کچھ نوجوان تو ستیہ گرہ کی کامیابی سے مایوس بھی ہو چکے تھے اور اُنھوں نے مشرقی بنگال میں چٹاگانگ میں جان ہتھیلی پر رکھ کر ایک فوجی چوکی پر چھاپہ مارا تھا اور انقلابی تحریک کے بہادرانہ واقعات میں "چٹاگانگ اسلحہ خانے پر دھاوا" کا بھی ذکر کیا جانے لگا تھا۔ وہ شانتی نکیتن میں رابندر ناتھ ٹیگور سے بھی ملے تھے۔ وہ شاعر تھے، فلسفی تھے اور حُسن شناس تھے۔ اِس طرح وہ گاندھی جی سے بالکل مختلف تھے لیکن دونوں ایک دُوسرے کی بہت عزت کرتے تھے۔ سال بھر سیاست کی ہلچل میں پھنسے رہنے کے بعد انور کو شانتی نکیتن جا کر بڑا سکون ملا۔ بارش

ابھی ختم ہی ہوئی تھی۔ چاروں طرف ہریالی چھائی ہوئی تھی۔ ہر طرف سکون ہی سکون تھا۔ وہ اپنی مرضی کے مطابق کہیں بھی جاسکتا تھا۔ کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔ پیڑ کے نیچے گھاس پر بیٹھے ہوئے کچھ لڑکے اُستاد کی تقریر سُن رہے تھے۔ ناچ گھر میں کالی کالی آنکھوں والی دبلی پتلی بنگالی لڑکیاں منی پوری رقص کی دل کو لُبھانے والے نرت کی مشق کر رہی تھیں۔ ایک جگہ کوئی گائک اپنی گونجتی ہوئی آواز میں ٹیگور کے گیت گا رہا تھا۔

بارش ختم ہو کر اب موسم خزاں شروع ہو گیا تھا، اس لئے سفر کرنے میں بھی اب کوئی تکلیف نہیں ہوتی تھی۔ دُور تک پھیلے ہوئے دھان کے کھیتوں کو پار کرتے ہوئے جن پر زمینداروں کا قبضہ تھا، وہ بنگال سے بہار پہنچے۔ یہی مہاتما بدھ کا قدیم مُلک تھا جنہوں نے علیسٰی سے بھی پہلے اہنسا کا اُپدیش دیا تھا۔ یہاں سے وہ یوپی اور دلّی ہوتے ہوئے پنجاب کے لہلہاتے ہوئے گیہوں کے کھیتوں کے درمیان پہنچے۔ انور ملس کو تاریخی جلیان والا باغ دکھانے لے گیا اور دیواروں پر گولیوں کے نشان دیکھ کر اُسے دس سال پہلے کے اُن خوفناک لمحوں کی یاد آ گئی۔

اب تک پُرانے زمانے سے جتنے لوگوں نے بھی ہندوستان پر حملہ کیا تھا وہ سب پشاور سے لاہور آئے تھے مگر وہ اُلٹے رُخ میں لاہور سے پشاور جا رہے تھے۔ قسمت سے یونس جیل کے باہر تھا۔ ایک ہی سال کے اندر وہ کافی لمبا ہو گیا تھا اور رنگ بڑا لگنے لگا تھا اُس نے اُن دونوں کو دکھایا کہ اُس کے وطن میں کیسا معجزہ ہو گیا تھا۔ صرف اتنا ہی نہیں ہوا تھا ہمیشہ سے اپنی بہادری کے لئے سراہے جانے والے پٹھانوں نے اب اہنسا کا راستہ اپنا لیا تھا اور وہ موت کو نفرت سے دیکھنے لگے تھے بلکہ اُن کی ایک مضبوط سیاسی اور سماجی تنظیم بھی بن گئی تھی جس میں آنے کے بعد قبیلوں اور خاندانوں کے سارے پُرانے

جھگڑے مٹ گئے تھے۔ اس تنظیم کا کانگریس کے ساتھ گہرا تعلق تھا اور یہ لوگ اپنے آپ کو "خدائی خدمت گار" کہتے تھے اور وہ سیاسی شعور پھیلانے کے ساتھ ساتھ تعلیم، سماج سدھار اور ایک جہتی کے لئے بھی کام کرتے تھے۔ کیونکہ اس علاقے کے اُس پار جہاں دو ملکوں کی سرحد بھی ٹھیک سے طے نہیں تھی، خوفناک قبائلی لوگوں کی بستیاں تھیں جن کی گولی کا نشانہ کبھی نہیں چوکتا تھا اور جو ذرا ذرا سی بات پر مرنے مارنے پر آمادہ رہتے تھے اور چونکہ انگریزوں نے یہ ہوّا کھڑا کر رکھا تھا کہ روسی کسی بھی وقت افغانستان کے راستے ہندوستان پر حملہ کر سکتے ہیں، اس لئے سرکار اس علاقے کو فوجی بچاؤ کے نظریئے سے کافی اہمیت دیتی تھی۔ اس لئے یہاں دباؤ بھی زیادہ ہوا تھا۔ دوسری جگہوں پر جتنی لاٹھیاں چلی ہوں گی اُتنی ہی بار یہاں گولیاں چلی تھیں۔

یونس نے انہیں ایک کمال کا واقعہ بتایا جس کے بارے میں اخباروں میں تقریباً کچھ نہیں کہا گیا تھا۔ ظاہر تھا کہ پشاور سے آنے والی ان خبروں کو سنسر کر دیا گیا تھا۔ ہمیشہ سے سرکار سے وفادار گڑھوالی سپاہیوں کے ایک دستے کو اُن کے انگریز افسروں نے پشاور کے ایک بڑی سڑک پر آتے ہوئے جلوس پر گولی چلانے کا حکم دیا لیکن گڑھوالیوں نے انکار کر دیا، کورٹ مارشل کی دھمکی دینے پر بھی انہوں نے گولی نہیں چلائی۔ اُن سب کو لمبی سزائیں دے دی گئیں لیکن عام لوگوں پر اس کا بہت گہرا اثر پڑا۔

(۱۴)

۲۶ جنوری ۱۹۳۲ء ـــــ ایک اور آزادی دیوس، یونس اس موقع پر اُن دونوں کو ایک گاؤں میں لے گیا جو لال کُرتی والے خدائی خدمت گاروں کا گڑھ تھا اور جہاں وہ کانگریس کا جھنڈا لہرا کر آزادی کا عہد کرنے والے تھے۔

کچھ سو طاقت ور اور لمبے چوڑے پٹھانوں کے سامنے جب پشتو زبان میں آزادی کا عہدنامہ پڑھا گیا تو انور کے کانوں کو وہ کچھ عجیب سا لگا۔ اُن میں سے زیادہ تر پٹھان سُرخ بھورے رنگ کی کھدّر کی قمیص پہنے تھے۔ اپنے اس لباس کی وجہ سے اُن کا نام "لال کُرتی والے" پڑ گیا تھا۔ اُن کے پیچھے مشہور درّۂ خیبر دکھائی دے رہا تھا۔ انور سوچنے لگا کہ ان بہادر پٹھانوں نے بہت سی صلاحیتیں ان ہی سخت اور ویران پہاڑیوں سے حاصل کی ہیں جن کے درمیان وہ صدیوں سے رہتے آئے ہیں ــــ

جب جھنڈا لہرانے کی رسم ختم ہو گئی تو انہیں خیبر درّے کی طرف سے بار بار گولیاں چلنے کی آواز آتی ہوئی سُنائی دی اور تھوڑی ہی دیر بعد دو ہوائی جہاز پہاڑیوں پر نیچے نیچے اُڑتے ہوئے دکھائی دیئے اور کہیں بہت دُور چٹانوں کے درمیان بم کا دھماکہ سُنائی دیا۔

آر۔ اے۔ ایف۔ کے ہوائی جہاز باغی سرحدی علاقوں میں باغیوں کو سزا دے رہے تھے ــــ سامراج وادی ہندوستان میں چلنے والی تحریک سے جھنجھلا کر اب سرحد کے اس پار اپنی 'فارورڈ پالیسی' پھیلا رہے تھے۔

وہ سب موٹر پر واپس پشاور پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ بازار میں بڑی ہلچل ہے۔ کوئی بہت بڑا واقعہ ہو گیا تھا۔ انہوں نے موٹر روک کر ایک آدمی سے پوچھا کہ آخر بات کیا تھی؟ اس سیدھے سادے پٹھان نے بڑے جوش کے ساتھ پشتو میں کہا ــــ

"گاندھی خان کو چھوڑ دیا!

"جواہر خان کو چھوڑ دیا!

"انقلاب خان کو مگر نہیں چھوڑا۔ کیوں؟"

جب وہ دِلّی پہنچے اُس وقت تک گاندھی۔ اِروِن سمجھوتے کی بات چیت شروع ہوگئی تھی اور ونسٹن چرچل نے بہت آگ بگولہ ہوکر کہا تھا کہ عجیب اندھیر ہے کہ ایک ننگا فقیر ہز میجسٹی کنگ ایمپرر کے نمائندے کے ساتھ برابری سے بات چیت کرنے کے لیئے وائسرائے کی کوٹھی کی سیڑھیوں پر چڑھے گا۔

کانگریس کے لیڈر ڈاکٹر انصاری کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے اور وہاں انور بغیر روک ٹوک کے بھی جاسکتا تھا جس کی وجہ سے اُسے دوسرے نامہ نگاروں کی طرح برآمدے میں بیٹھ کر انتظار نہیں کرنا پڑتا تھا۔ اس نے دیکھا کہ جواہرلال اپنے باپ کے مرجانے کی وجہ سے بہت اُداس تھے۔ بادشاہوں جیسی طبیعت رکھنے والے موتی لال جی جیل سے چھوٹنے کے کچھ ہی دن بعد مر گئے تھے۔ سروجنی نائیڈو بھی وہاں موجود تھیں۔ نوجوان انور اس بوڑھی شاعرہ سے بے حد متاثر ہوا تھا۔ اُنہوں نے ڈرائینگ روم کے ایک کونے میں اپنا دربار لگا رکھا تھا جہاں اُن کے پرانے دوستوں اور نوجوان چاہنے والوں کا جمگھٹا تھا اور اُنہیں وہ اپنی معلومات سے پُر باتیں سُنا رہی تھیں اور درمیان میں اُنہیں ہنساتی بھی جاتی تھیں۔ سارے ملک کے مختلف صوبوں کے بہت سے لیڈر بھی آئے ہوئے تھے اور ڈاکٹر انصاری کے باورچیوں کو اتنے بہت سے لوگوں کو الگ الگ اُن کی پسند کا کھانا کھلانے میں بہت مشکل پڑرہی تھی۔ کچھ کانگریسی لیڈروں کا کھانا تو سب سے الگ ہوتا تھا۔ گاندھی جی تو صرف بکری کا دُودھ پیتے تھے اور کھجوریں کھاتے تھے۔ اُن کے ایک چیلے صرف دہی کھاتے تھے۔ ایک اور صاحب تھے جو صرف درجن بھر سنترے اور چھ سیب کھاکر زندہ رہتے تھے۔

سارا گھر ایک عجیب سیاسی سرائے بنا ہوا تھا۔ دن بھر اور رات کے وقت۔ بھی سیاست داں، اخبار نویس، اخباروں کے فوٹو گرافر، بدیسی تماشبین اور موقع پرست لوگ وہاں منڈلاتے رہتے تھے۔ ان میں سے کچھ تو ابھی کل تک سرکار کے پٹھو تھے لیکن اب ہوا کا رخ پلٹتا ہوا دیکھ کر انہوں نے کانگریسیوں کے ساتھ میل جول بڑھانا شروع کیا تھا۔ بات چیت چلتے ہوئے کئی ہفتے ہو گئے تھے پر ابھی تک کوئی سمجھوتہ ہو نہیں پایا تھا۔ فضا میں ایک عجیب تناؤ تھا اور ہر آدمی ایک آس لگائے بیٹھا تھا۔ روز رات کو وائسرائے کی کوٹھی سے گاندھی جی کے واپس لوٹنے پر بند کمرے میں ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ ہوتی تھی۔ لیکن ممبر کوئی بات باہر نہ کہنے کے لئے عہد کئے ہوئے تھے اس لئے اخبار نویسوں کو اپنے تخیّل سے ہی کام لینا پڑتا تھا اور روزانہ خاص نامہ نگاروں کو کوئی نہ کوئی قابلِ فہم کہانی گھڑنی پڑتی تھی۔ کوئی لکھتا سمجھوتے کی بات چیت باہمی خوش خلقی اور نیک خواہشات کے ماحول میں چل رہی تھی۔ حالات پُر امید تھے۔ امید کی جاتی ہے کہ تفصیلات کی کچھ باتوں پر متفق نہ ہونے کی وجہ سے سمجھوتہ ہونے میں دیر لگ رہی ہے۔ وائسرائے نے لندن تار دے کر ہدایتیں مانگی ہیں! مہاتما گاندھی ورکنگ کمیٹی کے ممبروں کے ساتھ سوچ بچار کر کے سمجھوتے کی شرطیں طے کر رہے ہیں۔!

روز رات کو سب لوگ جاگتے رہتے تھے اور گاندھی جی کے وائسرائے کے یہاں سے لوٹنے کا انتظار کرتے تھے، یہ سننے کی امید میں کہ سمجھوتے پر دستخط ہو گئے۔ کبھی کبھی گاندھی جی صبح تک لوٹ کر نہیں آتے تھے اور ان کے آنے میں لگنے والی اس دیر سے ہی لوگوں کو امید بندھنے لگتی تھی۔ اخبار والے دوڑ کر ان کی موٹر کے پاس پہنچتے تھے اور پوچھتے تھے "ہو گیا؟" اور وہ مسکرا کر اپنا سر ہلا دیتے تھے۔ "نہیں، میں دو دن بعد پھر

وائسرائے سے ملنے جاؤں گا۔" پھر کوئی پوچھتا، "کیا آپ کو اب بھی اُمید باقی ہے؟" اور وہ جواب دیتے، "میں کبھی اُمید کا دامن نہیں چھوڑتا۔" پھر کوئی لاچاری سے پوچھتا، "گاندھی جی، کب تک سمجھوتہ ہونے کی اُمید ہے؟" اور گاندھی جی آسمان کی طرف آنکھیں اُٹھا کر کہتے "سب بھگوان کے ہاتھوں میں ہے۔"

(۱۶)

بھگوان ___ اور سمجھوتے کی بات چیت کرنے والے دونوں اصحاب جو مقدس ارواح کی رہنمائی میں یقین رکھتے تھے ___ ساری دنیا کو تین ہفتے تک انتظار کراتے رہے اور لوگوں کی دلچسپی اور پریشانی حد سے زیادہ بڑھ گئی۔ نامہ نگار بھی دیری کے لئے نئے بہانے گڑھتے گڑھتے تنگ آ چکے تھے۔ انور، جو اس گھر میں بغیر روک ٹوک آ جا سکتا تھا، باقی لوگوں سے کچھ زیادہ معلومات رکھتا تھا۔ ایک بار سمجھوتے کی بات چیت میں کچھ دن خالی چلے گئے تو لوگ سمجھنے لگے کہ بات چیت ناکامیاب رہی۔ کچھ لیڈر تو اپنا اپنا بوریا بستر بھی باندھنے لگے اور ورکنگ کمیٹی نے پھر سے جدّوجہد شروع کرنے کی تجویز پر غور کرنے کے لئے ایک لمبی بیٹھک کی لیکن دوسرے ہی دن وائسرائے کا ایک پیغام رساں گاندھی جی کے لئے ایک مہر بند لفافہ لایا اور بعد میں یہ پتہ چلا کہ اسی رات کو دونوں پھر ملیں گے۔

شام کو گاندھی جی مکان کی ایک چھت پر پرارتھنا کرنے والے تھے۔ چھت پر سے سامنے ہی جمنا کا خوبصورت نظارہ دکھائی پڑتا تھا۔ اس موقع پر بہت سے لوگ وہاں جمع تھے۔ کچھ لوگ تو اپنی مذہبیت کی وجہ سے وہاں اکٹھا ہوئے تھے اور کچھ لوگ محض دلچسپی کی وجہ سے آ گئے تھے۔ جب پرارتھنا ختم ہوئی اور لوگ جانے لگے تو دودھ جیسے سفید کھدّر کے کپڑے پہنے ہوئے کسی آدمی نے انور کو نام لے کر پکارا۔ ایک پل کے

لئے تو انور انہیں پہچان نہیں پایا، مگر پھر یکایک اسے خیال آیا کہ وہ سیٹھ مانک لال شاہ تھے۔ وہ یہاں کیا کر رہے ہیں؟ اس نے سوچا۔

"ہیلو انور" وہ ضرورت سے زیادہ تپاک سے انور سے ملے اور یہ بتانے کے بعد کہ وہ کسی کام سے دلّی آئے تھے اور ماں جی، آشا اور موہنا کے بارے میں انور کے سوالوں کا جواب دینے کے بعد وہ فوراً اپنے مطلب کی بات پر آ گئے، "انور، تمہاری کیا رائے ہے؟ کیا سمجھوتہ ہو جائے گا؟"

انور خود ابھی تک اس سلسلے میں کوئی فیصلہ نہیں کر پایا تھا، پھر بھی اس نے کہا، "وائسرائے نے پھر گاندھی جی کو بلایا ہے، اس لئے کچھ امید تو ہے۔"

"تھینک یو" اتنا کہہ کر سیٹھ جی غائب ہو گئے اور انور اپنے خیالوں میں کھویا کھڑا رہا۔

(۱۰)

اس رات سب سوالوں کا جواب مل گیا اور سارے شک دُور ہو گئے۔ امیدوں کا ٹوٹ جانا بھی ہفتوں کی اس تشویش سے بہتر تھا۔

آدھی رات کے بعد اندھیرے کو چیرتی ہوئی موٹر کی تیز روشنیاں آگے بڑھتی ہوئی دکھائی دیں۔ سب لوگ گاندھی جی کا استقبال کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے لیکن موٹر پر صرف ایک جوشیلا اخبار نویس تھا، ایک مقامی اخبار کا چیف رپورٹر۔ "ہو گیا" اس نے چلا کر کہا۔ "میں سیدھا وائسریگل لاج سے آ رہا ہوں۔ ان لوگوں نے کاغذ اور قلم منگوایا ہے۔"

گھنٹے بھر بعد گاندھی جی موٹر پر آئے۔ موٹر جو خود وائسرائے کی تھی۔ اس پر نمبر کی جگہ تاج لگا ہوا تھا۔ گاندھی جی کے ہاتھ میں ایک لپٹا ہوا کاغذ تھا۔ جواہر لال آدھی رات سے کچھ پہلے ہی جا کر سو گئے تھے۔ انہیں جگایا گیا اور وہ آنکھیں ملتے ہوئے گاندھی جی سے ملنے آئے۔ پھر دونوں ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ کرنے اندر چلے گئے۔ میٹنگ بہت تھوڑی دیر چلی۔

سمجھوتے کی شرطیں ممبروں کو پڑھ کر سنائی گئیں اور پھر سب لوگ سونے چلے گئے۔

انور کہیں سے سمجھوتے کی ایک نقل لے آیا اور اُس کی شرطیں پڑھ کر اس کا دل بیٹھنے لگا۔ اس میں تو شک نہیں کہ سرکار کو کچھ جھکنا پڑا تھا اور یہ سمجھوتہ خود اِس بات کا ثبوت تھا کہ سرکار نے کانگریس اور گاندھی جی کی طاقت اور ساکھ کو مان لیا تھا۔ مگر انور کو لاکھ ڈھونڈنے پر بھی کہیں اِس بات کا ذکر نہیں ملا کہ ہندوستان کو آزادی اور آزاد ہونے کا حق دیا گیا ہے" ہندوستان کی دستوری حکومت کے منصوبے" کا جہاں پر ذکر کیا گیا تھا وہیں پر "مدافعت، بیرونی معاملات اقلیتوں کی حالت، ہندوستان کے مالی قرض اور معاہدوں کی انجام دہی" کے بارے میں حقوق انگریز سرکار نے اپنے ہاتھ میں روک بھی لئے تھے۔ گاندھی جی نے اس شرط میں اتنا ضرور اضافہ کروا لیا تھا کہ یہ سب ہندوستان کے مفاد میں ہوں گے۔ لیکن یہ ایک جھوٹی تسلی تھی۔ کیونکہ اس کا مطلب ہمیشہ دو طرح سے نکالا جا سکتا تھا۔ کیا یہ سامراج واد کا دعویٰ نہیں تھا کہ ہندوستانیوں کو آزادی نہ دینا بھی" ہندوستان کے مفاد میں" تھا؟۔

رات بہت ہو گئی تھی۔ وہ اب گھر نہیں جا سکتا تھا۔ اس نے ٹیلیفون پر مِلس کو سمجھوتے کا خلاصہ بتایا اور ڈرائینگ رُوم میں صوفے پر لیٹ گیا۔ لیکن اُسے نیند نہیں آئی۔ بغل والے کمرے میں روشنی ہو رہی تھی اور اس نے دروازے کے شیشے سے جھانک کر دیکھا۔ کہ جواہر لال بھی جاگ رہے ہیں۔ وہ خیالوں میں ڈوبے ہوئے بیٹھے تھے اور سامنے رات کے اندھیرے میں گھور رہے تھے۔ انور سوچنے لگا کہ شاید وہ راوی کے کنارے کی اُس یادگار رات کے بارے میں سوچ رہے ہوں گے، عوام کے بہادرانہ کارناموں کو، لوگوں نے جو مصیبتیں جھیلی تھیں اُن کو اور اُن کی قربانیوں کو یاد کر رہے ہوں گے۔ اُس لمحے انور کو ایسا لگا کہ اُس کے دل میں بھی وہی درد اور اداسی تھی جو اُس خوبصورت چہرے پر

صاف جھلک رہی تھی جسے وہ اتنی دیر سے اپنے سارے جذبات، خیالات اور اُمیدوں کی نشانی سمجھتا آیا تھا۔

یہی سوچتے سوچتے اُس کی آنکھ لگ گئی اور جب اس کی آنکھ کھُلی اُس وقت رات کے پچھلے پہر کی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی، ندی کی طرف سے آنے والی ہوا کے جھونکے سے ایک کھڑکی کھُل گئی تھی اور جب وہ کھڑکی بند کرنے کے لئے اُٹھا تو اُس نے دیکھا کہ جواہر لال کا کمرہ خالی پڑا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ روز اس وقت وہ گاندھی جی کے ساتھ ٹہلنے جاتے تھے اس لئے وہ ہمت کر کے کمرے میں چلا گیا جہاں وہ بیٹھے تھے، وہاں میز پر لیمپ کے پاس ایک پیڈ رکھا تھا جس پر بار بار اُنہوں نے انگریزی میں ایک نظم کی دو سطریں لکھ رکھی تھیں۔

This is the way the world ends,

Not with a bang but a whimper.

(دنیا کا خاتمہ اسی طرح ہوتا ہے — دھماکے کے ساتھ نہیں بلکہ ایک ہلکی سی ہچکی کے ساتھ)

جب وہ نکل کر باہر برآمدے میں آیا تو اُس نے گاندھی جی اور جواہر لال کو ٹہل کر واپس لوٹتے ہوئے دیکھا۔ گاندھی جی ہمیشہ کی طرح مطمئن اور ہشاش بشاش تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے انہوں نے اپنے غیر مطمئن چیلے کو مطمئن نہیں تو راضی کر لیا تھا۔ رات بھر جاگتے رہنے کے باوجود جواہر لال بھی زیادہ خاموش دکھائی دے رہے تھے۔ انور سوچنے لگا کہ شاید اُن کے چہرے سے ظاہر ہونیوالا یہ سکون اُس کھلاڑی کے جیسا ہے جو ہار جانے پر بھی مایوس نہیں ہوتا۔

ندی کے پار مشرقی اُفق پر دھیرے دھیرے صبح کی لالی پھیلتی جارہی تھی۔ ایک نئے دن کا سویرا ہو رہا تھا۔ انور نے اپنے کوٹ کا کالر اونچا کر لیا اور ٹھنڈی ہوا میں کانپتا ہوا وہ ایک پیالی چائے کی تلاش میں باورچی خانے کی طرف چل دیا۔

۲۰

کہاں ہے منزل تیری؟

(۱)

مِلس نیویارک کا جہاز پکڑنے کے لئے بمبئی جارہا تھا۔ جب انور اُسے چھوڑ کر سٹیشن سے گھر لوٹنے لگا تو اُسے ایسا لگا کہ جیسے اچانک وہ اندر سے کھوکھلا ہو گیا ہے۔ سال بھر تک اُس نے مِلس کے ساتھ کام کیا تھا، ہندوستان کو سمجھنے میں اُس کی مدد کی تھی۔ اِس صاف گو اور با اُصول امریکی اخبار نویس کے ساتھ کام کرنا اُسے بہت اچھا لگتا تھا۔ یہ ایک سال اُس کے لئے بہت واقعات سے بھرپور اور پُرجوش رہا تھا اور اُن دونوں نے ساتھ رہ کر بہت سے عجیب اور معرکے کے واقعات دیکھے تھے۔ وہ کانگریس کے کارکنوں سے ملے تھے اور اُنہوں نے پُوری تحریک کو صحیح ڈھنگ سے دیکھنے اور پیش کرنے کی کوشش کی تھی۔ اُنہوں نے بڑے بڑے لوگوں کی باتوں اور اُن کے کاموں کو معقول اہمیت دی تھی۔ لیکن وہ معمولی لوگوں کو ایک پل کے لئے بھی نہیں بھولے تھے جن کے بغیر تحریک میں کبھی اندر اور

انقلابی جوش پیدا نہ ہوتا۔ ملس اکثر کہا کرتا تھا، "لیڈروں کو تو چھوڑ دو۔ اُن کی تقریروں کی خبر دینے کے لئے تو درجنوں نامہ نگار ہیں۔ ہمیں عام لوگوں کا مطالعہ کرنا چاہیے۔" اسی طرح ایک بار اور اُس نے کہا تھا "عوام جس لائق ہوتے ہیں، اُنہیں ویسے ہی لیڈر بھی ملتے ہیں کیونکہ لیڈر کہیں آسمان سے نہیں ٹپکتے ہیں بلکہ عوام کے درمیان سے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ وہ عوام کی شخصیت، اُن کی طاقت، اُن کی کمزوریوں، اُن کی آرزوؤں اور اُن کی اجتماعی خواہشات کو ظاہر کرتے ہیں۔"

انور نے ملس سے اس کے علاوہ اور بھی بہت سی باتیں سیکھی تھیں لیکن انور اکثر سوچا کرتا تھا کہ کیا سفر میں اُس کا ساتھ دینے کے علاوہ بھی اس نے رابرٹ کے لئے کچھ کیا تھا لیکن ملس کا خیال تھا کہ اُس نے اُس کے لئے بہت کچھ کیا تھا اور اسی لئے اس نے اپنی کتاب میں بھی اُس کے لئے شکریہ ادا کیا تھا۔ اُس نے اپنی کتاب "INDIA AWAKES" (ہندوستان جاگتا ہے) پبلشر کے پاس بھیجتے وقت اُسے انور کے نام منسوب کر دیا تھا اور لکھا تھا۔ "انور کے نام۔ جس نے ہندوستان میں میری آنکھوں اور میرے کانوں کا اور اکثر میری زبان کا بھی کام کیا۔"

گھر جاتے ہوئے انور اس انتساب کے بارے میں سوچ رہا تھا اور اُن بحثوں کو یاد کر کے مسکرا رہا تھا جو سارے مُلک کا دورہ کرتے وقت اُس نے ملس کے ساتھ کی تھیں۔ اُسے اس بات کا بڑا افسوس تھا کہ ملس کو واپس جانا پڑا لیکن اُسے اس بات کا اطمینان تھا کہ وہ امریکہ میں بھی ہندوستان کے لئے مفید کام کرے گا۔ اس نے امریکہ میں گھوم گھوم کر مختلف جگہوں پر تقریریں کرنے کا پروگرام بنایا تھا جن میں وہ اپنے مُلک والوں کو بتائے گا کہ اس نے ہندوستان میں کیا دیکھا تھا اور اس طرح کیتھرین میو جیسے مصنّفوں نے امریکیوں

کے سامنے ہندوستان کی جو مسخ تصویر پیش کی تھی، اُس کی جگہ پر وہ ہندوستان کی سچی تصویر پیش کریگا۔ ملِس کے رُوپ میں ہندوستان کو ایک بہت اچھا دوست مل گیا تھا۔ اور انور کو یقین تھا کہ وہ ہمیشہ . . . .

لیکن یکایک اس نے اپنے خیالات کو روک لیا اور مِلس کی اُس نصیحت کو یاد کرکے وہ مسکرا دیا جسے وہ بار بار دُہرایا کرتا تھا "انور، کسی بات کا اتنا پکا یقین نہیں کرنا چاہیئے۔"

(۲)

مِلس ٹھیک ہی کہتا تھا۔ انور کو بہت سی باتوں کا بالکل پکا یقین تھا۔ جیسے اس بات کا کہ مکمل آزادی کے معاملے میں کسی طرح کا سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔ واجب ہی تھا کہ اُسے بہت مایوسی ہوئی تھی۔ دو تین دن تک تو وہ بالکل کھویا کھویا سا رہا۔ وہ اس نئی حالت کو پوری طرح سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ اُس کی ناؤ کا لنگر ٹوٹ گیا ہے اور وہ نااُمیدی کے وسیع سمندر کے تھپیڑے کھا رہی ہے۔ اس کی رہنمائی کرنے کے لئے اُمید کی ایک کرن بھی نہیں تھی۔

"اب ہم کہاں جائیں؟" اُسے یکایک ایک اخبار نویس کا یہ سوال یاد آیا جو اُس نے سمجھوتے کے دوسرے دن صبح پُوچھا تھا اور وہاں پر موجود جو پانچ چھ دوسرے اخبار نویس گاندھی جی سے ملاقات کا انتظار کر رہے تھے اُن میں سے کسی نے بھی اس سوال کا جواب دینے کی کوشش نہیں کی تھی۔

وہ چاندنی چوک پار کرکے جامع مسجد کی طرف مُڑا تھا۔ ایک ٹرام کھڑکھڑ کرتی ہوئی اُس کے پاس سے گذر گئی اور اُس سے تھوڑی دُور پر جا کر رُک گئی۔ اُس نے ٹرام نہیں پکڑی۔ وہ پیدل گھر جانا چاہتا تھا تاکہ راستے میں اپنے اُلجھے ہوئے خیالات کو سُلجھا سکے۔

"اب ہمیں کدھر جانا ہے؟ سچ مچ کدھر؟"

کچھ دن تک تناؤ کے ساتھ خاموش رہنے کے بعد پھر ستیہ گرہ کی طرف؟

ابھی سے یہ چرچا ہونے لگا تھا کہ سمجھوتے میں جن شرطوں پر دستخط ہوئے تھے اُن میں سے کچھ کو سرکار پورا نہیں کر رہی ہے۔ لیکن اب ایک بار یہ ثابت ہو چکنے کے بعد کہ مکمل آزادی کے مقصد کے بارے میں بھی سودے بازی ہو سکتی ہے، کیا کانگریس کبھی عوام میں پہلے جیسا جوش پیدا کر سکے گی؟ کیا وہ پھر کبھی عوامی تائید حاصل کر سکے گی؟ وہ سوچ رہا تھا کہ آج ہزاروں معمولی کانگریسی — مرد اور عورتیں — جیل سے باہر آ کر کیا محسوس کرتے ہوں گے؟ اس سمجھوتے سے گجرات اور یو۔پی کے کسانوں کو کیا اُمید بندھے گی جنہیں گول میز کانفرنس سے کوئی سروکار نہیں ہے جو بھوکے پیٹ بھرنے کے لئے صرف کچھ روٹیاں چاہتے ہیں؟ کیا اب انقلابی عدم تشدد کو خدا حافظ کہنا تھا؟ کیا اب آزادی کی لڑائی پھر کانفرنسوں اور کونسل چیمبروں میں ہوا کرے گی — جس لڑائی میں لیڈر لوگ لفظوں سے لڑیں گے اور عوام صرف تالیاں بجائیں گے اور واہ واہ کریں گے؟ کیا وہ پھر وہیں پر پہنچ گئے تھے جہاں وہ اعتدال پسندوں اور دستور پسندوں سے کبھی علیحدہ ہوئے تھے؟

اب ہمیں کدھر جانا ہے؟ اس بڑے قومی سوال میں انور کا اپنا نجی سوال بھی شامل تھا۔ اب وہ کدھر جائے؟ پھر یونیورسٹی واپس؟ شاید اب سمجھوتے کے اس ماحول میں اُسے پھر داخل کر لیا جائے لیکن سال بھر تک باہر کی کھُلی دنیا میں رہ چکنے کے بعد کلاس میں بیٹھ کر اس کا دم گھُٹے گا اور یونیورسٹی میں جو کچھ اُسے پڑھایا جائے گا وہ اُسے بہت ہی بے کار معلوم ہو گا۔ پھر کیا وہ سیاسی کام شروع کر دے؟ اس نے کالج کے دنوں میں تقریر کرنے کی جو مشق کی تھی اُس سے وہ کوئی فائدہ اُٹھا سکتا ہے؟ لیکن اس میں لیڈر بننے کی صلاحیت

نہیں تھی۔ وہ کبھی جیل نہیں گیا تھا۔ اُس کی عمر بہت تھوڑی تھی اور اُس کے پاس پیسہ بھی نہیں تھا۔ وہ اپنا پیٹ کیسے پالے گا؟ کیا وہ اخبار نویس بن سکتا ہے؟ لیکن نئی نئی چیزوں کے بارے میں جاننے کی دلچسپی کے علاوہ اُس میں اس کام کے لئے بھی کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا اُس نے اپنی ساری زندگی میں بس ایک مضمون لکھا تھا اور اس ایک مضمون کی بنیاد پر اُسے کون اپنے اخبار میں لے لیگا؟ اس کے علاوہ اُسے اُن باتوں کا بھی بہت تھوڑا ہی علم تھا جن کے بارے میں ایک اخبار نویس کو جاننا چاہیئے ــــ معاشیات، سیاسیات، دستوری قانون۔ کیا اُسے 'آگے بڑھنے' کے لئے انگلستان یا امریکہ جانا چاہیئے؟ کیا وہ جا سکتا ہے؟ آگے بڑھنے کا تو نام تھا وہ سچ مچ دنیا دیکھنا چاہتا تھا اور اپنا نظریہ وسیع بنانا چاہتا تھا۔ کہ اُس کے ابّا کے پاس اتنا پیسہ نہیں ہے کہ وہ اُسے باہر بھیج سکیں۔ اُسے سرکاری وظیفہ بھی نہیں مل سکتا تھا!

"اب ہمیں کدھر جانا ہے؟" اور اُس وقت کے لئے تو اُس نے اِس سوال کا جواب ڈھونڈ لیا اور اپنے گھر کی گلی میں مُڑ گیا۔

(۳)

جس وقت وہ گھر پہنچا اُس کے ابّا کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ اُس نے نوکر سے پوچھا کہ کوئی خط تو نہیں آیا اور اُسے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ خطوں کا ایک پورا ڈھیر اس کے لئے رکھا ہوا تھا۔ آشا کی نازک لکھائی پہچان کر اُس نے سب سے پہلے اُس کا خط کھولا۔ وہ جیل سے چھوٹ آئی تھی لیکن وہ بہت دُکھی تھی کیونکہ اُس کے پیچھے لیشونت کی حالت بہت خراب ہو گئی تھی اور اب وہ موت کی گھڑیاں گن رہا تھا۔ "میں اپنا دکھ بتانے کے لئے تمہیں لکھ رہی ہوں۔ انور، یہ دیکھ کر میرا کلیجہ پھٹنے لگتا ہے کہ اتنا اچھا اور اتنا ہمّت

والا اور قابل نوجوان موت کی گھڑیاں گن رہا ہو اور ہم اس کے لئے کچھ بھی نہ کر سکیں۔ میں سوچتی ہوں کہ اُسے ایسی حالت میں بیمار چھوڑ کر میں نے جیل جا کر بڑا پاپ کیا ہے لیکن شاید تمہیں معلوم ہے کہ میں کیوں اتنی کائر بن گئی۔" انور جانتا تھا اور اسی لئے اُسے آشا پر بڑا ترس آرہا تھا۔

اُس نے اپنا خط ختم کرنے کے بعد بھی کچھ سطریں یار لکھی تھیں۔" وہ مر گیا۔ آج صبح اُس کی موت ہو گئی۔ اُس وقت تک میں یہ خط ڈاک میں نہیں ڈال سکتی تھی لیکن ایک بات کی تسلّی ہے کہ اُس نے 'سرمایہ' کا ترجمہ کل رات پورا کر لیا تھا۔" خط پر جہاں جہاں آشا کے آنسو گرے تھے وہاں سیاہی پھیل گئی تھی۔

لشونت اور اُس کی بہادرانہ جدّوجہد کے بارے میں سوچتے ہوئے کہ اُس نے مرتے دم تک اُس کام کو پورا کرنے سے ہمت نہیں ہاری۔ جس میں وہ یقین رکھتا تھا، انور نے دوسرا لفافہ کھولا۔ اس پر بھی بمبئی کی مہر لگی ہوئی تھی۔ موہن کا خط تھا۔ ہلکے ارغوانی رنگ کے بڑھیا کاغذ پر اتنا گھسیٹ کر لکھا تھا کہ پڑھا نہیں جا سکتا تھا۔ اُس نے اپنے ہمیشہ کے انداز میں لکھا تھا۔" انور، مائی ڈیر، اب صلح ہو گئی ہے، لڑائی کے جھنڈے لپیٹ لئے گئے ہیں اس لئے اب اِس ملک میں رہنے میں کوئی مزا نہیں۔ مجھے وداع کرو۔ میں اگلے ہفتے ولایت جا رہا ہوں۔ اگر کبھی رنگین پیرس آنے کا اتفاق ہو تو امریکن ایکسپریس کے پتے پر خبر دینا۔ میں تمہیں پینٹنگ کرنا سکھاؤں گا ـــــ سارے شہر کو لال کر دینا" خط کے ایک ایک لفظ پر موہن کی چھاپ تھی۔ وہی متوالا دلیش بھگت جو پلاٹینم کے سگریٹ کیس میں سے نکال کر بیڑی پیتا تھا اور تاج کے ڈائننگ روم میں سرکار کے خلاف پرچے بانٹتا تھا۔

وہ اب کدھر جا رہا تھا؟ پیرس کی رنگین سڑکوں کی طرف۔ ایسا لگتا تھا کہ انور کو چھوڑ کر باقی سب ہی لوگ اپنی زندگی کے پلان بنا رہے تھے۔ راز نے لکھنؤ سے لکھا تھا کہ اُس

نے جیل میں بہت سی نظمیں لکھی ہیں اور وہ انہیں جلد ہی چھپوانے والا ہے۔ کتاب کے نام سے ظاہر تھا کہ اُس کی نظمیں بہت جوشیلی ہوں گی۔ کتاب کا نام اُس نے رکھا تھا "آگ اور آنسو"۔ اس کے بعد اُس نے گاؤں گاؤں گھوم کر لوک گیت اور کسان شاعروں کی غیر مطبوعہ نظمیں اکٹھا کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ سبحان کا بھی ایک خط تھا اور اُس آگ اُگلنے والے مارکسی نے لکھا تھا کہ وہ ستیہ گرہ سے تنگ آ چکا تھا اور اب وہ کانپور کے چمڑے کے کارخانوں میں مزدوروں کی تنظیم کر رہا تھا۔ اُس نے لکھا تھا "اب پولیس کی نظر میرے اُوپر بھی رہنے لگی ہے اور مجھے دو بار وارننگ بھی مل چکی ہے۔ بھلا جانتے ہو یہاں کا ڈی۔ ایس۔ پی کون ہے؟ سلمہ کے شوہر منظور احمد۔ وہ اپنے دفتر میں مجھ سے سوال جواب کر رہے تھے کہ اتنے میں وہ بھی وہاں آ گئی۔ کافی موٹی ہو گئی ہے اور ایسی خوش نظر آتی ہے جیسے کھلا پلا کر تیار کی ہوئی موٹی تازی گائے۔" انور اس بھدّی تشبیہ پر تلملا اُٹھا لیکن اُس کے بعد جو کچھ لکھا تھا اُسے پڑھ کر بہت ہنسی بھی آئی۔ "میں نے تم سے کہا تھا نا کہ ہار مونیم زندگی کے لئے اُن شاعروں کی ہوائی بکواس سے زیادہ ضروری ہیں جو ایک ایسی چیز کے بارے میں جو ہمارے لئے اتنی ہی ضروری ہے جتنا کہ پینے کا پانی، زمین آسمان کے قُلابے ملاتے رہتے ہیں۔"

دنیا بہت چھوٹی تھی اور لاکھ کوشش کرنے پر بھی سلمہ کی یاد اُس کے دل سے نہیں جاتی تھی۔ وہ اُسے بھول کیوں نہیں جاتا؟ کاش وہ کچھ دنوں کے لئے ان سب چیزوں سے دُور رہ پاتا۔ جا سکتا۔ شاید اس سے کچھ فائدہ ہوتا۔ حالانکہ تب بھی سبحان کی یہ کہنے سے نہ چوکتا کہ یہ حقیقت سے دُور بھاگنا ہے، جو اُس کے جاگیردارانہ طور طریقے اور نظریے کا ثبوت تھا۔

سارے خط پڑھ چکنے کے بعد اُس نے صبح کا اخبار اُٹھایا۔ اس کی نظر پہلے ہی صفحے پر چھپی ہوئی ایک موٹی سی خبر پر پڑی — "دہشت پسند قیدی پھانسی لگنے سے پہلے ہی جیل سے بھاگ

نکلا" جلدی جلدی اُس نے پوری خبر پڑھ ڈالی۔ یہ اس کا پُرانا دوست رتن ہی تھا۔ وہ اُن قیدیوں میں سے ایک تھا جنہیں پھانسی کی سزا سُنائی گئی تھی۔ جب اُسے پارک سے کال کوٹھڑی میں لے جایا جا رہا تھا اُس وقت وہ جیل سے بھاگ نکلا تھا۔ کہا جاتا تھا کہ پولیس اُسے تلاش کر رہی تھی لیکن انور کو یقین تھا کہ اب وہ اُن کے چنگل میں آنے والا نہیں ہے۔

اُس کے پاس ہی ایک دوسری خبر چھپی ہوئی تھی جس میں لکھا تھا کہ بھگت سنگھ، سکھدیو اور راج گرو کی موت کی سزائیں رد کرانے میں گاندھی جی کی ساری کوششیں ناکام ثابت ہوئی تھیں اور چونکہ قیدیوں نے رحم کی بھیک مانگنے سے انکار کیا تھا اس لئے انہیں فوراً پھانسی پر چڑھایا جانے والا تھا۔ کم سے کم تین نوجوان ایسے تھے جن کے سامنے یہ سوال نہیں تھا کہ "اب ہمیں کدھر جانا ہے؟" انہوں نے موت کا راستہ چُنا تھا اور اُن کے قدم آخر تک نہیں ڈگمگائے تھے۔

(۴)

اُس دن رات کو جب اکبر علی مسجد سے نماز پڑھ کر لوٹے اور باپ بیٹا کھانا کھانے بیٹھے تو اکبر علی نے انور سے پوچھا "اچھا انور اب تم نے کیا کرنے کا فیصلہ کیا ہے؟ میرا تو خیال ہے کہ اگر تم ایم اے پاس کرنا چاہو تو یونیورسٹی والے تمہیں پھر واپس لے لیں گے۔"

"نہیں ابا، اب علی گڑھ جانے کو جی نہیں چاہتا۔ میں تو دو ایک برس کے لئے ولایت جانا چاہتا ہوں، لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ کے پاس مجھے باہر بھیجنے کے لئے پیسے نہیں ہیں اس لئے میرا تو خیال ہے کہ میں کچھ دن یہیں رہ کر کوئی نوکری ڈھونڈوں گا۔ اگر کسی اخبار میں مل جائے تو اچھا ہے۔"

"میرا تو خیال ہے کہ اخبار میں فوراً اتنی اچھی نوکری نہیں ملے گی۔ اگر ولایت سے کوئی ڈگری لے آؤ تو اچھا رہے گا۔ کچھ دنیا بھی دیکھ لوگے اور تجربہ بھی ہو جائے گا جو آگے چل کر اخبار کی

نوکری میں کام آئے گا۔"

"یہ تو ٹھیک ہے ابا۔ لیکن اتنا پیسہ کہاں سے آئے گا؟ میں نہیں چاہتا کہ آپ کہیں سے قرض لیں یا کوئی چیز گروی رکھیں۔"

"اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔" اکبر علی نے دھیرے دھیرے کچھ ہچکچاہٹ سے کہا۔ "تم اپنے پیسے سے جا سکتے ہو۔ اور بات یہ ہے کہ تمہارے رامیشور کاکا مرتے وقت دس ہزار روپے چھوڑ گئے تھے۔"

"دس ہزار!" انور نے تعجب سے کہا۔ یہ تو بہت بڑی رقم تھی۔ "لیکن کیوں؟"

"ان کے اپنی کوئی اولاد نہیں تھی اور وہ تمہیں بہت پیار کرتے تھے۔ اس لئے وہ اپنی جائداد کا کچھ حصہ تمہارے لئے چھوڑ گئے ہیں۔ وہ تمہارا پیسہ ہے اور تم جس طرح چاہو اُسے خرچ کر سکتے ہو۔"

بیمار اور بوڑھے رامیشور کاکا کی یاد آتے ہی انور کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ بہت ہی رحمدل آدمی تھے اور انور کو ابھی تک یاد تھا کہ وہ اُسے سونے کے بٹن بنوا دینے کو کہا کرتے تھے اور اگر اکبر علی نے انہیں زیادہ لاڈ کر کے بیٹے کو تباہ کر دینے سے روکا نہ ہوتا تو وہ بنوا بھی دیتے۔ لیکن دس ہزار روپے! رامیشور دیال جیسے امیر آدمی کے لئے بھی یہ بہت کافی بڑی رقم تھی۔

"میں سوچتا ہوں کہ انگلینڈ چلا جاؤں۔" انور نے اپنے ابا سے کہا۔ "اور وہاں سے لندن سکول آف اکنامکس کی ڈگری لے آؤں۔ ہو سکے تو جرنلزم کا ڈپلوما بھی لے لوں۔ لیکن بنیادی طور پر تو میں ساری دنیا گھومنا چاہتا ہوں، اگر آپ یہ نہ سمجھیں کہ یہ وقت برباد کرنا ہوگا۔"

اکبر علی پکے مسلمان تھے۔ انہوں نے انور کی ملک ملک گھومنے کی خواہش کی تائید کی کیوں کہ رسول نے بھی کہا تھا کہ ہر سچے مسلمان کا فرض ہے کہ وہ علم حاصل کرے چاہے اس کے لئے اُسے

چین ہی کیوں نہ جانا پڑے"۔ اُس زمانے میں! اب سے تیرہ سو سال پہلے عربستان والوں کے لیے چین ہی دنیا کی حد تھی۔

"میں ایک اور بات کے بارے میں تُم سے پوچھنا چاہتا تھا۔ عام طور پر تو یہ ماں کے پوچھنے کی ہوتی ہے ......" اتنا کہہ کر وہ کچھ اُلجھن میں پڑ کر رُک گئے۔ انور سمجھ گیا کہ اب اُس کے ابا کیا چاہتے ہیں لیکن وہ اُن کے کہنے کا انتظار کرتا رہا۔

"اب تُم جوان ہوئے"۔ اکبر علی نے پھر کہنا شروع کیا "اور اس عمر میں آدمی شادی کر کے گھر بسانے کی سوچتا ہے۔ تو اگر تُم کہو تو میں تمہارے لئے کوئی لڑکی دیکھوں ....؟"

"نہیں نہیں ابا۔" انور نے مخالفت کرتے ہوئے کہا۔ "ابھی جلدی کیا ہے۔"

"تُم اکیس برس کے ہو۔" اُس کے ابا نے اُسے یاد دلایا۔ "جب میری شادی ہوئی تھی اُس وقت میں تو اُنیس ہی برس کا تھا۔"

"یہ تو سچ ہے" بیٹے نے بحث کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن ابا، زمانہ بدل گیا ہے۔ کم سے کم مجھے انگلینڈ تو ہو آنے دیجئے۔"

باپ نے بیٹے کی بات مان لی۔ "میں تمہیں مجبور نہیں کرنا چاہتا۔ تُم خود اچھی طرح سوچ سمجھ کر فیصلہ کر لو۔ لیکن یہ بتا دو کوئی لڑکی ہے تو نہیں۔" بیٹے سے ایسی بات کہتے ہوئے اُن کی زبان کچھ لڑکھڑا گئی "میرا مطلب ہے کوئی خاص لڑکی جسے تُم جانتے ہو اور جو تمہیں پسند ہو۔؟"

"جی نہیں، ابا۔ ایسی کوئی لڑکی نہیں ہے۔" انور نے کافی یقین کے ساتھ کہا اور اُس نے اپنے دل کو بھی سمجھا لیا کہ اب یہی سچ بات بھی تھی۔

(۵)

گاندھی اِروِن سمجھوتے کی شرطیں چھپیں تو ملک میں لوگوں پر اُس کا الگ الگ اثر

ہوا۔ جو انقلابی نوجوان انگریز سرکار کے مقابلے میں الگ قومی انقلابی سرکار بنانے کے خواب دیکھ رہے تھے اُن کی اُمّیدوں پر پانی پھر گیا۔ اعتدال پسندوں نے سپرو اور جیکر کی سمجھوتہ کرانے کی کوششوں کی کامیابی پر اپنے آپ کو مبارکباد دی۔ سرکار کے پُرانے وفاداروں میں وائسرائے کے اس قدم پر بوکھلاہٹ پھیل گئی کہ انہوں نے ایک پُرانے غدّار کو برابری کا درجہ دے دیا تھا اور وہ اس میں آگے چل کر اپنے طبقے کا خاتمہ دیکھنے لگے۔ سرکاری افسر یہ سوچ سوچ کر پریشان تھے کہ اب کھدّر پوش کانگریسی لیڈر حکومت کریں گے اور اُن پر حکم چلائینگے۔ ہندو فرقہ پرستوں کا خیال تھا کہ اب وہ صرف سرکار کا سہارا نہیں لے سکتے۔ اُنہیں اپنے مفادات کی حفاظت کے لئے کانگریس کے پاس بھی جانا پڑے گا۔ مسلمان فرقہ پرستوں نے تو اعلان کر دیا کہ یہ اُن کے ساتھ سراسر دھوکہ تھا، اُنہیں ہندوؤں کے ہاتھ بیچ دیا گیا تھا اور انہوں نے اس "بنیئے گاندھی" سے اپنا رشتہ توڑنے اور اُسے بدنام کرنے کے لئے اپنی تنظیم کرنی شروع کر دی تھی۔ انہیں شکایت تھی کہ وہ سب ہندوستانیوں کی طرف سے بولنے کا دعویٰ کیسے کرتا ہے۔ چھ سو سے اوپر دیسی رجواڑے یہ محسوس کرنے لگے کہ جیسے کوئی زلزلہ آگیا ہو اور اُن کے تخت ڈول گئے ہوں۔ کانگریسی راج کا بھوت اُن کے سر پر منڈلانے لگا۔ انہیں ایسا دکھائی دینے لگا کہ جمہوریت کا راکشس اُنہیں کھا جانے کے لئے مُنہ پھاڑے بڑھا چلا آرہا ہے۔ اُن میں سے کچھ تو اتنے گھبرا گئے کہ وہ بھاگے بھاگے وائسرائے کے پاس فریاد لے کر آئے کہ انہیں گاندھی سے بچایا جائے۔ کچھ نے اسی مقصد سے نئی دلی کے خدا کے پاس اپنے سفیر بھیجے۔

اِن سہمے ہوئے رجواڑوں میں سلام پور کے نواب صاحب بھی تھے جنہوں نے سرکار کے سیاسی محکمے کے سامنے اپنی فریاد رکھنے کے لئے تایا امجد علی کو بھیجا تھا۔ انور کی ولایت جانے کی تیاریوں کے وقت اُن کے وہاں پہنچنے سے سارا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ کیونکہ یہ ظاہر تھا کہ وہ اس

بات سے خوش نہیں تھے اور اُنہوں نے اپنی اِس رائے کو اپنے تک ہی نہیں رکھا۔ انہوں نے انور کے سامنے یہ بات کہی کہ نوجوان لڑکے ولایت جا کر بگڑ جاتے ہیں اور دین مذہب، سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ اُن کی عمر کا لحاظ کر کے انور نے کچھ بھی نہیں کہا اور اِس ڈر سے کہ کہیں جھگڑا بڑھ نہ جائے وہ اُٹھ کر کمرے سے باہر چلا گیا۔

جب انور واپس آیا تو اُس نے دیکھا کہ امجد علی اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ کسی سنجیدہ مسئلے پر باتیں کر رہے تھے۔ انور کو آتا دیکھ کر اُنہوں نے اپنی آواز اور دھیمی کر دی لیکن انور نے اپنے ابا کو کہتے سُنا "بھائی صاحب معاف کیجئے گا لیکن یہ ممکن ہی نہیں ہے"۔ انور سوچنے لگا کہ وہ کیا باتیں کر رہے ہوں گے۔

اُس رات دریا گنج کے مسلمانوں کی ایک میٹنگ ہونے والی تھی۔ 'ناپاک' گاندھی اِروِن سمجھوتے کی مخالفت کرنے کے لئے اور یہ اعلان کرنے کے لئے کہ گول میز کانفرنس میں گاندھی جی کو "کانگریس کے ہندوؤں" کے علاوہ اور کسی کی نمائندگی کرنے کا حق نہیں ہے۔ دِلّی کے محلّوں ہی میں نہیں بلکہ سارے ملک میں اس طرح کی میٹنگیں کی جا رہی تھیں۔ انور جانتا تھا کہ اِن سب ہی میٹنگوں میں ایک ہی قرارداد پاس کی جاتی تھی اور اس قرارداد کے آخر میں ہندوستان کے مسلمانوں کی طرف سے یہ اعلان کیا جاتا تھا کہ اُنہیں ہز ہائی نَس دی آغا خاں کی رہنمائی میں گول میز کانفرنس میں حصہ لینے والے مسلمان نمائندوں میں پورا یقین تھا۔

اکبر علی صاحب کو اس میٹنگ کی صدارت کرنے کے لئے راضی کر لیا گیا تھا۔ انور چاہتا تھا کہ اس کے ابا گاندھی جی کی مخالفت کرنے کی اُس رجعت پسند کوشش میں نہ پھنسیں۔ لیکن چونکہ کچھ ہی دن بعد وہ ولایت جانے والا تھا اس لئے وہ اپنے ابا کے ساتھ کوئی سیاسی جھگڑا مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ یہی سوچ کر وہ چُپ رہ گیا۔

لیکن تایا امجد علی انور کو ترغیب دینے پر تُلے ہوئے تھے۔ جب وہ لوگ کھانا کھا چکے اور میٹنگ میں جانے کی تیاری کرنے لگے جو پاس ہی کی ایک مسجد میں ہونے والی تھی تو انہوں نے انور کی طرف غور سے دیکھا، جو ایک کتاب لے کر سونے جا رہا تھا اور اُس سے پوچھا "انور تم نہیں چلو گے؟"

اکبر علی نے فضول کے جھگڑے کو روکنے کے لئے شیروانی کے بٹن بند کرتے ہوئے کہا، "بھائی صاحب، اِسے رہنے دیجئے، اِسے ہماری میٹنگوں میں دلچسپی نہیں ہے۔"

انور نے سوچا تھا کہ تایا امجد علی اب چُپ ہو جائیں گے لیکن وہ اتنی آسانی سے ہار ماننے والے نہیں تھے۔ "اگر وہ کانگریسی بھی ہے" اور کانگریسی' لفظ کو انہوں نے بڑی نفرت کے ساتھ کہا، "تب بھی اُسے کبھی کبھی یہ بھی سُننا چاہیئے کہ مسلمان کیا کہتے ہیں۔" اور پھر وہ انور سے بولے۔ "یا تمہیں اُس میٹنگ میں جاتے ہوئے شرم آتی ہے جس میں تمہارے ابّا صدارت کر رہے ہوں۔"

یہ بہت ہی اوچھا اور کمینے پن کا وار تھا اور اکبر علی کو اپنے بھائی کی یہ بات اچھی نہیں لگی۔ لیکن مُنہ سے نکلی ہوئی بات واپس تو نہیں لی جا سکتی تھی۔ انور نہیں چاہتا تھا کہ اُس کے تایا ابّا کی وجہ سے اس کے ابّا کو اس کی طرف سے کسی طرح کی غلط فہمی ہو، اس لئے اُس نے اُٹھ کر شیروانی پہن لی۔ امجد علی کی طرف کوئی توجّہ دیئے بغیر اس نے اپنے ابّا سے کہا، "ابّا، اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو میں بھی چلوں؟"

(۶)

انور اِن میٹنگوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ پہلے قرآن کی کچھ آیتیں پڑھی گئیں تاکہ سننے والوں پر مذہبی فضا چھا جائے۔ اور پھر جوشیلی نظمیں پڑھی گئیں جن میں بتایا جاتا تھا کہ اسلام نے کتنے شاندار دن دیکھے تھے اور کس طرح مسلمانوں نے سپین سے لے کر چین تک ساری دنیا کو جیت لیا تھا۔ ان نظموں سے سُننے والوں میں لڑنے کا جوش پیدا کیا گیا۔ اس کے بعد

اکبر علی صاحب سے میٹنگ کی صدارت کرنے کو کہا گیا۔

تجویز پیش کرتے وقت اپنی تقریر میں اکبر علی نے جتنی بھی باتیں کہی تھیں اُن میں زیادہ تر سے انور اتفاق نہیں کرتا تھا لیکن اُسے یہ ماننا پڑا کہ اُس کے ابّا بہت سنبھل کر تقریر کر رہے تھے اور انہوں نے گاندھی جی پر یا کانگریس کے دوسرے لیڈروں پر کوئی بیہودہ ذاتی حملہ نہیں کیا تھا۔ اُن میں اب تک پُرانا سامراجیوں کی مخالفت کا جوش کچھ کچھ باقی تھا اور انہوں نے سب سے زیادہ سخت باتیں کانگریس کے بارے میں نہیں بلکہ انگریزوں کے بارے میں کہیں۔ انہوں نے انگریزوں پر ساری دنیا میں اور ہندوستان میں بھی مسلمانوں کو تباہ کر دینے کی سازش کا الزام لگایا۔ انہوں نے مشرقِ متوسط کے ملکوں میں سامراجیوں کی سازشوں کا ذکر کیا لیکن نہ جانے کس طرح گاندھی اِروِن سمجھوتے کو بھی اُن میں شامل کر دیا۔

اکبر علی کی تقریر کے بعد دوسرے لوگوں کی تقریروں کا رُخ خراب ہوتا گیا۔ جن لیڈروں کی انور عزّت کرتا تھا انہیں ایسی گندی گندی گالیاں دی گئیں کہ انور سُن کر دنگ رہ گیا۔ کئی مقرّروں کی "خالص اسلامی" تقریریں سُن کر تو وہ حیرت میں آ گیا۔ خاص طور پر اپنے نانا ابّا کی تقریر سُن کر جو اُس زمانے کی ڈینگ مار رہے تھے جب ساری دنیا پر مسلمانوں کی حکومت تھی۔ "ہم انگریزوں کی طرح یہاں تجارت کرنے کے بہانے سے نہیں آئے تھے۔ ہم ہاتھ میں تلوار لیکر اِس مُلک میں آئے تھے اور ہم نے تلوار کے زور سے اسے جیتا تھا۔" اس کے بعد انہوں نے دھمکی دی کہ ایک بار پھر مسلمانوں کو "اسلام کی تلوار" نکالنی پڑیگی اور پھر سے اسلامی سلطنت قائم کرنی ہوگی چاہے انہیں خون کی ندیاں ہی یاد کیوں نہ کرنی پڑیں۔ اُس کے نانا ابّا نے اپنی تقریر میں جو خوفناک تصویر کھینچی تھی اُس کا تصوّر کر کے انور کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور اُس نے دیکھا کہ اُس کے ابّا صدر کی حیثیت سے مقرّر کو روکنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ امجد علی گرج رہے تھے "ہم سرکار کو بتا دینا چاہتے ہیں

کہ ہم مسلمانوں کا گاندھی سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔ گائے کا پیشاب پینے والے ہندوؤں سے ہمیں کوئی سروکار نہیں ہے۔ ہم مسلمان ایک الگ قوم ہیں، ہماری الگ زبان ہے، ہماری الگ تہذیب ہے، ہم ہمیشہ الگ رہے ہیں اور ہمیشہ الگ رہیں گے۔"

تھوڑی دیر بعد انور کو ایسا لگا کہ اُسے یہ بھی سُنائی نہیں دے رہا ہے کہ تایا امجد علی کیا کہہ رہے ہیں۔ اُسے اُن کی صورت بھی نہیں دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے سامنے نہ جانے کتنے امجد علی کھڑے تھے ــــ ہندو امجد علی، مُسلمان امجد علی، پارسی اور سِکھ امجد علی، عیسائی اور ہریجن امجد علی، جن کے داڑھیاں تھیں، چوٹیاں تھیں، جن کے گلے میں جنیئو پڑے تھے اور زنجیروں سے صلیبیں لٹک رہی تھیں ــــ اور سب چلّا رہے تھے، "ہم الگ قوم ہیں۔" اُن کے ہاتھوں میں اسلام کی تلوار، ہندو مذہب کی تلوار، سِکھ مذہب کی تلوار چمک رہی تھی اور وہ بھارت ماتا کے جسم میں یہ تلواریں بھونک رہے تھے اور تھوڑی دیر بعد انور نے دیکھا کہ ہر تلوار سے خُون ٹپک رہا ہے۔

بڑا بھیانک منظر تھا۔ انور چونک پڑا اور اُس کا دھیان پھر اُس میٹنگ کی طرف لوٹ گیا۔ امجد علی اپنی تقریر ختم کر چکے تھے اور صدر صاحب تجویز پر ووٹ لینے جا رہے تھے۔ "لیکن اس سے پہلے کہ میں آپ لوگوں سے ہاتھ اُٹھانے کو کہوں اگر یہاں پر کوئی اس تجویز کے خلاف ہو اور وہ یہاں آکر بولنا چاہتا ہو تو وہ خوشی سے بول سکتا ہے۔" انور کو ایسا لگا کہ اُس کے ابّا کی نظریں سیدھے اُسی پر جمی ہوئی تھیں اور جس طرح سے اُنھوں نے یہ بات کہی تھی اُس سے ایسا لگتا تھا کہ وہ انور کو بولنے کے لئے للکار رہے تھے۔

"انور میاں!" کسی نے اُسے پیچھے سے پکارا اور جب اُس نے مُڑ کر دیکھا تو اس کی نظریں کھدّر پوش رحمت چاچا پر پڑیں۔ رحمت سفید داڑھی والا دُبلا پتلا تھا جو ستیہ گرہ اور خلافت کے زمانے میں اکبر علی کے ساتھ کام کر چکا تھا۔ کانگریس سے الگ نہیں ہوا تھا اور ستیہ گرہ میں جیل بھی ہو آیا

تھا۔ سمجھوتے پر دستخط ہونے کے بعد وہ ابھی جیل سے چھوٹ کر آیا تھا" انور میاں" وہ اپنے سیدھے سادے ڈھنگ سے کہہ رہا تھا "تُم بولتے کیوں نہیں؟ یہ گورنمنٹ والے ہماری آواز بھی تو سُنیں"

"ہاں رحمت چاچا، میں ضرور بولوں گا" اُس نے اس سیدھے سادے دیش بھگت کو یقین دلایا اور اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اپنے ابا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس نے کہا "میں اس تجویز کے خلاف بولنا چاہتا ہوں"

(۷)

انور جب اپنے ابا کی بغل میں جا کر کھڑا ہوا تو اُسے اس بات کا احساس تھا کہ اُس کی اس حرکت سے لوگوں میں ایک سنسنی پھیل گئی تھی۔ سینکڑوں لوگوں کی نظریں اُس پر جمی ہوئی تھیں اور اُن نظروں میں تعجب، یہ جاننے کی دلچسپی کہ وہ کیا کہنے جا رہا ہے، نفرت اور ڈر سب ہی کچھ دکھائی دے رہا تھا ــــ جیسے وہ کسی نئے قسم کے خونخوار جانور کو دیکھ رہے ہوں۔ تایا امجد علی غصّے کے مارے کھول رہے تھے اور اپنی لمبی مونچھوں کو چبا رہے تھے۔ اگر اُن کا بس چلتا تو شاید وہ اپنے اِس گستاخ بھتیجے کو وہیں کوڑے لگوا دیتے۔ لیکن سب سے زیادہ تعجب تو اُسے اکبر علی کے چہرے کو دیکھ کر ہوا۔ وہ نہ صرف مسکرا کر اس کا حوصلہ بڑھا رہے تھے بلکہ عجیب بات یہ تھی کہ اپنے بیٹے کی اس ہمّت کو دیکھ کر اُن کا چہرہ خوشی سے کھل اُٹھا تھا۔

انور کو یہ سوچ کر کافی تسلّی ہوئی کہ کم سے کم اُن کے ابا اس کی تقریر پر ناراض نہیں ہونگے۔ انور نے بولنا شروع کیا اور چھوٹتے ہی اس نے ایسی بات کہی جس سے سُننے والے دنگ رہ گئے۔ "جتنے لوگ یہاں بولے ہیں اُن سب نے گاندھی اِروِن سمجھوتے کی بُرائی کی ہے۔ میں بھی اِس سمجھوتے کو اچھا نہیں سمجھتا" اِس کے بعد وہ کچھ دیر کے لئے رُکا تا کہ اُس کی یہ بات لوگوں کے دماغ میں اچھی

طرح بیٹھ جائے۔ پھر تُم نے لڑنا شروع کر دیا۔ اس لئے نہیں کہ سرکار نے مہاتما گاندھی اور کانگریس کی کچھ مانگیں مان لی ہیں، مگر اس لئے کہ کچھ اس سے بھی زیادہ بنیادی مانگیں نہیں مانی گئی ہیں۔ میں تو یہ چاہتا تھا کہ گاندھی جی آزادی کے بنیادی مسئلے پر سمجھوتہ نہ کرتے۔"

شروع شروع میں اس سے جو گھبراہٹ تھی، وہ اب دُور ہو گئی تھی اور اس نے ان مقرروں پر زبردست حملہ شروع کیا جنھوں نے کانگریس کو "ہندوؤں کی جماعت" کہہ کر اس پر حملہ کیا تھا۔ علی گڑھ یونیورسٹی کی یونین میں اس نے طنز کرنے کی جو مشق کی تھی اس سے اس نے اس وقت پورا فائدہ اٹھایا۔

"تو کانگریس ہندوؤں کی جماعت ہے میری رائے میں تو کچھ لوگ یہ بھی کہنا چاہیں گے کہ کانگریس میں کوئی مسلمان ہے ہی نہیں۔ میرے دادا ایک زمانے میں، جب خلافت کا زور تھا مولانا ابوالکلام آزاد کو امام الہند کہا کرتے تھے۔ میرے خیال سے اب مولانا آزاد شاید ہندو ہو گئے ہیں۔ میرے خیال سے مولانا حسین احمد مدنی اور جمعیت العلماء کے دوسرے مولاناؤں کے بارے میں بھی یہی بات سچ ہے۔ جسٹس عباس طیب جی اور حسن امام صاحب کو بھی ہندو کہا جانا چاہیئے کیونکہ وہ گاندھی جی کے دوست ہیں۔ اگر میں اپنے دوستوں کے نام گنواؤں جیسے اصغر حسین راز، سبحان اور یونس تو آپ کہہ دیں گے کہ یہ سب دہریئے ہیں۔ کیا سرحد کے خدائی خدمت گار اور ان کے لیڈر خان عبدالغفار خاں بھی دہریئے ہیں؟ دلّی کے بلکہ کہنا چاہیئے اپنے دریا گنج کے آصف علی صاحب کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ آپ میں سے زیادہ تر لوگ انھیں ذاتی طور پر جانتے ہیں۔ کیا ان کے بارے میں بھی یہ کہیں گے کہ وہ ہندو ہو گئے ہیں؟" انور نے دیکھا کہ وہ تڑاتڑ جو نام گنا تا جا رہا تھا انھیں سُن کر وہ لوگ تلملا اٹھے تھے۔ اس کے بعد اس نے اپنا ترپ کا پتّہ نکالا۔ سفید داڑھی والے اس بوڑھے جلاہے کو مخاطب کر کے

جو مُقرّر کے پیچھے طنز پر بیٹھا دل ہی دل میں ہنس رہا تھا۔ انور نے اونچی آواز میں پوچھا " رحمت چاچا تم کب سے اسلام چھوڑ کر کافر بن گئے ؟ " اب بحث اپنے گھر کی مثالوں پر آگئی تھی اور جب رحمت نے جواب دیا، " انور میاں، تمہیں معلوم نہیں ؟ میری شُدھی تو اسی مسجد میں اس میٹنگ سے پہلے ابھی عشاء کی نماز کے بعد ہوئی ہے " سب لوگ ہنس پڑے۔ رحمت چاچا کی اس بات میں بڑا تیکھا طنز تھا کیونکہ سب لوگ جانتے تھے کہ رحمت چاچا اس علاقے کے پکّے مسلمان تھے۔ مسجد میں اکثر پانچوں وقت کی نماز پابندی کے ساتھ پڑھتے تھے۔

یہ دیکھ کر کہ وہاں پر بیٹھے ہوئے لوگ اس کی بات اب غور سے سُن رہے ہیں، انور نے سیاسی دلیلیں دینی شروع کیں۔ اُس نے کانگریس کی تاریخ دہرانی شروع کی اور یہ بتایا کہ کس طرح ہندوؤں اور مسلمانوں نے مل کر اُسے بنایا تھا۔ پھر اپنے تایا ابا کی طرف دیکھ کر اس نے بھرپور وار کیا۔ " لیکن، ظاہر ہے، ایک خاص قسم کے مسلمان اور ہندو ایسے بھی ہیں جو کبھی کانگریس میں نہیں رہے ہیں۔ یہ لوگ وہ ہیں جو ہمیشہ سرکار کے ٹکڑوں پر پلے ہیں " پھر اُس نے چودھری محمد عمر کی طرف دیکھ کر کہا، " اور جو سرکاری ٹھیکے پانے کی اُمید لگائے رہتے ہیں۔ "
اس کے بعد تو وہ برس پڑا! " آپ اسلام کی تلوار پھر نکالنے کی بات کرتے ہیں۔ کیا آپ اسے صرف اپنے ہندوستانی بھائیوں کے خلاف استعمال کرنا چاہتے ہیں ؟ عجیب بات ہے کہ جن غیر ملکیوں نے مغلوں سے اُن کا تخت چھینا تھا، آپکے بادشاہ کو قید کر کے برما بھیج دیا تھا، آپکے شہزادوں اور جاگیرداروں کو اس دریا گنج میں اس مسجد کے سامنے سُولی پر لٹکا دیا تھا، آپ کی شہزادیوں کی بے عزتی کی تھی، اُن کے خلاف یہ تلوار چلتے میں نے نہ دیکھی ؟ جی نہیں، آپ اپنی اسلام کی تلوار انگریزوں کے خلاف کیسے اُٹھا سکتے ہیں کیونکہ آپ کی تجویز کے مطابق آپکے لیڈر تو آغا خاں ہیں جو انگریزوں کے پُرانے وفادار دوست ہیں۔ جہاں تک میرا سوال ہے میں آپکے آغا خاں کے مقابلے میں رحمت چاچا

کو مسلمانوں کو زیادہ اچھا لیڈر سمجھتا ہوں۔"

وہ سمجھتا تھا کہ اُس کی اِس بات پر تہلکہ مچ جائے گا لیکن کسی نے چوں بھی نہیں کی۔ اُس نے اپنے ابا کی طرف دیکھا۔ وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے مُنہ لٹکائے بیٹھے تھے۔ صرف تایا امجد علی دانت پیس رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر انور کو اُن کی زہر میں بُجھی ہوئی تقریر یاد آ گئی۔

"یہاں کچھ لوگوں نے کہا ہے کہ مسلمان ایک الگ قوم ہے جن کا ہندوؤں اور دوسرے لوگوں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ اُن کا کیا تعلق ہے۔" اس کے بعد اس نے بڑی سنجیدہ اور بڑی دھیمی آواز میں انہیں جلیانوالہ باغ کی بھیانک داستان سُنائی جہاں ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کا خون ایک ساتھ بہا تھا۔ "اُس خون کو الگ کرنے کی کوشش کیجیے۔" اُس نے کہا اور اُس کا گلا بھر آیا۔ پھر اس نے بتایا کہ بمبئی میں کیا دیکھا تھا۔ کس طرح پٹھان اور سکھ والنٹیروں پر ایک ساتھ لاٹھیاں برسائی گئی تھیں اور انہوں نے مل کر اُن لاٹھیوں کا مقابلہ کیا تھا۔ "یہ بھی خون بہانے کا ایک طریقہ ہے۔ لیکن یہاں کچھ لوگ یہ دیکھنا زیادہ پسند کریں گے کہ مسلمان اور سکھ ایک دوسرے کے چھُرے بھونکیں۔"

بہت دیر ہو گئی تھی۔ انور کی تقریر ختم ہونے کا وقت قریب آ گیا تھا اِس لئے اُس نے صرف اتنا کہا کہ ہندوستان میں ایسا نہیں ہے کہ ایک طرف ہندو ہیں اور دوسری طرف مسلمان۔ بلکہ بٹوارہ اس طرح ہے کہ ایک طرف وہ لوگ ہیں جو اپنے ملک کو آزاد دیکھنا چاہتے ہیں اور دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو ایسا نہیں چاہتے۔ "اور بھی کئی بٹوارے ہیں۔" اُس نے کہا۔ "ایک طرف کسان ہیں جو بھوکوں مرتے ہیں اور دوسری طرف زمیندار ہیں جو ذرا بھی محنت کئے بغیر موٹے ہوتے جاتے ہیں۔ ایک طرف مزدور ہیں جو کارخانوں میں اپنا خون پسینہ ایک کرتے ہیں اور دوسری طرف سرمایہ دار ہیں جو دوسروں کی محنت پر عیش کرتے ہیں۔ آپ خود فیصلہ کر لیجئے کہ آپ

کس طرف ہیں۔ آپ میں سے کچھ لوگ سرکار کی حمایت کر کے اور کانگریس کو گالیاں دے کر اپنی دھن دولت اور اپنی طاقت بچائے رکھنا چاہیں گے۔ آپ خوشی سے ایسا کیجئے گا۔ لیکن کم سے کم اسلام کی دُہائی نہ دیجئے اور اپنے مذہب کو اپنی بزدلی اور اپنی خود غرضی کیلئے آڑ نہ بنائیے۔"

وہ بالکل تھک کر بیٹھ گیا اور اُس نے دیکھا کہ اُس کے ابّا کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ اُٹھے اور انہوں نے بھاری دل سے بہت دھیرے دھیرے کہا۔" انور نے جو کچھ کہا ہے اُس کی ہر بات کو میں صحیح نہیں سمجھتا لیکن مجھے اس بات کا فخر ہے کہ میرے بیٹے میں اتنی ہمّت تھی کہ وہ جس بات کو صحیح سمجھتا تھا وہ اُس نے کھُل کر سب کے سامنے کہی۔ اب جو اس تجویز کے حق میں ہوں...."

امجد علی فوراً اُٹھ کھڑے ہوئے اور اپنے بھائی کی بات کاٹ کر بولے "جو لوگ حق میں ہوں وہ اللہ اکبر کا نعرہ لگائیں۔"

اللہ اکبر کے نعرے سے آسمان گونج اٹھا اور صدر صاحب نے اعلان کیا کہ تجویز منظور ہو گئی جس پر امجد علی صاحب نے چلاّ کر کہا، "اتفاقِ رائے سے!"

(۸)

ایک پل میں سب کچھ ہو گیا، جیسے گرمیوں میں صاف آسمان سے اچانک طوفان پھٹ پڑے۔

وہ تینوں چپ چاپ گھر واپس جا رہے تھے۔ ایک عجیب تناؤ تھا۔ کسی نے ایک لفظ بھی نہیں کہا، پھر بھی ایسا لگتا تھا کہ یہ خاموشی ذرا سی ٹھیس لگنے پر کانچ کی طرح ٹوٹ جائے گی۔ جب وہ گھر میں پہنچے اور آنگن کے دروازے کی کنڈی چڑھا دی گئی تو امجد علی نے اپنی طنزیہ ہنسی سے اس خاموشی کو توڑ دیا۔ "تو تمہارا یہ خیال تھا کہ تم اپنی لچھے دار باتوں سے اور اپنی ہمت سے سننے والوں کو اپنی طرف کر لو گے! مگر دیکھا ایک آدمی نے بھی تمہاری طرف ووٹ نہیں دیا۔"

اکبر علی کپڑے بدلنے اندر کے کمرے میں چلے گئے تھے اور امجد علی اُن کے موجود نہ ہونے کا پورا فائدہ اُٹھا رہے تھے۔ پھر بھی انور نے سوچا کہ اس کے تایا ابّا کی باتوں میں طنز اور چوٹ ضرور ہے پر یہ وقتی بات ہے، وہ شاید انور کی سخت باتوں پر ناراض ہو گئے ہونگے اس لئے اُس نے بھی یوں ہی اُنہیں چھیڑنے کے لئے کہہ دیا۔ "لیکن تایا ابّا، تجویز اتفاق رائے سے نہیں پاس ہوئی تھی۔ جیسا کہ آپ نے اعلان کیا تھا۔" شاید اُس نے "آپ نے" لفظ پر ضرورت سے زیادہ زور دیا تھا اور امجد علی یہ سنتے ہی آپے سے باہر ہو گئے۔

"تو تمہارا کہنے کا مطلب ہے کہ میں جھوٹا ہوں۔ کیوں؟" اُنہوں نے چلا کر کہا۔ "تو میں بھی تمہیں بتا دوں کہ میرا مطلب یہ تھا کہ کسی مسلمان نے خلاف ووٹ نہیں دیا تھا۔ وہ میٹنگ مسلمانوں کی تھی اور تمہارے جیسے ہندو حرامزادوں کے ووٹ کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔"

اکبر علی اندر کے کمرے سے بھاگ کر باہر نکل آئے اور اُنہوں نے بے حد پریشانی اور گھبراہٹ کے ساتھ کہا، "بھائی صاحب!"

انور کے لئے جس ہتک آمیز لفظ کا استعمال کیا گیا تھا اُس کا پورا مطلب سمجھنے میں اُسے کچھ پل کی دیر لگی۔ انور کو "حرامزادہ" لفظ ماضی کی ایک گونج جیسا لگا اور نہ جانے کیوں وہ اُس دن کی یاد کرنے لگا، جب اُس نے اپنے ابّا سے اس لفظ کے معنی پوچھے تھے اور آج دس برس بعد بھی اُس نے دیکھا کہ یہ لفظ سنتے ہی اکبر علی کے چہرے پر پھر وہی عجیب پریشانی چھا گئی۔

"بھائی صاحب!" آج اپنے بڑے بھائی سے یہ الفاظ کہتے وقت اُن کے چہرے پر پھر وہی جذبات تھے۔ "آپ کو میرے بیٹے کو اس طرح کی بات کہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔" اور اتنا کہہ کر وہ انور کا ہاتھ پکڑ کر وہ اُسے دوسرے کمرے کی طرف لے جانے لگے۔

"ابّا مجھے چھوڑ دیجیے۔" یہ کہہ کر اُس نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ پھر وہ اپنے تایا ابّا کے پاس گیا اور

ایک ایک لفظ کو تول کر بولا "آپ نے ابھی جو کچھ کہا تھا ذرا پھر تو کہیئے گا۔"

"انور! جانے دو۔" اکبر علی نے مضطرب ہو کر کہا "تم ان کی بات نہ سنو۔ اُن کا تو دماغ خراب ہے۔"
اور پھر وہ لپک کر اپنے بڑے بھائی کے پاس گئے اور آنکھوں میں آنسو بھر کر بولے "بھائی صاحب! خدا کے واسطے میری خاطر میرے بیٹے کو مجھ سے نہ چھینیئے۔"

لیکن امجد علی پر تو جیسے بھوت سوار تھا۔ انہوں نے انتہائی ظالمانہ انداز میں کہا "وہ آپ کا بیٹا نہیں ہے۔ اُس نے آج ثابت کر دیا کہ آپ کی اکتیس برس کی پرورش کا اُس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ آج پھر وہ اُسی کوڑے پر واپس پہنچ گیا جہاں سے وہ آیا تھا۔ اُس نے ثابت کر دیا کہ وہ ایک کافر کے بیج سے پیدا ہوا ہے کہ وہ ایک رنڈی کا اَن چاہا بیٹا ہے۔" پھر وہ انور کی طرف مڑے جو گم سُم کھڑا یہ سب سن رہا تھا "اور کچھ جاننا چاہتے ہو؟ اپنے باپ کا نام جاننا چاہتے ہو؟ وہ وہی دق کا مارا ہوا خبیث کافر رامیشور تھا۔ وہ تو جہنم پہنچ گیا لیکن تم اپنی ماں پھمیا کے پاس کیوں نہیں جاتے؟ وہ تو بہت نامی عورت ہے۔ ہر آدمی چاوڑی بازار میں اس کا کوٹھا جانتا ہے۔"

آخر کار انور نے اپنی زبان کھولی۔ اکبر علی سے مخاطب ہو کر اُس نے پوچھا "کیا یہ سچ ہے؟"
اکبر علی کی آنکھوں سے آنسو بہہ بہہ کر اُن کی داڑھی پر گر رہے تھے۔ انہوں نے کہا "لیکن انور سُنو تو ....." وہ اُس سے کہنا چاہتے تھے کہ کچھ بھی ہو پر وہ اُن کا بیٹا ہے۔ لیکن انور اُن کی یہ بات سُننے کے لئے وہاں تھا ہی نہیں۔

بغیر کچھ کہے وہ گھر سے باہر نکل گیا۔

اکبر علی نے آنسو اور غصّے سے بھری ہوئی آنکھوں سے اپنے بڑے بھائی کو دیکھا اور زندگی میں پہلی بار انہوں نے اُن کی بے حُرمتی کرتے ہوئے کہا "آپ نے مجھ سے میرا بیٹا چھین لیا۔ اب آپ کو تسلی ہو گئی؟ اب آپ یہاں سے تشریف لے جائیے۔"

گھر سے باہر نکل کر اور گلیوں میں بے مقصد گھومتے ہوئے وہ اپنے آپ سے کہتا رہا___ نہیں! نہیں! یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ ممکن نہیں ہے۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ اس طرح ایک پل میں کسی کے کچھ الفاظ کہہ دینے سے کسی کی پوری زندگی تباہ نہیں ہو سکتی۔ ایسا کہیں نہیں ہوتا۔ ضرور کہیں کوئی غلطی ہو گی۔ یہ ساری باتیں اُس کے تایا ابا کے گندے ذہن کی پیداوار ہوں گی۔ یا کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ غصے میں خود اُس کے تصور نے یہ تصویر بنالی ہو گی۔

اس کے قدموں کی تال پر اُس کا دل بھی دھڑک رہا تھا "نہیں! نہیں! ایسا نہیں ہو سکتا! یہ ناممکن ہے! ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔"

لیکن اُسکے دل کی گہرائی میں یہ ڈر بھی آہستہ آہستہ بڑھتا جا رہا تھا کہ جو کچھ اُس نے سُنا تھا وہ سچ تھا۔ سمجھ میں آنے والی بات نہیں تھی لیکن پھر بھی سچ تھی! ناممکن ضرور تھی، لیکن پھر بھی ہوئی تھی۔

اُسکی آنکھوں کے سامنے بچپن کی تصویریں گھومنے لگیں۔ اُسکے کانوں میں بچپن کے سُنے ہوئے الفاظ گونجنے لگے اور اب اُن کا نیا مقصد ظاہر ہونے لگا اور ابھی اس کے سامنے جو راز کھولا گیا تھا، وہ سچ لگنے لگا۔

چاوڑی بازار کی وہ "دوسری عورتیں!" کیا یہی وجہ تھی کہ جب سے اس نے اکبر علی سے "چھجّوں پر کھڑی ہوئی رنگی پُتی عورتوں" کے بارے میں پوچھا تھا تب سے وہ اُس راستے سے کترا کر جانے لگے تھے؟

کیا یہی وجہ تھی کہ جب انور نے اُن سے "حرامزادہ" کا مطلب پوچھا تھا تو وہ اتنا پریشان ہو گئے تھے اور کھسیا گئے تھے؟

(۹)

آخر کار اُسے اس راز کا پتہ چل گیا تھا کہ اس کی صحت اتنی خراب کیوں تھی اور اس کی بیماری کا

کی وجہ ڈاکٹر جمشید جی کی سمجھ میں کیوں نہیں آئی تھی۔ اُسے یہ صحت اپنے اصلی باپ سے ورثے میں ملی تھی۔ تو رامیشور کاکا اِسی لئے اُسے اتنا پیار کرتے تھے، اسی لئے وہ اُس کیلئے دس ہزار روپئے چھوڑ گئے تھے۔

دس ہزار روپیے! ایک انسان کی زندگی کی قیمت؟ حرامزادہ ہونے کا معاوضہ؟ رنڈی کا بیٹا ہونے کا داغ چھپانے کے لئے رشوت؟ رنگین مزاج سیٹھ جی یہ قیمت چکا کر، یہ معاوضہ ادا کر کے، یہ رشوت دے کر چلے گئے تھے۔ نروان حاصل کرتے! انور کا دماغ اسی طرح کے ٹوٹے خیالات سے بھر گیا۔

انور سنسان سڑکوں کے خوفناک سناٹے میں گھوم رہا تھا۔ کبھی کبھی کوئی خارش زدہ کتا اس کے پیچھے ہو لیتا تھا۔ انور نے یکایک محسوس کیا کہ وہ اس دنیا میں اکیلا ہے اور دنیا اب اُس کے لئے مٹ چکی ہے۔ اُسے ایسا لگا کہ وہ اکیلا ہے اور ننگا ہے اور اُسکی پیدائش کا داغ اب سب کی آنکھوں کے سامنے ہے۔ اُسے ایسا لگ رہا تھا کہ اُسے زندگی کے جن اصولوں کی عزت کرنا سکھایا گیا تھا ــــ شرافت اور بھلائی، دریادلی اور نیکی، رحم اور انسانیت ــــ وہ سب مانگے ہوئے کپڑوں کی طرح اُس کے بدن سے اُتار لئے گئے تھے کیونکہ یہ کپڑے اُس کے ٹھیک نہیں آتے تھے۔ اب صرف نفرت اس کے ساتھ رہ گئی تھی۔

اب داغدار پیدائش کی تصویر اُس کے سامنے صاف طور سے آتی جا رہی تھی۔ شاعری کا شوق رکھنے والے ایک رنگین مزاج لیکن بزدل نوجوان نے چوری چھپے پاپ کی گلیوں میں عیاشی کے بیج بوئے تھے اور جب اِس بیج سے پھل نکلا تو وہ کڑوا تھا۔ انہوں نے یہ پھل اپنے بے اولاد دوست کے حوالے کر دیا جو اُس "بچے" کو گود لینے کو تیار تھے۔ اُسے اُس آدمی سے اور اُس عورت سے کتنی نفرت تھی جنہوں نے اسے اِس دنیا میں پیدا کیا تھا اور پیدا ہوتے ہی اُس کے بدنامی کا داغ لگا دیا تھا۔

وہ جلدی جلدی لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا

کہ کس چیز سے بھاگ رہا تھا۔ کیا وہ کبھی بھی اپنی اُس پچھلی زندگی سے دُور بھاگ سکے گا جس نے اچانک آدبوچا تھا۔

" اب تمہیں کہاں جانا ہے؟" اب اس سوال میں جو نیا مطلب پیدا ہو گیا تھا اور اس پر غور کرتے ہوئے اُسے ہنسی آ گئی ۔۔ ایک طنز بھری کڑوی ہنسی اور جب اس نے دیکھا کہ اُس کے قدم اُسے چاوڑی بازار تک لے آئے تھے تو اسے کوئی تعجب نہیں ہوا۔ اس نے اپنے آپ سے پوچھا کیا اُس کا خون کا رشتہ اُسے یہاں کھینچ کر لایا ہے یا وراثت میں ملی ہوئی گناہ گار فطرت؟

(۱۰)

" نواب صاحب"۔ ایک چکنے چپڑے دلال نے شرارت بھری مسکراہٹ کے ساتھ اُسے پکارا، " کیسا مال چاہیئے۔ گدرایا پکا، پنجابی، کشمیری ...؟"

" کیا تم چھمیا بائی کا کوٹھا جانتے ہو؟"

" وہ تو اب بوڑھی ہو گئی ہے اور بہت دن سے اُس نے دھندا بھی چھوڑ رکھا ہے لیکن کچھ پٹاخہ چھوکریاں ضرور رکھ چھوڑی ہیں۔ اگر حضور کہیں تو ...."

" مجھے اُسی کے یہاں لے چلو۔"

راستے میں انور کے دماغ میں اپنی ماں کی صورت کی ایک جھلک دیکھنے کی بے چینی نے ایک بھیانک ہیجان کی شکل اختیار کر لی۔ زندگی بھر وہ اپنے آپ کو اُس چیز سے بچاتا آیا تھا جو اُسے "پاپ" بتائی گئی تھی۔ اُس نے اپنے جسم کو پاک رکھا تھا۔ اُس پر کوئی دھبہ لگنے نہیں دیا تھا کیونکہ وہ اپنے آپ کو شریف باپ کا بیٹا سمجھتا تھا۔ لیکن اب اُسے پتہ چلا تھا کہ وہ خود اُسی "پاپ" سے پیدا ہوا تھا جس سے اُسے اپنے آپ کو بچانا تھا۔ قسمت نے اس کے ساتھ بڑا بے رحم مذاق کیا تھا اور اس نے بدلہ لینے کی ٹھان لی تھی ... اُسی رات ... اپنی ماں کے

ہی گھر کی کسی لڑکی کے ساتھ... اُس کا جی چاہا کہ اس نے جو شیطانی پلان بنایا تھا اس پر قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

لکڑی کی سیڑھیاں پیر رکھتے ہی چرمرا اُٹھیں۔ گندی، اندھیری اور بدبودار سیڑھیاں۔ جیسے جیسے وہ سیڑھیوں پر اوپر چڑھتا گیا اُس کی ہمت جواب دیتی گئی اور اس کے عمر بھر کے دبو پن نے پھر اُسے آدبوچا۔ اب اس کی حالت، اُس آدمی جیسی نہیں تھی جو کسی سے بدلہ لینے جا رہا ہو بلکہ اُس شرمیلے نوجوان جیسی تھی۔ جو پہلی بار رنڈی کے کوٹھے پر جا رہا ہو۔

ایک عورت، جو وقت سے پہلے ہی بوڑھی ہو گئی تھی، فرش پر بچھی ہوئی سفید رنگ کی گندی چاندنی پر گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھی ہوئی پان لگا رہی تھی۔ اپنے چھوٹے قد کی وجہ سے وہ کچھ موٹی لگتی تھی۔ اُس کی جلد اب بھی ملائم تھی مگر اس پر جھریاں پڑ گئی تھیں اور اُس کے سفید بالوں میں مہندی کی لالی تھی۔

"چھمیا بائی" دلال نے اُس عورت کو مخاطب کر کے کہا "نواب صاحب چھوکریوں کو دیکھنا چاہتے ہیں"۔

چھمیا بائی نے نظریں اُوپر اٹھا کر دیکھا اور اتنا کم عمر گاہک دیکھ کر وہ کچھ چونک گئی۔ "بیٹھیے تشریف رکھیے" اُس نے اپنے پیشے کی روایات کے مطابق ضرورت سے زیادہ تکلف کے ساتھ کہا۔

تو یہ تھی اس کی ماں۔ یہ سوچ کر انور نے خون کا گھونٹ پی لیا۔ اُس نے سُن رکھا تھا کہ ماں اگر پچاس برس بعد بھی اپنے بچے کو دیکھے تو وہ اُسے پہچان لیتی ہے لیکن اس کی ماں نے اُسے نہیں پہچانا تھا۔ شاید اپنے ذلیل پیشے کی وجہ سے اس میں انسانیت اتنی مر چکی تھی کہ اب انسان کی فطرت بھی اس میں باقی نہیں رہ گئی تھی۔ وہ اتنی گری ہوئی، گندی اور قابلِ نفرت نہیں لگی جتنی کہ انور نے اُس کی طرح کی عورتوں کے بارے میں سوچا تھا۔ پھر بھی انور کے دل میں اُس کے لیے وہ پیار پیدا نہیں ہوا

جو بیٹے کو ماں سے ہوتا ہے۔ اُس کے دل میں صرف نفرت تھی۔ گہری نفرت جسکی کوئی انتہا نہیں تھی۔

دلال اپنی دلالی لے کر کھٹ کھٹ کرتا ہوا سیڑھیاں اُتر گیا اور انور اس عورت کے پاس اکیلا رہ گیا۔ وہ اپنے خیالوں میں بھی وہ اسے ماں نہیں کہنا چاہتا تھا۔

"بجلی! شاما! یہاں تو آؤ" اس نے زور سے آواز دی اور دو لڑکیاں جو مشکل سے سولہ سولہ برس کی رہی ہونگی شرماتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئیں۔ انہوں نے اپنے چہروں پر اتنی سرخی پوت رکھی تھی کہ یہ بتانا بھی مشکل تھا کہ اُن کے چہرے اندر سے کیسے تھے۔ انور کو وہ خوبصورتی کا ایک بھونڈا مذاق معلوم ہو رہی تھیں۔ اس کی پسندیدگی کا انتظار کرتے ہوئے وہ اتنی قابل رحم لگ رہی تھیں جیسے مویشیوں کے میلے میں لگائے بکریاں ہوں۔ انسان کا جسم خریدنے کے خیال سے ہی انور کو متلی ہونے لگی اور پہلی بار ایک جھلک دیکھ لینے کے بعد وہ آنکھ بھر کر انہیں دیکھ بھی نہیں سکا۔ ایک پل کے لئے تو وہ یہ بھی بھول گیا کہ وہ وہاں آیا کس کام سے تھا۔ جب ایک لڑکی پان لیکر اُس کے پاس آئی تو اُس نے پان لینے سے انکار کر دیا اور اُسے یہ بھی دھیان نہیں رہا کہ اُسے طشتری میں کچھ پیسے رکھ دینے چاہیئے تھے۔

"ابھی شرم آتی ہے، کیوں؟" چھمیا بائی نے اُس سے پوچھا اور کوئی جواب نہ ملنے پر اس نے لڑکیوں کو ہاتھ کے اشارے سے اندر جانے کو کہا اور بڑی دیر تک فرش پر بچھی ہوئی سفید چاندنی پر پان کے دھبوں کو دیکھتی رہی۔

لڑکیاں اپنی پائلیں چھنکاتی ہوئی کمرے سے چلی گئیں اور تھوڑی دیر بعد انور کو دوسرے کمرے میں سے کھسیا کر ہنسنے کی آواز سنائی دی۔ انور سمجھ گیا کہ وہ اس کی نامردی کا مذاق اُڑا رہی تھیں۔

"ایسی جگہ آنے کا... پہلا اتفاق ہے، کیوں؟" چھمیا بائی کی آواز میں ایک پیشہ ور عورت کی دلچسپی کے مقابلے میں ایک انسان کا تجسس زیادہ تھا۔

انور نے چپ چاپ سر ہلا کر اقرار کر لیا۔ اُسے ایسا لگا کہ شرم کے مارے اُس کا چہرہ لال ہو رہا ہے اور اُس نے رومال نکال کر اپنے تمتمائے ہوئے چہرے پر سے پسینہ پونچھا۔

"کسی اچھے گھر کے معلوم ہوتے ہو۔" چھمیا بائی نے یہ بات انور سے نہیں کہی تھی بلکہ شاید وہ اپنے آپ سے باتیں کر رہی تھی اس لئے انور نے بھی کوئی جواب دینا ضروری نہیں سمجھا۔

کچھ دیر تک وہ خیالوں میں ڈوبی ہوئی چپ چاپ بیٹھی رہی جیسے اپنے دل میں کوئی فیصلہ کر رہی ہو۔ پھر اُس نے بےحد پیار سے انور سے کہا "جاؤ بیٹا! اپنے گھر جاؤ۔ اور اب پھر کبھی یہاں نہ آنا۔"

انور کو ایسا لگا کہ یہ بات چھمیا بائی نے نہیں بلکہ کسی دوسری ہی عورت نے کہی ہو۔ وہ کچھ کہے بغیر جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا اور جب وہ ٹٹول ٹٹول کر سیڑھیاں اُتر رہا تھا تو اس نے چھمیا بائی کی آواز سُنی، "جیتے رہو بیٹا!"

(۱۱)

بیٹا!

ہاں اُس نے اُسے یہی تو کہا تھا۔ اُسے اس سے پہلے بھی کئی لوگوں نے بڑے پیار سے بیٹا کہا تھا۔ اکبر علی نے جو ابھی گھنٹہ بھر پہلے تک اس کے باپ تھے، رامیشور دیال نے جنہیں یہ ہمیشہ سے معلوم تھا کہ وہ اُن کا بیٹا ہے اور بمبئی میں ماں جی نے۔ لیکن اس لفظ میں اس سے پہلے کبھی اتنی مٹھاس، اتنی نرمی، زندگی کے سب سے بنیادی جذبے سے بھرپور پیار محسوس نہیں کیا تھا جتنا کہ اس وقت گری ہوئی عورت کے منہ سے سُننے پر، گناہ کی اس بیٹی کے منہ سے۔ اپنی اس ماں کے منہ سے!

اگر اُسے یہ معلوم ہوتا کہ وہ سچ مچ اُس کا بیٹا ہے تو شاید یہ بات نہ ہوتی۔ تب اس میں کوئی انوکھی یا اہم بات نہ ہوتی۔ ساری دنیا میں کروڑوں مائیں اپنے بیٹوں کے ساتھ پیار کا برتاؤ

کرتی ہیں لیکن چھمیا بائی کی نظروں میں تو وہ اس کی چھوکریوں کا ایک کمسن گاہک تھا جسے اس چیز کا ابھی نیا نیا شوق پیدا ہوا تھا! پھر بھی اس نے اپنے منافع کو بھول کر اُسے پاپ کے راستے پر چلنا سکھلانے کی بجائے اُسے وہاں سے واپس بھیج دیا تھا۔ اُس نے اُسے "بیٹا" کہا تھا اور ماں کی طرح اُسے دعا دی تھی۔ اس نے انسانیت اور دریا دلی کے اعلیٰ جذبوں کا ثبوت دیا تھا۔ اب انور کو اُسے اپنی "ماں" سمجھنے میں کوئی شرم محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

جتنی دیر میں انور سیڑھیوں سے نیچے اُترا اس کی دنیا ہی بدل چکی تھی۔ اب اُس کی دنیا نفرت اور لالچ اور گندی خود غرضی سے بھری ہوئی نہیں تھی۔ چھمیا بائی نے اس کی دنیا بدل دی تھی صرف ایک لفظ سے۔

یہ جان کر کہ انسانیت اس گندے اور بدصورت ماحول میں بھی پائی جاتی ہے جہاں اس کی ماں رہتی تھی، انور کے دل سے جیسے وہ ساری کڑواہٹ دُور ہو گئی جو ابھی گھنٹہ بھر پہلے تک موجود تھی۔ اس نے خود کے متعلق اس ڈرامے کے کرداروں کو ایک نئی شکل میں دیکھا اور اُسے اُن سب سے ہمدردی ہوئی۔۔۔ رامیشور دیال جو بزدل آدمی تھے لیکن جن کے دل میں رحم تھا، جنھوں نے اپنی جوانی کی لغزش کے پھل کو نفرت سے ٹھکرا نہیں دیا تھا بلکہ اس کے لئے ایک گھر میں رہنے کا انتظام کر دیا تھا اور اُسے ایک خاندان کا فرد بنا دیا تھا اور مرتے وقت بھی وہ اس کے لئے مناسب انتظام کرنا نہیں بھولے تھے۔ چھمیا، جو ایک ایسی عورت تھی جسے نہ جانے کن حالات نے گناہ کی یہ زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا تھا، مگر جس میں اس کی بنیادی انسانیت اور نیک دلی ابھی تک باقی تھی، اور اکبر علی جو اُن میں سب سے زیادہ نیک اور شریف تھے، جنھوں نے ایک دوسرے آدمی کی "ناجائز" اولاد کو اپنے بیٹے کی طرح پالا تھا، اُسے کسی دوسرے انسان سے بڑھ کر چاہا تھا، اس کی ہر خواہش کو سمجھنے اور پوری کرنے کی کوشش کی تھی۔

لیکن وہ خود، جو بدنصیبی کی اولاد تھا، کیا اس کی پیدائش اور پرورش کے ان عجیب حالات

کے پیچھے بھی کوئی بنا بنایا منصوبہ تھا؟ وہ ایک ہندو کا بیٹا تھا جو سب سے بدنصیب قابلِ نفرت طبقے کی عورت کی کوکھ سے پیدا ہوا تھا اور اس کی پرورش ایک مسلم خاندان میں ایک مسلم کی حیثیت سے ہوئی تھی۔ وہ اتحاد کی ایک انوکھی نشانی تھی۔ انسانیت کا ایک ایسا سنگم جس میں خون اور تہذیب کی کئی دھارائیں آگرتی تھیں۔ وہ ملک میں ابھرتی ہوئی فرقہ وارانہ دشمنی اور نفرت کے بارے میں سوچنے لگا۔ اُس سمت ہندو مسلم دشمنی کے بارے میں جس کی آگ پھر بھڑکائی جا رہی تھی۔ کل رات کی میٹنگ اس خطرے کی نشانی تھی۔ اور ابھی بہت سی باتیں اسی طرف اشارہ کرتی تھیں۔ اگر امجد علی اسلامی سلطنت کے خواب دیکھ رہے تھے تو بہت سے دوسرے لوگ ہندو راج کے بھی خواب دیکھ رہے تھے۔ لوگوں میں نفرت تھی اور اس سے بھی بُری بات یہ تھی کہ اُن میں ڈر تھا ہندوؤں کے دل میں مسلمانوں کا ڈر اور مسلمانوں کے دل میں ہندوؤں کا ڈر۔ اور جب ڈر کے مارے انسان حکومت کے خواب دیکھنے لگتا ہے تو خون خرابہ لازمی ہو جاتا ہے۔

ہو سکتا ہے کہ آج خطرہ بہت بڑا نہیں لیکن آگے چل کر بڑھتے بڑھتے وہ نہ صرف آزادی کے لئے خطرہ بن سکتا ہے جس کے لئے وہ سب ہی جدوجہد کرتے آئے تھے، بلکہ سماجی انصاف کے اُس عظیم اور وسیع خیال کے لئے بھی خطرہ بن سکتا ہے جس کے لئے اُنہیں ابھی جدوجہد کرنی تھی۔ کیا یہ سچ نہیں تھا کہ وہ اپنی پیدائش کے لحاظ سے نہ تو ہندو تھا نہ پوری طرح مسلمان ہی، بلکہ خود دونوں ہی تھا۔ جو بھارت ماتا کی اولاد کی ایک انوکھی نشانی تھا۔ دونوں ہی فرقوں کے جذبات کو زیادہ اچھی طرح سمجھ سکتا تھا اور اُن کے اتحاد کے لئے کام کر سکتا تھا، جس کی کہ وہ نشانی تھا اور ساتھ ہی اپنی ماں کی یاد اُسے ہمیشہ بدنصیب ٹھکرائے ہوئے اور ستم زدہ لوگوں کے حقوق کے لئے لڑنے کے لئے متحرک کر سکتی تھی؟

"اب ہمیں کہاں جانا ہے؟"

اب سڑکوں پر اتنا سنّاٹا نہیں تھا جب اُس نے اپنے تھکے ہوئے قدم گھر کی طرف اٹھائے تو سڑکوں پر کچھ کچھ چہل پہل دکھائی دینے لگی تھی۔

دودھ والے بہنگیوں میں پیتل کے ہنڈے لٹکائے تیز تیز بھاگے جارہے تھے۔ کار خانوں کے مزدور رات پالی پوری کر کے جلدی جلدی گھر کی طرف قدم بڑھا رہے تھے۔ چائے خانوں اور ہوٹلوں کے دروازے کھُل رہے تھے۔ نان بائیوں کی دکانوں سے تازہ ڈبل روٹیوں کی سوندھی سوندھی گرم خوشبو آرہی تھی۔

زندگی! زندگی!! زندگی!!!

انور اپنے تھکے ہوئے جسم میں بھی زندگی کو، اس کی لے کو اور اس کی تیزی کو محسوس کر رہا تھا۔ وہ اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنے لگا، وہ پڑھنے اور گھومنے کے لئے غیر ملکوں میں جائے گا، ہندوستان واپس آکر پھر کام کرے گا اور قومی جدوجہد میں حصّہ لے گا!

اُس نے رات پالی سے گھر لوٹتے ہوئے دو مزدوروں کو آپس میں باتیں کرتے سُنا۔

"... دس گھنٹے... جب کہ ساری دنیا میں آٹھ گھنٹے ہوتے ہیں۔"

"مالک کو ہماری کیا فکر؟... اوور ٹائم کا بھتّہ بھی نہیں ملتا..."

"بھیّا، بات بڑھتی جارہی ہے... میری بات یاد رکھنا... ایک نہ ایک دن جلدی ہی جدّوجہد شروع ہونے والی ہے..."

زندگی اور جدّوجہد! یہ تھا مستقبل کا پروگرام۔ اب اُس کی سمجھ میں آگیا کہ سب کو کہاں جانا ہے۔

دروازہ کھُلا تھا جیسے اُس کا کوئی انتظار کر رہا تھا۔

اکبر علی جاگ رہے تھے اور دالان میں ٹہل رہے تھے۔ اُن کی داڑھی پر آنسوؤں کی بوندیں چمک رہی تھیں۔ پرانے زنگ کھائے ہوئے قبضوں پر کھسکتے ہوئے کواڑ کی آواز سن کر انہوں نے مڑ کر دیکھا۔

"آگئے بیٹا؟" انہوں نے اُس کی طرف دیکھے بغیر ہی پوچھا۔ وہ اُس کے پیروں کی آہٹ سے ہی اُسے پہچان گئے تھے۔

"ہاں ابا۔" اور یہ کہہ کر وہ دوڑ کر اپنے ابا کی کھلی ہوئی باہوں میں سما گیا۔

"انقلاب" ایک دلچسپ اور حقیقت افروز کہانی ہے۔ کیونکہ اس کی بنیاد واقعات پر ہے۔"

• ہندوستان سٹینڈرڈ (کلکتہ)

"یہ ناول ایک نگار خانہ ہے جہاں انقلابی اور ٹوڈی بچے، مارکسٹ اور گاندھی وادی، راجے اور اُن کے دلال، ہر قسم کے کردار ملتے ہیں۔"

• اِلسٹریٹیڈ ویکلی آف اِنڈیا (بمبئی)

"یہ ناول ہندوستان کی جنگِ آزادی کی سچی تصویر ہے۔"

• ہندوستان ٹائمز (دہلی)

"یہ تاریخی ناول (جس کا مصنف ایک جرنلسٹ کی حیثیت سے ہندوستان بھر میں مشہور ہے) ہر ہندوستانی کو پڑھنا چاہیے۔"

• امرت بازار پتریکا (کلکتہ)

تصویریں: سپرکووال زاویہ (سودیکس ایڈیشن)

گرد پوش: انقلاب (عبد الرحمٰن)

آزادی کا جلوس [illegible]